عمر فاروقؓ

شاہکارِ رسالت

پرویزؒ

عمر ہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

شاہکارِ رسالتؐ

عمر فاروقؓ

جن کے عہدِ خلافت میں اسلام ایک جیتے جاگتے
نظامِ حیات کی شکل میں سامنے آیا

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ○ 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اذا اردتم ان یطیب المجلس فافیضوا

فی

ذکرِ عمرؓ

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مجلس پاکیزہ ہو جائے تو
عمرؓ کا ذکر کیا کرو!

(خواجہ حسن بصریؒ)

اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

شاہکارِ رسالتؐ

ایڈیشن اوّل : نومبر 1973ء

ایڈیشن نہم : اپریل 2007ء

ایڈیشن دہم : دسمبر 2014ء

مطبع: طیب اقبال پرنٹرز، رائل پارک، لاہور

ناشر

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

25-بی، گلبرگ 2، لاہور 54660۔ پاکستان

فون نمبر: 35753666, 35764484

trust@toluislam.com

www.toluislam.com

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

No part of this book may be reproduced by any mechanical, photographic, or electronic process, or in the form of a phonographic recording, nor may it be stored in a retrieval system, transmitted, or otherwise copied for public and private use, without written permission except in the case of brief quotations embodied in critical articles and reviews.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نشاناتِ راہ

مضمون	صفحہ
گزرگاہِ خیال	01
پہلا باب	
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا	
1-ارشادِ نبویؐ ___ جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ حالتِ اسلام میں بھی بہتر تھے۔	26
2-فریضۂ رسالت، محض پیغامِ خداوندی پہنچا دینا نہیں تھا، ایک اُمت کی تعمیر کر کے اس پیغام کے مطابق معاشرہ متشکل کرنا بھی تھا۔	26
3-اس پیغام کی اوّلین مخاطب قوم ___ عرب۔	27
ان کی خصوصیات، ابوجہل اور امراء القیس کا جذبۂ تمرّد اور احساسِ برتری۔	27
4-رسولؐ اللہ کی دعا کہ ابوجہل اور عمر میں سے کوئی ایک مُشرف بہ اسلام ہو جائے۔	29
5-ابنِ خطابؓ کے ذاتی اور خاندانی کوائف۔	30
آپ نبی اکرمؐ سے دس سال چھوٹے تھے۔	31
باپ سخت گیر تھا، مشقت بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔	31
6-معاشرہ میں مقام۔	31
7-آپ سخت مزاج تو تھے سنگدل نہیں تھے۔	
رِقتِ قلبی کا واقعہ۔	32
دوسرا باب	
خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد	
1-قریش کی طرف سے اس جدید تحریک (دینؐ) کی مخالفت۔ مخالفت کی وجہ یہ کہ ان کے معاشرتی اور معاشی نظام کو جڑ بُنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔	33
2-نوحۂ ابوجہل درحریمِ کعبہ۔	33
3-ابنِ خطاب کی طرف سے مخالفت اور تشدّد۔	34
4-اسلام لانے کا واقعہ۔ عام روایات کے مطابق۔	34
5-یہ روایات صحیح دکھائی نہیں دیتیں۔	36
اس کی وجہ۔	36
6-صحیح سبب ___ خود حضرت عمرؓ کی زبانی۔	38
7-سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے ہاں	

مضمون	صفحہ
جا کر بتایا کہ میں اسلام لے آیا ہوں۔	40
8-اسلام کی دعوت کے لئے جلوت کا مقام آ گیا۔	41
9- کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہجرت بھی اسی طرح اعلانیہ کی تھی۔	42
10-عہدِ رسالت مآبؐ میں حضرت عمرؓ کا مقام اور فضیلت ـــ خود حضورؐ کی سند و شہادت۔	43
11-اس کے باوجود جذبۂ اطاعتِ رسولؐ اپنی انتہاء تک۔	43
یہ تربیتِ نبویؐ کا نتیجہ تھا۔	44
12-بعض غلط روایات ـــ یعنی ایسی روایات جن میں کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی فلاں فلاں آیات حضرت عمرؓ کے مشورہ، خیال یا رائے کے مطابق نازل ہوئی تھیں۔	46
13-یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے وحی کے نبیادی تصوّر پر حرف آتا ہے۔ وحیٔ خداوندی کسی انسان کے خیال یا رائے کے تابع نہیں ہوتی تھی۔	47
14-قرآنی آیات کے سلسلہ میں ''شانِ نزول'' کا نظریہ غلط ہے۔	47
15-واقعۂ قرطاس ـــ اس کی تفصیل چوتھے باب میں سامنے لائی جائے گی۔	48
16-ایک اور روایت ـــ رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت عمرؓ کا ردِّ عمل ـــ یہ روایت بھی صحیح نہیں۔	48
اصل بات یوں ہوئی ہوگی۔	49

تیسرا باب

خلافتُ حفظِ ناموسِ الٰہی است

مضمون	صفحہ
1-مذہب اور دین میں فرق۔	51
مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جو یکسر انفرادی اور موضوعی جذبہ ہے۔	51
دین معاشرت یا مملکت کے نظام کا نام جو انفرادی اور اجتماعی پوری زندگی کو محیط ہوتا ہے۔	51
2-دین میں اصلاً اطاعت خدا کی ہوتی ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔	52
یہ کتاب (قرآنِ مجید) اِسلامی مملکت کا غیر متبدل ضابطہ ہوتی ہے جسے سربراہِ مملکت عملاً نافذ کرتا ہے۔	52
3-''خدا اور رسول'' کی اطاعت سے مراد، اس نظام کی اطاعت ہوتا ہے۔	52
4-رسولؐ اللہ کے بعد نظام، حضورؐ کے جانشینوں نے قائم کیا۔ انہیں خلیفۃ الرّسولؐ کہا جاتا ہے اور اس منصب کو خلافت۔	53
5-صحابۂ کبارؓ کے مومنِ حقّا ہونے کی شہادتِ خداوندی۔ ان کے باہمی تعلقات، اخوت، یگانگت اور مودّت کے۔	53
6-ہماری کتبِ تاریخ اور احادیث میں ان صحابہؓ کے مطابق کیا کہا گیا ہے۔	54
7-خلافت کے متعلق حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ	

مضمون	صفحہ
کی گفتگو۔	54
8-اوّلین خلیفہ (حضرت ابوبکرؓ) کے انتخاب کا واقعہ۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کے مابین کیا ہوا؟	55
طبری کی تاریخ کی تصریحات۔	58
9-یہ سب روایات وضعی اور تاریخ کے بیانات افسانے ہیں۔	65
صحابہؓ کی سیرت ان سے مُنزّہ اور بلند تھی۔	65
خلافت کے متعلق دو ایک اصولی باتیں۔	66
انسان خلیفۃ اللہ نہیں۔	66
حضرت ابوبکرؓ کی تصریح کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں خلیفۃ الرّسول ہوں۔	66
11- ڈسپلن کی مثال ـــ حضرت عمرؓ (حضرت) اسامہؓ بن زید کے لشکر کے ساتھ بطور سپاہی جارہے تھے۔خلیفہ (حضرت ابوبکرؓ) نے حضرت اسامہؓ سے اجازت لے کر انہیں اپنے پاس رکھا۔	66
12 - حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے باہمی تعلقات ـــ محبت یگانگت، احترام اور تکریم کے باہمی تعلقات۔	67
حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد کہ خلیفہ درحقیقت عمرؓ ہی ہیں۔انہوں نے قبولِ خلافت سے انکار کر دیا تو میں خلیفہ بن گیا۔	67
حضرت عمرؓ بطور قاضی (مجسٹریٹ)۔	67

مضمون	صفحہ
13- حضرت عمرؓ کا انتخاب۔	68
14- قرآن نے مشاورت کا اصول دیا ہے، اس کا طریقۂ کار (یعنی مشینری) کا تعیّن خود ہی نہیں کر دیا۔اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑا ہے۔	68
قوانین و دستور کے سلسلہ میں قرآن کا انداز ہی یہی ہے۔غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر ہر زمانے کی اُمت کو جزئیات متعیّن کرنے کی آزادی۔	68
15-اس اصول کے مطابق اعیانِ مدینہ نے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا۔	68
16-بیعت کا مفہوم ـــ اپنا جان اور مال ''خدا کے ہاتھ'' بیچ دینا۔	69
یہ معاملہ سربراہِ مملکت کی وساطت سے طے پاتا ہے۔	69
17-انتخابِ حضرت عمرؓ کی توثیق۔	70
18- خلافتِ حضرت عمرؓ کا آغاز۔ 23 جمادی الآخر 13 ہجری (22 اگست 632ء)۔	71
19- پہلا خطبۂ خلافت۔	71
حضرت ابوبکر صدیقؓ کا۔	71
حضرت عمرؓ کے دو خطبے، تین دعائیں اور تمنائیں۔	72
قرآن کے فہم اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی دعا۔	73
حقوق و فرائض کی صراحت۔	74
20- خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب۔	75

مضمون	صفحہ
امیر کے معنی ـــــ نشاناتِ راہ متعیّن کرنیوالے راہنما۔	75
21- خلافت اور ملوکیّت میں فرق۔	76
ملوکیت یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا بادشاہ بن جائے' ہر وہ نظامِ حکومت جس میں بعض انسان دوسرے انسانوں کے محکوم ہوں' ملوکیّت ہے۔	76
22- خلافت کا مفہوم حضرت عمرؓ کے ارشادات کی روشنی میں۔	77
چوتھا باب	
حسبنا کتاب اللہ	
1- واقعۂ قرطاس سے متعلق روایت صحیح نہیں۔	79
لیکن اگر حضرت عمرؓ نے کسی وقت "حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہ" فرمایا تھا تو یہ قرآن کی تعلیم اور رسولؐ اللہ کے اُسوہ کے عین مطابق تھا۔	80
2- قرآنِ کریم مکمل' غیر متبدل' محفوظ کتاب ہے۔	80
خدا نے خود کہا ہے کہ یہ تمہارے لئے کافی ہے۔	80
رسولؐ اللہ نے بھی یہی فرمایا کہ میں تمہارے لئے کتاب اللہ چھوڑ چلا ہوں۔	80
3- صحابہؓ بھی اپنے "اہلِ قرآن" ہونے پر فخر کرتے تھے۔	81
4- عمل بالقرآن کے لئے حضرت عمرؓ کی تاکید۔	81
5- عمالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلیں معیار یہ تھا کہ وہ قرآن پر کس قدر عبور رکھتے ہیں۔	82
6- قاری سے مراد' قرآن کو سمجھنے والا تھا' نہ صرف پڑھنے والا۔	82
7- واللہ عالَم مت کہو۔ جو بات نہیں جانتے' سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔	83
8- قرآن کی آیت سُن کر غصہ اُتر جاتا تھا۔	83
9- استنباطِ نتائج اور جُزئی قوانین کی ترتیب' قرآنی اصولوں کی روشنی میں کرتے تھے۔	83
عراق کی مزرعہ اَراضی کی تقسیم کا معاملہ۔	84
10- مسئلۂ تقدیر کا حل ـــــ میں خدا کی تقدیر کی طرف سے خدا ہی کی تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔	84
11- خدا' انسانوں کو رزق' انسانوں ہی کے ہاتھوں سے دیتا ہے۔	86
12- متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر قانونِ خداوندی پر بھروسہ کرتا ہے۔	86
13- خدا کی کتاب کو مرکز اور محور بناؤ' علماء و مشائخ کو سند و حجت تسلیم نہ کرو۔	87
14- قوموں کی موت و حیات کے فیصلے' قرآنی اقدار کی رُو سے ہوتے ہیں۔	87
15- آپ کی وصیت ـــــ کتاب اللہ کو تھامے رہو۔ اس طرح تم گمراہ نہیں ہو گے۔	88
16- حضرت ابنِ عباسؓ کی شہادت کہ آپ فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے تھے اور سب کے	

مضمون	صفحہ
حصے برابر تقسیم کرتے تھے۔	88
17- چھوٹی چھوٹی باتوں میں زیادہ کاوش نہیں کرتے تھے۔ اگر ایک لفظ کے معانی معلوم نہیں ہو سکے تو اس میں تردّد اور اضطراب کی کون سی بات ہے؟	88
18- محض لَا اِلٰہ کہہ دینے سے جنت نہیں مل سکتی، جنت عمل سے ملتی ہے۔	89
19- دوسرا عظیم واقعہ ــــ قرآن شخصیّت پرستی کو مٹانے کے لئے آیا تھا خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔	90
قرآنِ کریم کی تعلیم اور حضورؐ کی عملی زندگی نے شخصیّت پرستی کے تصور تک کو مٹا دیا۔	90
20- ''شجرِ رضوان'' کے تلے لوگ آ کر نماز پڑھنے لگ گئے آپ نے اس درخت کو کٹوا دیا۔	
21- جس مسجد میں حضورؐ نے ایک دفعہ نماز پڑھی تھی لوگ دُور دُور سے آ کر اس مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ آپ نے اس سے بھی روک دیا۔	90
22- ایک قبر کو لوگ دانیال نبی کو قبر کہہ کر اس کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؓ نے اس قبر کو چھپا دیا۔	94
23- حجرِ اسود کے متعلق کہا کہ وہ صرف ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔	94
شعائر اللہ کی تعظیم کا قرآنی مفہوم۔	94
24- جمع و تدوینِ احادیث کے متعلق حضرت عمرؓ (اور صحابہؓ) کا مسلک۔ انہوں نے اس سے سختی سے روک دیا تھا۔	97
25- جمعِ قرآن کے سلسلہ میں وضعی روایات۔	101
26- حضرت عمرؓ اور تفقہ فی القرآن۔	104
27- آپ انہی معاملات پر غور و فکر کرتے تھے جو درحقیقت پیش آتے تھے۔ یونہی فرضی مسائل یا ''اندیشہ ہائے افلاکی'' کے متعلق بحث و تمحیص سختی سے روکتے تھے۔	105
28- حضرت عمرؓ کے فقہی فیصلے۔	105
اور ان فیصلوں کے دُور رَس مستقل نتائج ــــ چند مثالیں:	106
(i) اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت معطل کر دی۔	
(ii) زنا بالجبر میں عورت کو سزا نہیں دی جائے گی۔	
(iii) قاتل، مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔	
(iv) عدالت سے معافی کے بعد جرم کا دھبہ مٹ جاتا ہے اور اس کے اثرات و عواقب باقی نہیں رہتے۔	
(v) حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو سزا دی جائے گی۔	
(vi) قانون کا علم نہ ہونے کی صورت میں مجرم کو سزا نہیں دی جائے گی۔	107

پانچواں باب

زِندگی جُہد است و اِستحقاق نیست

مضمون	صفحہ
1- حرکت و عمل، جدو جہد خود زندگی کا تقاضا ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب شامل ہیں۔	108
2- کائنات میں خیر و شر، تعمیری اور تخریبی قوتوں کا باہمی تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اس تصادم کی آخری جولانگاہ، میدانِ کارزار ہوتا ہے۔	108
3- اس آخری ٹکراؤ کو قتال کہا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے لئے جہاد کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔	109
4- مومن کی زندگی جہادِ مسلسل کی زندگی ہے جس کی آخری کڑی قتال ہوتا ہے۔	109
5- ہجرت اور جہاد کے متعلق تفصیلی گفتگو—— یہ کیوں، کن حالات میں، اور کن شرائط کے ماتحت قتال فی سبیل اللہ بنتا ہے۔	109
6- حضرت عمرؓ کی ساری زندگی جہدِ مسلسل کی زندگی تھی۔	131
7 - خلافتِ فاروقی جہادِ مسلسل کی برق آسا داستان ہے۔	131
8- حضرت عمرؓ جنگ کی جزئیات تک خود مرتّب کرتے تھے۔	131
9- آپ خود میدانِ جنگ میں کیوں نہ گئے؟ اس کی وجہ۔	132
10- جنگ کے سلسلہ میں ہدایات۔	132
11- سب سے زیادہ زور ''نیتوں کی اصلاح'' پر دیا جاتا تھا۔ اس کا مفہوم کیا تھا؟ ایک محیّر العقول واقعہ۔	134
12- جنگ میں کامیابی کا راز سیرت کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی ہے۔ اس باب میں اپنا موازنہ دشمن کے ساتھ کرتے رہو۔	134
13- اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ خدا کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ مخلوقِ خدا تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔	135
14- تم اپنی رعایا (ماتحتوں) کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے اگر تم رعایا (ماتحت) ہو تو اپنے افسر کو دیکھنا چاہو۔	135
15- جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔	136
16- اِسلامی لشکر میں سپاہیوں اور کمانڈروں کے تعلقات —— حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے سپاہیوں کو چھوڑ کر محفوظ مقام پر جانے سے انکار کر دیا اور ان کھانوں سے بھی ہاتھ کھینچ لیا جو ضیافت میں صرف ان کے لئے تیار کئے گئے تھے تمام اہلِ لشکر کیلئے نہیں۔	136
17- غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک۔	137
حمص کے ذِمیوں سے وصول کر دہ جزیہ واپس	

مضمون	صفحہ
دے دیا۔	137
جزیہ کے متعلق مختصر سا اشارہ۔	137
18-اسلام ان کے حُسنِ سیرت کی بدولت پھیلا تھا۔	138
19 - لشکریانِ اسلام کے متعلق مقوقس کے ایلچیوں کا تبصرہ۔	138
20-ایران کے گورنر (ہرمزانؔ) کا تبصرہ — جب وہ قید ہو کر آیا تھا — پہلے عرب تنہا ہوتے تھے اس لئے ہم ان پر غالب آ جاتے تھے' اب ان کے ساتھ خدا بھی ہوتا ہے' ہم ان دو کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔	138
21-حضرت عمرؓ نے تاکید کر دی تھی کہ مسلمان سپاہی غیر مسلموں (اہلِ ایران) سے خلا ملا پیدا نہ کریں۔	139
22-میدانِ جنگ کے حالات معلوم کرنے کا جذبۂ بے اختیارِ شوق۔ حضرت عمرؓ قادسیہ سے آنے والے سانڈنی سوار قاصد کے ساتھ دوڑتے آئے اور حالات سنتے رہے۔	139
23-آپ نماز کی حالت میں بھی لشکروں کے متعلق سوچا کرتے تھے — نماز میں ایسے خیالات کا دل میں پیدا ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔	140
نماز میں ایسی کیفیت خود رسول اللہؐ کی بھی ہوتی تھی۔	140
24-شہادت کا مرتبہ — اپنے بھائی کی شہادت پر غمزدگی کا عالم — اور ایک شاعر کے ایک فقرہ سے سکونِ قلب۔	143
25-مساواتِ اسلامیہ — قبائلی افتخار اور حسب و نسب کی نسبتوں کو مٹا دیا۔	143
کسی جنگ میں دو سپاہیوں میں باہمی تکرار ہو گئی انہوں نے اپنے اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان کی سخت سرزنش کی۔	144
حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو سخت انتباہی مراسلہ۔	144
26-میدانِ جنگ میں گئے ہوئے "سپاہیوں کے بچوں کا باپ عمرؓ ہے"۔ سپاہیوں کے گھر والوں کے کام کاج خود جا کر کرتے۔ عام حکم دے دیا کہ ایک خاص وقفہ کے بعد ہر سپاہی کو گھر آنے کی رخصت دی جایا کرے۔	145
27-شکست خوردہ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی۔	145
کس طرح کی حوصلہ افزائی۔ شہادت کے متعلق ایمان' کہ اس سے حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے اور یہ اطمینان کہ میرے بعد میرے بیوی بچے لاوارث نہیں رہ جائیں گے' مومن سپاہیوں کو شیروں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیتا تھا۔	146

چھٹا باب

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

مضمون	صفحہ
1- مُستشرقین کا اعتراض کہ رسول اللہؐ نے مکہ میں	

مضمون	صفحہ
درویشانہ زندگی بسر کی اور مدینہ آ کر مملکت قائم کر لی۔	147
2-ہمارے ہاں کے جواب دینے والوں کا معذرت خواہانہ انداز۔	147
3-عیسائیت میں قانون کا تصور ہی نہیں۔مملکت کا تصور کیسے ہوسکتا ہے؟	148
4-اسلام مذہب نہیں' دین ہے اور دین کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہونہیں سکتا ___ قرآنی تصریحات۔	148
5- مکّی زندگی قیامِ مملکت کے پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔اس زندگی میں مملکت کے متعلق حضورؐ کے ارشادات۔	150
6-یہ مملکت کسی دوسرے کی مملکت چھین کر قائم نہیں کی گئی تھی۔''جُوعِ الارض''اِسلام میں جائز نہیں۔	151
7-''اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا'' اس اعتراض کا جواب۔خود حضرت عمرؓ کا (آزاد کردہ) غلام وثیق ساری عمر عیسائی رہا۔مصر کے قیدیوں کو اجازت کہ چاہے اسلام قبول کرلیں چاہے عیسائی رہیں۔	152
8-دوسرا اِعتراض ___ مفتوح علاقہ کے باشندوں کوغلام اورلونڈیاں بنالیا جاتا تھا ___ اس کا جواب۔	156
9- تیسرا اعتراض ___ جزیہ اور ذِمّی ___ اس کا جواب۔	159

مضمون	صفحہ
مفتوح قوموں کے ساتھ معاہدات کی دو ایک مثالیں۔نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسولؐ اللہ کا معاہدہ اوراہلِ بیت القدس (ایلیاء) کے ساتھ حضرت عمرؓ کا معاہدہ۔	160
10-معاہدات کی پابندی کی محیرّ العقول مثالیں۔	162
اہل الذّمہ کے گاؤں کے باہر درختوں کے سائے تلے بیٹھتے تو اس کا بھی معاوضہ دے دیتے۔	162
انہیں اس کے رسوم و رواج اور شخصی قوانین کی آزادی تھی حتیٰ کہ وہاں کی دفاتری زبان تک بحال رکھی جاتی تھی۔	163
11-بعد میں کیا ہوا۔اس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔	163
12-سلسلۂ فتوحات۔	164
13-ایرانی اور بازنطینی سلطنتیں۔	164
ان ممالک کی حالت۔	165
14-نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں بازنطینی سلطنت کے ساتھ ٹکراؤ۔	165
جنگِ مؤتہ ___ (8)ھ	166
تبوک کی طرف مہم۔بغیر جنگ کے واپسی۔	166
بازنطینیوں کی روک تھام کے لئے لشکر کی تیاری۔	167
حضورؐ کی وفات۔	167
15-عہدِ صدیقیؓ۔ مذکورہ بالا لشکر کی (حضرت اسامہؓ بن زید کی زیرِ سرکردگی) روانگی۔سرحدی معاہدات۔	167

مضمون	صفحہ
اندرونِ عرب قبائل کی بغاوت۔ مانعینِ زکوٰۃ یا مُرتدین سے مراد۔ زکوٰۃ کا مفہوم۔	167
16- سرحدِ عراق پر خطرات۔ ایرانی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کے کاشتکاروں اور محنت کشوں پر مظالم۔	169
حضرت مثنیٰؓ بن حارث دربارِ خلافت میں۔	169
17- ایرانیوں کے خلاف سب سے پہلا معرکہ۔ حیرہ کی فتح اور وہاں کے حاکم، ہرمز کا قتل۔	169
18- دوسری طرف رومیوں کو یورش کا خطرہ۔	169
یرموک کا معرکہ اور نمایاں کامیابی۔	170
دمشق کی فتح۔ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بن ولید بطور فاتح داخل ہوئے اور دوسری طرف، رومی سپہ سالار نے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی۔ اس صلح کو سارے لشکر پر واجب قرار دیا گیا۔	170
حضرت ابو بکرؓ کی وفات۔	170
19- عہدِ فاروقیؓ۔ (جمادی الاخریٰ) 13ھ۔634ء	170
20- حضرت مثنیٰؓ بارِ دیگر بارگہِ خلافت میں۔	170
21- سلطنتِ ایران کے حکمران۔ خسرو پرویز سے لے کر یزدگرد تک جو حضرت عمرؓ کا ہمعصر تھا۔	171
22- ایرانیوں کے ساتھ ٹکراؤ اور اسلامی لشکر کی فتح۔	171
23- ایرانی سپہ سالار جابان کی گرفتاری۔ اسے ایک مسلمان سپاہی نے (اَن جانے) اَمان دے دی تو یہ اَمان تمام لشکر پر واجب قرار پا گئی۔	172
24- معرکہ جسر (پل) میں مسلمانوں کو شکست۔	173
حضرت ابو عبیدہؓ ثقفی کی شہادت۔	173
25- حضرت مثنیٰؓ کے ساتھ مقابلہ۔ ایرانیوں کی شکستِ فاش۔	174
حضرت مثنیٰؓ کی وفات۔	174
حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بطور سپہ سالار۔	174
26- یزدگرد کے دربار میں اسلامی لشکر کا سفیر۔	174
مٹی کے ٹوکرے کا تحفہ لے کر شاداں و فرحاں لَوٹ آئے۔	175
27- رستم کے دربار میں اسلامی لشکر کا سفیر۔	176
28- معرکہ قادسیہ، رستم مارا گیا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے لشکر کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔	177
تاریخِ عالم ایک عظیم موڑ مُڑ گئی۔	
29- ابو محجن ثقفیؓ، گوشہ زنداں سے میدانِ کارزار میں۔	177
30- ایرانی لشکر کا تعاقب — ''بحرِ ظلمات میں دَوڑا دیئے گھوڑے ہم نے''۔	178
31- لیجئے! ایران کا دار السلطنت، مدائن بھی فتح ہو گیا، اور اس کے ساتھ ہی ایران کی مملکت کا خاتمہ ہو گیا۔	179
32- شاہنشاہِ ایران کا قصرِ اَبیض اور اس کا سامان و یراق۔ اس میں نادر مجسمات بھی تھے۔ مسلمانوں	

مضمون	صفحہ
نے انہیں اسی طرح صحیح وسلامت رہنے دیا۔	180
33- سپاہیوں میں سے کسی نے اس مالِ غنیمت میں سے ایک سوئی تک کو نہیں چھُوا تھا۔	180
حضرت عمرؓ کا اس پر اظہارِ تعجب اور حضرت علیؓ کا ارشاد کہ آپ کی سپاہ اس قدر دیانت دار اس لئے ہے کہ آپ خود اس قدر دیانتدار ہیں۔	181
34- نہاوند کا معرکہ اور مسلمانوں کی کامیابی۔ ایران کے دیگر صوبے بھی یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔	181
35- یزدگرد کا انجام ـــ ایک پَن چکی میں پوشیدگی کی حالت میں قتل۔	182
36- ایران کے گورنر، ہرمزان کے ساتھ مقابلہ۔	
ہرمزان گرفتار ہو کر مدینہ پہنچا۔	183
فریب دہی سے جان بچانے کا ڈرامہ۔	183
یہ واقعہ منطقی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔	183
37- ہرمزان زندہ رہا، مدینہ میں رہا، اور آخر الامر اس نے اپنا انتقام لے لیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت اسی کی سازش کا نتیجہ تھا۔	185
38- یہ قصہ کہ یزدگرد کی تین بیٹیاں قید ہو کر آئیں اور لونڈیاں بنالی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک، حضرت امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ، شہربانو تھیں۔	
یہ قصہ بوجوہ ناقابلِ تسلیم ہے۔	186
39- معجزات ـــ مخالفین نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے تھے۔ حضورؐ نے قرآن اور اپنی زندگی کو بطور معجزہ پیش کیا۔	187
40- صحابہ کبارؓ نے بھی نہ کشف وکرامات کا دعویٰ کیا تھا، نہ روحانیت اور سلوک کی منازل کا ذکر۔ ان کی ''روحانیت'' ان کی پاکیزہ زندگی اور ان کی کرامات ان کی فتوحات تھیں۔	188
41- جب مسلمانوں میں تصوف دَر آیا تو انہیں اپنی کرامات کے لئے سندوں کی تلاش ہوئی۔	189
ایک کرامت حضرت عمرؓ کی طرف بھی منسوب کر دی۔ ''یا ساریہ الی الجبل'' ـــ یہ روایت بھی وضعی ہے۔	189
42- ''عروسِ نیل'' کا افسانہ۔	190
43- رومیوں کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ۔	192
چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیوں اور کامرانیوں کے بعد حمص اور انطاکیہ کے معرکے۔	193
44- مسلمان افواج کی کامیابی کا راز، ایک عیسائی سیاستدان کی زبانی۔	193
یہ ان کا حُسنِ اخلاق اور پاکیزگیٔ سیرت تھی۔	193
45- شام کی مکمل فتح، ہرقل کا قسطنطنیہ کی طرف فرار۔	194
46- فتحِ بیت المقدس۔	195
47- حضرت عمرؓ کا سفرِ بیت المقدس۔	196

مضمون	صفحہ
اس ''سکندرانہ جلوس'' کے قلندرانہ مناظر!	197
بیت المقدس کی زیارت گاہوں کی سیر۔	198
کلیسا میں نماز ادا کرنے سے انکار کہ ممکن ہے بعد میں مسلمان اسے مسجد بنالیں۔	198
48-ایک ضمنی گوشہ ـــ کعب احبار کی یہودیت کی غمازی۔ حضرت عمرؓ کی سرزنش۔ نومُسلم اقوام کس طرح اپنے سابقہ معتقدات کو ساتھ لے کر آئیں اور انہیں عین اسلام بنادیا۔ اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت۔	199
49- قبۃ الصخرہ اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر اور تاریخ۔	201
50- ''مسجدِ اقصیٰ'' کا ذکر قرآنِ کریم میں۔ تفاسیر اس کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ شبِ معراج کا ذکر۔ وضعی روایات۔ سورۂ بنی اسرائیل میں حضورؐ کی ہجرت کا بیان ہے اور ''مسجدِ اقصیٰ'' سے مراد مدینہ ہے نہ کہ بیت المقدس کی کوئی مسجد۔	202
51- فتحِ بیت المقدس کا جشن۔ حضرت بلالؓ کی اذان۔ رسولؐ اللہ کی جنت آفریں صحبتوں کی یاد۔ ہر آنکھ اشکبار ہر قلب خونفشاں۔	204
52- حمص پر عیسائیوں کی یورش اور شکست۔	205
53- مسلمانوں کا جندی سابور پر حملہ۔ ایک (مسلمان) غلام نے انہیں امان کا وعدہ دے دیا اور اس وعدہ کو سارے مسلمانوں نے تسلیم کرلیا۔	206
54- فتحِ مصر۔	206
حضرت عمروؓ ابن عاص کی تجویز اور دلائل۔	207
55- اسلامی سپاہ کے متعلق مقوقس کے تأثرات۔	208
56- مصر کا دارالخلافہ اسکندریہ فتح ہوگیا۔	209
57- نویدِ فتح لے کر قاصد مدینے پہنچا۔	209
وہاں امیر المومنین کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے میں کیا تھا؟	209
58- حضرت عمرؓ کا ارشاد کہ میں سو کیسے سکتا ہوں؟	209
59- شہرِ فسطاط کی تعمیر۔ اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟	210
60- حضرت عمروؓ بن عاص نے اپنے لئے بلند منبر بنوایا' حضرت عمرؓ نے اسے تڑوا دیا۔ حاکم کو رعایا سے اونچا نہیں بیٹھنا چاہیئے۔	210
61- انہوں نے حضرت عمرؓ کے لئے ایک مکان وہاں بنوایا تو آپ نے لکھا کہ اس مکان کو رفاہِ عامہ کے لئے وقف کردو۔ حجاز میں رہنے والے کا مصر میں کیسے مکان ہوسکتا ہے؟	210
62- اسکندریہ کی لائبریری جلانے کا افسانہ۔	210
63- ان فتوحات کی انسانیت سازی پر غیروں کا خراجِ تحسین۔	211
64- حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی کا واقعہ ـــ جسے اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔	213
تاریخ اس واقعہ کے متعلق کیا کہتی ہے۔	
اس پر قرآنِ کریم اور سیرتِ حضرت عمرؓ کی روشنی	

مضمون	صفحہ
میں تبصرہ۔	217
65-ہمیں اس قسم کے محاکمہ میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔	219
یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔	219

ساتواں باب

آئینِ جہانداری

مضمون	صفحہ
1-عربوں جیسی ناتجربہ کار قوم کے لئے ایسی وسیع و عریض مملکت کا نظم و نسق آسان کام نہیں تھا۔	221
2-اس مملکت کے نظم و نسق کے بنیادی خط و خال۔	
مسجد اس کا مرکز، اور دار الشوریٰ تھی۔	222
3- مملکت صوبوں اور کمشنریوں میں منقسم تھی۔	
والی، صوبوں کے گورنر تھے۔	223
4-حج کے اجتماع میں تمام والیانِ مملکت شریک ہوتے تھے۔ اس میں مملکت کے اہم معاملات بھی طے ہوتے تھے اور عوام کی مشکلات کا ازالہ بھی ہوتا تھا۔	223
5-احوالِ مملکت سے باخبر رہنے کے لئے وقائع نویس مقرر کئے۔ شعبۂ محاصل۔	224
6-خلافت کے معنی یہ ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔	224
7-اراضیات کا انتظام۔	225
8-آبپاشی اور آب نوشی کے لیے نہریں کھدوائی	
گئیں۔	255
نہر سویز کی تجویز ـــ اسے سیاسی مصالح کی بنا پر عمل میں نہ لایا گیا۔	226
9-نئے نئے شہر بسائے گئے۔	226
تین کمروں سے زائد پر مشتمل مکان بنانے کی اجازت نہیں تھی۔	226
10-سڑکوں کی تعمیر۔	226
11-مساجد کی تعمیر ـــ یہ ملت کی اجتماعی زندگی کے مراکز تھے۔	226
مسجدِ نبویؐ اور حرمِ کعبہ کی توسیع۔	227
12-بیت المال، خزانہ کی عمارت بڑی مستحکم بنوائی جاتی تھی۔	227
13-عسکری نظام۔ ہر مومن، سپاہی (مجاہد) تھا۔	
14-اس دوران میں اندرونِ ملک بھی کوئی فساد نہیں برپا ہوا تھا۔ کوئی بغاوت نہیں اُبھری حالانکہ حکومت کے پاس کوئی ''سٹینڈنگ آرمی'' نہیں تھی۔	227
15-جیوشِ اسلامیہ کے سپاہی، اسلام کے مبلّغ بھی تھے۔ یہ تبلیغ، ان کی حُسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار کے ذریعے ہوتی تھی۔	228
16- قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّم کے خصوصی انتظامات۔	228
17-سنِ ہجری کا تعیّن۔	229

مضمون	صفحہ
18- امورِ مملکت سے متعلق، سب کام تحریری ہوتا تھا۔	230
اس کے لئے سکریٹریٹ قائم کیا گیا۔	230
19- ایک نہایت اہم سوال جو دل میں ابھرتا ہے۔ یہ تمام ریکارڈ کہاں چلا گیا۔ اس کا ایک پرزہ تک بھی کہیں نہیں ملتا۔	230
20- ہمارے ہاں اوریجنل ریکارڈ کہیں بھی نہیں۔ صرف قرآنِ کریم محفوظ و غیر محرّف ہے اور بس۔ یہی دین میں سند و حجت ہے اور صدرِ اوّل کی تاریخ کی صحت کا معیار۔	231
21- نظامِ عدل۔	232
عدل کی اہمیت قرآنِ کریم کی رُو سے۔	232
22- عدل سے مراد کیا ہے؟	233
قانون کے مطابق فیصلہ۔	233
لیکن اگر قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو پھر......	233
قانون وہی مبنی بَر عدل ہوگا جو وحیٔ خداوندی کے مطابق ہو۔	233
23- حضرت عمرؓ قضاۃ (ججوں) کو خود ہدایات بھیجتے رہتے تھے کیونکہ قرآنی فقہ پر آپ کی نگاہ بڑی وسیع و عمیق تھی۔	234
24- ان ہدایات کا ملخص۔	234
یہ ہدایات گویا نظامِ عدل کے ستون ہیں۔	234
25- ثقہ اور قابلِ اعتماد وہ ہے جو باہمی معاملات میں کھرا ثابت ہو نہ کہ وہ جو نمازیں بہت پڑھتا ہو۔	235
26- حضرت عمرؓ کے فیصلے۔	236
بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ سزا اُسے دی جائے گی جس نے اسے بھوکا رکھا تھا (حاطب ابنِ بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ)۔	237
27- جبلہ بن ایہم کا واقعہ ـــ سزا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔	238
اس واقعہ کے ضمن میں دو ایک بصیرت افروز نتائج۔	238
28- خود اپنے بیٹے ـــ عبدالرحمٰن ـــ کا واقعہ۔	240
29- ایک دلکشا واقعہ ـــ ''مجھے اپنا دوست نہ بنائیے۔ میں اس سے جائز مراعات سے بھی محروم ہو جاؤں گا''۔	241
30- حضرت عمروؓ بن عاص کے بیٹے کا واقعہ۔	241
احترامِ آدمیت کا درخشاں اصول۔ لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا، تم نے انہیں غلام کیوں بنا لیا!	241
31- خود حضرت عمرؓ کے خلاف، حضرت شریحؒ کا فیصلہ۔	242
32- حضرت عمرؓ بہ حیثیت مدعا علیہ، حضرت زیدؓ کی عدالت میں۔	242
33- حضرت علیؓ بہ حیثیت مدعا علیہ، حضرت عمرؓ کی	

مضمون	صفحہ
عدالت میں۔	242
مساواتِ انسانیہ کا نہایت لطیف اور عمیق مظاہرہ۔	243

آٹھواں باب

حوادثِ آفاقی

مضمون	صفحہ
1- طبعی کائنات میں رُونما ہونے والے حوادث پر انسان قابو پا سکتا ہے کیونکہ اشیائے فطرت کا علم دیا گیا ہے۔	244
لیکن ان پر اسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے جس حد تک انسان نے قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر لیا ہے۔	244
2- آج سے چودہ سو سال پہلے علمِ انسانی کی حالت۔	244
3- عہدِ فاروقیؓ میں عمواس (علاقہ شام) کا طاعون۔	245
فاروقِ اعظمؓ کا خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف چلے جانا اور محفوظ رہنا۔	245
حضرت ابوعبیدہؓ کا اپنے سپاہیوں کا ساتھ نہ چھوڑنا اور طاعون کی نذر ہو جانا۔	246
4- عرب میں شدید قحط ـــــ اس کی تباہ کاریوں پر غلبہ پانے کے لئے حُسنِ تدابیر۔	247
5- خود حضرت عمرؓ کا قحط زدگان کی صف میں بیٹھنا اور جو کچھ انہیں میسر آئے وہی کچھ خود کھانا۔	247
اس سے آپ کی صحت پر سخت مضر اثر پڑا۔	248
آپ کا ارشاد کہ جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے، مجھے ان کی تکلیف کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔ امیر المومنین کے پوتوں اور پوتیوں کو بھی وہی کچھ ملے گا جو دوسرے بچوں کو ملتا ہے، خواہ اس کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔	248
6- ایک وضعی روایت کہ حضرت عمرؓ نے نمازِ اِستسقاء میں حضرت عباسؓ کا واسطہ دے کر خدا سے بارش کی دعا مانگی تھی۔	249
7- یہ روایت بھی ہمارے ہاں موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس دل میں عباسؓ کی محبت نہیں ہو گی اس دل میں ایمان نہیں آ سکتا۔	250
یہ سب عباسی دَور کی کرشمہ زائیاں ہیں۔	250

نواں باب

سیاسی نظام

مضمون	صفحہ
1- اسلام کے سیاسی نظام کا اصل الاصول۔	251
حکومت صرف کتابِ خداوندی (قرآن) کی ہو گی۔	252
2- قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے جزئیات کا تعیّن اُمت کے باہمی مشورہ سے ہو گا۔	253
یہ فیصلے مرکز کی طرف سے قوانین کی شکل میں نافذ ہوں گے، انہی کو شریعت کہا جائے گا۔	253

مضمون	صفحہ
3-اسی لئے اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں۔	253
4-جن امور میں کتاب اللہ خاموش ہے ان میں کُرید مَت کرو۔ وہ خاموش اس لئے ہے کہ ان امور کا تعلق دین سے نہیں۔	254
دین سب کا سب' کتاب اللہ کے اندر آ گیا ہے۔	255
5- قرآنِ کریم کے صریح احکام کی شرائط و تضمنات بھی اسلامی حکومت مقرر کرے گی۔	255
6-اسلامی نظامِ حکومت کی اطاعت ہی ''اطاعتِ خدا و رسول'' ہے	256
7- قرآنی اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور حکومت کی متعیّن کردہ جزئیات بدلی جاسکتی ہیں۔	256
8-امامِ اعظمؒ کا مسلک۔	256
9-نیز' امام ابن قیمؒ کا۔	257
10-علامہ اقبالؒ کی تصریحات۔	257
11- عہدِ فاروقی میں قانون سازی کا یہی اصول تھا۔	258
12-نظامِ مشاورت۔	259
یہ مغربی نظامِ جمہوریت سے بنیادی طور پر مختلف بلکہ اس کی نقیض ہے۔	259
13- غیر مسلم باشندوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جاتا تھا۔	260
14-غیر ملکی باشندوں کی آراء سے بھی اِستفادہ کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں غیر مسلم' بلا روک ٹوک' مکّہ آتے جاتے تھے۔	260
15- سربراہِ مملکت مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند ہوتا تھا یا ویٹو کا اختیار رکھتا تھا۔	261
بڑی بصیرت افروز بحث۔	261
16- ''عمر کی رائے وحیٔ خداوندی نہیں۔ یہ ایک انسان کی رائے ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اسے سند اور سنت قرار نہ دو''۔	262
17- قانون سازی کا طریق۔ ''ہر حکم قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا''۔	263
18- مہر کا تعیّن کرنے کے سلسلہ میں ایک عورت کی طرف سے اعتراض کہ ایسا کرنا قرآن کے خلاف ہوگا۔	
اس اعتراض کا جائزہ۔	264
19- تغیرِ حالات کے ماتحت' عہدِ رسالتمآبؐ کے فیصلوں میں تبدیلی ــــ اس کی مثالیں۔	264
20- اوّلیاتِ حضرت عمرؓ ــــ یعنی وہ امور جن کے متعلق آپ نے پہلے پہل فیصلے دیئے۔	266
21-حاصلِ بحث۔	267
22- فیصلے کرنے کا حق صرف نظامِ حکومت کو ہے ــــ افراد یا کسی جماعت کو نہیں۔	267
23- اس کے بعد کیا ہوا؟ اور پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟	268

مضمون	صفحہ
24- قانون سازی ہی نہیں ـــــ سیرت سازی۔	270
25- عمال کے انتخاب میں معیار' قرآن کا علم اور حسنِ معاملات تھا۔	270
26- ایک نہایت بلند اصول اور دقیق نظریہ۔	271
طاقت ور خائن اور کمزور دیانت دار' دونوں نقصان رساں ہوتے ہیں۔	271
27- جس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے محبت نہیں وہ رعایا کا شفیق کیسے ہوسکتا ہے۔	272
28- جو شخص خود کسی عہدہ کا طلب گار ہو اسے اس پر تعینات نہیں کرنا چاہئے۔	272
29- ایک شخص اچھا شاعر ہوسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ گورنر بھی اچھا ہو۔	272
30- ممتاز صحابہؓ کو مدینہ میں رکھتے تھے' باہر نہیں جانے دیتے تھے کہ مبادا نومسلم رعایا میں شخصیّت پرستی شروع ہوجائے۔	272
31- اپنے بیٹے (عبداللہ) کو کوفہ کا گورنر نہیں بنایا حالانکہ وہ اس منصب کے لئے نہایت موزوں تھے۔	272
32- جس حاکم کی شکایت سنتے' اسے وہاں سے تبدیل کردیتے اور پھر شکائت کی تحقیق کرتے۔	273
33- صرف موزوں شخص کی تعیناتی سے میری ذمہ داری ختم نہیں ہوجاتی۔ مجھے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ میرے اندازے کے مطابق کام بھی کرتا ہے یا نہیں۔	273
34- اپنے عمالِ حکومت کو ہدایات۔	273
امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے عالمگیر منشور (مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے)۔ قبائلی عصبیّت کو ختم کردو۔ کوئی مظلوم' اپنی مدد کے لئے اپنے قبیلہ کو آواز نہ دے' صرف آمیر کو آواز دے۔ اب گروہ دو ہی ہوں گے ـــــ ظالم اور مظلوم۔	274
گورنر' اپنی مجالس میں تکیہ لگا کر نہ بیٹھیں۔	275
قرآن جاننے والوں اور دیانتداروں کی عزت افزائی کرو۔	275
حکومت میں نرمی ہونی چاہئے لیکن کمزوری نہیں۔ سختی ہونی چاہئے لیکن اِستبداد نہیں۔	275
ایسے بن کر رہو کہ پُرامن تم سے بے خوف رہیں' اور بدمعاش خوف زدہ۔	275
جو شخص شر پیدا کرکے غالب آیا وہ غالب نہیں' مغلوب ہے' جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی' وہ کامیاب نہیں' ناکام ہے۔	275
جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔	276
جُھوٹا مُوٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔	276
اہلِ عجم کی تقلید مَت کرو۔	276
جس میں تکبر دیکھو' سمجھو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار	

مضمون	صفحہ
ہے۔ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔	276
35- محاسبہ کس طرح کیا جاتا تھا۔	276
عمال کی تعیناتی کے وقت ان کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی تھی اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کیا جاتا تھا۔	277
36- ایک حاکم کے خلاف شکایت موصول ہوئی تو ان سے کہا کہ بیت المال کی بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریئے) کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔	277
37- حمص کے گورنر کا بالاخانہ جلوا دیا اور اسے حکم دیا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو تاکہ دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے۔	277
38- گورنر کی زندگی۔۔۔ نہ ملازم' نہ خادمہ' نہ فالتو کپڑوں کا جوڑا اور کسی گزرے ہوئے گناہ کی یاد سے سکتہ چھا جاتا تھا۔	278
39- ہر ایک کو سزا پبلک میں دی جاتی تھی۔	279
40- عمال کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کی حرکات وسکنات عوام کے لئے سند بن جاتی ہے۔	279
41- امیر المومنین خود اپنے آپ کو بھی محاسبہ کے لئے پیش کر دیتے تھے۔	279
یمنی چادروں کا واقعہ۔	279
بیت المال کے کوڑے میں سے نکلا ہوا ایک درہم بھی عمرؓ کے گھرانے کے بچے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہیئے۔	280
''عمرؓ! خدا سے ڈرو''۔ مجمع میں سے ایک شخص نے بار بار پکارا۔ آپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔	280
اگر خلیفہ بھی کج رَو ہو جائے تو ہم اس کا سر اُڑا دیں گے۔	281
42- امیر المومنین کے اہل وعیال کا محاسبہ۔	281
آپ جب کوئی حکم نافذ کرتے تو سب سے پہلے اپنے اہلِ خاندان کو تاکید کرتے کہ اس کی تعمیل کرنا۔ جو ایسا نہیں کرے گا اسے دُگنی سزا دی جائے گی۔	281
43- حضرت عباسؓ کا ارشاد کہ حضرت عمرؓ اس پرندے کی مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔	282
ذمہ داری کے احساس کے دو واقعات۔	282
حضرت علیؓ کا ارشاد کہ حضرت عمرؓ القوی الامین ہیں اور اسی لئے تمام عمال اور سپاہی تک بھی امین ہیں۔	282
44- خلیفہ خود رعایا کے حالات دریافت کرتا تھا' اس کے لئے رات کے وقت گشت بھی کرتا تھا۔	283
وہ بچہ جو اس لئے رو رہا تھا کہ اس کی ماں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی تھی۔	284
وہ عورت جس نے بھوکے بچوں کو بہلانے کے لئے ہانڈی میں خالی پانی ڈال کر اسے چولہے	

مضمون	صفحہ
پر چڑھا رکھا تھا۔	284
زچّہ عورت کی خدمت کے لئے اپنی زوجۂ محترمہ کو ساتھ لے کر گئے۔	285
وہ لڑکی جو دودھ میں پانی نہیں ملانا چاہتی تھی۔ آپ اسے بہو بنا کر گھر لے آئے۔	285
وہ مجاہد جس کا ہاتھ کسی جنگ میں کٹ گیا تھا۔	285
دشتِ شام کی بڑھیا نے کہا کہ عمرؓ اگر اپنی رعایا کے حالات سے باخبر نہیں رہ سکتا تو اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ حضرت عمرؓ کا ساری مملکت کا دورہ کرنے کا ارادہ۔	286
45- تاکید کہ حکام کے دروازے عوام کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔	287
46- حج کے اجتماع میں عام شکایات سنی جاتیں۔	287

دسواں باب

معاشرتی زندگی

مضمون	صفحہ
1- انسانی روابط کے تمام گوشے قانون کی زنجیروں میں نہیں جکڑے جا سکتے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے۔	289
2- معاشرتی زندگی کی اصلاح، صحیح تعلیم و تربیت اور اچھا نمونہ پیش کرنے سے ہو سکتی ہے۔	289
3- اس باب میں حضرت عمرؓ کے اقدامات۔	290
میاں بیوی کے تعلقات سے متعلق ہدایات و نظریات۔ (ضمناً) اپنی غلطی کے احساس پر معذرت۔ دُرّہ عمرؓ کا نہیں، خدا کا ہے۔ اسے خدا ہی کے لئے اٹھنا چاہئے۔ بدوضع اور بدہیئت آدمیوں کی سرزنش۔ نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی۔	291
4- ایک زاہد مرتاض کو دُرّہ رسید کیا اور کہا کہ خدا تجھے غارت کرے ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹ رہا ہے۔	292
5- دنیا میں سب سے بڑی مصیبت کم مال اور کثرتِ عیال ہے۔	293
6- جوانوں کو نصیحت۔	293
7- اولاد کی تعلیم و تربیت کیسی ہونی چاہئے۔	293
8- شعر و ادب کی تاکید۔	293
ایک ضمنی گوشہ ـــ قرآن اور شاعری۔	293
حضور نبی اکرمؐ کا ذوقِ شعری۔	296
اور حضرت عمرؓ کا۔	297
9- موسیقی کا ذوق بھی رکھتے تھے اور شعر ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔	297
10- مدائن کے قصرِ ابیض کے نادر مجسمات کو محفوظ رکھا۔	298
اسلام اور فنونِ لطیفہ۔	298
11- آپ کے مزاج میں شگفتگی اور شگفتہ ظرافت بھی تھی۔	298

مضمون	صفحہ
آپ کے مزاح کی ایک تبسم خیز مثال۔	298
12-اور رقیق القلب بھی ___ اس کی مثالیں:	299
بچوں سے پیار اور محبت۔	
حیوانات تک سے ہمدردی۔	
13- قرآن پڑھتے وقت، ہچکیاں لے لے کر روتے تھے۔	299
14- تقاضائے عدل اور جذباتِ رحم و ہمدردی میں تصادم۔	300
اسوۂ نبی اکرمؐ میں ایسے نازک مقام کی درخشندہ مثال۔	300
مجرم یہودی کا قتل اور اس کی بچی کی آہ و فریاد۔	
"محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ قتل کا اشارہ کرتا ہے اور محمد ابنِ عبداللہ کی آنکھ روتی ہے"۔	300
15- تضادِ جذبات میں مسلکِ فاروقی۔	301
جو بیوی کاروبارِ مملکت میں مداخلت کرتی تھی آپ نے اسے طلاق دے دی حالانکہ وہ بڑی محبوب بیوی تھی۔	301
بیویوں کو تحائف قبول کرنے کی ممانعت۔	301
اس باب میں شدّتِ احتیاط کی مثالیں۔	302
16- بیٹے نے سرکاری چراگاہ میں اونٹ چرائے تو ان کا منافع بیت المال میں جمع کر دیا۔	303
17- بیٹوں نے بیت المال میں بھیجے جانے والے روپے سے تجارت کر لی تو ان سے منافع وصول کر لیا گیا۔	303
18- حضرت حفصہؓ امہات الأمہ میں سے تھیں لیکن چونکہ وہ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں اس لئے مراعات میں انہیں سب سے مؤخر کیا جاتا تھا۔	304
19- وظیفہ میں اپنے بیٹے کو نسبتاً کم حصہ دیا۔	304
20- جس سے آپ دوستی کے تعلقات رکھتے، اسے مراعات کم ملتیں۔	305
21- بیت المال سے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لئے کم از کم لیتے تھے، بیوی کا دوپٹہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ اسے اوڑھ کر، دوسروں کے سامنے آ سکتیں۔	305
22- بیت المال سے تھوڑا سا شہد بھی کابینہ کی منظوری سے لیا۔	305
23- گوشت کی کمی کے زمانے میں تاکید کہ گوشت ناغے سے خریدا کرو۔	306
24- حسنِ اخلاق کی تاکید۔ تمہارا جو مقام مخلوق کی نگاہ میں ہے وہی مقام خدا کی نگاہ میں ہے۔	306
25- اپنی اصلاح کی طرف ہمیشہ دھیان رکھو۔	306
تمہارے کسی جانور میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو تم اس کی اصلاح کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہو لیکن اپنے نفس کی خرابی کے لئے پریشان نہیں ہوتے۔ تم اپنے آپ کو جانوروں جتنی بھی اہمیت نہیں دیتے۔	306

مضمون	صفحہ
26- میری تعریف مت کرو۔	307
27- احترامِ آدمیت۔ کسی کے متعلق رُسواکُن الفاظ مت استعمال کرو۔	307
28- پاکیزہ باطن کے مدعیوں سے کہتے کہ اس کا اظہار اپنے اعمال وکردار سے کرو۔	307
29- اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔	307
30- انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل وعیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آئے تو مَرد بن جائے۔	308

گیارھواں باب

معاشی نظام

مضمون	صفحہ
1- مثالی حکومت کا معیار' ایک مغربی مفکر کے نزدیک۔	309
2- زندگی کے متعلق مغرب کے نظریۂ مادیّت اور قرآنی تصورِ حیات میں بنیادی فرق۔	309
3- قرآنی نقطۂ نگاہ سے انسان کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات' دونوں کی نشوونما نہایت ضروری ہے۔	310
اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی اس قسم کی نشوونما کا انتظام کرے۔	311
4- طبیعی زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے سوشلسٹ نظام وضع ہوئے ہیں لیکن ان کے ہاں وہ اساسِ محکم نہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہو سکے۔ اس لئے یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکا' نہ ہوسکتا ہے۔	311
5- یہ اساسِ محکم قرآنی نظریۂ حیات فراہم کرتا ہے۔	312
6- معاشی نظام کی پیچیدگی کی اصل:	312
یہ تصوّر کہ ایک فرد اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار خود ہے۔	312
اسی سے طبقات کی تفریق وجود میں آتی ہے۔	312
7- قرآن اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔	312
اس کے نظام کی رُو سے' تمام افراد کی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوتی ہے۔	312
8- اس مقصد کے لئے ذرائعِ پیداوار' مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں۔	314
9- اس مملکت کو قائم کرنے والی جماعت کے افراد' خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کی رُو سے وہ اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور خدا اس کے عوض' انہیں جنت کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ معاہدہ خدا کے نام پر قائم ہونے والی حکومت کے ساتھ ہوتا ہے۔	314
10- جنتِ ارضی کی خصوصیات ــــ تمام ضروریاتِ زندگی پوری ہونا۔	314

مضمون	صفحہ
11- یہ نظام بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔	315
12- قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا تفصیلی بیان اوران تدریجی مراحل کا ذکر، جن سے گزر کر یہ اپنی آخری منزل تک پہنچے گا۔	316
13- رسولؐ اللہ نے اس نظام کا آغاز فرمایا۔	333
14- لیکن حضورؐ کی اپنی زندگی اس نظام کے اِنتہاء کی آئینہ دار تھی۔	333
15- رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ کی چند جھلکیاں۔	333
آپؐ نے کس طرح اس نظام کا نمونہ پیش فرمایا۔	
نہایت بصیرت افروز حقائق۔	334
16- سیرتِ صدیق اکبرؓ میں اس نظام کی جھلکیاں۔	336
امیر المومنین کا وظیفہ، ایک مزدور کی اُجرت کے برابر ہوگا۔	337
مٹھی بھر آٹا بھی زائد از ضرورت ہے تو وہ بھی نہیں رکھا جائے گا۔	337
17- عہدِ فاروقیؓ میں معاشی نظام کا نقشہ۔	338
خدا بندوں کو رزق انسانوں کے ہاتھوں سے پہنچاتا ہے۔ بنیادی اصول، ایک ضمنی گوشہ، قرآن میں حقوق العباد ہی کا ذکر ہے حقوق اللہ کا نہیں۔	339
ایک حدیثِ قدسی۔	339
18- رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔	339
19- اگر رزق کی کُشاد میں اقدارِ خداوندی کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بھی موجبِ تباہی بن جاتا ہے۔	340
حضرت عمرؓ کی دعا۔	340
20- فتح جلولا کا مالِ غنیمت دیکھ کر حضرت عمرؓ کی نمناک آنکھیں کہ اس سے یہ اُمت کہیں بے راہ رو نہ ہو جائے۔	340
21- ''اگر فرات کے کنارے ایک کُتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی''۔	340
22- مدینہ کی بھوکی عورتوں کا خیال رکھنا مقدم ہے۔	341
23- ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جائے۔ ذاتی اطمینان کرتے کہ ایسا ہو رہا ہے۔	341
24- اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کھائیں۔ (حضرت ابنِ عمرؓ)	342
25- ''خدایا! اس قوم کا کیا ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے''۔	342
26- جس بستی میں کوئی شخص بھوک پیاس سے مر جائے تو اہلِ بستی پر اس خون کی دیت لازم آجاتی ہے۔	343
امام ابنِ حزم کا فتویٰ۔	343
27- رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے جب وہ حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو جائے۔	344
28- حکومت کی شکر گزاری کی بھی ضرورت	

مضمون	صفحہ
نہیں۔اس نے اللہ کا مال' اللہ کے بندوں پر خرچ کیا۔اس کا شکر کس بات پر؟	344
29- ایک روایت ___ امام مہدی مال کی تقسیم مساویانہ کرے گا۔ (ضمناً) امام مہدی کے متعلق مروجہ روایات اور عقائد' قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔	345
30- بیت المال کی اشیاء کی حفاظت کی ذمہ داری کے بصیرت افروز واقعات۔	346
31- خلیفہ کی اپنی پوزیشن۔	347
(i) حضرت عمرؓ کا خود مقرر کردہ وظیفہ۔	347
(ii) مسلمانوں کا مال' یتیم کے مال کی طرح ہے۔ اگر مَیں محتاج نہیں ہوتا تو کچھ نہیں لیتا۔ محتاج ہوتا ہوں تو بقدرِ ضرورت لے لیتا ہوں۔	347
(iii) حضرت حفصہؓ کا مشورہ کہ وظیفہ میں کچھ اضافہ کر لیجئے۔	347
اس کا جواب۔	347
(iv) امیر المومنین کا کھانا۔	348
مَیں اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہوں جب مجھے یقین ہو جائے کہ مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔	348
ایک وقت میں صرف ایک سالن۔	348
"اپنے حصے کی ساری خوشگوار چیزیں یہیں نہ لے لو' کچھ آخرت میں لینے کے لئے بھی رکھ چھوڑو"۔	348
(v) ایسی زندگی کیوں بسر کرتے تھے! اس کی وجہ کہ "اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو لوگوں پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکالیف کا احساس کس طرح سے ہو"۔	349
(vi) امیر المومنین کا لباس۔	349
پیوند لگے کپڑے۔	350
ایک ہی جوڑا جسے دھو کر سکھا لیتے۔	350
حج کی تقریب پر امیر المومنین کا وَرود!	350
(vii) مکان وہی تھا جو خلیفہ بننے سے پہلے تھا۔	350
سادہ مکانات تعمیر کرنے کی تاکید سب کے لئے تھی۔	350
32- قیصرِ روم کے قاصد کا مشاہدہ اور تأثرات۔	351
ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہوتا امیر ہوتا ہے۔ ہمارا امیر وہ زمین پر سو رہا ہے۔	351
"اے عمرؓ! تُو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے"۔	351
33- "سربراہِ مملکت کی حیثیت ایک خزانچی کی سی ہوتی ہے"۔ (ارشادِ نبویؐ)	351
34- آمدنی اور اس کی تقسیم۔	351
مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا۔	352
35- مالِ غنیمت کے متعلق قرآنی احکام۔	352
36- دولت کی تقسیم کا مسئلہ' مشکل ترین مسئلہ ہے۔اس کی آخری شکل مارکس کا یہ نظریہ ہے کہ	

مضمون	صفحہ
ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔ خود مارکس اور لینن کا اعتراف کہ یہ اصول ناقابلِ عمل ہے۔	353
37- یہ اصول رسولؐ اللہ کا تجویز فرمودہ تھا اور حضورؐ نے اس پر عمل بھی کر کے دکھایا تھا۔	354
38- اَراضیات کی بندوبست۔	354
(i) ابتدائی دور ـــــ زمین پر کسی کی ملکیت نہیں تھی۔	354
(ii) نظامِ سرمایہ داری کی ابتداء ـــــ زمین پر ذاتی ملکیت۔	355
(iii) رسولؐ اللہ کے انقلابی اقدامات۔	355
''زمین اللہ کی اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے ہونی چاہیئے''۔	355
(iv) زمین بٹائی پر نہیں دی جاسکتی۔	356
39- عراق کی زمینوں کا مسئلہ ـــــ تفصیلی بحث۔	356
فیصلہ قرآنِ کریم کی روشنی میں ہوا اور وہ یہ کہ زمین حکومت کی تحویل میں رہے گی، افراد میں تقسیم نہیں کی جائے گی۔	359
اس واقعہ سے مستنبط ہونے والے نتائج۔	359
40- اراضیات سب، حکومت کی تحویل میں رہیں گی۔	360
حکومت انتظامی سہولت کے لئے جن لوگوں کو قطعاتِ اراضی دے، عند الضّرورت ان سے واپس بھی لے سکتی ہے۔	360
حکومت کاشتکار سے اتنا ہی لے سکتی ہے جتنا اس کی ضرورت سے زائد ہو۔	361
41- چراگاہیں مفادِ عامہ کے لئے کھلی رہیں گی۔	361
ان میں غریبوں کے مویشی چریں گے دولتمندوں کے نہیں۔	
42- پانی کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔	362
43- اراضیات کے حُسنِ انتظام سے مملکت کی آمدنی میں محیر العقول اضافہ ہو گیا۔	362
ایک علاقہ (بحرین) کا خراج پانچ لاکھ وصول ہوا۔	362
یہ صرف حُسنِ انتظام کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دیانت و امانت بھی شامل تھی۔	363
حضرت عمرؓ کی دیانت کا مثالی واقعہ۔	363
بیت المال کے اونٹوں کا دودھ تک نہیں پیا۔ سہواً پیا ہوا بھی قے کر کے نکال دیا۔	363
44- وظائف کا تعیّن۔	363
(i) صدقہ و خیرات انسانی قلب کے لئے موت ہیں اس لئے حاجتمندوں کی ضروریات ملک کی طرف سے پوری ہونی چاہئیں نہ کہ انفرادی خیرات کے ذریعے۔	363
(ii) ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضروریات کے مطابق	

مضمون	صفحہ
مقرر رہوتا تھا۔	364
یہی طریق عہدِ صدیقی میں بھی رائج رہا۔	364
(iii) عہدِ فاروقی میں۔	365
(i) پہلی عام مَردم شماری۔	365
اس پر جرمن مُستشرق فان کریمر کا بصیرت افروز تبصرہ۔	365
(ii) آپ نے وظائف کے تعیّن میں ضرورت کے بجائے ترجیحی سلوک کا اصول اختیار فرمایا۔	365
ہمارے نزدیک یہ آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔	366
(iii) نسبی تعلق معیارِ ترجیح نہیں ہوسکتا۔	366
رسولؐ اللہ کے ارشاداتِ گرامی۔	366
جو تاریخی واقعہ ان اصولوں کے خلاف ہے، اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔	366
(iv) وظائف کی مقدار۔	368
لاوارث بچوں تک کا وظیفہ۔	368
اپنے بیٹے کو حضرت اسامہؓ بن زید سے کم وظیفہ۔	368
(v) وظائف کے علاوہ، خوراک بھی ہر ایک کو بیت المال سے دی جاتی تھی۔	369
”لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو۔ مُٹھی مُٹھی بھر دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں رہیں گے۔	369
(vi) اس کے بعد لوگوں کو اکتسابِ زر سے روک دیا۔	369

مضمون	صفحہ
(vii) وظائف کے اس طرح جمع ہونے سے لوگوں کے پاس فاضلہ دولت جمع ہونے لگی۔	370
(viii) اس سے حضرت عمرؓ کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انہوں نے اس کے ازالہ کا تہیہ کرلیا۔	
لیکن قبل اس کے کہ ایسا کیا جاتا، آپ کی شہادت ہوگئی۔	371
45- وظائف کے متعلق حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مضر نتائج حضرت عثمانؓ کے زمانے میں برآمد ہونے شروع ہوگئے۔	371
سید قطب اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصریحات۔	372
اس سے نظام سرمایہ داری کی بنیاد پڑ گئی۔	372
46- تاریخ کے ان بیانات پر ہمارا تبصرہ۔	372
ہم انہیں صحیح تصور نہیں کرسکتے۔	374
بارہواں باب	
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم	
1- میری زندگی کے دو دَور۔	376
قرآنِ کریم کو غور و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش۔	376
2- اس منزل میں ایک دشوار مرحلہ۔	377
دعا کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔	377
3- اس کے متعلق میری سعی و کاوش۔	377
قرآنی آیات کا مفہوم۔	377

مضمون	صفحہ
4- خدا اور بندے کا تعلق۔	377
خدا کی ذمہ داریاں کس طرح اس کے بندوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔	378
5- مظلومینِ مکّہ کی امداد' صاحبِ قوت مجاہدینِ مدینہ کے ہاتھوں۔	378
6- وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ کا صحیح مفہوم۔	379
7- حضرت عمرؓ کا ارشادِ گرامی۔	380
خدا نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ مَیں تمہاری دعائیں اس تک نہ پہنچنے دوں۔	380
اس عظیم حقیقت کی وضاحت۔	380
8- اب ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں۔	381
اسلامی مملکت کے بغیر قبول نہیں ہوسکتیں۔	381
تیرہواں باب	
خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود	
1- دس سال کی قلیل مدت میں محیر العقول انقلاب۔	382
انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام کے نامہ نگار کا خراجِ تحسین۔	
2- داخلی دنیا میں نفسیاتی تبدیلی۔	383
3- ہیکل اور طٰہٰ حسین کا نذرانۂ عقیدت۔	384
4- اس کے بعد تاریخِ انسانیت کا جگر سوز المیہ۔	386
5- 26 ذی الحجہ 23ھ کی صبح' مسجد نبویؐ میں' عین بحالتِ نماز' حضرت عمرؓ پر خنجر کا مہلک وار' حیرت	

مضمون	صفحہ
یکسر حیرت۔	387
6- حضرت عمرؓ کا پہلا سوال کہ قاتل کون تھا۔	388
اظہارِ اطمینان کہ وہ کسی مسلمان اور عرب کے ہاتھوں شہید نہیں ہو رہے۔	388
7- زندگی کے آخری لمحات میں جانشینی سے متعلق جامع اسکیم۔	388
اپنے بیٹے کو امیدواروں کے زُمرے میں بھی نہ رکھا۔	389
8- اپنے قرضہ کی ادائیگی کی طرف سے اطمینان۔	
بیٹے نے ذمّہ لے لیا۔	389
9- قبر کے لئے جگہ — حضرت عائشہؓ سے اجازت حاصل کرلی۔	389
احتیاط کی شدّت — کہا کہ ایک دفعہ میرے مرنے کے بعد بھی دریافت کر لینا۔	390
10- مؤاخذۂ آخرت کے احساس کی شدت۔	390
11- آپ کی عمر۔	391
ضمناً رسول اللہؐ کی عمر کے متعلق مختلف روایات۔	391
12- رفقاء کی طرف سے خراجِ تحسین۔	392
ہماری طرف سے برگِ عقیدت۔	393
13- شہادتِ حضرت عمرؓ کے سلسلہ میں سازش کا انکشاف — ہرمزانؔ اس کے پیچھے تھا۔	394
حضرت عمرؓ کے بیٹے عبیداللہؓ نے' ہرمزان' جفینہ اور (قاتلِ حضرت عمرؓ) فیروز لولوء کی بیٹی کو قتل کر دیا۔	395

مضمون	صفحہ
14- اے کاش! ہرمزان اور فیروز کے مدینہ میں رہنے کے معاملہ میں حضرت عمرؓ زیادہ احتیاط سے کام لیتے!	396
15- بعض تاریخی روایات میں ہے کہ بعض لوگوں نے آپ کو اس حادثہ کی وارننگ بھی دے دی تھی۔	396
16- کچھ بھی تھا ایران نے اپنی ذلّت آمیز شکست کا انتقام لینے کے لئے پہلا قدم اٹھالیا۔	397
اس کے بعد کے اقدامات کے لئے چودھواں باب دیکھئے۔	397
بزمِ انجم	
فاروقِ اعظمؓ کے متفرق اقوالِ درخشندہ۔	398
چودھواں باب	
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد!	
(اِنتقام)	
1- ہرمزان اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ۔	403
2- مسلمانوں کی قوت کا راز — اتباعِ قرآنی۔	403
3- ایرانی سازش — ان سے قرآن چھڑا دو۔	404
4- عربی اور عجمی اسلام سے مراد۔	404
5- ایران اور روما کی فتوحات میں فرق۔	404
ایرانی اسلام لے آئے۔	405

مضمون	صفحہ
6- ان کے عوام اسلام لائے تو ان کی تعلیم و تربیّت نہ ہوسکی۔	405
اور خواص' خاص مقصد لے کر مسلمان ہوئے۔	405
ان کا مقصد مسلمانوں اور اِسلام سے اِنتقام لینا تھا۔	405
7- نازک مقام — ہمارا مذہب پرست طبقہ بات سننے تک کے لئے تیار نہیں ہوتا۔	406
8- کتبِ روایات و تاریخ کی حقیقت۔	407
9- شیعہ حضرات کے ہاں تقیّہ جزوِ ایمان ہے۔	407
تاریخ پر اس کا اثر۔	408
10- مذہبی پیشوائیت کے ردِّ عمل کا ایک واقعہ۔	
حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح۔	408
11- روایات اور تاریخ کے متعلق میرا مسلک۔	409
12- پہلا نزاع — مسئلہ خلافت۔	410
13- خلافت بطور حقِ وراثت۔	410
14- ایرانیوں کے اپنے شہنشاہوں کے متعلق عقیدہ۔	411
15- عبداللہ ابنِ سبا۔	411
اس کا سیاسی کردار — اور مذہبی فتنہ۔	412
16- امام کے وصیِ رسول اور مامور مِن اللہ ہونے کا عقیدہ۔	412
17- خلافت کے متعلق یہ عقائد' کفر و ایمان کا خطِ امتیاز قرار پا گئے۔	413

مضمون	صفحہ
18- ''تاریخ المؤرخ'' کا تبصرہ۔	413
19- حضرت شہربانو کے متعلق شیعہ روایت۔	414
اہلِ ایران کے ساتھ رشتہ کا تعلق۔	415
20- حضرت سلمانؓ فارسی کے متعلق وضعی روایات۔	415
21- حضرت علیؓ کے بعد، امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری۔ اس طرح خلافت پوری کی پوری بنی اُمیہ کے پاس چلی گئی۔	416
22- امیر معاویہؓ کے حسنینؓ کے ساتھ تعلقات ــــ وہ انہیں عطیات دیتے تھے۔	416
اور یزید بھی۔	417
ان کی باہمی رشتہ داریاں۔	417
23- بنی اُمیہ اور بنی عباس کی رقابت۔	417
24- ایرانیوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔	418
25- ابومسلم خراسانی ــــ فنِ پراپیگنڈہ کا ماہر۔	419
(ضمناً، بنی اُمیہ کے خلاف فاطمیین کی محاذ آرائیاں)۔	419
26- ''سیاہ جھنڈوں والے'' (امام مہدی) کا ظہور۔	419
27- سلطنت بنی عباس کے ہاتھ آ گئی۔	420
28- ''اہلِ بیت'' کا احتجاج کہ حکومت انہیں ملنی چاہئے تھی، بنی عباس کیسے لے گئے۔	420
حقِ خلافت کے متعلق محمد نفس زکیہ اور عباسی خلیفہ منصور کے مابین خط و کتابت۔	420
29- عہدِ عباسیہ میں برامکہ کا اثر و نفوذ۔	424
حکومت عملاً انہی کے ہاتھ میں تھی۔	424
30- بَرامکہ نے سارے معاشرے کو عجمی رنگ میں رنگ دیا۔	425
31- بَرامکہ کا انجام۔	426
32- عباسی سلطنت کے خلاف فاطمیین و علویین کی محاذ آرائیاں۔	427
33 مصر میں فاطمی حکومت۔	427
34- بغداد پر ایرانی تغلّب۔ دیلمی حکومت۔	428
35- بغداد، شیعیّت کا مرکز۔	429
عزاداری کی تقاریب کی ابتداء۔	429
36- ابن العلقمی اور نصیر الدین طوسی کی سازش سے ہلاکو خاں کا حملہ۔	429
بغداد کی تباہی اور عباسی سلطنت کا خاتمہ۔	429
37- خود ایرانیوں کا اعتراف کہ ہم نے اپنی شکست کا بدلہ لیا تھا۔	429
38- یہ انتقام سیاسی تھا ــــ اب دینی انتقام کی طرف آیئے۔	430
39- اِسلام کی اساسات کا اجمالی تعارف۔ (تجدیدِ یادداشت کے لئے)	430
40- حضراتِ آئمہ کا شجرۂ نسب۔	432
41- شیعوں کا فرقہ کیسانیہ اور اس کے معتقدات	

مضمون	صفحہ
42-فرقہ زیدیہ۔	433
43-امامیہ (اثنا عشری) اور اسماعیلیہ کا ابتدائی تعارف۔	433
44-شیعوں کے بعض غالی فرقے اور ان کے معتقدات۔	433
45-اسماعیلیوں کے عقائد: موجودہ قرآن محرف ہے۔	435
اس کا مفہوم بھی باطنی معانی کی رُو سے سمجھ میں آ سکتا ہے جن کا علم صرف ائمہ کو ہوتا ہے۔امامت کے متعلق عجیب وغریب نظریہ اور اعتقادات۔	436
46-آغا خانیوں اور بوہروں کے اعتقادات۔	437
47-فرقہ امامیہ یا اثنا عشریہ۔	438
اصول الکافی، سب سے معتبر حدیث کی کتاب۔	438
48-ائمہ کو خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ۔محدَّث کی اصطلاح۔	439
49-خدا سے علم حاصل ہونے کے اعتبار سے نبی اور محدَّث میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔	439
50-ائمہ کا مقام۔	440
51-موجودہ قرآن محرف ہے۔	444
52-قرآن کے باطنی معانی۔	446
53-قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے ـــــ جفرؔ، جامعہؔ اور مصحفِ فاطمہؓ۔	446
54-اہلِ بیت کے گھروں میں نزولِ ملائکہ۔	447
55-سوال یہ ہے کہ یہ اعتقادات حضراتِ ائمہ کی طرف منسوب ہیں جو سب کے سب عرب تھے پھر ایرانیّت کا ان سے کیا تعلق!	448
56-جامعینِ احادیث سب ایرانی تھے۔	449
57-الکافی کے متعلق شیعہ علماء کی رائے۔اس میں بہت سی روایات ضعیف ہیں۔	449
58-ضمناً ـــــ میرے خلاف ''فتنہ انکارِ حدیث'' کا اِتہام۔حدیث کے متعلق میرا مسلک۔	450
59-سنیوں کے عقائد ومسلک پر ایرانی اثرات۔	451
60-جمع قرآن کے متعلق شکوک وشبہات۔	451
61-ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ۔	452
62-وحیٔ متلو اور غیر متلو کا عقیدہ۔	453
وحی متلو قرآن کے اندر ہے۔ وحی غیر متلو کتبِ احادیث میں۔	453
اس طرح احادیث کو قرآن کے ہم پایہ قرار دے دیا گیا۔	454
63-جامعینِ احادیث سب ایرانی تھے۔	455
64-ان میں کس قسم کی احادیث ملتی ہیں۔	455
آلِ عباس کی محبت اور اہلبیت کی محبت جزوِ ایمان ہے۔	455
65-دوسری طرف اس قسم کی حدیثیں بھی کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد اصحاب مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ)۔	457

مضمون	صفحہ
66- امام ابن جریرؒ طبری کی تفسیر جو روایات پر مبنی ہے' اُم التفاسیر قرار پا گئی۔	457
67- اور امام طبریؒ کی تاریخ نے اُمّ التواریخ کی حیثیت اختیار کر لی۔	458
68- اِس سے اسلام دین نہ رہا' مذہب بن گیا۔	459
69- آیۂ استخلاف میں' خلافت سے مفہوم روحانی امامت قرار پا گیا نہ کہ مملکت وحکومت۔	459
70- مذہب وسیاست میں ثنویّت۔	461
71- قانون سازی کے دروازے بند۔ اُمت پر جمود وتعطل چھا گیا۔	461
قرآن بطور سند وحجت کہیں بھی باقی نہ رہا۔	462
(ضمناً' فرقہ اہلِ قرآن کی غلط نگہی)۔	462
72- ملوکیّت اور مذہبی پیشوائیت کے بعد' نظامِ سرمایہ داری کا احیاء۔	463
زکوٰۃ کے متعلق روایت۔	464
بے حدونہایت ذاتی ملکیّت۔	464
73- عقائد میں تبدیلی۔	465
74- عقیدۂ تقدیر ـــ مجوسیّت کا یہ عقیدہ کس طرح مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا۔	465
تقدیر کے متعلق روایات۔	466
75- سب سے زیادہ تباہ کن سازش۔	469
عجمی ترکش کا زہر آلود تیر ـــ اِسلام کے تابوت کی آخری میخ۔	469
یعنی تصوف! ـــ جو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔	469
76- سرخیلِ صوفیاءُ شیخِ اکبر ابنِ عربی کے معتقدات۔ یہ اخوان الصفا سے متاثر تھے جو اسماعیلی عقائد کے داعی تھے۔	470
77- تصوف کے اَساسی عقائد اور قرآنِ کریم۔	471
جہاد کے خلاف۔	474
78- علامہ اقبالؒ اور تصوف۔	475
''ایرانی شعبدہ بازوں کی کمند''	475
79- محدّثیت اور کشف والہام کے عقیدہ سے دعوائے نبوت کا دروازہ کھل گیا۔	475
80- مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ کی بنیاد انہی نظریات پر تھی۔	476
ان کا سب سے بڑا کارنامہ بھی جہاد کو منسوخ قرار دینا تھا۔	477
81- ایرانی سازش کا ملخص۔	477
82- کیا اس کا علاج ممکن ہے۔	478
ضرور ممکن ہے' بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جس نے رسول اللہ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں کہا تھا کہ ـــ حسبنا کتاب اللہ۔ اور یہی میری عمر بھر کی پکار ہے۔	478

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گزرگاہِ خیال

میرے ذمے ایک گراں بار قرض تھا
للہ الحمد ..... کہ میں آج اُس سے سُبکدوش ہو رہا ہوں

میرا سفینۂ حیات، متعدد جوئباروں اور متنوع آبناؤں سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے۔ میری پیدائش[1] ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور طریقت کا نہایت نظیف و لطیف آمیزہ تھا۔ گھر کے اسی ماحول کی نسبت سے مَیں اکثر (اِستعارۃً) کہا کرتا ہوں کہ میری پیدائش پر اگر میرے ایک کان میں اذان کی ندائے جانفزا پہنچی تھی تو دوسرے میں قوالوں کی آواز میں، امیر خسروؒ کے ''قول قلبانوں'' کی نشید روح افروز۔ (میرے والد مرحوم تو ناخواندہ تھے لیکن) میرے دادا (مولوی، چوہدری، حکیم رحیم بخشؒ) حنفی مسلک کے ایک جیّد عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے۔ علاوہ ازیں، وہ ایک ماہر طبیب بھی تھے ـــ لیکن انہوں نے ان میں سے کسی خصوصیت کو بھی ذریعۂ معاش نہ بنایا، کہ وہ نوعِ انسان کی طبعی یا روحانی اصلاح یا امداد کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ مجھے اپنے علم و سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے، اِس لئے انہوں نے شروع ہی سے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا اور میری پرورش، تربیت اور تعلیم انہی کے ہاتھوں یا زیرِ نگرانی ہوئی۔ فطرت کی کرم گُستری سے ذہنِ رسا پایا تھا اس لئے علومِ شریعت و طریقت کے مبادیات پر تھوڑے سے عرصہ میں عبور حاصل کر لیا۔ دادا جان، سلوک کی منازل بھی ساتھ کے ساتھ طے کرائے جاتے تھے اس لئے مراقبات، مجاہدات، ریاضات (چلّہ کشیاں اور زاویہ نشینیاں) اُس عمر میں میرے معمولات بن چکے تھے جس میں بچے ہنوز ''گلی ڈنڈا'' کھیلا کرتے تھے۔ میرے ہمعصر پتنگیں اڑایا کرتے تھے اور میں ''آنسوئے اَفلاک'' کے حقائق و معارف سمجھنے میں محو ہوتا تھا۔ اس ضمن میں ایک بات بالخصوص قابلِ ذکر

1۔ چونکہ مَیں یہاں اپنے سوانح حیات پیش نہیں کر رہا اس لئے مَیں اپنے آپ کو انہی واقعات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں جن کا تعلق موضوع زیرِ نظر سے ہے۔ ویسے میری پیدائش 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی تھی، جو مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک مشہور بستی تھی۔

ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ بعض ''اتفاقات'' کس طرح ایک فرد کی زندگی کے مستقبل کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ محض حُسنِ اتفاق تھا کہ دادا جان کا تعلق تصوف کے چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے تھا جس میں موسیقی کو جزوِ عبادت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے' شعر و نغمہ سے متعلق میرے ذوقِ لطیف کی از خود نشو و نما ہوتی گئی۔ اگر اُن کا تعلق (مثلاً) قادریہ یا نقشبندیہ سلسلہ سے ہوتا تو میرے اس ذوق کا دم گھٹ جاتا اور نہ معلوم پھر' یہ تسکین نایافتہ تقاضے کس کس قسم کے نفسیاتی معاذیر کے جھروکوں سے جھانکتے اور ''شرعی تاویلوں'' کے روزنوں سے سر نکالتے۔

بٹالہ ایک متشدد قسم کا مذہبی قصبہ تھا۔ آبادی کی اکثریت تو حنفی المسلک سُنیوں پر مشتمل تھی لیکن اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع بھی خاصی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں قادیان جانے کے لئے بٹالہ ہی ریلوے اسٹیشن تھا؛ اس لئے وہاں کے زائرین کے لئے یہ قصبہ ناگزیر گزرگاہ تھا۔ علاوہ ازیں' یہ عیسائی مشنریوں کا مرکز اور آریہ سماج کا بھی گڑھ تھا۔ اُس زمانے میں بین الفرق مُناظروں اور بین المذاہب مباحثوں کا بڑا زور تھا۔ اس لئے جس طرح دریا کے کنارے بستیوں کے بچے پیدائشی تیراک ہوتے ہیں' بٹالہ کے مذہب پرست طلبا پیدائشی مناظر ہوتے تھے۔ فضا کے ان تقاضوں کی وجہ سے' مختلف فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ دادا جان کو ان سب کے لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا (اور تو اور' وہ سنسکرت کے بھی عالم تھے) اس لئے میں ان وادیوں سے بآسانی گزرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی میری انتہائی خوش بختی تھی کہ وہ اس قدر مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود' بڑے روشن خیال اور وسیع الظرف واقعہ ہوئے تھے۔ ابتداءً وہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اس زمانے میں اِس زبان کا جاننا کس قدر ضروری ہے' تو انہوں نے کافی بڑی عمر میں تھوڑے سے عرصہ میں اس میں بھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ مجھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے میری اسکول کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا۔ انہی مؤثرات و عوامل کا نتیجہ تھا کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے' میری نگاہ کی مشرقی اور مغربی اُفقین کافی وسیع ہو چکی تھی ––– اور ان کے ساتھ ہی ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں بھی کافی عمیق۔

تصوف کا ''ہمہ اُوست'' انسان کو وسیع المشرب بنا دیتا ہے ––– اگرچہ اکثر اوقات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی وسیع المشرب ––– اس وسیع المشربی کا نتیجہ تھا کہ میں جس جذب و شوق سے میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا' اس سوز و گداز کے ساتھ عزاداری کی مجلسوں میں بھی حاضری دیتا تھا[1] اور قوالی تو خیر تھی ہی جزوِ عبادت ––– اس قسم کے اضداد کا مجموعہ تھا میرے بچپن اور ابتدائے شباب کا زمانہ۔

لیکن میں نے ابھی فطرت کی اُس نوازشِ خصوصی کا ذکر نہیں کیا جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ اُس نے ذوقِ سلیم اور ذہنِ رسا کے ساتھ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کی تھی۔ غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

1۔ ویسے بھی صوفی' آدھا شیعہ ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی کتاب کے آخری باب میں ملے گی۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی' دردِ لادوا پایا

عشق کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا' تنقیدی نگاہ کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سے درد پیدا ہوتا ہے لادوا' اور پھر یہی دردِ لادوا' دنیا کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے۔ یہی وہ جنسِ گراں مایہ ہے (کم از کم میرے حق میں تو یہ ایسی ہی ثابت ہوئی ہے) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اے متاعِ درد دَر بازارِ جاں انداختہ گوہرِ ہر سود دَر جیبِ زیاں انداختہ

غالب نے یہ بھی کہا تھا کہ

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے چندین سُخنِ نغز' کہ گفتے' کہ شنودے

میں بھی اس کی ہمنوائی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے یہ تنقیدی نگاہ نہ ملتی' تو میری ساری متاعِ حیات ''یوسف بقیمتِ اوّل خریدہ'' سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ میں نہ کوئی ''سخنِ نغز'' کہہ سکتا' نہ سن سکتا۔

میں پہلے' اِس کانٹے کی اُس کھٹک کی طرف آتا ہوں' جس کا درد اُس زمانے میں لادوا تھا۔ میں ایک دن تفسیر دیکھ رہا تھا' سورۂ احزاب کی یہ آیت میرے سامنے تھی۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا [33:69]

اَے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا' جنہوں نے موسٰیؑ کو (طرح طرح کی باتیں کرکے) ستایا لیکن اللہ نے ان تمام باتوں سے اس کی بریّت کردی۔

بات کچھ ایسی دقیق نہ تھی۔ قرآنِ مجید کے مختلف مقامات میں تفصیل سے درج ہے کہ بنی اسرائیل کس طرح حضرت موسٰیؑ کو تنگ کرتے اور بات بات پر بگڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس سے حضرت موسٰیؑ کا تو کچھ نہ بگڑا' خود وہ قوم معتوب اور نعمائے خداوندی سے محروم ہوگئی لیکن اس کی تفسیر میں مجھے یہ لکھا ہوا ملا:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ بڑے حیادار تھے۔ اس طرح جسم کو چُھپائے رکھتے تھے کہ اس کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل نے انہیں ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چُھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اس قسم کی کوئی اور بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ (حضرت) موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بَری کرے۔ سو موسٰیؑ ایک دن تنہائی میں' اپنے کپڑوں کو پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لئے اس کی طرف بڑھے' تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے' یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے' اے پتھر! میرے کپڑے' یہاں تک کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک

گروہ تک پہنچ گئے۔ انہوں نے انہیں (حضرت موسیٰؑ کو) برہنہ دیکھ لیا اور ان پر واضح ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے۔ اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بَری کر دیا۔ اُس جگہ پہنچ کر پتھر رُک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لیکر پہن لئے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم' اس پر ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں تین یا پانچ۔

(جامع ترمذی و بخاری)

مجھے جھنجھنی آ گئی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دل میں طرح طرح کے شکوک ابھرنے لگے' لیکن جب یہ خیال آیا کہ یہ تو نبی اکرمؐ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے' تو کپکپا اٹھا۔ گڑگڑا کر توبہ کی اور شیطان سے پناہ مانگی جو اس قسم کے وساوس پیدا کر رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد کیفیت یہ ہو گئی کہ تفسیر کا کوئی سا ورق الٹا' اس پر اسی قسم کی تفسیری روایات دکھائی دیں۔ اس کشمکش میں جو کچھ میرے دل پر گزر رہی تھی' اُسے کسی سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ نہ قرآنِ پاک کی تفسیر چھوڑ سکتا تھا' نہ اس پر اختیار تھا کہ اس سے دل میں اس قسم کے شکوک اور وساوس پیدا نہ ہوں۔ شکوک پیدا ہونے کے بعد ساتھ ہی دل میں یہ خیال ابھرتا کہ رسولؐ اللہ کی بیان فرمودہ تفسیر' اور اس کے خلاف شکوک! معاذ اللہ' ثمّ معاذ اللہ۔

ایک دن بخاری شریف دیکھ رہا تھا تو اُس میں اس روایت پر نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ سلیمان بن داوٗد (علیہما السّلام) نے ایک روز کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس یا ننانویں عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شاہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ ان کے ایک ہمنشین نے ان سے کہا کہ ''انشاء اللہ'' کہو' مگر انہوں نے ''انشاء اللہ'' نہ کہا۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے' اگر وہ ''انشاء اللہ'' کہہ لیتے تو سب عورتوں کے بچے پیدا ہو جاتے اور وہ سب شہسوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (بخاریؔ' کتاب الجہاد)

''اَصح الکتب بعد کتاب اللہ'' میں یہ حدیثِ رسولؐ!! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں' اور کہاں جاؤں؟ دل میں کشمکش کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی۔ تفاسیر میں وہ کچھ دیکھتا تو کتاب اللہ (قرآن مجید) کے متعلق طرح طرح کے خیالات اُبھرنے شروع ہو جاتے۔ احادیثِ مقدّسہ میں یہ کچھ دیکھتا تو جگر شق ہو کر رہ جاتا۔ ان کے بعد' کُتبِ فقہ سامنے آتیں تو ان میں ایسے ایسے ''مسائل'' لکھے ملتے جن کا مَیں' اُس زمانے میں تو ایک طرف' اِس وقت بھی کسی محفل میں تذکرہ نہیں کر سکتا — یہ تھی میری اضطراری کیفیت' لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ دل پر بیت رہی تھی' اُسے زبان تک لا نہیں سکتا تھا۔ اُس ماحول میں ایک اَنجانا خوف تھا جو دل و دماغ پر بُری طرح چھا رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہوا یہ کہ میں ان کُتبِ مقدّسہ کو اٹھاتا اور انہیں چوم کر پھر اسی طرح رکھ دیتا۔

یہ آتشِ خاموش میرے دل میں سلگ رہی تھی کہ تاریخ نے اسے شعلۂ جوالہ میں بدل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے — اور

یہ کانٹے وہ ہیں کہ جن کی چبھن کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی ـــــ کہ محرم قریب آ رہا تھا۔ سُنیوں کی مسجدوں اور شیعہ حضرات کے امام باڑوں میں محافل و مجالس کا انعقاد شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' مَیں ان تقاریب میں بڑے احترام و عقیدت سے شامل ہوا کرتا تھا۔

بخاریؔ شریف میں ایک حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا' وہ بخشا جا چکا ہے ـــــ مغفورٌ لھم ـــــ حدیث تو یہ پہلے معلوم تھی' تاریخ میں کیا دیکھتا ہوں کہ جس لشکر نے پہلے پہل قسطنطنیہ پر حملہ کیا' اس کا سپہ سالار یزیدؔ ابنِ معاویہ تھا' اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ اور خود امام حسینؓ اس میں سپاہی (مجاہد) کی حیثیت سے شریک تھے۔

یزیدؔ' اور اس لشکر کا سپہ سالار جس کی مغفرت کی بشارت وضمانت رسولؐ اللہ نے دی تھی! یقین مانئے' پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ـــــ سر چکرا گیا ـــــ اِس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ مَیں نہ سنیوں کی محفل میں شریک ہوا' نہ شیعوں کی مجلسوں میں۔ تنہا خاموش بیٹھا رہتا' اور کبھی کبھی بے ساختہ پکار اٹھتا کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

لیکن نہ اس ''دلِ شوریدہ'' پر کسی کو رحم آتا تھا نہ اس تمنا پر جو اس بھنور میں طلسمِ پیچ و تاب بن رہی تھی! میری وہ جنت چھن رہی تھی' جس نے میرے دل و دماغ کو بچپن سے پُر بہار بنا رکھا تھا۔ میرا وہ سکون برباد ہو رہا تھا جسے میں نے برسوں کی حسین آرزوؤں اور مقدس دعاؤں سے حاصل کیا تھا اور اس کی جگہ حالت یہ تھی کہ

مرا دردیست اندر دل' اگر گویم زباں سوزد
اگر دَم دَرکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

لے دے کے'' ذکر و فکرِ صبحگاہی'' (تصوف) کا پیدا کردہ ایک سُرور تھا' سو میری حرماں نصیبی (اور اب سمجھتا ہوں کہ خوش بختی) کہ وہ بھی ''نذرِ برہمن'' ہو گیا۔ تفصیل اس ''غارتگریٔ بہارِ چمن'' کی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

داداؔ جان کے ہاں' عام طور پر سرِ شام' شہر کے اچھے اچھے دانشور آتے اور مختلف علمی اور فکری موضوعات پر گفتگو رہتی لیکن رات ڈھلے ایک اور محفل جمتی جو پُر اَسرار سی ہوتی۔ اس میں دُور دَراز کے سادھو' سنیاسی' یوگی آتے اور موضوعِ گفتگو ویدانتؔ اور ہمہ اُوستؔ کے رَموز و اَسرار ہوتے۔ تصوّف کا انتہائے کمال' کراماتؔ سمجھا جاتا ہے اور انہی کرامات (اور ان کے تذکروں) سے حضرات اولیاء کرامؒ کی عظمت و عقیدت (بلکہ ہیبت) دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے ـــــ پھر تصوّف کو ''مغزِ دین'' کہا جاتا ہے اور مُنتہائے اسلام۔ وہ یوگی' سنیاسی آتے تو ان سے لامحالہ صوفیائے کرام کے کشف و کرامات کے تذکرے چھڑتے' لیکن

میری حیرت کی اِنتہاء نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ بعض یوگی' ان سے بھی کہیں زیادہ تحیر انگیز اور تعجب خیز ''کرامات'' دکھا دیتے۔ اس سے میرے دل میں یہ خیال ابھرتا کہ اگر ہمارے اولیاءِ کرام کی کرامات' دین کا عصارہ اور قربِ خداوندی کا نتیجہ ہیں' تو یہ بُت پرست' مشرک' یوگی' ان سے بھی زیادہ حیرت فروش ''کرامات'' کیسے دکھا دیتے ہیں؟ کُتبِ تصوّف میں اس کا جواب زیادہ سے زیادہ یہ ملتا کہ اولیاءِ کرام کی کرامات' کرامات کہلاتی ہیں' اور ان مشرکین کی شعبدہ بازیاں' اِستدراج ــــ لیکن یہ لفظی تفاوت میرے لئے وجہِ تسکین نہ بن سکتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ میرا وہ سکون بھی چھنتا چلا گیا' جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنی صحت تک قربان کردی تھی۔ (اس کے اثرات عمر بھر میرے ساتھ رہے' اب بھی اسی طرح موجود ہیں۔ مجھے صحت مند زندگی کبھی نصیب نہیں ہوئی!)۔

کبھی کبھی جی میں آتا کہ اِن شکوک وشبہات کا (جن کی آماجگاہ میرا قلبِ حزیں بن رہا تھا اور جن کی وجہ سے میرا دن کا چین اور راتوں کی نیند مجھ پر حرام ہو رہی تھی) دآدا جان سے تذکرہ کروں' لیکن (میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شدتِ احترام وعقیدت کا نتیجہ تھا یا ان کے علوِّ مرتبت کی عظمت کا احساس) مَیں اپنے اندر اس کی جرأت نہیں پاتا تھا۔ میں اسے ڈر بھی نہیں کہہ سکتا' ہیبت بھی نہیں ــــ وہ تو بڑے ہی محبت کرنے والے شفیق تھے ــــ لیکن کچھ تھا جس کی وجہ سے ایسا کہنا تو ایک طرف' میں ان کے دل میں اس کا احساس تک بھی پیدا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میرے دل میں اس قسم کے شکوک اُبھر رہے ہیں ــــ اور پھر ابھی میری عمر بھی کیا تھی!

میں اس داستانِ تپش وخلش کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے قلب ودماغ کی یہ اضطراری کیفیت برسوں تک رہی' تا آنکہ مجھے' بصیغۂ ملازمت' لاہور آنا پڑا۔ یہ تبدیلی میرے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ اس سے میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا۔ اس فضاء میں مجھے زیادہ آزادی سے سوچنے کا موقعہ مل گیا ــــ یہ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔

علامہ اقبالؒ سے میرا ذہنی تعارف بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ جب ان کی مثنوی ــــ اسرارِ خودی ــــ شائع ہوئی تو دآدا جان نے مجھے خصوصیّت کے ساتھ اُسے پڑھایا ــــ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ چھوٹی تقطیع کے نفیس کاغذ پر بڑے خوبصورت انداز میں چھپی تھی اور دآدا جان کے پاس جو نسخہ تھا اس پر علامہ اقبالؒ کے دستخط ثبت تھے۔ اُس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس کتاب پر مصنف کے دستخط ثبت ہوں اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہؒ نے وہ نسخہ دآدا جان کو تقدیماً ارسال فرمایا تھا اور ان کے باہمی روابط تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ جب میں لاہور آنے لگا تو انہوں (دآدا جان) نے لاہور میں دو ''بزرگوں'' سے ملنے کے لئے فرمایا تھا ــــ ایک امام الدّین نجار' جو نوّاں کوٹ میں رہتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں، اور دوسرے علامہ اقبالؒ ــــ بہر حال' بات اُس مثنوی کی ہو رہی تھی۔

اس کے اُس (پہلے) ایڈیشن میں حافظؔ کے متعلق وہ اشعار بھی تھے جن کی بناء پر' ملک بھر کے متصوّفین نے علامہ کے خلاف طوفان برپا کر دیا تھا۔ اس بحث و نزاع میں علامہ نے ''عجمی اسلام' یا اسلام پر عجمی اثرات کا بار بار ذکر کیا تھا ـــــ اور یہ بات میرے دماغ کے ساتھ چپک گئی تھی۔ لاہور کی نسبتاً آزاد فضا میں میرے دل میں اس تجسّس کا جذبہ بیدار ہوا کہ معلوم کیا جائے کہ حقیقی اسلام اور عجمی اسلام میں کیا فرق ہے اور وہ عجمی اثرات کیا تھے جن سے حضرت علامہؒ نے اس طرح متنبہ کیا تھا۔ یہاں سے تحقیقات کا ایک نیا باب میرے سامنے کھل گیا۔ یہ تحقیق یکسر آزادانہ تھی کیونکہ ''سابقہ اسلام'' کی اندھی عقیدت ان شکوک و شبہات نے ختم نہیں تو دھندلی ضرور کر دی تھی جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ میں نے قریب دس سال کا عرصہ ان سنگلاخ زمینوں اور خار دار جھاڑیوں میں گزارا' اور ان موضوعات سے متعلق جو کتابیں بھی مجھے دستیاب ہو سکیں' انہیں چاٹ ہی نہیں لیا' ہضم کر ڈالا۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف و اِعلان میں کوئی باک یا تأمل نہیں کہ اُس زمانے میں' سابقہ معتقدات میں سے کسی پر بھی میرا یقین باقی نہیں رہا تھا۔ یوں کہیئے کہ میں اُس زمانے میں لآ کی منزل سے گزر رہا تھا اور اِلّآ ہنوز میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ ان حالات میں عین ممکن تھا کہ میں اسلام ہی سے برگشتہ ہو جاتا لیکن (میری انتہائی خوش بختی کہ) اس ورطۂ لآ میں ایسا جاذبہ موجود رہا جو اِن تلاطم خیزیوں میں' میری کشتی کا لنگر بن گیا ـــــ اور وہ جاذبہ تھا حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت ہی نہیں محبت۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا تحیر انگیز انقلاب برپا کر دیا تھا نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہو سکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری' نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعویٰ کو یوں ہی نہیں جھٹک دینا چاہئے' انتظار کرنا چاہئے تا آنکہ میں قرآن کو خود سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا (اور کس قدر محکم سہارا) جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کم کشش کی کوئی قوت مجھے اس ورطہ میں سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سچ ہے:

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو   عشق خود اک سیل ہے' سیل کو لیتا ہے تھام

کس قدر احسانِ عظیم ہے اس ذرۂ ناچیز پر اُس آفتابِ عالمتاب کا' جس کی رحمۃ للعالمینی کے تصدق مجھے ـــــ منزل ملی' مقام ملا' مدعا ملا۔

کوثر چکد از لبم' بایں تشنہ لبی   خاور دمد از شبم' بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب' کہ در حریم دلِ ماست   شاہنشہِ انبیاء' رسولِ عربی

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [33:56]

برسوں کی تحقیق و کاوش کے بعد یہ حقیقت میرے سامنے آ گئی کہ ہمارا مروجہ اسلام جن عناصر کا مجموعہ ہے' وہ کہاں کہاں سے

مُستعار لئے گئے اور کس طرح جزوِ اسلام (بلکہ عین اسلام) بن گئے ہیں ـــــ (ضمناً) میرے تصنیفی پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ میں ان تحقیقات کی روشنی میں اسلام کی (مسلمانوں کی نہیں' اسلام کی) تاریخ مرتب کروں جس میں یہ بتایا جائے کہ حقیقی اسلام کس طرح مروجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہو گا جب میں قرآنِ مجید کے متعلق اپنے پیشِ نظر پروگرام سے فارغ ہو گیا کہ اِسے ہر دوسرے کام پر تقدّم وتفوّق حاصل ہے۔ سرِدست' اس تاریخ کی ہلکی سی جھلک اس کتاب کے آخری باب میں آپ کے سامنے آئے گی۔

وادئ لا سے گزرنے کے بعد' مَیں' منزلِ اِلّا کی طرف آیا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

گر تُو میخواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اس سے یہ بنیادی حقیقت سامنے آئی کہ دین قرآنِ کریم کے اندر ہے' اور قرآنِ کریم سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اُسے خالی الذہن ہو کر نہ سمجھا جائے۔ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ [56:79] سے' میرے نزدیک یہی مراد ہے۔ فیضانِ اقبالؒ سے یہ حقیقت بھی میری سمجھ میں آئی کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق ''محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات'' ہے۔ محاورۂ عرب سے مراد یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں یہ کتابِ عظیم نازل ہوئی تھی) قرآنی الفاظ کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا اور تصریفِ آیات سے مفہوم یہ کہ قرآنِ کریم میں ایک موضوع پر مختلف مقامات پر جو کچھ آیا ہے اسے بیک وقت سامنے رکھا جائے۔ اس سے قرآنِ کریم اپنے مطالب آپ واضح کر دیتا ہے۔ (دیکھئے 6:106)

یہ سفر بڑا طویل بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ ہمارے ہاں کے اس ہزار سالہ عرصہ میں' مذہب[1] اسلام کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اہرامِ مصر بھی اس ڈھیر کے سامنے پست نظر آئیں۔ لیکن دیدۂ عبرت اس حرماں نصیبی پر جس قدر آنسو بھی بہائے کم ہے کہ اسے اس آسماں بوس انبار میں قرآنِ خالص کے متعلق جو کچھ ملے گا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ قرآنی لغات میں بھی لے دے کے امام راغبؒ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ بیشک ایک مفید کوشش ہے لیکن وہ ایسی مختصر ہے کہ اس سے قرآنی تصورات سامنے نہیں آ سکتے۔ باقی رہی مضامین کے اعتبار سے قرآنی تبویب' سو اس باب میں بھی جو کچھ ہوا ہے وہ چنداں مفید مطلب نہیں۔ وہ محض الفاظ کی اساس پر میکانکی تبویب ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قرآنِ خالص کے متعلق کسی نے کوئی مفید کام کیا ہی نہیں۔ کیا ہو گا لیکن قدامت پرست طبقہ نے اسے باقی نہیں رہنے دیا کہ اِن کی انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ قرآنِ کریم اُمت کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ کیونکہ اس کی تعلیم کے بے نقاب اور عام ہو جانے سے' ان کے مفادات پر زَد پڑتی تھی۔ اندریں حالات' میں نے جلد محسوس کر لیا کہ اگر مجھے قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ سے قرآن سمجھنا ہے تو اس کے

1۔ واضح رہے کہ میں اس اسلام کو جسے خدائے تعالٰی نے بوساطتِ نبی اکرمؐ دنیا کو دیا تھا' دین کہہ کر پکارتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں اس کے لئے یہی لفظ آیا ہے' اور مروجہ اسلام کو جو انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے مرکب ہے' مذہب کے نام سے تعبیر۔ مذہب کا لفظ تک قرآن میں نہیں آیا۔

لئے سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' یہ راستہ دور دراز بھی تھا اور دشوار گزار بھی' جسے مجھے بلا رفیق و زمیل' تنہا طے کرنا تھا۔ اگر یہاں بھی عشقؔ' جرأت آفریں اور حوصلہ افزاء نہ ہوتا تو میں اس کوہکنی کی ہمت کبھی نہ کرسکتا۔ بحمد اللہ کہ قریب تیس سال کی مسلسل خارہ شگافی کے بعد' میں ان چٹانوں سے جوئے شِیر لانے میں کامیاب ہوگیا۔ چار جلدوں میں میری لغات القرآن اور تیس پاروں میں مفہوم القرآن اس کے ثمرات میں سے ہیں۔ دو درجن کے قریب قرآنی حقائق پر مشتمل مجلدات اور طلوعِ اسلام کے مضامین اس پر مستزاد ہیں — اور اگر ان میں اس درسِ قرآن کو بھی شامل کرلیا جائے جو گذشتہ بیس سال سے مسلسل دیا جارہا ہے اور جسے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کرلیا گیا ہے تو — سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کے لئے — واضح رہے کہ اس تمام عرصہ میں' مَیں ملازمت بھی کرتا رہا (جس سے مَیں نے 1955ء میں قبل از وقت پنشن لے لی)۔ جب مَیں اس قطع کردہ منزل پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں تو یقین مانئے' میرے تصور میں بھی نہیں آتا کہ یہ سفر میں نے تنہا کیسے طے کرلیا۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ

عشق کی اک جست نے طے کردیا قصہ تمام　　　اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر میں اس مقام پر استاذی المکرّم حافظ محمد اسلم جیراج پوری (علیہ الرحمتہ) کا ذکر نہ کروں جن کی مشفقانہ حوصلہ افزائی میرے لئے موجبِ ہزار تقویت بنتی رہی۔ میری آنکھوں نے اس مردِ درویش جیسا پاک سیرت' عالمِ متبحر' قرآن کا شیدائی بلکہ فدائی کہیں نہیں دیکھا۔ خدا انہیں اپنے سحاب کرم کے سایہ میں رکھے — طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ۔

جب اس طرح قرآنِ خالص میرے سامنے آیا تو میرے قلب و دماغ کی دنیا جگمگا اُٹھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتابِ عظیم کے متعلق کہا ہے كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ [14:1] ''اے رسولؐ! ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعے آپ نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں''۔ اَور کسی کا تو اس پر اعتقاداً ایمان ہوگا لیکن میرا اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اسلام کی صداقتوں پر میرا ایمان تقلیدی نہیں — تقلیدی ایمان کو تو مَیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا — میرا یہ ایمان ذاتی تحقیق' علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہے' اور اس جہت سے میں اپنے آپ کو ''نومسلم'' کہا کرتا ہوں۔ قرآن پر اس طرح ایمان کا نتیجہ ہے کہ میں ان صداقتوں کو پورے حتم و یقین کے ساتھ علم و بصیرت کی روشنی میں' دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہوں — اور ایک مدت سے ایسا کررہا ہوں — ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ان تحقیقی کاوشوں کی رُو سے' تفسیر و روایات اور فقہ و تاریخ کی پیدا کردہ تاریکیاں کس طرح چھٹ گئیں' یہ داستان تو آپ کے سامنے آگئی۔ تصوّف کے دلدل سے میں کس طرح باہر نکلا' یہ قصہ ابھی محتاجِ بیان ہے۔ اس داستان کے بیان کرنے سے

پہلے، میں ایک اہم نکتہ آپ کے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں ۔ وہ یہ کہ جن غلط نظریات کا تعلق انسان کے ذہن (INTELLECT) سے ہوتا ہے، فکری طور پر ان کی تصحیح یا اصلاح آسانی سے ہوسکتی ہے، لیکن جن تصورات کا تعلق اس کے جذبات (EMOTIONS) سے ہو، وہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں اس لئے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب بنی اسرائیل کے متعلق کہا تھا کہ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ [2:93] ''گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھی''، تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؒ

تو اس سے شاید وہ اپنی انہی الجھنوں کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ یہ منزل میرے لئے بھی بڑی دشوار گزار اور صبر طلب ہوئی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تصوّف کے متعلق میری کھٹک اس وقت شروع ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی اُسی قسم کے شعبدات سرزد ہوجاتے ہیں جس قسم کی ''کرامات'' کے مدعی ہمارے اہلِ تصوف ہوتے ہیں۔ جن مراقبات و ریاضات کا نتیجہ یہ کرامات ہوتی ہیں، ان کا مجھے ذاتی تجربہ بھی تھا۔ میں اس کاوش اور تجسّس میں تھا کہ معلوم کروں کہ مشرک سنیاسیوں اور یوگیوں سے اس قسم کے کارنامے کس طرح سرزد ہوجاتے ہیں۔ میں نئی دہلی میں تھا کہ وہاں بنگلور (جنوبی ہند) کا ایک پنڈت 'گیتا' پر لیکچرز دینے کے لئے آیا۔ وہ فلسفہ کا استاذ تھا اور سنسکرت کے علاوہ اسے مغربی علوم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ اس کے علم اور یوگ کی بڑی دھوم تھی۔ میں اس کے لیکچروں میں بھی جاتا اور علیحدگی میں بھی اس سے باتیں کرتا۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی قیام گاہ سے اٹھ کر میرے ہاں چلا آیا (مَیں اُس زمانے میں وہاں تنہا رہتا تھا)۔ اس نے مجھ سے قرآن کے حقائق و معارف سمجھنے شروع کئے اور مَیں اُس سے گیتا پڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے زیرِ ہدایت، یوگ کی مشقیں بھی شروع کردیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں، میں نے دیکھ لیا کہ یوگ کی ان مشقوں اور تصوّف کے مراقبوں میں صرف طریقِ کار کا فرق ہے، ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی قوتِ خیال کا ارتکاز (CONCENTRATION OF WILL POWER)۔ قریب چھ ماہ بعد وہ گیتا اچاریہ، اپنی گیتا، کرشن جی کی مورتی اور ایک (کنگ نما) ساز میرے پاس چھوڑ کر اور مجھ سے قرآنِ مجید کا نسخہ لے کر چلا گیا؛ اور مجھ سے کہہ گیا کہ اس راستے کے مزید منازل طے کرنے کے لئے شملہ کی فلاں سمادھی میں جایا کرو۔ دفاتر کے شملہ جانے پر میں نے اُس سمادھی میں جانا شروع کیا اور چند ہی ماہ کی مشقوں کے بعد وہیں پہنچ گیا جہاں مجھے مراقبوں اور مجاہدوں نے پہنچایا تھا۔ اُسی زمانے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کچھ مشرق میں ان طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یورپ میں وہی کچھ عملِ تنویم (ہپناٹزم) کے ذریعے پیدا کرلیا جاتا

ہے۔ میں نے اس کی بھی مشق کی اور دیکھا کہ منتہٰی اس کا بھی وہی ہے [1]۔ اس عملی تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ جہاں تک تصوّف کے کراماتی گوشے کا تعلق ہے' یہ ایک فن ہے جسے ہر شخص (بلاتمیزِ مذہب وملت) حاصل کر سکتا ہے' اسی طرح جیسے ورزش اور کسرت سے ہر شخص اپنی جسمانی قوت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

یہ رہا تصوّف کا فنی پہلو لیکن اس کی اصل و بنیاد اس دعویٰ پر استوار کی جاتی ہے کہ اس سے خدا سے ''ہمکلامی'' حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم سے میں نے اس حقیقت کو بھی سمجھ لیا کہ خدا سے ہمکلامی صرف حضراتِ انبیاء کرامؑ کو حاصل ہوتی تھی (جسے وحی کہا جاتا ہے)۔ اس کا سلسلہ' حضور نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد' خدا سے ہمکلامی کا تصوّر ختمِ نبوت کی مہر توڑنے کا نہایت غیر محسوس اور (بظاہر) معصوم سا طریقہ ہے' اور عجمی سازش کا نتیجہ۔ خدا نے اپنی جو باتیں (کلام) انسانوں تک پہنچانی تھیں' وہ قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیں۔ ان میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافہ کی حاجت۔ لہٰذا مزید ''ہمکلامی'' کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہی ختمِ نبوت کا مفہوم ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' صوفیا کے ''کشف والہام'' ان کے اپنے نفسِ غیر شعوری کی کرشمہ سازیاں ہوتے ہیں' خدا سے ہمکلامی نہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کے عقیدہ نے اسلام کو کس قدر مسخ اور اُمت کو کس طرح تباہ کیا ہے' اس کی تفصیل ختمِ کتاب کے آخری باب میں سامنے آئے گی۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں میرے سفرِ حیات کی داستان۔ میں نے اسے بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ اس پس منظر میں اس بات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ روایات' تفسیر' فقہ' تاریخ اور تصوف اور دوسری طرف قرآنی حقائق سے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا انحصار سنی سنائی باتوں پر نہیں۔ میں سب کچھ اپنی ذاتی تحقیق اور تجربہ کے بعد کہتا ہوں —— قلندر ہر چہ گوید' دیدہ گوید۔

میری عمر بھر کی تحقیق وکاوش کا ماحصل یہ ہے کہ'

(1) جو دین' نبی اکرمؐ کی وساطت سے' منجانب اللہ ملا تھا' وہ بتمام وکمال' قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

(2) دین کے معاملہ میں حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرآنِ کریم ہے۔ روایات ہوں یا تاریخ' شریعت ہو یا طریقت' غرضیکہ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے ہمارے ہاں مروج ہے' ضرورت ہے کہ اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ جو اس پر پورا اُترے اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے' جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ ہمارے ہاں جو کچھ متوارث چلا آ رہا ہے' ہمارے اسلاف نے اسے بہرحال قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا ہوگا' ہمیں بَری الذّمہ قرار نہیں دے سکتا۔ قرآن کا

---

[1] چونکہ اعجوبہ پسندی گویا ''انسانی فطرت'' میں داخل ہے اس لئے میرے اس قسم کے بیانات پڑھنے کے بعد اکثر احباب تقاضا کیا کرتے ہیں کہ انہیں ان طریقوں کی تفصیلات بتائی جائیں۔ میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ جب سے میں نے ان راستوں کو چھوڑا ہے' پھر ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس لئے مجھے اس قسم کی فرمائشوں سے معذور رکھا جائے۔

از گوشۂ بامے کہ پریدیم' پریدیم

مطالبہ یہی ہے کہ تم خود غور وفکر کے بعد، ردّ وقبول کا فیصلہ کرو۔

(3) اسلام مذہب نہیں، دین ہے جو صرف مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں عملی شکل اختیار کر سکتا ہے۔اس مملکت کا فریضہ، قرآنی احکام واقدار کو، عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

(4) قرآنی مملکت ـــــ محض قوانین کے میکانکی نفاذ سے وجود میں نہیں آجاتی۔اس کے لئے ایسی جماعت (امت) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے افراد کی زندگی قرآنی اقدار کے قالب میں ڈھلی ہو۔حضورؐ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور عدیم النظیر تربیت سے ایک جماعت تیار فرمائی اور ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔حضورؐ کا یہی عمل ہے جو قیامت تک نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کو سامنے لانے کے لئے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔اس مقصد کے لئے جب میں نے کتبِ روایات وتاریخ کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ وہ اس قسم کے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جو نہ صرف خلافِ علم وعقل اور خلافِ قرآن ہیں بلکہ ان سے حضورؐ کی سیرت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔دوسری طرف میں نے جب قرآنِ مجید پر غور کیا تو دیکھا کہ اس میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصولی گوشے محفوظ ہیں۔میں نے ان اصولوں کو عنوان قرار دیا اور ان کی روشنی میں کتبِ روایات وآثار کو کھنگالا۔ان میں جو واقعات قرآن کے مطابق نظر آئے، انہیں قبول کر لیا، جو اس کے خلاف دکھائی دیئے انہیں مسترد کر دیا۔اس طرح حضورؐ کی نکھری، اُجلی، مصفّا، پاکیزہ سیرت مرتب ہو کر سامنے آگئی جو ''معراجِ انسانیت'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔للہ الحمد کہ میری اس محنت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔لیکن یہ سن کر آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے اس کی بھی مخالفت کی۔ان کی وجوہِ مخالفت میں سے مَیں، اس موقعہ پر صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ہمارے ہاں یہ عقیدہ ایک مسلّمہ کی حیثیت سے مروج چلا آ رہا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت نو سال کی۔مخالفین کی طرف سے اس پر جس قدر اور جس نہج سے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔قطع نظر ان کے اعتراضات کے، یہ چیز خود قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہے کیونکہ قرآن نے بلوغت کو نکاح کی شرط قرار دیا ہے۔بنابریں، میں اس خیال کو ذہن کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دے سکتا تھا کہ یہ واقعہ صحیح ہوگا۔میں نے جب اس کے متعلق تحقیق سے کام لیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس سال کے قریب تھی۔اس پر مجھے جس قدر مسرت حاصل ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔میں سمجھتا تھا کہ ہمارے مذہبی حلقہ کی طرف سے اس پر صدائے تحسین بلند ہوگی کہ معاندین کے جس اعتراض کا ان سے کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا تھا، تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ وہ واقعہ ہی غلط ہے لیکن ان حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی۔دلیل یہ تھی کہ اگر اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے بخاریؒ شریف کی اس روایت کو غلط قرار دینا پڑے گا جس میں حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال

کی بتائی گئی ہے۔اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک' قرآن اور صاحبِ قرآن کی حیثیت کیا ہے اور کُتبِ روایات وتاریخ کا مقام کیا۔اوراسی سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ جو شخص کتبِ روایات وتاریخ کی تحقیق و تنقیح کا مشن لے کر اُٹھے' اِن کی طرف سے اُس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔میرا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر میرے خلاف' ایک ہزار ''علماء کرام'' نے کفر کا فتویٰ عائد کیا تھا' اور ہر محراب و منبر سے میرے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ جاری ہے جو یکسر جھوٹے الزامات پر مبنی ہوتا ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی بے مثال تعلیم وتربیت سے قدوسیوں کی ایک جماعت تیار فرمائی اوران کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔آپؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد' اس مملکت کی سربراہی حضرت صدیقِ اکبرؓ کو تفویض ہوئی لیکن ایک تو ان کا زمانہ خلافت بہت مختصر تھا (قریب اڑھائی سال) اور دوسرے ملک کے اندر مختلف بدوی قبائل نے جو شورش برپا کی تھی' آپ کا زیادہ وقت اس کے فرو کرنے میں صَرف ہوگیا۔ بنابریں' اس نظام کی تکمیل ان کے عہد میں بھی نہ ہوسکی' اگرچہ جو فریضہ انہوں نے ادا کیا (یعنی استحکامِ مملکت) وہ بجائے خویش بڑا دقیع اور مستحقِ ہزار تبریک وتحسین ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی معاشرہ (یا نظامِ مملکت) کے لئے جو اصول بیان کئے ہیں' وہ تو واقعی بڑے بلند ہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ ان پر کبھی عمل ہو بھی سکا ہے۔اور اگر کبھی ان پر عمل ہوا بھی تھا' تو وہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟ ہمارے ہاں اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان پر خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عمل کیا گیا تھا جب صحیح اسلامی مملکت قائم ہوئی تھی لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ اس نظام یا مملکت کی تفصیل بتایئے تو ہماری تاریخ اس کا جو نقشہ پیش کرتی ہے اس کا مثالی ہونا تو ایک طرف' اسے دیکھ کر خود ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق وتجسّس کا ایک معتدبہ حصہ اس کے لئے بھی وقف کیا کہ کسی طرح اس نظام کا صحیح نقشہ سامنے آجائے۔ یہ نقشہ مجھے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مِلا۔ کتبِ تاریخ وروایات میں اس کے متعلق بھی ہر قسم کا رطب ویابس مخلوط ملتا ہے' لیکن میں نے جب اسے اپنے مسلک (یعنی قرآنی معیار) کے مطابق چھانا پھٹکا تو یہ اپنی منزّہ شکل میں سامنے آگیا۔اسی سے میں' اسلام کو بہ حیثیتِ دین (عملی نظامِ حیات) سمجھ سکا۔اس سے مجھے جس قدر مسرت واطمینان حاصل ہوا ہوگا' اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ نقشہ میرے سامنے تو ایک مدت ہوئی آچکا تھا' لیکن اسے دوسروں کے سامنے لانے میں ایک خاص اَمر دامن کش تھا۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی سربراہی میں صحابہ کبارؓ کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا' اور صحابہؓ کے بارے میں مسلمانوں کے دو بنیادی گروہوں —— شیعہ اور سُنی —— میں جو اختلاف ہے اس نے ''کفروایمان'' تک کی شدت اختیار کررکھی ہے۔مشکل بالائے مشکل یہ کہ خود سُنیوں کی کتبِ روایات وتاریخ میں بھی ایسی ایسی باتیں ملتی ہیں' جو اِن حضرات (صحابہ کرامؓ) کے شایانِ شان نہیں۔

اس قسم کی روایات اور تاریخی شواہد پر تنقید کا نتیجہ وہی ہو سکتا تھا' جس کا ذکر' حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح کے سلسلہ میں آ چکا ہے ـــ پھر جب اس سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا (یعنی یہ کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا اور اس کے بعد اِسلام پر کیا بیتی) تو اس سلسلہ میں میری تحقیق نے مجھے جن نتائج تک پہنچایا' ان سے مروجہ اسلام کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو نظرِ ثانی کا محتاج ومتقاضی نہ ہو۔ اس سے یہ کیفیت ایک حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے کہ

تمدن' تصوّف' شریعت' کلام ـــ بُتانِ عجم کے پُجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ـــ یہ اُمّت روایات میں کھو گئی (اقبالؒ)

مذہبی پیشوائیت میں' حقائق کا سامنا کرنے کا نہ حوصلہ ہوتا ہے نہ برداشت۔ اور جب حقائق کی گیرائی اور گہرائی کا یہ عالم ہو تو اس کے ردِّ عمل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں' ایک عرصہ تک' ان مشکلات پر غور کرتا رہا۔ ایک طرف قرآنِ کریم کا تقاضا تھا کہ ـــ دیکھا ہے جو کچھ تُو نے' اَوروں کو بھی دکھلا دے ـــ دوسری طرف یہ موانعات تھے۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

میں ایک عرصہ تک اسی بیم ورجا میں رہا' لیکن بالآخر' اب (جبکہ میری عمر ستر برس سے بھی متجاوز ہو گئی ہے' اور نہیں معلوم کہ خدا کے طبیعی قانون کی رُو سے مجھے اس دنیا میں رہنے کی کس قدر مزید مہلت مل سکتی ہے)' مَیں نے مناسب (ہی نہیں ضروری) سمجھا کہ میں ان حقائق کو اربابِ فکر ونظر کے سامنے لے آؤں۔ ''ضروری'' اس لئے کہ اسلام بہ حیثیتِ دین (نظامِ حیات) سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ اس کی عملی شکل کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں دیؔن کے مختلف گوشوں کو پہلے قرآنِ کریم کی روشنی میں' نظری حیثیت سے پیش کیا ہے اور پھر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ صدرِ اوّل میں اس پر عمل کس طرح ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے' دیؔن کا یہ نظام' عہدِ رسالتمآبؐ اور شیخین (حضرت صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ) کے زمانہ میں' اس جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا جس کی تعلیم وتربیت خود رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان حضرات کی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بناء پر' قرآنِ کریم نے اس کا تعارف بڑی شرح وبسط سے کرایا ہے' انہیں' اس نے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ [48:29] ''رسول اللہ کے ساتھی'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے' اور خود حضورؐ کو ان کا ''صاحب'' (ساتھی) کہہ کر پکارا ہے (53:2)۔ ایک مقام پر حضورؐ کے شریکِ غار کو صَاحِبِهٖ کہا ہے (9:40)۔ حضورؐ کے ان ساتھیوں کو عام طور پر ''مومنین'' کہا گیا ہے لیکن مزید تعارف کی غرض سے انہیں مہاجریؔن اور انصاؔر کے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اُس دور میں اسلام لانے والوں کے ایک اور گروہ کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے جو اعراب (بادیہ نشینوں) پر

مشتمل تھا۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے' مسلمانوں کی حیثیت سے' مملکتِ اسلامی کی اطاعت تو قبول کر لی تھی لیکن ''ایمان ان کے دِل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا'' (49:14)۔قرآنِ کریم نے جن ''ناپختہ ایمان والوں'' کا ذکر کیا ہے'ان سے یہی لوگ مراد ہیں۔ان کے سوا' باقی تمام وہ مومن تھے جن کے راستے پر چلنے کی تاکید خود قرآن نے کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ اس راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا (4:115)۔اس سے ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے مقام کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

(2) ان کی اہمیت کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ [8:62] خدا وہ ہے جس نے' اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو آپ کی تائید وتقویت کا موجب بنایا۔آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ [8:64]

اے نبی! (i) خدا اور (ii) یہ جماعتِ مومنین' جو آپ کا اتباع کرتی ہے' آپ کے لئے کافی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ صحابہؓ کی جماعت کا مقام اس قدر بلند تھا کہ خدا نے انہیں اپنے ساتھ ہم قوس قرار دے کر' یہ کہا ہے کہ یہ دونوں (خدا اور جماعتِ مومنین) حضورؐ کے مشن کی کامیابی کے لئے کافی ہیں۔

(3) صحابہؓ کی اس اہمیت کے پیشِ نظر حضورؐ سے کہا گیا کہ ''یہ لوگ جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے صبح وشام' مسلسل وپیہم ـــــ خدا کو پکارتے ہیں' انہیں اپنے قریب رکھیں' دھتکاریں نہیں (6:52 ; 18:28) وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ [26:215 ;15:88]۔ان کی اس طرح پرورش اور حفاظت کریں جس طرح مرغی اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔

(4) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' یہ جماعت' مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی۔ان کے متعلق فرمایا:

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰۤئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا‌ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ [8:74]

وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی' یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومنِ حقّا) ہیں۔ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔

اس آیۂ جلیلہ میں' اللہ تعالیٰ نے' جملہ مہاجرین اور انصار کو مومنِ حقّا کہہ کر پکارا ہے اور ان کی مغفرت اور رزقِ کریم کی ضمانت دی ہے۔اس آسمان کے نیچے' کسی کے ایمان اور مغفرت کی اس سے بڑی شہادت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

(5) ان میں کچھ وہ تھے جنہوں نے حضورؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا اور کچھ وہ جو اُن میں' ذرا بعد' شامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے جنت کی بشارت دی ہے۔سورۃ توبہ میں ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ [9:100]

مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی اور وہ جو حُسن کارانہ انداز سے ان میں بعد میں شامل ہوئے' اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغات (جنّت) تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

غور فرمایئے' اللہ نے تمام صحابہؓ کے لئے' خواہ وہ السابقون الاوّلون کے زمرے میں شریک تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے' ابدی جنت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ دوسرے مقام پر' ان میں' بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے فَاُولٰۗىِٕكَ مِنْكُمْ [8:75] وہ بھی تم میں سے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے وعدے کا تعلق ہے' ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کی رُو سے' مدارج کا تعیّن اعمال کی رُو سے ہوتا ہے (19-46) لہٰذا السابقون الاوّلون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے' لیکن جہاں تک جنت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے' وہ ان سب کے لئے یکساں ہے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں فرمایا:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ [57:10]

وہ لوگ جنہوں نے فتحِ مکّہ سے پہلے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا' مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ السّابقون الاوّلون کے مدارج بے شک بلند ہیں لیکن اللہ کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے (اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی)۔

(6) یہ تھی وہ جماعتِ صحابہؓ' رسول اللہؐ کے ساتھی' جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے' سورۂ الفتح میں' ان وجد آور الفاظ میں کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم کے ان حسین و جمیل الفاظ پر غور کیجئے اور پھر ان رفقائے محمدؐ کے مقامات و مدارج کا تصور کیجئے۔ فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڠ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا [48:29]

مَیں اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم، اپنے مفہوم القرآن سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:

محمدؐ، اللہ کا رسول اور اس کے رفقاء کار کی جماعت۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دِل اور ہمدرد (5:54)۔ تُو انہیں دیکھتا کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ (لیکن یہ تارک الدّنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ، اور ان کی سیرت، صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے۔ اس سے، انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات سابقہ کتبِ آسمانی —— تورات و انجیل —— میں بھی مذکور تھیں۔

انہوں نے نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔ (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے)، جب کاشتکار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی (24:55)۔ لیکن اس کے لئے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہوگی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے۔ (تخمِ صالح، قوانینِ فطرت سے مطابقت، مسلسل محنت اور استقلال و استقامت —— کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)۔

یہ تھے صحابہؓ رسولؐ اللہ جنہیں اللہ نے مومن حقّاً (پکے اور سچے مومن) کہہ کر پکارا۔ جنہیں جنت اور مغفرت کی بشارت ہی نہیں دی بلکہ وعدہ کر کے اس کی ضمانت دے دی (اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا 3:8)۔ ان کے متعلق وضاحت کر دی کہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یہ شہادت، ضمانت، صراحت، وعدے ان سب کے لئے تھے۔ ان میں کسی کی استثناء نہیں تھی۔ یہ تمام مہاجرین و مجاہدین و انصار کے لئے یکساں تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) صحرائی قبائل (اَعراب) ایسے تھے جن

کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی تھی اس لئے "ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا"۔ قرآنِ کریم میں جن منافقین کا ذکر آتا ہے' ہوسکتا ہے کہ وہ انہی میں سے ہوں۔ لیکن مومنین اور منافقین میں تمیز حضورؐ کی زندگی ہی میں ہوچکی تھی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ [3:179] ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اس معاشرہ کو علیٰ حالہٖ رہنے دے۔ وہ خبیث وطیب میں تمیز کرکے رہے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تمیز حضورؐ کی زندگی میں ہوچکی تھی۔ بہرحال' اتنی بات تو حتمی اور یقینی ہے کہ مہاجرین وانصار' جن سے اللہ نے جنّت کا وعدہ کیا تھا' آخری دم تک مومنِ حقّا رہے تھے کیونکہ جنّت کا وعدہ تو اللہ انہی سے کرسکتا تھا جو زندگی بھر (اپنے مرنے تک) جنت کے مستحق رہے ہوں۔ جو شخص آج مومن ہو اور کل کو (معاذ اللہ) مُرتد ہوجائے اسے اللہ جنّت کی ضمانت کس طرح دے سکتا ہے؟

لیکن ہماری کتبِ روایات وتاریخ میں انہی صحابہؓ کے متعلق وہ کچھ لکھا ملتا ہے جس سے ان کا مومنِ حقّا اور مستحقِ جنت ہونا تو ایک طرف' مسلمان ہونا بھی باقی نہیں رہتا۔ شیعہ حضرات کا (اپنی روایات کی رُو سے) عقیدہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد' اہلِ بیت کے علاوہ' صرف پانچ مسلمان رہ گئے تھے باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے تھے۔ آپ کو غالباً خیال گزرے گا کہ شیعہ حضرات کا مسلک الگ ہے اس لئے ان کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا مستعبد نہیں' لیکن سُنّی تو تمام صحابہؓ کے مومنِ حقّا ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرکے آپ کو حیرت ہوگی کہ سُنّیوں کے ہاں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں جن کی رُو سے صحابہؓ کا (معاذ اللہ) مرتد ہوجانا ثابت ہے۔ سُنّیوں کے ہاں' بخاری کو احادیث کی معتبر ترین کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل حدیث موجود ہے۔

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہؓ کی ایک جماعت کو (فرشتے) جہنم کی طرف لئے جارہے ہوں گے۔ میں پکاروں گا کہ یہ تو میرے صحابی ہیں، یہ میرے صحابی ہیں۔ اللہ فرمائے گا کہ (اے رسولؐ!) جب تو ان سے جدا ہوا تو یہ مرتد ہوکر اپنے سابقہ مذہب کی طرف لَوٹ گئے تھے۔ (بخاری ــــ کتاب الانبیاء)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایک طرف یہ حضرات ہر صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کہتے ہیں اور دوسری طرف' ان روایات کو بھی صحیح مانتے ہیں! لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ کتبِ احادیث کا بالاستیعاب مطالعہ کریں گے تو آپ کو ان میں' اس سے بھی زیادہ تحیر انگیز روایات ملیں گی ــــ اور ایسی ہی ہیں وہ روایات جن کے انکار سے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے!

روایات کے بعد' آپ کُتبِ تاریخ کی طرف آیئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں صحابہؓ کے متعلق کہا گیا ہے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [48:29] وہ آپس میں بڑی محبت اور پیار سے رہتے تھے۔ وہ سب آپس میں بھائی بھائی تھے (49:10)۔ سورۂ آلِ عمران میں' جماعتِ صحابہؓ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:

تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی جس سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ یہ تم پر اللہ کا خاص انعام تھا۔ تم (زمانہ قبل از اسلام میں) جہنم کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا (3:102)۔

دوسرے مقام پر ہے:

اللہ نے ان مومنین کے دلوں میں باہمی اُلفت ڈال دی۔ اے رسولؐ! (یہ باہمی الفت ایسی متاعِ گراں بہا ہے کہ) اگر آپؐ ساری دنیا کی دولت بھی صَرف کر ڈالتے تو یہ بات پیدا نہ ہوسکتی۔ یہ بات اللہ ہی سے ممکن تھی۔ وہ قوت اور حکمت دونوں کا مالک ہے (8:63)۔

یہ اللہ کی شہادت تھی۔ اس کے برعکس، ہماری تاریخ ان کے متعلق کیا کہتی ہے، اس کی بابت آپ کو ذرا آگے چل کر (متنِ کتاب میں) تفصیل سے نظر آئے گا۔ آپ (بالخصوص) تیسرے باب میں دیکھیں گے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے فوری بعد، جب خلیفہ کے انتخاب کے لئے مہاجرین اور انصار کا اجتماع ہوا تو اس میں کیا منظر سامنے آیا؟ آپ دیکھیں گے کہ اس میں (معاذ اللہ) ایک کی ڈاڑھی تھی اور دوسرے کا ہاتھ، ایک کا خنجر تھا اور دوسرے کا سینہ۔ اور طعن و تشنیع اور سب و شتم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا یہ نقشہ ہے جو (رسولؐ اللہ کی وفات کے فوری بعد) تاریخ ہمارے سامنے لائی ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھئے، قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ "کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کر دے" (4:92)۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا [4:93]

جو مومن کسی دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ اللہ نے اس کے لئے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مومن کے قتلِ عمد کی سزا کیا ہے۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد، جنگِ جمل ہوئی۔ اس میں (بجز معدودے چند) آدھے صحابہؓ ایک طرف تھے اور آدھے دوسری طرف۔ ان میں باہمی جنگ ہوئی جس میں دس ہزار صحابہؓ قتل ہوئے —— دس ہزار مومنین کا قتل خود مومنین کے ہاتھوں! (عیاذ باللہ)۔ اس سے اگلی جنگ (صفین) میں تاریخ کے بیان کے مطابق ستر ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ آپ سوچئے کہ اگر تاریخ کے ان بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا فیصلہ کی رُو سے، ان میں سے کوئی ایک بھی مستحقِ مغفرت رہتا ہے، حالانکہ یہ سب وہ تھے جن کی مغفرت اور جنت کا وعدہ خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایات اور تاریخی بیانات سب افسانے ہیں جو خاص سازش کے ماتحت وضع کئے گئے۔ اس سازش کی تفصیل کتاب

کے آخری باب میں ملے گی۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ......

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتراض کو نظری طور پر سامنے لانے کے بجائے اسے ایک عملی مثال سے واضح کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ چند سال اُدھر کی بات ہے' سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس میں انہوں نے ان روایات کو بہ ہیئتِ مجموعی یکجا کر دیا جن کی بنا پر' غیر مسلم مصنف صحابہؓ کرام کی سیرت کو مسخ کر کے پیش کیا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک روایت ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے لکھا کہ جب یزید کی فوج نے مدینہ پر حملہ کیا تو

> وحشی فوجوں نے گھروں میں گُھس گُھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں حتّٰی قیل انه **حملت الف امراء ۃ فی تلک الایام من غیر زوج** کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (خلافت وملوکیت صفحہ 182)

یہ 63ھ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے — یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے صرف پچاس سال بعد کا۔ اُس وقت ابھی صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد (زندہ) موجود تھی اور باقی اُمت تابعینؒ پر مشتمل تھی۔ دوسری طرف یزید کی فوج بھی ''وحشی تاتاریوں'' سے مرتب نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمرے میں شامل ہونے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ مندرجہ بالا روایت کو دیکھئے اور سوچئے کہ اس سے مسلمان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ ان ''وحشی فوجیوں'' کو تو چھوڑیئے' سوچئے یہ کہ مدینۃ النبیؐ کے یہ مسلمان' اپنی ماؤں' بہنوں' بیٹیوں' بیویوں کے ساتھ (معاذ اللہ) یہ کچھ بے محابا ہوتے دیکھتے رہے اور کسی کی غیرت جوش میں نہ آئی۔ نہ ہی ان خواتین نے' جو خود بھی صحابہؓ نہیں تو تابعینؒ کے زمرے میں شمار ہوتی تھیں' کسی قسم کی مزاحمت کی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ اس سے جو ایک ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے' ان کی نسل آج تک چلتی آ رہی ہے' ان کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ آپ سوچئے کہ کیا ایسی تاریخ کو قابلِ اعتماد قرار دیا جائے گا جس میں اس قسم کی روایات ہوں؟ اور تاریخ بھی وہ جو بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے' محض زبانی روایات کی بنیاد پر' صدرِ اوّل کے اڑھائی تین سو سال بعد' اُس زمانے میں مرتب کی گئی ہو جب مسلمانوں میں گروہ بندانہ تعصب عام ہو چکا تھا!

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے' انہوں نے مختلف کتبِ تاریخ کے نام گنوانے کے بعد کہا کہ:

> اب غور فرمایئے۔ یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔ اگر یہ اُس دَور کی تاریخ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالتؐ مآب سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں

موجود نہیں کیونکہ عہدِ رسالتمآبؐ کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ، شیخین کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے، سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی —— اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں، وہ تو سب صحیح ہیں، مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں، وہ سب غلط ہیں۔

(خلافت وملوکیت صفحہ 314)

ہماری کتبِ روایات و تاریخ کس طرح اور کب مرتب ہوئی تھیں، اس کے متعلق تفصیلی ذکر کتاب کے آخری باب میں آئے گا۔ سرِ دست ہم مندرجہ بالا اعتراض کی طرف آتے ہیں۔ تاریخ کے سلسلہ میں ہماری (مسلمانوں کی) کیفیت باقی دنیا کے مقابلہ میں مخصوص اور منفرد ہے۔ قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ہم حرفاً حرفاً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اب اگر تاریخ میں کوئی بات ایسی ملے جو قرآن کے کسی بیان کے خلاف ہو، تو اسے ہم کبھی صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ (مثال کے طور پر) قرآنِ مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے عزیزِ مصر کی بیوی کے اصرار کے باوجود اپنے دامنِ عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ اب اگر کوئی تاریخ، حضرت یوسفؑ کے بے شمار محاسن بیان کرنے کے ساتھ یہ کہے کہ انہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا تو ہم ان محاسن کو تو صحیح تسلیم کر لیں گے لیکن ان کی طرف منسوب کردہ دست درازی کے واقعہ کو کبھی صحیح تسلیم نہیں کریں گے۔ اس پر اگر دنیا یہ کہے کہ تمہاری یہ روش بڑی غیر علمی ہے کہ تم تاریخ کے ایک حصے کو صحیح تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کو غلط، تو ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ ایسے معاملات میں تاریخ کے پرکھنے کا ہمارا معیار تم سے مختلف ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے جو قرآنی تصریحات سے ٹکراتا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہوگا کہ ہم علمی تحقیق سے یہ ثابت کریں کہ قرآنی تصریح مبنی برحقیقت ہے اور تاریخ کا بیان غلط، لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے، ہم قرآنی بیان کو غلط قرار نہیں دیں گے۔ ایک غیر مسلم کی تو یہ پوزیشن ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کے جس بیان کو جی چاہے صحیح تسلیم کرے اور جس سے چاہے انکار کر دے، لیکن قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا یہ مؤقف نہیں ہو سکتا۔ انہیں تو قرآن کے ایک ایک حرف کو برحق تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر کسی کو، قرآنِ مجید کے کسی بیان پر بھی شبہ ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ مسئلہ زیرِ نظر پر غور فرمائیے۔

(1) قرآنِ مجید میں صحابہ کبارؓ (مہاجرین و انصار) کے متعلق بہ صراحت کہا گیا ہے کہ وہ مومنِ حقّاً (پکے اور سچے) مومن تھے۔

(2) قرآنِ مجید میں مومنین کی صفات اور خصوصیات بہ صراحت بیان کی گئی ہیں۔

(3) اس سے واضح ہے کہ صحابہ کبارؓ ان صفات و خصوصیات کے پیکر تھے جو مومنین کے متعلق قرآن میں آئی ہیں۔

(4) اگر تاریخ میں صحابہؓ کی ایسی خصوصیات کا ذکر آتا ہے جنہیں قرآن مومنین کی صفات بتاتا ہے' تو ہم تاریخ کی ان شہادات کو صحیح تسلیم کریں گے' لیکن اگر اس میں صحابہؓ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی گئی ہے جو ایک مومن کے شایانِ شان نہیں' تو ہم تاریخ کے اس بیان کو بلا تامل مسترد کر دیں گے۔ یہ اس لئے کہ ایسی صورت میں سوال' تاریخ کے دو بیانات کا نہیں ہوگا بلکہ اس میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قرآن ہوگا اور دوسری طرف' انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ۔ ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں' کسی طبریؔ یا ابنِ اثیرؔ پر ایمان لانے کے نہیں۔ اگر قرآن کے مقابلہ میں طبریؔ اور ابنِ اثیرؔ (وغیرہم) کی ہزار تاریخیں بھی غلط ثابت ہوتی ہیں تو ہوا کریں لیکن ہم ان مؤرخین کی خاطر' قرآنِ مجید کے ایک لفظ کو بھی غلط تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن کریم نے ان حضرات (صحابہؓ) کو ''معصوم'' قرار نہیں دیا۔ ان سے سہو و خطا اور اجتہادی غلطیوں کا امکان تھا۔ اس باب میں خود قرآن کریم نے وضاحت کر دی ہے کہ مومنین کا شعارِ زندگی یہ ہے کہ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ [53:32] وہ کبائر الاثم اور فواحش سے مجتنب رہتے ہیں' البتہ ان سے لَمَمْ سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لَمَمْ کے معنی ہیں' یونہی کبھی کبھار' بلا ارادہ کسی ناپسندیدہ بات کا سرزد ہو جانا۔ اس کو سہو و خطا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ [7:201]

متقیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی کوئی شیطانی خیال یونہی گھومتے گھماتے انہیں چھو جائے تو وہ ہدایتِ خداوندی کو سامنے لے آتے ہیں اور اس سے ان میں فوراً بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔

بنابریں' ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے سلسلہ میں لَمَمْ کی حد تک تو کسی تاریخی بیان کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے' لیکن ان کی طرف منسوب کردہ کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا جو مومنؔ کے شایانِ شان نہ ہو۔

ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اصحابِ رسول اللہؐ کے فہم و ادراک کی صلاحیتوں میں فرق تھا اور اس اعتبار سے انہوں نے تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے جو کچھ اخذ کیا' اس میں تفاوتِ مراتب ضروری تھا۔ لیکن ان میں سے کسی سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہو سکتی تھی جو مومنِ حقّا کی خصوصیات کے خلاف ہو۔ اس باب میں وہ سب یکساں تھے فلہٰذا یکساں احترام کے مستحق۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ان سب کے لئے تھا۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائیں کہ مہاجرین و انصار کے زمرے میں کس کس کا شمار ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس ذریعہ بھی کون سا ہے جس سے ہم اس قسم کی فہرستیں مرتب کر سکیں۔ ذریعہ ہمارے پاس تاریخ ہی ہے۔ لہٰذا تاریخ نے جس کے متعلق بھی ایسا کہہ دیا ہے' ہم اسے اس زمرہ میں

شامل سمجھ لیں گے اور اس کا احترام کریں گے۔ اس لئے کہ اگر تاریخ نے کسی اور کو بھی اس فہرست میں شامل کر دیا ہے تو اس کا احترام کرنا خدا کے ہاں جرم نہیں قرار پائے گا۔ لیکن اگر اس فہرست میں شامل حضرات میں سے کسی کے متعلق ہم نے سوءِ ظن سے کام لیا تو اس کی بابت ہم سے ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ بنا بریں' صحابہ کبارؓ میں سے کسی کے متعلق بھی بدظنی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ وہ سب واجب الاحترام ہیں۔ باقی رہے ان کے بعد کے مسلمان' سو اُن کے مومنِ حقاً تسلیم کر لینے کے متعلق قرآنِ کریم ہمیں مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ ان کے اعمال کس قسم کے تھے اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ ان کے متعلق ہمارا مؤقف از رُوئے قرآن یہ ہے کہ:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ [2:141]

یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے لئے' تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔

یہ ہے میرا مؤقف تاریخ کے سلسلہ میں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے' اسلام پر جس قدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں' اور اس کی جس قدر گھناؤنی تصویر سامنے لائی جاتی ہے' اس کی ذمہ داری ہماری کتبِ روایات و تاریخ پر عائد ہوتی ہے۔ بنا بریں' اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قرآنِ کریم کو معیار قرار دے کر عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے۔ یہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ میرا بہرحال' یہی مسلک اور مشن ہے۔ (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) میں نے' اسی معیار کے مطابق' پہلے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کو مرتب کیا۔ اس کے بعد میں نے عہدِ صحابہؓ کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا تو دیکھا کہ وہ بھی رطب و یابس سے پٹی پڑی ہے۔ میں نے اسے بھی' قرآنی معیار کے مطابق پرکھا اور کھنگالا۔ اس سلسلہ میں' مَیں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے' اسے مغربی مؤرخین کے معیار کی رُو سے ہسٹوریکل ریسرچ (تاریخی تحقیق) قرار نہیں دیا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں' تاریخی تحقیق کی گنجائش ہی نہیں اور جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو غلط فہمی میں مبتلا ہے یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ ہمارا سارا تاریخی سرمایہ متقدّمین کی چند کتابیں ہیں' جو صدرِ اول کے صدیوں بعد' بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے' محض بر بنائے روایات' مرتب ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں کے ''محققین'' اس سے زیادہ کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ ان کتابوں میں سے' اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق' واقعات منتخب اور مقتبس کر کے' ایک نئی تالیف مرتب کر دیں۔ میں نے بھی یہی کیا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میرا معیارِ انتخاب و اقتباس' میرا ذاتی نقطۂ نگاہ نہیں بلکہ غلط اور صحیح کا قرآنی معیار ہے۔ میری پیشکش اسی اعتبار سے منفرد ہے' اور (میرے نزدیک) اس لئے اہم کہ یہ میرے مدت العمر کے مطالعہ اور فکر کی ماحصل اور میری زندگی کا نقطۂ پرکار تمنّا ہے۔

عام قاعدہ کے مطابق' چاہئے تھا کہ کتاب میں مندرج ایک ایک واقعہ کا حوالہ دیا جاتا' لیکن میں نے جب ایسا کرنا چاہا تو

دیکھا کہ ساری کتاب حوالوں سے بھر جائے گی۔ اسے میرے ذوقِ سلیم نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ میں نے ان واقعات کا جو ہمارے ہاں عام طور پر مسلّم ہیں' حوالہ نہیں دیا' صرف ان واقعات کے حوالوں تک اکتفا کیا ہے جو شاذ ہیں یا متنازعہ فیہ۔ ویسے میرے ریکارڈ میں ایک ایک واقعہ کا حوالہ موجود ہے اور ''فہرست مصادر الکتاب'' میں' ان میں سے نسبتاً زیادہ مشہور کتابوں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں جن سے میں نے' بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا ہے۔

(جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے)' اسلامی نظام کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا' اور اسلام اپنی حقیقی صورت کھو کر' مروّجہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا۔ (جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے) عمر بھر کے تنقیدی اور تحقیقاتی مطالعہ کی رُو سے' یہ حقیقت میرے سامنے بے نقاب ہو گئی ہے کہ یہ کیسے ہو گیا اور اسی بنا پر میرا ارادہ ہے کہ (اگر مجھے مہلت اور توفیق حاصل رہی تو) میں اس سرگزشت کو تفصیل سے بیان کروں گا ــــ لیکن اس کے لئے معلوم نہیں مجھے کب فرصت مل سکے' اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کتاب کے آخری باب میں' اس عبرت انگیز داستان کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس سرگزشت کے مختلف گوشوں سے ہمارے مختلف فرقے اختلاف کریں گے کیونکہ ان میں' ان کے نظریات ہدفِ تنقید نظر آئیں گے۔ اس سلسلہ میں' مَیں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ

(1) میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں' اس لئے میں نے جو کچھ لکھا ہے' اس سے نہ کسی فرقہ کی جانبداری مقصود ہے نہ کسی کی مخالفت۔

(2) میرے نزدیک دین میں سند اور حجت' اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ جو کچھ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مَیں اسے قرآنی معیار پر پرکھتا ہوں۔ جسے' اپنی بصیرت کے مطابق' قرآن کے مطابق پاتا ہوں اسے صحیح قرار دیتا ہوں جو اس کے خلاف نظر آئے اُسے غلط سمجھتا ہوں۔ مجھے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں' لیکن اگر کوئی اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایسے عقیدہ یا نظریہ کو' جسے میں قرآن کے خلاف پاتا ہوں' غلط کیوں ٹھہرایا جاتا ہے' تو اس کے لئے میں معذور ہوں ــــ قرآن کی رُو سے کتمانِ حقیقت جرمِ عظیم ہے اور منافقت' انتہائی دنائت۔

(3) ہر فرقہ اپنے نظریات و متعقدات کو اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ان میں سے جس نظریہ یا عقیدہ کو میں' قرآن کے خلاف پاتا ہوں' اس کے متعلق' بنا بر احتیاط و احترام' یہ سمجھتا اور کہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ وہ کوئی ایسا نظریہ یا عقیدہ پیش نہیں کر سکتے تھے' جو قرآن کے خلاف ہو۔ لیکن اگر ان کے متبعین اس پر اصرار کریں کہ اُن کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے انہوں نے ایسا ہی کہا یا کیا تھا' تو میں کہہ دیا کرتا ہوں کہ ایسا کہنا آپ کو مبارک۔ میں اُن کے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لینا چاہتا' میں ان کا احترام کرتا ہوں۔

(4) اور آخری بات یہ کہ (جیسا کہ مَیں اپنی ہر تصنیف میں اس کا اعتراف اور اعلان کیا کرتا ہوں) مَیں نہ اپنی بصیرت کو سہو وخطا سے منزہ سمجھتا ہوں' نہ اپنے فہمِ قرآن کو حرفِ آخر۔ مَیں قرآنِ مجید کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ' نہ میرا کوئی دعویٰ ہے نہ مقام۔ وَاللّٰہ علیٰ مَا نقُولُ شھیْد۔

آپ' باب اوّل میں دیکھیں گے کہ حضور نبی اکرمؐ نے دُعا مانگی تھی کہ ابوجہل اور عمر میں سے کوئی ایک مشرف بہ اسلام ہو جائے۔ یہ دعا (حضرت) عمرؓ کے حق میں پوری ہوگئی اور وہ آغوشِ رسالتؐ میں آ گئے۔ حضورؐ کی اس دعا سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ کی نگہِ جوہر شناس نے (حضرت) عمرؓ کی مضمر صلاحیتوں کو کس طرح بے نقاب دیکھ لیا تھا۔

نبی اکرمؐ' معلّم' مربّی اور مزکّی تھے ـــــ یعنی آپؐ کا فریضہ یہ تھا کہ آپؐ اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے اپنے دست پروردگان کی صلاحیتوں کو ایسی جِلا بخشیں جس سے وہ شرفِ انسانیت کے پیکر بن جائیں۔ ابوجہل' دستِ نبویؐ کی صورت گری کی سعادت سے محروم رہا تو اس کی صلاحیتیں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ وہ ناکامی کی زندگی جیا اور نامرادی کی موت مر گیا۔ (حضرت) عمرؓ کو یہ سعادت نصیب ہوگئی تو ان کی صلاحیتیں نشو ونما پا کر ایسے متوازن قالب میں ڈھل گئیں جس سے وہ نابغہ روزگار بن گئے۔ تاریخ نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں' اِن سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ دست پروردگانِ رسالتؐ میں' انہیں اس سعادت کا سب سے زیادہ حصہ نصیب ہوا تھا۔ اس نہج سے دیکھئے تو حضرت عمرؓ کے کمالات' حضورؐ کی نگہِ انتخاب اور سیرت سازی کے رہینِ کرم تھے۔ اسی اعتبار سے میری نگہِ بصیرت نے انہیں **شاہکارِ رسالتؐ** کے لقب سے پکارا ہے ـــــ رسولؐ اللہ شاہکارِ خالقِ فطرت' اور فاروقِ اعظمؓ شاہکارِ رسالتؐ۔

پھر' جس طرح نبی اکرمؐ کے خاتم الانبیاء اور مکمل دینِ خداوندی ہونے سے' دیگر انبیاء کرامؑ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آ جاتا' اسی طرح فاروقِ اعظمؓ کے شاہکارِ رسالتؐ قرار پانے سے دیگر دست پروردگانؓ رسالتؐ کے علوِ مرتبت میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہو جاتی۔ مقامِ صحابیت پر فائز ہونے کی جہت سے سب یکساں احترام و تکریم کے مستحق رہتے ہیں۔ **رَّضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ** کا اعزازِ خداوندی سب کے لئے ایک جیسا ہے۔

میں نے اسلام کو بہ حیثیتِ دین (نظامِ حیات) سیرتِ فاروقیؓ سے سمجھا تھا' اس لئے اس سیرت کو اُجلی اور نکھری صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا اپنے ذمہ قرض محسوس کرتا تھا۔ للہ الحمد کہ میں آج اس قرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

نومبر 1973ء

پرویز

25۔ بی' گلبرگ 2-لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا
باب

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

رسولؐ اللہ نے فرمایا:

خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ (مسلمؒ باب خیار الناس)

جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ حالتِ اسلام میں بھی بہتر ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پہلے، جب نفسیات کے علمی مطالعہ کا ہنوز تصور تک بھی دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا، انسانی مضمرات کی اس گہرائی تک پہنچنا نگۂ محمدیؐ ہی کے لئے ممکن تھا۔

فریضۂ رسالت

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رُشد و ہدایت کا مقصد، انسانوں تک صحیح تعلیم پہنچا دینا ہی نہیں تھا، اس کی غایت یہ تھی کہ انسانی زندگی کے، انفرادی اور اجتماعی، ہر گوشے میں خوشگوار انقلاب پیدا کر کے، کاروانِ انسانیت کو صحیح راستے پر گامزن کر دیا جائے تاکہ اس طرح زندگی، رفتہ رفتہ، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے پیغامِ خداوندی کو حروف و نقوش کی شکل میں دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اسے خود انسانوں میں سے ایک فرد کے ذریعے، عام کیا جاتا۔ اس منتخب فرد (جسے رسولؐ کہا جاتا تھا) کا یہ فریضہ تھا کہ وہ، اس پیغام کو عام کرنے کے بعد، ایسی قوم تیار کرے جو اس پیغام کا عملی پیکر بنے، اور اُس نظام کو متشکل اور متمکّن کر کے دکھا دے جو اس پیغام کی غایت تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسولؐ کا فریضۂ زندگی کس قدر اہم اور اس کی ذمہ داری کیسی گراں بار ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے رسولؐ کے اس عظیم فریضہ کو چند مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ **يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** [2:129; 62:2] وہ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے، انہیں ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے اور پھر مسلسل و پیہم تربیت سے ان کے جوہرِ انسانیت کی نشو و نما کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے تعلیم و تربیت یافتہ انسانوں کے دلوں کو یک نگہی اور یک مقصدی کے رشتے میں منسلک، اور انہیں باہمدگر پیوست کر کے ایک ایسی امت کی تشکیل کرتا ہے جو اس پیغامِ خداوندی کو عملی نظام کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔

عربوں کی خصوصیّت

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام تھا جس کے اندر وہ تمام قوانین و اصولِ حیات' جامع اور غیر متبدل شکل میں محفوظ کر دیئے گئے تھے جن کے مطابق عالمگیر انسانیت کو آخرالامر ایک حیات پرور اور انسانیت ساز نظام کے تابع زندگی بسر کرنی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رفیع و منیع پروگرام کی اِبتداء ایک ایسی قوم کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جو اس بارِ امانت کے اٹھانے کی کما حقہٗ اہل ہو۔ تاریخِ انسانیت کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ اس عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لئے سرزمینِ عرب کو کیوں منتخب کیا گیا؟ عربوں میں وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بناء پر انہیں اس قابل سمجھا گیا کہ وہ اس اَبدیت بداماں انقلاب کے لئے اولین خمیر کا کام دیں۔ زمانۂ قبل از اسلام کے عربی معاشرہ میں (جسے ایّامِ جاہلیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے) جو ذمائم اور عیوب و بائی امراض کی طرح عام ہو رہے تھے' اُن کے تذکرے سے کتبِ تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں لیکن اُن کی اُن خصوصیات کو' جن کی بِناء پر انہیں اس جلیل القدر مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا' نمایاں اور جامع طور پر بہت کم سامنے لایا جاتا ہے' حالانکہ تاریخ کا یہ گوشہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے ان خصوصیات کو اپنی کتاب' معراجِ انسانیّت میں' جو حضورِ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہے' بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اس مقام پر انہیں' موضوعِ زیرِ نظر کی نسبت سے' مجملاً پیش کیا جاتا ہے۔ (میں نے اس میں لکھا ہے کہ) کسی قوم کے اجتماعی عیوب و ذمائم کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو غلامی اور محکومی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نشۂ قوت کی بدمستی اور جذبۂ تغلّب کی بدلگامی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ پہلی شق میں دنایت' کمینگی' بے حمیّتی' بے غیرتی' دُوں ہمتی' پست فطرتی' تنگ نظری' کور ذَوقی' بدعہدی' غدّاری' منافقت' دروغ بافی' بہانہ سازی' فریب کاری' مکاری' عیاری' تلوّن مزاجی' بددیانتی' عدم اعتماد' سہل انگاری' تن آسانی' گریہ گری جیسی رذیل عادات شامل ہیں۔ دوسری طرف نشۂ قوت و سطوت کی بدمستی سے' اِستیلاء' تغلّب' استحصال' اِستبداد' تمرد' نخوت' تظلم جیسی انسانیت سوز خصلتیں بیدار ہوتی ہیں جن سے انسان' انا الموجود لا غیری کے اہرمانہ نشۂ اقتدار سے مغلوب ہو کر' اپنے سوا کسی کو جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

خطۂ حجاز نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی اس میں ہوسِ ملک گیری اور جُوع الارض پیدا ہوئی تھی۔ اس سرزمین کو یہ خصوصیّت حاصل تھی کہ جب سے زندگی کی نمود ہوئی' اس پر کسی غیر نے حکومت نہیں کی۔ غیر تو ایک طرف' اُن کی اپنی بھی کوئی منظّم حکومت نہیں تھی۔ اس لئے ان کے دل و دماغ ان اِبلیسانہ رُوباہ بازیوں سے پاک اور صاف تھے جو میکیاولی سیاست کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف' وہاں تمدنی زندگی کے وہ جراثیم بھی نہیں پہنچ پائے تھے جو ایرانؔ و رومؔا کی جذامی تہذیب کی پیداوار تھے۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے جو صاف اور شفاف صحرائی ماحول میں زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے۔ اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ ان کے سینوں میں صحراؤں کی سی وسعت' ان کی نگاہوں میں چشموں کی سی پاکیزگی اور سیر چشمی' ان کے ارادوں میں رُطب و نخیل کی

سی بلندی اور ان کے عزم میں کوہساروں کی سی پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ مہماں نوازی' ایفائے عہد' احسان شناسی' شجاعت' بسالت' مروّت ان کی فطرت بن گئی تھی۔ ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ جس قوم میں اس قسم کے جوہر پہلے سے موجود ہوں' اسے ایک مثالی اُمّت بنا دینا چنداں مشکل نہ تھا لیکن اس مشکل کا اندازہ اس وقت لگ سکے گا جب ہم یہ دیکھیں کہ ان پسندیدہ خصائل کے ساتھ' ان میں ناپسندیدہ خصائص کس قسم کے تھے اور ان کی شدّت اور تصلّب کا کیا عالم تھا! احساسِ برتری اور جذبۂ انتقام جوئی ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی انہیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر ایسی لڑائیاں چھڑ جاتی تھیں جن کا سلسلہ سَو سَو سال تک جاری رہتا اور ہر مرنے والا اپنی اولاد کو وصیت کر جاتا کہ جب تک تم فریقِ مخالف سے انتقام نہ لے لو' اس آگ کو فرو نہ ہونے دینا۔ ان کے نسبی افتخار کا یہ عالم تھا کہ ایک قبیلہ' اپنے سے فروتر قبیلہ کے ساتھ رشتۂ یگانگت استوار کرنا تو ایک طرف' ان کے مقابلہ میں میدانِ کارزار میں اُترنا بھی باعثِ ننگ سمجھتا تھا۔ ان کے جذبۂ تفوق و منافست کی یہ کیفیت تھی کہ جب بدر کے میدان میں ایک مجاہد' ابوجہل کا سر کاٹنے لگا تو اس نے کہا کہ دیکھنا میری گردن کو ذرا نیچے' کندھوں کے برابر سے کاٹنا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ جب لڑائی کے بعد مقتولین کے سَروں کا نیزوں پر جلوس نکلے گا' تو میرا سَر باقیوں کے سَروں سے چپہ بھر اونچا ہوگا اور دُور سے نظر آئے گا کہ فلاں سردار کا سَر ہے!

مذہب کی دنیا کو تذلّل و تعبد کا انتہائی گوشہ سمجھا جاتا ہے۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ جس معبود کو پرستش کے لئے منتخب کر لیا جائے اس کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے خدا تسلیم کر لیا جائے اس کے حضور سرکشی کیسی؟ لیکن عربوں کا احساسِ برتری اور جذبۂ تغلّبِ نفس اس گوشہ میں بھی عجیب و غریب تھا۔ ایک دفعہ امرآء القیس کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا تو وہ' حسبِ دستور' اپنے سب سے بڑے دیوتا کی بارگاہ میں پہنچا کہ اس سے باپ کا انتقام لینے کی اجازت حاصل کرے۔ اجازت طلبی کے لئے تیر پھینکا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ دوسری مرتبہ تیر پھینکا تو پھر بھی وہ نفی میں نکلا۔ تیسری (اور آخری) مرتبہ تیر پھینکا تو جواب پھر بھی نفی میں تھا۔ امراء القیس بپھر گیا۔ تیروں کا ترکش زور سے بت (یعنی اپنے خدا) کے منہ پر مارا اور کہا کہ اگر تیرے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہوتا تو پھر میں دیکھتا تُو کس طرح انتقام لینے سے باز رہتا ہے! تو اجازت نہیں دیتا' تو نہ دے' میں تو انتقام لے کر رہوں گا —— یہ کہا اور انتقام جوئی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

یہ تھی وہ قوم جسے اس قسم کی اُمت کے قالب میں ڈھالنا مقصود تھا جس میں عرب کا سب سے بڑا سردار حبش کے ایک غلام (بلالؓ) کو سیّدنا بلالؓ (ہمارے سردار بلالؓ) کہہ کر پکارے' اور جس میں قوانینِ خداوندی کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کر دیا جائے کہ ان کی تعمیل میں' دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہو —— لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [4:65]۔ کسی تالاب میں محصور پانی کو تو آپ جس طرح جی چاہے استعمال میں لا سکتے ہیں' لیکن ایک کف

بردہان، بپھرے ہوئے سیلاب کو ساحلوں میں محبوس کرنا' تا کہ وہ باعثِ تباہیٔ باغ وراغ بننے کے بجائے وجہِ شادابی کشت وچمن بن جائے، کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔

رسولؐ اللہ کی دُعا

یہ تھے وہ عرب جنہیں عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ پھر جس طرح یہ قوم' اپنی ہمعصر اقوام میں منفرد خصوصیات کی حامل تھی' اسی طرح' خود اس قوم میں بھی بعض قبائل دیگر قبائل کے مقابلہ میں افضل واعلیٰ تھے۔ ان میں قریش کا قبیلہ سب سے بلند تھا' اور قریش میں بنو ہاشم کی شاخ' سب سے زیادہ سرفراز (اسی شاخِ بلند کے گُلِ سر سبد محمدؐ رسول اللہ تھے)۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر قبیلہ میں بھی بعض افراد' دوسرے افراد کے مقابلہ میں بلند وبرتر تھے۔ قریشِ مکہ میں' اُس زمانے میں دو افراد' باقیوں کے مقابلہ میں زیادہ سرکردہ نظر آتے تھے۔ اُنہی پر نبی اکرمؐ کی نگہِ انتخاب آ کر رُکی تھی اور اُنہی کے لئے آپؐ نے بدرگاہِ ربّ العزت ان الفاظ میں اپنی شدّتِ آرزو کا اظہار فرمایا تھا کہ:

> یا الٰہ العالمین! اسلام کو ابوجہلؔ یا عمؔر ابن الخطاب کے ذریعے تقویّت بخش۔ ان دونوں میں سے تجھے جو بھی محبوب ہو اُسے مشرف بہ اسلام فرما۔

ابوجہل' عمر ابن الخطاب کا ماموں تھا' اور ان دونوں (ماموں' بھانجا) کا اس معاشرہ میں کیا مقام تھا' اس کا اندازہ حضورؐ کی اس دعا سے لگ سکتا ہے۔ یہ شاخِ بنو ہاشم سے منسلک نہیں تھے بلکہ قریش کے ایک اور قبیلہ عدیؔ سے متعلق تھے۔ عربوں کے عام معمول کے مطابق' ان دونوں شاخوں میں بھی باہمی چشمک رہتی تھی۔ رسولؐ اللہ کی مندرجہ بالا دُعا ایک اور عمیق نفسیاتی حقیقت کی دلالت کرتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسولؐ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ افرادِ اُمت کی انسانی صلاحیتوں (یعنی انسانی ذات) کی نشوونما کرے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی انسانی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یہ صلاحیتیں بیدار تو ہوتی ہیں لیکن ان کا رُخ متعین نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ تعمیری نتائج مرتب کرنے کی بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اول الذّکر افراد کے سلسلہ میں رسولؐ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مناسب تعلیم و تربیت سے' پہلے ان کی انسانی صلاحیتوں کو بیدار کرے اور اس کے بعد ان کا رُخ صحیح سمت کی طرف متعین کرے۔ لیکن ثانی الذّکر افراد کے ضمن میں اُسے' ان کی بیدار شدہ (لیکن سرکش) صلاحیتوں کو مستقل اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ خود حضورؐ کے ارشاد فرمودہ استعارہ کے مطابق یوں کہئے کہ "ان کے ابلیس کو مسلمان کرنا" مقصود ہوتا ہے۔ حضورؐ نے جن دو افراد (ابوجہلؔ اور عمؔر) کے لئے دُعا مانگی تھی' ان کی صلاحیتیں' بیدار اور اس کے ساتھ ہی نہایت بیباک' سرکش اور عناں تاب تھیں۔ لیکن تھیں وہ ایسی توانائیوں کی حامل کہ اگر "ان کا ابلیس مسلمان ہو جاتا" تو وہ فلاح وفروغِ انسانیت کے لئے بڑی تقویّت کا موجب بنتیں۔ ان دونوں میں' ابوجہلؔ کا ابلیس' پندارِ نفس کے اس مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں سے واپس آنا وہ اپنے

لئے موت کا پیغام سمجھتا تھا۔ وہ دعوتِ محمدؐیہ کو کس نگاہ سے دیکھتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اُس سے اِس کی بابت سوال کیا گیا تو اُس نے کہا کہ

ہم میں اور عبدِ مناف (یعنی نبی اکرمؐ کے خاندان) میں شرف وعظمت کا جھگڑا تھا۔ انہوں نے کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا۔ انہوں نے ذمہ داریاں سنبھالیں تو ہم نے بھی سنبھالیں۔ انہوں نے بخششیں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ غرضیکہ ہم ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتے رہے۔ لیکن جب ہم نے شہ سواری میں ان پر سبقت حاصل کی تو انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ ہم میں نبی مبعوث ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔ اب ہم اس کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہرگز اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔

لیکن خاندانی عصبیت اور جذبۂ منافست نے، ابنِ خطابؔ کی فکری صلاحیت کو مفلوج نہیں کر دیا تھا۔ ان کے ذوقِ تحقیق وتفحص کا یہ عالم تھا کہ جب ہجرت کے بعد آپ مدینہ گئے تو وہاں یہودیوں کے ہاں تورات کا درس ہوتا تھا' آپ اس درس میں شریک ہوتے تھے لیکن تورات عبرانی زبان میں تھی اس کے لئے آپ نے عبرانی سیکھی اور اس میں اس حد تک مشق بہم پہنچائی کہ آپ براہِ راست تورات کا مطالعہ کرنے لگ گئے۔ یہی تھا وہ جذبۂ تحقیق وتجسّس جس کی بناء پر وہ اسلام کی دعوت کا غائر نگاہ سے مطالعہ کر رہے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ابوجہل' جہالت کی زندگی جیا اور جہالت ہی کی موت مر گیا لیکن عمر ابن الخطاب ——' فاروقِ اعظمؓ بن کر آسمانِ انسانیت پر مہرِ عالمتاب کی طرح ایسے چمکا کہ اس کی ضوفشانیاں اَبدالآباد تک وجۂ تابندگیٔ عالم بن گئیں۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

ذاتی اور خاندانی کوائف

اہلِ عرب عموماً عدنانؔ کی اولاد ہیں اور عدنانؔ کا سلسلہ حضرت اسمٰعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ عدنانؔ کے نیچے گیارہویں پشت میں فہر بنؔ مالک' ایک ذی اقتدار شخصیت گزری ہے۔ انہی کی اولاد ہے جو قریشؔ کے لقب سے مشہور ہے۔ قریش کی نسل میں دس اشخاص نے بڑا نام پیدا کیا اور انہی کی طرف نسبت سے قریشؔ کے دس جداگانہ قبیلے وجود میں آئے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ہاشمؔ تھا جس سے رسول اللہؐ متعلق تھے' اور ایک قبیلہ عدیؔ' جس کی اولاد سے (حضرت) عمرؓ تھے۔ حضرت عمرؓ کا سلسلۂ نسب' رسولؐ اللہ سے آٹھویں پشت میں جا کر مل جاتا ہے۔ ان کے والد کا نام خطابؔ تھا اسی لئے انہیں عمر ابن الخطاب کہا جاتا ہے۔ چونکہ سنینؔ کے معاملہ میں ہماری صدرِ اوّل کی تاریخ بڑی ناقص ہے اس لئے آپ کی سنِ پیدائش کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ عام

طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی پیدائش' نبی اکرمؐ کی بعثت سے تیس سال پہلے ہوئی تھی۔اور چونکہ (عام روایات کے مطابق) بعثت کے وقت حضورؐ چالیس سال کے تھے' اس لئے (اس اعتبار سے) آپ' نبی اکرمؐ سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے۔ہم نے یہ تصریح محض تاریخی نقطۂ نگاہ سے ضروری سمجھی ہے' ورنہ اسلام کے نقطۂ نظر سے تو آپ کی ''پیدائش'' بعثتِ نبویؐ کے چھٹے سال ہوئی' جب حضورؐ کے دمِ مسیحائی نے آپ کو حیاتِ تازہ سے سرفراز فرمایا (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔باپ بڑا سخت گیر تھا۔ایک دفعہ (زمانۂ خلافت میں) آپ مکہ سے باہر وادی ضجنانؔ سے گزر رہے تھے کہ اچانک کھڑے ہوگئے۔آبدیدہ ہوکر فرمایا:

> اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے' اس وادی میں اونٹ چرایا کرتا تھا' تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھوں مار کھاتا اور آج یہ دن ہے کہ اللہ کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں۔

سوچئے کہ اس قسم کا تفاوتِ مقام' عمرؓ کے سوا اور کون بیان کرسکتا تھا! زندگی کی راہوں میں اسی قسم کے باریک فرق کرنے کی جہت سے تو آپ فاروقؔ کہلائے۔

معاشرہ میں مقام

جبلِ عرفاتؔ کے قریب ایک مقام تھا عکاظؔ جہاں سال بہ سال اس مقصد کے لئے میلہ لگتا تھا کہ عرب کے تمام اہلِ ہنر وفن وہاں جمع ہوکر اپنے اپنے کمالات کے جوہر دکھائیں۔اس میلہؔ میں وہی صاحبِ ہنر شریک ہوتے تھے جو اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔اُس زمانے میں کُشتی لڑنا بہت بڑا فن سمجھا جاتا تھا۔عمر ابن الخطابؔ' عکاظ کے دنگل میں کُشتی لڑا کرتے تھے اور اس کا شُہرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔شہسواری میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔شعر کا مذاق نہایت شستہ تھا' اس لئے جب وہ کُشتی کے اکھاڑے سے نکل کر' محفلِ شعر وسخن کی طرف آتے' تو وہاں بھی باعثِ رونقِ مجلس بن جاتے۔ حسب ونسب پر فخر کرنا عربوں کی بنیادی خصوصیت تھا' اس لئے علم الانساب ان کے ہاں بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا تھا۔(حضرت) عمرؓ نے یہ فن اپنے باپ سے سیکھا اور اس میں ایسا مقام حاصل کیا کہ جب کوئی شخص قریش کے سامنے نسبی تفاخر کے لئے آتا تو اس کے مقابلہ کے لئے عمر ابن الخطابؔ کو منتخب کیا جاتا۔وہ قریش کے سفیر بھی تھے' اس لئے جب کسی سے ان کی (قریش کی) جنگ ہوتی' تو اس سلسلہ میں وہ آپ ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتے۔عربوں میں لکھنا پڑھنا بہت کم آدمی جانتے تھے۔چنانچہ بعثتِ نبویؐ کے وقت مکّہ میں صرف سترہ آدمی نوشت وخواند سے واقف تھے' اور ان میں ایک عمرؓ بھی تھے۔

تجارت کی غرض سے آپ' اکثر دُور دراز علاقوں (عراق' شام' یمن) جایا کرتے تھے۔لیکن انداز یہ تھا کہ ضرورت کے مطابق کاروبار کرکے' باقی وقت' وہاں کے اعیانِ سلطنت اور اربابِ حکمت ودانش سے ملتے اور اس طرح اپنے علم وفکر میں

اضافہ کرتے۔ زندگی خوشحالی کی بسر کرتے تھے بلکہ بعض روایات سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان کا شمار قریش کے متموّل ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔

اِسلامی تحریک کی مخالفت

اِسلام نے جو تحریک اٹھائی تھی' وہ اسے' عربوں کے قدیم تمدن و معاشرت' اور ان کے متوارث تصورات و نظریاتِ حیات کے لئے عظیم خطرہ سمجھتے تھے اس لئے اس کی مخالفت کرتے تھے' اور چونکہ انتہائی مخلص اور انتہاء پسند تھے اس لئے اس مخالفت میں بھی سب سے آگے تھے اور مسلمانوں پر سختیاں کرنے میں بڑی شدّت برتتے تھے۔

(حضرت) عمرؓ کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ بڑے سخت گیر' تند خُو' دُرشت مزاج تھے۔ ہنٹر (دُرۂ عمری) ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتا تھا اور وہ اس سے لوگوں کو پیٹتے تھے لیکن ان کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ اسلام کے بعد تربیّتِ نبویؐ نے ان میں کیا قلبِ ماہیّت پیدا کر دی تھی' اس کا ذکر تو بعد میں آئے گا' زمانہ جاہلیت میں بھی وہ (سخت مزاج تو تھے لیکن) سنگدل نہیں تھے۔ ان کی کیفیت وہ تھی' جس کا نقشہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

تنِے پیدا کُن از مُشتِ غبارے — تنِے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ اُو دِلِ درد آشنائے — چوں جوئے در کنارِ کوہسارے (اقبالؒ)

جیسا کہ کہا جا چکا ہے' وہ (دیگر زُعمائے مکّہ کی طرح) مسلمانوں پر بڑی سختیاں کرتے تھے۔ ان سختیوں سے تنگ آ کر' مسلمان (مردوں اور عورتوں) نے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی میں کی ایک خاتون' اُمّ عبداللہ بنت ختمہ کا بیان ہے کہ جب ہم ہجرت کے لئے سامانِ سفر باندھ رہے تھے تو عمر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے ــــ ''اُمّ عبداللہ! کیا تم واقعی جا رہی ہو''۔ میں نے کہا ''ہاں قسم بخدا! ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے۔ تم نے تو ہمیں تنگ کر مارا ہے' اللہ ہمیں کشائش عطا کر دے گا۔ ہم جا رہے ہیں''۔ اس پر عمر نے ایک عجیب حسرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا اور کہا ''اچھا! اللہ تمہارا ساتھ دے''۔ اُمّ عبداللہ کہتی ہیں کہ میں نے عمر کو ساری زندگی اس قدر رقیق القلب نہیں دیکھا تھا۔ جب عامر بن ربیعہ گھر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ عمر اسلام لے آئیں گے۔

اور اُمّ عبداللہ کا قیاس صحیح نکلا۔ عمر کی رقّتِ قلب اسے کشاں کشاں اس آستانہ پر لے گئی جہاں عرقِ انفعال کا ہر قطرہ موتیوں سے تولا جاتا ہے۔ وہ وہاں پہنچا' انتہائی دلگدازی اور جانسوزی کے عالم میں' ہاتھ پھیلائے اور صدا دی کہ

ساقیا! بر جگرم شعلۂ نمناک انداز

دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دُوسرا باب

خلیلِ عشق دَیرم را حَرم کرد

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' اُمرائے قریش' اس جدید تحریک (اسلام) کی شدت سے مخالفت کرتے تھے۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ یہ (جدید) تصورِ حیات اور نظامِ زندگی' ان کے قدیمی معتقدات اور نظامِ معاشرہ کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو ''نوحۂ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ'' کے عنوان سے' جاوید نامہ میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس جدید نظامِ حیات (دینِ محمدیؐ) کی روز افزوں ترقی سے گھبرا کر' ابوجہل کعبہ میں گیا۔ غلافِ کعبہ کو تھاما' اور اپنے معبودان ـــــ لات و منات و ہبل ـــــ کو نہایت عجز و الحاح سے پکار کر' ان کے حضور یوں نوحہ کناں ہوا کہ:۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دمِ اُو کعبہ را گُل شُد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں را زِ دست ما ربود
تا بساطِ دینِ آباء در نَورد — با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

اس کے بعد کہا کہ یہ دین جس قسم کا انقلاب لانا چاہتا ہے' وہ ہمارے لئے تباہ کُن ہے۔

مذہبِ اُو قاطعِ مُلک و نَسب — از قریش و مُنکر از فضلِ عرب
دَر نگاہِ اُو یکے بالا و پَست — با غلامِ خویش بَر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
اَحمراں با اَسوداں آمیختند — آبروئے دُودمانے ریختند

یہ وہ انقلاب ہے جسے یہ نیا دین ہماری معاشرتی زندگی میں لانا چاہتا ہے۔ اور جو تبدیلی یہ معاشی زندگی میں لانے کا مدعی ہے' وہ اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ وہ طبقاتی امتیاز مٹانا چاہتا ہے اور تمام انسانوں میں اس قسم کی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے امیر اور غریب کا فرق ہی مٹ جائے۔ یہ خالص مزدکیّت (پارسؔ کی کمیونزم) ہے جسے اس (محمدؐ) نے سلمانؔ

فارسی سے سیکھ لیا ہے۔

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزی بر عرب آوردہ است

اس نوحہ کے ساتھ اس نے اپنے معبودوں سے درخواست کی کہ:

اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود از بے کیشاں بگیر

اے منات، اے لات، ازیں منزل مرو — گزرِ منزل می روی، از دِل مرو

یہ تھی ان کی وجۂ مخاصمت۔ اس کے لئے وہ مسلمانوں پر بڑا تشدد برتتے، جاں سوز سختیاں کرتے، جگر گداز اذیتیں پہنچاتے لیکن ان بادہ مستانِ توحید پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ دیکھتے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ:

بڑھتا ہے اور ''ذوقِ گنہ'' یاں سزا کے بعد

ابنِ خطاب کی طرف سے مخالفت

ان سختیوں سے، ان میں سے کوئی بھی اپنی روش سے باز نہیں آتا، اور یہ تحریک آگے ہی آگے بڑھے چلی جارہی ہے۔ ان متشدد مخالفین میں ابن الخطاب پیش پیش تھا۔ وہ اپنے معاشرہ میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ طبعاً انتہاء پسند پھر جوانی کا زمانہ ـــــ اس پر طرہ یہ کہ، (بقول ان کے) یہ ''ارتداد'' خود ان کے اپنے گھر میں بھی گھس آیا ـــــ ان کی ایک کنیز (لبینہؓ) مسلمان ہوگئی اور بہن (فاطمہؓ) اور بہنوئی سعیدؓ بن زید، جو اُن کے چچازاد بھائی بھی ہوتے تھے اسلام لے آئے۔ اس سے ان کا جذبۂ مخاصمت وتشدد اور بھی بڑھ گیا۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جس مقام پر یہ جذبۂ مخاصمت اپنی انتہاء تک پہنچتا ہے اسی مقام سے خود ان کی اپنی زندگی ایک نیا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔

اِسلام لانے کا واقعہ

روایات میں ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ ان کی بہن اور بہنوئی کی نسبت سے سامنے لایا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قریش نے تنگ آ کر بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ اس ''فتنہ'' کو فرو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ خود محمدؐ کو (معاذ اللہ) قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذمہ عمرؓ نے لیا۔ وہ اسی ارادے سے گھر سے نکل کر جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک مسلمان نعیمؓ ابن عبداللہ ملے۔ انہوں نے پوچھا کہ عمر! اس دوپہر کی سخت گرمی میں کدھر جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ (معاذ اللہ) اس بے دین کی طرف جس نے قریش میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ انہیں بیوقوف بناتا ہے، ان کے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے۔ میں اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

اس پر نعیمؓ نے کہا ''عمر! تم ٹھیک راستے پر نہیں چل رہے۔ اگر تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا تو سوچو کہ کیا بنو عبدِ مناف تمہیں زندہ

چھوڑیں گے''۔ باتیں کرتے کرتے دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا تو ابنِ خطابؓ نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کو تو بھی بے دین ہو گیا ہے۔ اگر مجھے اس کا علم ہوتا تو میں تجھی سے ابتداء کرتا۔

نعیمؓ نے دیکھا کہ عمرؓ اس طرح باز آنے کا نہیں تو اُس سے کہا کہ ابتداء کرنی ہے تو مجھ سے کیوں کرتے ہو؟ خود اپنے گھر سے کیوں نہیں کرتے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا بہنوئی اور بہن دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمرؓ نے یہ سنا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً اپنی بہن کے گھر کی طرف ہو لئے۔ بعض روایات میں ہے کہ انہیں راستے میں نعیم ابن عبدؓاللہ نہیں بلکہ سعدؓ بن ابی وقاص ملے تھے۔ بہر حال، بہن کے گھر کے دروازہ پر پہنچ کر، عمرؓ نے دستک دی تو اندر بہن اور بہنوئی، قرآنِ کریم کی سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کر رہے تھے۔ دستک کی آواز پر پوچھا کہ کون؟ تو جواب ملا ابنؓ الخطاب۔ یہ سُن کر ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بہنوئی نے جلدی سے دروازہ کھولا تو بہن قرآن کے اوراق اپنے پہلو کے نیچے چُھپا کر بیٹھ گئیں۔ عمرؓ نے پوچھا کہ اندر سے گنگنانے کی کیا آواز آ رہی تھی۔ تم دونوں کیا پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جواب میں تامل برتا تو یہ کڑک کر بولے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم دونوں بے دین ہو گئے ہو! یہ کہا اور سعیدؓ پر جھپٹ پڑے۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ چونکہ عمرؓ اُن سے زیادہ طاقتور تھے، اس لئے بہنوئی کو زمین پر دے مارا، اور ان کے سینے پر سوار ہو گئے۔ بہن مدافعت کے لئے آگے بڑھیں تو بھائی نے اس کے چہرے پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لہولہان ہو گئی۔ وہ غصے سے بولیں کہ اے دشمنِ خدا! تو مجھے اس لئے مارتا ہے کہ میں کہتی ہوں اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو سن لو کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ہم اسلام لا چکے ہیں۔ فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ [20:72] جو تیرا جی چاہے کر لے۔

بہن کا خون آلود چہرہ — اور یہ جواب! عمرؓ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ غصہ فرو ہو گیا۔ رقتِ قلب عود کر آئی۔ بہنوئی کو زمین پر سے اٹھایا۔ بہن سے کہا کہ مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے کہا — ہرگز نہیں۔ بھائی نے کہا عزیزہ! تیری بات میرے دل میں اُتر چکی ہے۔ مجھے صحیفہ دو کہ میں اسے خود پڑھوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے ضائع نہیں کروں گا۔ تمہیں واپس دے دوں گا۔ بہن نے کہا کہ ''تم ناپاک ہو اور اس صحیفہ کو صرف پاک لوگ چُھو سکتے ہیں۔ پہلے غسل کرو تو پھر صحیفہ دوں گی'' — غور کیجئے کہ ایسی سادہ سی تدبیر میں نگاہ کا زاویہ اور دل کا ارادہ بدلنے کے لئے کتنے نفسیاتی مؤثرات پوشیدہ تھے!

عمرؓ نے صحیفہ ہاتھ میں لیا۔ اس میں سورۃ طٰہٰ اور دیگر سورتوں کی آیات درج تھیں۔ کھولا تو سامنے سورۂ حدیدؓ تھی — سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [57:1]۔ عمرؓ پڑھتے جاتے تھے اور ان کی دل کی حالت بدلتی جاتی تھی۔ تلاوت ختم کی تو عمرؓ کی دنیا بدل چکی تھی۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا مَیں

کہا کہ جو ذات ایسی باتیں کہے اس کے ساتھ واقعی کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے بتاؤ کہ محمدؐ کہاں ہیں! چونکہ اب عمرؓ کا انداز کچھ اور ہو چکا تھا اس لئے انہیں بتا دیا گیا کہ آپ مع صحابہؓ صفا کے دامن میں قیام پذیر ہیں۔ آپ نے تلوار حمائل کی اور سیدھے حضورؐ کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اندر سے دروازہ بند تھا۔ صحابہؓ نے ابنِ خطاب کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ حضرت حمزہؓ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر عمرؓ نیک ارادے سے آیا ہے تو بسم اللہ اور اگر ایسا نہیں، تو ہم سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ حضورؐ نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا کہ اسے اندر آنے دو۔ آپؐ، عمرؓ کو ساتھ لے کر الگ کمرے میں تشریف لے گئے اور پوچھا کہ عمر! کس ارادے سے آئے ہو۔ (حضرت) عمرؓ نے کہا کہ

یہ گواہی دینے کے لئے اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور آپؐ اس کے سچے رسول ہیں۔

یہ سن کر حضورؐ نے بآوازِ بلند کہا۔ اللہ اکبر! جس سے صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ عمرؓ ایمان لے آئے ہیں۔

یہ بات صحیح نظر نہیں آتی

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا یہ واقعہ باختلافِ جزئیات، کم و بیش تمام روایات میں مذکور ہے —— لیکن ہمارے نزدیک یہ روایات صحیح نہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بہنوئی اور بہن کے ساتھ بھی تشدد برتا ہو لیکن یہ بات کچھ جچتی نہیں کہ محض یہ ہنگامی واقعہ ان میں ایسی عظیم تبدیلی کا موجب بن گیا ہو کہ وہ گئے ہوں رسولؐ اللہ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے لئے، اور اس واقعہ کے بعد ارادہ اسلام لانے کا کر لیا ہو۔ ہم نے جو کہا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ روایات صحیح نظر نہیں آتیں تو اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔ (مثلاً)

(1) یہ بات عمر جیسی شخصیت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی کہ اس نے ایک ایسے اہم معاملہ کے متعلق، جس نے اس کی سابقہ زندگی کے تمام قلبی، ذہنی اور معاشرتی رشتوں کو منقطع کر کے، اسے ایک اور ہی راستے پر ڈال دینا ہو، کبھی غور و فکر نہ کیا ہو، اور محض ایک ہنگامی واقعہ سے متاثر ہو کر، جذباتی طور پر ایسا انقلابی فیصلہ کر لیا ہو۔ عمرؓ جیسی شخصیت ایسے معاملہ کا فیصلہ اس طرح نہیں کر سکتی تھی۔

(2) (حضرت) عمرؓ لکھے پڑھے تھے —— مکہ کے سترہ لکھے پڑھے لوگوں میں سے ایک۔ وہ تجارت کے لئے دیگر ممالک میں جاتے تو کاروبار سے فرصت کا وقت نکال کر، وہاں کے زعماءِ سیاست اور مشاہیرِ فکر و تدبر سے ملاقاتیں کرتے اور اس طرح اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ) ان کے ذوقِ تجسّس کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تورات کو براہِ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کر لیا۔ ہم آئندہ چل کر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح ایک ایک معاملہ پر مہینوں غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ اور فیصلہ پر پہنچتے، فکر و تدبر ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

(3) یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی طبیعت اور مزاج و روش کا انسان، ایک ایسی دعوت کے مالہٗ و ماعلیہ پر غور و فکر نہ کرتا

ہوگا جو اس کی ذات ہی نہیں بلکہ اس کے ملک اور قوم اس کے مذہب اور معاشرہ میں بنیادی انقلاب برپا کرنے کے لئے ظہور میں آئی تھی اور جو ان کی مخالفت کے علی الرغم دن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اس قسم کی دعوت اور تحریک سے فکری طور پر کبھی غیر متعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ دعوت چھ برس سے جاری تھی اور اس وقت تک اس میں چالیس پینتالیس افراد شریک ہو چکے تھے جن میں مکہ کی بڑی بڑی نامور ہستیاں شامل تھیں۔ ہو نہیں سکتا کہ ابنِ خطابؓ نے کبھی ان معاملات کو اپنی گہری توجہ کا مستحق نہ قرار دیا ہو اور اس دعوت کے داعی کی تعلیم نے اس دعوت کے قبول کرنے والوں کی زندگی میں جو محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوں۔

(4) نہ ہی یہ ممکن ہے کہ مکّہ میں رہتے ہوئے (حضرت) عمرؓ نے کبھی قرآنی آیات نہ سنی ہوں۔ رسول اللہؐ کی یہ دعوت کوئی باطنی تحریک یا گپت ودیا نہیں تھی۔ آپؐ نے تو اس دعوت کا آغاز بھی پہاڑ کی چوٹی سے تمام اہلِ مکہ کو بآوازِ بلند پکار کر کیا تھا اور اس کے بعد پھر اس پیغام کو دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جاتے تھے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ آواز اور تو سب تک پہنچی ہو لیکن اگر نہ پہنچی ہو تو ابنِ خطابؓ کے کانوں تک نہ پہنچی ہو!

(5) ان شواہد سے ظاہر ہے کہ (حضرت) عمرؓ اس دعوت سے اچھی طرح باخبر تھے۔ قرآن کی آواز ان تک پہنچ چکی تھی اور وہ کامل چھ برس سے اس پر غور و فکر کرتے چلے آ رہے تھے۔ ایک مفکر کی صورت میں یہ تو ممکن ہے کہ وہ ایک معاملہ پر عرصہ سے غور و فکر کرنے کے باوجود ہنوز کسی حتمی نتیجہ پر نہ پہنچا ہو اور پھر یکایک کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے جس سے اس کی نگاہوں میں ایسی چمک پیدا ہو جائے کہ اس معاملہ کی حقیقت ابھر کر اس کے سامنے آ جائے اور وہ اس کے متعلق یقینی فیصلہ تک پہنچ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ کسی ہنگامی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ دراصل مجموعی تأثر (ACCUMULATIVE EFFECT) ہوتا ہے اس کے برسوں کے غور و فکر کا۔ اور کوئی ہنگامی واقعہ بس ایک فتیلہ کا کام دیتا ہے جس سے اس کی فکر کا آتش گیر مادہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ ایک مفکر جو فیصلے بحران (CRISIS) میں کرتا ہے وہ (بظاہر) ہنگامی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتے ہیں اس کی مدت العمر کی سوچ کا نتیجہ۔ وہ بحران اس فیصلہ کا فوری سبب —— (IMMEDIATE CAUSE) بن جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس کی فکر کا نقطۂ آخریں (CLIMAX)۔

(حضرت) عمرؓ کے ایمان لانے کا انقلابی فیصلہ بھی اسی قبیل کا تھا۔ اب رہا یہ کہ اس کا فوری سبب کیا تھا اس سوال کے جواب کے لئے ہم مندرجہ بالا روایات کے بجائے اس روایت کو کیوں نہ صحیح مانیں جسے (حضرت) عمرؓ نے خود بیان کیا ہے اور جو ان شواہد سے مطابقت بھی رکھتی ہے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سنئے کہ اپنے اسلام لانے کے واقعہ کے متعلق خود (حضرت) عمرؓ کیا کہتے ہیں۔

خود حضرت عمرؓ کا بیان

ان کا بیان ہے کہ: جاہلیّت میں، میں شراب کا رسیا تھا۔ ہر شب، ہم، یارانِ قدح خوار کی ایک رنگین محفل جما کرتی تھی۔ ایک رات میں گیا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ میں کئی ایک اور مقامات میں پہنچا لیکن اتفاق کہ شراب مجھے وہاں بھی نہ ملی۔ اب میں نے سوچا کہ یوں گھر لوٹنے کے بجائے، کعبہ کا طواف ہی کرتا جاؤں۔ حریمِ کعبہ میں سناٹا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص تنہا محوِ عبادت ہے اور اونچی آواز سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ محمد رسولؐ اللہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ موقعہ اچھا ہے۔ دیکھوں کہ یہ شخص تنہائی میں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔ دبے پاؤں آگے بڑھا محتاط تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں اس لئے میں غلافِ کعبہ میں چھپ گیا اور سرکتا سرکتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھ میں اور ان میں غلافِ کعبہ کے سوا کچھ اور حائل نہ تھا۔ آپ نہایت جذب وکیف کے عالم میں کھڑے، قرآنِ مجید کی یہ آیات پڑھ رہے تھے کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ان الفاظ میں کچھ ایسا بلا کا اثر تھا کہ میں نے کہا کہ قریش جو کہتے ہیں کہ یہ شخص نہایت بلند پایہ شاعر ہے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہ اتنے میں آپؐ نے اگلی آیت پڑھی کہ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ میں نے کہا کہ یہ تو اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کرتا ہے۔ تو پھر، جیسا کہ قریش کہتے ہیں، یہ کاہن ہوگا، کہ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے کہ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ۔ قرآن کے اسلوب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا، تو پھر یہ ہے کیا؟ میرے دل کی اس بات کا جواب مجھے ان الفاظ میں ملا۔ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ [69:43]۔ آپ یہ پڑھتے جا رہے تھے اور مجھ پر ایک عجیب وغریب کیفیّت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

بھیگی ہوئی رات، تاروں کی چھاؤں، حریمِ کعبہ اور اس میں کامل سکوت۔ اس سکون افزا ماحول میں، خود صاحبِ قرآن کی زبانِ اقدس سے قرآن کی آیات کی نشیدِ رُوح پرور! کشش ومحویّت کے ان تمام عناصر کے حسین امتزاج نے وہ کیفیت پیدا کی جو ابنِ خطابؓ کے فکری ارتقاء کے نقطۂ عروج اور نفسیاتی تغیر کے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچنے کا موجب بن گئی۔ یہ وہ مقام تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے، آغوشِ سحاب آخر

اس مقام پر عمرؓ کی شدتِ شوق وہ فتیلہ بن گئی جس نے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اور ان کے نیچے، لاشعور میں پہلو بدلنے والے قیاسات کو یقینِ محکم کی شکل میں، شعور کی سطح پر لے آنے کا موجب بن گیا۔

(عمرؓ کا بیان ہے)

رسول اللہؐ قرآن پڑھتے جا رہے تھے اور میں بے اختیار روتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے نماز ختم کر لی اور گھر جانے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ میں بھی دبے پاؤں آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب ہو گیا۔ آپؐ نے آہٹ پا کر مڑ کر دیکھا، تو مجھے پہچان لیا اور ڈانٹ کر کہا:

ابنِ خطاب! تم ایسے وقت میں یہاں کیسے؟

آپؐ کے سامنے اُس وقت ابنِ خطاب نہیں تھا۔ تین دن پہلے آپؐ نے جو دعا مانگی تھی، اس کی قبولیت، محسوس پیکر میں، سامنے تھی۔ ابن خطابؓ نے کہا کہ:

یہ گواہی دینے کے لئے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

اس پر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر، میرے لئے ثبات و استقامت کی دُعا مانگی[1]۔

عمرؓ اسلام لے آیا اور اس کی اس حیاتِ نو پر:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد — حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دِگرے پیدا شُد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ دَرے پیداشُد

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا وہ واقعہ جسے انہوں نے خود بیان فرمایا — وہ واقعہ جس سے مقناطیس اور فولاد کا غیر مرئی اور غیر محسوس رشتہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ مقناطیس کی طرف کھنچ کر جانے کے لئے فولاد بننا ضروری ہے۔ یا، یوں کہئے کہ مقناطیس، فولاد کو اپنے آغوش میں لیتا ہے، مٹی کے ڈھیلے کو نہیں۔ وہ پکار کر کہتا ہے کہ

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری — میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

یہی معنی ہیں اس حقیقتِ کبریٰ کے، جسے لسانِ محمدیؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

خِيَارُهُمْ فِيْ الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ

1۔ ابنِ اسحٰق و مسندِ امام احمد بن حنبل — بحوالہ ہیکل۔

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ واقعہ بعثتِ نبویؐ کے بعد چھٹے سال کا ہے۔ اُس وقت تک چالیس پینتالیس کے قریب افراد اسلام لا چکے تھے۔ لیکن ان میں بیشتر کمزور اور ناتواں تھے اس لئے امرائے قریش ان پر بڑی سختیاں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی معاشرہ میں بڑی ممتاز حیثیت تھی۔ اس لئے عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پر کوئی ہاتھ اٹھاتا۔ لیکن یہ نَو عمر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ

میری خواہش یہ تھی کہ جو تکلیف عام مسلمانوں کو پہنچتی ہے، وہ مجھے بھی پہنچنی چاہئے تا کہ میں محسوس کرسکوں کہ غریبوں اور کمزوروں پر بیتتی کیا ہے۔

[اور عمرؓ کی یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے وہ تاریخِ انسانیت کے اس بلند مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر ملے گی۔ سرِ دست، عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد، ان کی مندرجہ بالا خواہش کی طرف آیئے]۔

اس مقصد کے لئے آپ نے ارادہ کیا کہ "قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے پاس جا کر انہیں اپنے اسلام لانے کے واقعہ سے مطلع کروں اور پھر دیکھوں کہ وہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں؟ اس مقصد کے لئے آپ سب سے پہلے، اپنے ماموں، ابوجہل کے پاس گئے جو زعمائے قریش میں بلند پوزیشن کا حامل تھا۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ باہر نکلا تو آپ نے کہا کہ میں تمہیں یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ میں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہے۔ یہ سن کر اُس نے حیرت سے پوچھا۔ کیا واقعی؟ آپ نے کہا، جی ہاں! واقعی۔ اس نے کہا کہ باز آجاؤ۔ آپ نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ یہ سن کر وہ گھر کے اندر گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے اپنے جی میں کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد، پھر ایک اور قریشی سردار کے پاس گئے تو اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ عمرؓ مایوس سے ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ ایمان لائے ہیں تو اُن کے بیٹے، حضرت عبداللہ (بن عمرؓ) سنِ تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ ان کی زبانی روایت ہے کہ جب میرے والد سردارانِ قریش کی طرف سے اس طرح مایوس ہو گئے تو آپ نے کسی سے پوچھا کہ مکہ میں سب سے بڑا ڈھنڈورچی کون ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ اس قسم کا آدمی جمیل بن معمر الجمحیؔ ہے جو بات اس تک پہنچ جائے، سمجھ لو کہ سارے مکہ میں پھیل گئی۔ یہ سن کر میرے والد جمیلؔ کے پاس گئے اور اس سے اپنے اسلام لانے کا ذکر کیا۔ اس نے سُنا تو ایک لفظ کہے بغیر سیدھا کعبہؔ کی طرف چل دیا۔ حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ حریمِ کعبہ میں اس وقت بہت سے سردارانِ قریش بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جمیلؔ نے بالفاظ بلند عمرؓ کے اسلام لانے کا اعلان کر دیا۔ اس پر لوگ مجنونانہ حضرت عمرؓ پر

ٹوٹ پڑے اور مار پٹائی شروع ہوگئی۔ جب حضرت عمرؓ کے ماموں نے یہ دیکھا تو اس نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں نے اپنے بھانجے کو پناہ دے دی ہے۔ اب جو ہمت کر سکتا ہے آگے بڑھے۔ اس پر سب پیچھے ہٹ گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ پناہ حضرت عمرؓ کو (حضرت) عمرو ابن العاص کے والد، عاص بن وائل سہمی نے دی تھی ـــــ لیکن یہ پناہ کسی نے بھی دی ہو، عمرؓ اس قسم کی پناہ گاہوں کے پیچھے رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ

اس پناہ دہی کے بعد میں دیکھتا کہ عام مسلمانوں کو پیٹا جا رہا ہے اور میں ہر طرح سے محفوظ و مصئون ہوں، تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ ابنِ خطاب! تمہیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ مسلمان بیچارے اذیتیں اٹھائیں اور تم اطمینان سے بیٹھے رہو۔ چنانچہ میں اُٹھا، سیدھا کعبہ پہنچا جہاں میرا ماموں اور دیگر سردارانِ قریش بیٹھے تھے۔ وہاں جا کر میں نے اپنے ماموں سے اعلانیہ کہا کہ آپ کی پناہ آپ کو مبارک ہو! میں اسے واپس کرتا ہوں ـــــ وہ بہت کہتے رہے کہ ایسا نہ کرو تکلیف اٹھاؤ گے لیکن میں تو تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے کہا کہ میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ اٹل ہے۔

اس کے بعد لوگ مجھے مارتے اور میں لوگوں کو مارتا حتیٰ کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرما دیا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ [8:64]

"اے نبی! اللہ اور مومنین جو تیرے متبع ہیں، تیرے لئے کافی ہیں"۔

نبی اکرمؐ اس وقت تک اپنی اس دعوت کے ساتھ کھلے بندوں قریش کے مقابلہ میں نہیں آئے تھے۔ عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد حالات بدل گئے تو صحابہؓ کے مشورہ سے، جن میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے، یہ طے پایا کہ اب اس پرچم کو لے کر باہر نکلنا چاہئے۔ چنانچہ حضورؐ، صحابہؓ کی دو صفوں کے جلو میں باہر تشریف لائے ـــــ ایک صف میں حضرت حمزہؓ تھے اور دوسری میں حضرت عمرؓ۔ اس طرح مسلمان کعبہ میں داخل ہو گئے اور قریش دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یعنی اس طرح مسلمانوں کو وہ حقوق حاصل ہو گئے جو ویسے تو ہر عرب کو حاصل تھے لیکن جن سے قریش نے انہیں اس جرم کی پاداش میں محروم کر رکھا تھا کہ وہ اللہ کو الٰہِ واحد کیوں مانتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ

عمرؓ کا اسلام ہماری کامیابی تھی۔ ان کی ہجرت ہماری نصرت اور ان کی خلافت ہمارے لئے باعثِ رحمت۔ جب تک عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے، ہم کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب وہ اسلام لائے تو قریش سے لڑ بھڑ کر ان سے ہمارے اس حق کو تسلیم کرا لیا کہ ہم بھی کعبہ میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

حضرت صہیبؓ کا بیان ہے کہ

جب عمرؓ مسلمان ہوئے تو اسلام کھل کر سامنے آ گیا اور اس کی دعوت اعلانیہ دی جانے لگی۔ ہم کعبہ کے گرد حلقے بنا کر بیٹھتے اور

بیت اللہ کا طواف کرتے۔ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیتے اور بدزبانی کرنے والے کو دندان شکن جواب دیتے۔
اور اسی پر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو فاروق کے ممتاز لقب سے سرفراز فرمایا ـــــ یعنی وہ جس کی وجہ سے کفر اور اسلام' حق اور باطل' کا فرق نکھر کر سامنے آ گیا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ:

اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور ان کے دل کو حق سے سرفراز فرمایا۔ اور وہ فاروق ہیں جن کے ذریعے حق اور باطل میں تفریق کی گئی۔

ہجرت

مسلمانوں نے' مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت' چپکے چپکے کی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے ہجرت بھی اسی طرح دھڑلے سے کی جس طرح اپنے اسلام لانے کے واقعہ کو اس قدر جرأت اور بیباکی کے ساتھ عام کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ

میں نہیں جانتا کہ عمرؓ بن خطاب کے سوا کسی نے اعلانیہ مکّہ سے ہجرت کی ہو۔ چنانچہ جب وہ ہجرت کے ارادے سے نکلے تو تلوار گلے میں لٹکائی۔ کمان کندھے پر رکھی' تیر مٹھی میں لئے' نیزہ کمر سے باندھا اور کعبہ کی طرف چل پڑے۔ کعبہ اُس وقت قریش سے بھرا پڑا تھا۔ پہلے انہوں نے نہایت اطمینان سے کعبہ کے سات طواف کئے پھر نماز پڑھی۔ اس کے بعد قریش کے ایک ایک گروہ کے پاس یہ کہتے ہوئے گئے کہ تمہیں رُوسیاہی نصیب ہو۔ اللہ تمہارے جیسوں کو مغلوب اور ذلیل کرتا ہے۔ جو کوئی اپنی ماں کو ماتم گُسار' اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ بنانا چاہتا ہے وہ میرے پیچھے آئے اور مجھ سے دو دو ہاتھ کر لے۔

اگرچہ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے بھی' دیگر مسلمانوں کی طرح' خاموشی سے ہجرت کی تھی اور آپ کے ساتھ بیس سوار اور بھی تھے۔

حضور نبی اکرمؐ کی رفاقت میں حضرت عمرؓ نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے' ان کی تفصیل کا حقیقی مقام' نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیّبہ ہے کیونکہ یہ کارنامے' بلاواسطہ خود حضورؐ سے متعلق تھے۔ صحابہ کرامؓ کی حیثیت حضورؐ کے رفقاء کی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کا تعارف اسی حیثیت سے کرایا ہے جب کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ [48:29] محمدؐ رسول اللہ اور حضورؐ کے رفقاء' جن کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــ یعنی عہدِ رسالتمآبؐ میں بنیادی اور عمودی حیثیت نبی اکرمؐ کی تھی ـــــ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ اور صحابہؓ کی حیثیت' حضورؐ کے رفقاء کی تھی۔ اس لئے اُس دورِ ہمایوں میں جو معرکے سرزد ہوئے اور اسلام کو جس طرح فروغ حاصل ہوا' اس سلسلہ میں اوّلاً اور اساساً ذکر حضورؐ ہی کا آنا چاہئے اور صحابہ کرامؓ کا تذکرہ تبعاً اور ثانیاً ـــــ لہٰذا' اُس دور میں حضرت عمرؓ نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے' ان کے تذکرہ کا یہ مقام

نہیں۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ حضورؐ کے زمانے میں جو لڑائیاں لڑی گئیں، غیر قوموں سے جو معاہدات ہوئے، مملکت کے سلسلہ میں جو انتظامات کیے گئے، اسلام کی اشاعت کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئیں، ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمرؓ کی شرکت کے بغیر طے پایا ہو۔ اسی بناء پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ وُزَرَائِیْ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ[1] اہلِ زمین میں سے ابوبکرؓ و عمرؓ میرے وزیر ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے (ازالۃ الخفاء میں) لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اے عمرؓ جب تمہیں شیطان کسی راستے پر چلتا دیکھ لیتا ہے تو اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے"۔

اور آخر میں ہم، فاروقِ اعظمؓ کے حق میں، حضور نبی اکرمؐ کی وہ سند و شہادت پیش کرتے ہیں جس سے بڑی انسانی سند و شہادت اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں ہو سکتی اور وہ سند یہ ہے کہ

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے عمرہ کی اجازت چاہی اور آپؐ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

یا اُخَیَّ! مجھے اپنی دُعا میں یاد رکھنا۔

حضرت عمرؓ جب کبھی اس کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ

مجھے رسولؐ اللہ کا ارشاد —— یا اُخَیَّ! ان تمام اشیاء سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ (بحوالہ ہیکل)

اور اس سے زیادہ متاعِ گراں بہا، اس کائنات میں اور ہو بھی کون سی سکتی ہے؟

ہم اَوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

جذبۂ اطاعت

لیکن اس اوجِ مرتبت، اور حضورؐ کی نگاہوں میں اس قدر موانست و یگانگت کے باوجود حضرت عمرؓ کا جذبۂ اطاعتِ رسولؐ، اپنی انتہاء تک پہنچا ہوا تھا —— اور یہی ایک سچے مومن کا شعار اور معیارِ ایمان ہے (4:65)۔ اس باب میں وہ اس قدر محتاط رہتے تھے کہ ایک دفعہ حضورؐ نے انہیں ایک قبیلہ (تُربہ) کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا۔ راستے میں ایک اور دشمن نظر آیا جس پر آپ بڑی آسانی سے کامیابی حاصل کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ جب اہلِ لشکر نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھے صرف تُربہ کے خلاف جنگ کا حکم دیا تھا۔ میں کسی اور دُشمن کے خلاف ہاتھ کس طرح اٹھا سکتا ہوں؟

فرقِ مراتبت کا لحاظ

اور فرقِ مراتبت کا آپؓ اس قدر لحاظ رکھتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن زمعہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب مرض الموت میں

1. اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابنِ اثیر)

رسولؐ اللہ کے درد میں شدت ہوئی' تو میں وہاں موجود تھا۔ (حضرت) بلالؓ نے حضورؐ کو صلوٰۃ کے لئے آواز دی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت کسی اور سے کہہ دو کہ امامت کرا دے۔ میں باہر نکلا تو حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ امامت کرا دیجئے۔ چنانچہ وہ کھڑے ہو گئے اور تکبیر کہی۔ رسولؐ اللہ نے آواز سنی تو فرمایا کہ کیا ابوبکرؓ موجود نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن زمعہؓ بیان کرتے ہیں کہ اس پر حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا کہ:

> ابن زمعہؓ! تجھ پر افسوس ہے کہ تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ خدا کی قسم' جب تو نے مجھے امامت کے لئے کہا تو میں نے یہی سمجھا کہ یہ رسولؐ اللہ کا فرمان ہے۔ اگر میرا یہ گمان نہ ہوتا تو میں کبھی امامت نہ کراتا۔ میں نے کہا کہ رسولؐ اللہ نے ایسا حکم تو نہیں دیا تھا۔ لیکن جب میں نے حضرت ابوبکرؓ کو موجود نہ پایا اور آپ کو دیکھا تو آپ سے ایسا کہہ دیا کیونکہ میرے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کی عدم موجودگی میں اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ مستحق اور کوئی نہیں تھا۔

یہ تھا اطاعتِ رسولؐ کا جذبہ اور فرقِ مراتبت کا لحاظ حضرت عمرؓ کے دل میں! یہ درحقیقت اس تربیتِ نبویؐ کا نتیجہ تھا جس نے ابن الخطاب کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا تھا۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے کہ تربیتِ ذات کے معنی یہ ہیں کہ اُس فرد کے اندر جو کچھ سخت ہے وہ اُسے نرما دے' اور جو کچھ نرم ہے اسے سخت کر دے۔ تربیتِ نبویؐ کا یہی کمال تھا۔ اِسی کو قرآنِ کریم نے وَيُزَكِّيهِمْ [62:2] کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور عمرؓ ابن الخطاب اس کی چلتی پھرتی مثالی تصویر تھے۔

بعض غلط روایات

آگے بڑھنے سے پہلے' ہم بعض ایسی روایات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں حضرت عمرؓ کے علوِ مرتبت کے ثبوت میں بہت بڑی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات حضرت عمرؓ کے خیال مشورے یا رائے کے مطابق نازل ہوئیں۔ ہماری کتبِ روایات و تفسیر میں ان آیات کی تفصیل دی گئی ہے۔ انہیں ہم تفسیر ابنِ کثیر سے نمونۃً پیش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تفسیر ہمارے ہاں بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے۔

(1) خُمر (شراب) کے امتناعی احکام کے سلسلہ میں' اس تفسیر میں لکھا ہے:

> حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے تحریمِ شراب کے نازل ہونے پر فرمایا۔ خدایا! ہمارے سامنے اور کھول کر بیان فرما۔ پس سورۂ بقرہ کی آیت فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّ [2:219] نازل ہوئی۔ حضرت فاروقؓ کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے اس کی تلاوت کی گئی۔ پھر بھی آپؓ نے فرمایا' اے اللہ! تو ہمیں اور واضح الفاظ میں بتا۔ پس سورۂ نسآء کی آیت وَأَنتُمْ سُكَٰرَىٰ [4:43] نازل ہوگئی...... حضرت عمرؓ کو بلوایا گیا اور یہ آیت بھی انہیں سنوائی گئی لیکن پھر بھی آپؓ نے یہی فرمایا کہ اے اللہ! اس

بارے میں صفائی سے بیان فرما۔ پس سورۂ مائدہ کی آیت اتری فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ [5:91]۔ سنا تو فرمانے لگے اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا ہم رُک گئے، ہم رُک گئے۔ (ابنِ کثیر۔ سورۂ مائدہ)

(2) جنگِ بدر مسلمانوں اور مخالفینِ اسلام (قریش) کے درمیان پہلی لڑائی تھی۔ اس وقت تک جنگ کے قیدیوں کے متعلق احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں تفسیر ابنِ کثیر میں کہا گیا ہے:

مسندِ امام احمد میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ آپؐ نے ان سے اپنا منہ پھیر لیا۔ آپؐ نے دوبارہ پوچھا تو حضرت عمرؓ نے اپنا وہی جواب دہرایا۔ آپؐ نے پھر اپنا منہ پھیر لیا۔ اب کی دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ ہماری رائے میں آپؐ ان کی خطا سے درگذر فرمائیے اور انہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیجئے۔ اب آپؐ کے چہرے سے غم کے آثار جاتے رہے اور عفوِ عام کر دیا اور فدیہ لے کر سب کو آزاد کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی آیت (8:67) نازل کی۔
(تفسیر سورۂ انفال)

سورۂ انفال کی آیت میں کہا گیا ہے کہ

نبی کے لئے یہ شایانِ شان ہی نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں تا آنکہ وہ جنگ میں پوری پوری کامیابی نہ حاصل کر لے۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تمہارے لئے آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم نے جو کچھ لیا ہے اس پر تمہیں سخت عذاب دیا جاتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو سخت صدمہ ہوا اور وہ عتابِ خداوندی کی اس وعید پر رونے لگ گئے (اس مقام پر ہم، اس آیت کے صحیح مفہوم کو سامنے نہیں لا رہے۔ موضوعِ زیرِ نظر کے اعتبار سے، اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ ان روایات کی رُو سے یہ آیت بھی حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق نازل ہوئی تھی)۔

(3) عبداللہ بن اُبی بن سلول، مدینہ کا رئیس المنافقین تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے کی درخواست پر حضورؐ اس کے جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس پر

حضرت عمرؓ نے آپؐ کا دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ آپؐ اس منافق کے جنازے کی نماز پڑھائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس سے منع فرمایا ہے...... لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس پر سورۂ توبہ کی یہ آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ [9:84] نازل ہوئی۔ (تفسیرِ مذکور۔ سورۂ توبہ)

(4) آیاتِ حجاب کے سلسلہ میں لکھا ہے:

بخاری شریف میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ تین باتیں میں نے کہیں جن کے مطابق رب العالمین سے احکام

نازل ہوئے۔(1) میں نے کہا' اگر آپؐ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو مصلّٰی بنائیں تو بہتر ہو۔ اس پر خدائے تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّى۔ (2) پھر میں نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ کے گھر میں ہر کہ ومہ آئے جائے۔ آپؐ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دیں تو اچھا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردے کا حکم نازل ہوا (33:53-59)۔ (3) جب حضورؐ کی ازواجِ مطہرات غیرت کی وجہ سے کچھ کہنے سننے لگیں تو میں نے کہا' کسی غرور میں نہ رہنا اگر حضورؐ تمہیں چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ تم سے بہتر بیویاں آپؐ کو دلوائے گا۔ چنانچہ اس پر یہ آیت (33:51) نازل ہوئی۔ (تفسیرِ مذکور۔ سورۂ احزاب)

اس قسم کی روایات پیش کرنے کے بعد بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی بصیرت وفراست کو دیکھئے کہ خود اللہ تعالیٰ آپ کے خیال اور رائے کے مطابق احکام نازل کیا کرتا تھا! ایسا کہنے والے (بزعمِ خویش) حضرت عمرؓ کی عظمتِ شان تو ثابت کردیتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے متعلق کسی قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے!!

شانِ نزول کا عقیدہ

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے تو یہ چیز صرف انہی آیات تک محدود نہیں جن کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کا اطلاق ان تمام روایات پر ہوتا ہے جنہیں ''شانِ نزول'' کی روایات کہا جاتا ہے۔ ''شانِ نزول'' کے سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے سامنے فلاں تنازعہ پیش ہوا۔ اس کے متعلق اختلافِ رائے ہوا۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ اس پر اللہ کی طرف سے فلاں آیت نازل ہوئی۔ اس تنازعہ، قصہ یا واقعہ کو متعلقہ آیت کی ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے' جیسا کہ حضرت عمرؓ سے متعلق آیات کے ضمن میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ ''شانِ نزول'' کا عقیدہ ہے جس سے اللہ اور اس کی کتاب کے متعلق وہ تصور پیدا ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے سلسلۂ رشد وہدایت جاری فرمایا۔ اللہ' علیم ہے' حکیم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی زندگی کے تقاضوں کے حل کے لئے کس قسم کے اصول وضوابط کی ضرورت ہے۔ وہ ان اصول وضوابط کو مختلف زمانوں میں' مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے نازل کرتا رہا تاآنکہ اس کی مشیّت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب ایک ایسے ضابطۂ اصول وقوانین کا دیا جانا مناسب سمجھا گیا جو انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو ہمیشہ کے لئے پورا کرسکے۔ خدا کے اس آخری' عالمگیر' مکمل' غیر متبدل' محفوظ ضابطۂ حیات کا نام قرآنِ کریم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ قرآنِ کریم میں دیا گیا ہے وہ خدا کے اَزلی اور اَبدی علم پر مبنی ہے۔ یہ تمام اصول وضوابط' شروع ہی سے اس کے علم میں تھے اور اس کی مشیّت کے پروگرام کے مطابق انہیں انسانوں تک پہنچایا جانا تھا۔ یہ ایک طے شدہ امر تھا۔ اسی طرح طے شدہ' جس طرح قوانینِ فطرت

شروع سے ہی علمِ خداوندی میں موجود تھے البتہ ان کا ظہور تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہوا۔

یہ ہے اللہ اوراس کی کتاب کے متعلق' صحیح (قرآنی) تصور۔اس کے برعکس اگر''شانِ نزول'' کے نظریہ کو صحیح مانا جائے تو اس کی رُو سے صورت یہ سامنے آئے گی کہ

(1) فلاں واقعہ سرزد ہوا جس کے متعلق فیصلہ نہ ہو پایا کہ کیا کرنا چاہیئے یا جو فیصلہ ہوا اُسے خدا نے پسند نہ کیا۔اس پر اس نے فلاں حکم یا قانون نازل کر دیا۔ بالفاظِ دیگر' اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو وہ حکم یا قانون نازل ہی نہ ہوتا۔ یہ محض ایک اتفاقی امر تھا کہ وہ واقعہ ظہور میں آ گیا تو یہ حکم نازل ہو گیا۔

(2) رسولؐ اللہ نے تریسٹھ سال کی عمر پائی۔ اگر حضورؐ کچھ اور عرصہ تک زندہ رہتے تو ہوسکتا تھا کہ اس قسم کے اور واقعات بھی رونما ہو جاتے جن کی وجہ سے قرآن میں کچھ اور احکام دے دیئے جاتے۔

(3) اب بھی یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات ظہور میں آتے رہیں جو اگر رسولؐ اللہ کی زندگی میں رونما ہوتے تو ان کے متعلق بھی اللہ کی طرف سے احکام وضوابط مل جاتے۔حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور نبوت (یعنی اللہ کی طرف سے نزولِ وحی) حضورؐ کے ساتھ ختم ہوگئی۔اس لئے اب اس قسم کے واقعات کے متعلق اللہ کی طرف سے راہنمائی مل ہی نہیں سکتی۔

یہ' اور اسی قسم کے دیگر سوالات (اور اعتراضات) ہیں جو''شانِ نزول'' کے نظریہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جاسکتا۔ظاہر ہے کہ یہ نظریہ' قرآنِ کریم کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے' مخالفین کی طرف سے وضع کیا گیا اور اسے اس قسم کی وضعی روایات کے ذریعے عام کیا گیا ورنہ قرآنِ کریم (جو سرتاسر علمِ الٰہی پر مبنی ہے) زمان ومکان کی حدود سے ماوراء اور واقعات وحوادث کی احتیاج سے مستغنی ہے۔ وہ ان ابدی اصول وقوانین کا مکمل مجموعہ ہے جو علمِ خداوندی میں اَزل سے موجود تھے اور جنہیں' اپنے وقت پر' انسانوں تک پہنچایا جانا مقصود تھا۔اس میں شُبہ نہیں کہ قرآنِ کریم میں بہت سے واقعات کا ذکر آتا ہے لیکن جو احکام ان واقعات کے ضمن میں سامنے آتے ہیں' ان کی صورت یہ نہیں کہ وہ واقعہ ظہور میں آ گیا تو وہ حکم نازل ہو گیا۔ اگر وہ ظہور میں نہ آتا تو وہ حکم بھی نازل نہ ہوتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ روایات جن کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں احکام حضرت عمرؓ کی رائے اور خیال کے مطابق نازل ہوئے' ناقابلِ اعتبار اور وضعی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی فراست وبصیرت کے اور بے شمار واقعات ہمارے سامنے آئیں گے جو اُن کی بلندیٔ فکر ونظر کی شہادت پیش کریں گے۔ وحی کو ان کی فراست وبصیرت کے تابع قرار دینے سے ان کا مرتبہ تو بڑھتا نہیں لیکن وحی کی عظمت مجروح اور اَبدیت ختم ہو جاتی ہے۔اس قسم کے مروجہ اعتقادات و تصوّرات قرآنی روشنی میں نظر ثانی کے متقاضی ہیں۔

واقعۂ قرطاس

کتبِ روایات و تاریخ میں' حضرت عمرؓ کی طرف ایک اور واقعہ بھی منسوب ہے جسے 'واقعۂ قرطاس' کہا جاتا ہے۔ مجملاً یہ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی وفات سے تین دن پہلے مرض کی حالت میں فرمایا کہ قلم دوات لاؤ تا کہ میں تمہارے لئے ایسی بات لکھ دوں جس سے تم آئندہ گمراہ نہ ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ حضورؐ کو اس وقت درد کی شدت ہے اور حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ اس لئے قلم دوات وغیرہ لانے کی ضرورت نہیں۔

اس واقعہ کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے اور اس سے مختلف قسم کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ہم نے زیرِ نظر تصنیف میں حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کے عنوان سے ایک الگ باب باندھا ہے اس واقعہ کی تفصیل اور اس عظیم اعلان کی حقیقت اور اہمیت اُس مقام پر سامنے لائی جائے گی یعنی چوتھے باب میں۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

رسولؐ اللہ کی وفات پر

ایک روایت یہ بھی ہے کہ:

> جب حضرت عمرؓ کو رسولؐ اللہ کی وفات کا علم ہوا تو آپ تلوار لے کر مسجد میں کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ جو شخص کہے گا کہ رسولؐ اللہ فوت ہو گئے ہیں' میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپؐ ہر گز فوت نہیں ہوئے بلکہ اپنے ربّ کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے حضرت موسیٰؑ تشریف لے گئے تھے اور چالیس رات غیر حاضر رہنے کے بعد واپس اپنی قوم میں آ گئے تھے۔ رسولؐ اللہ بھی یقیناً واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔

اس کے بعد روایت کہتی ہے کہ

> اُس وقت حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ ایھا الناس! من کان یعبد محمدًا فان محمدًا قد مات۔ ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حیّ لا یموت (اے لوگو! جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمدؐ وفات پا چکے ہیں لیکن جو شخص اللہ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے تو اللہ یقیناً زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہیں ہو گی)۔

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ [3:144]

محمدؐ بجز نیست کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسولؑ (آئے اور دنیا سے) چلے گئے۔ اس لئے اگر (کل کو) یہ بھی وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام ان کی ذات تک محدود تھا) اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟

اس کے بعد روایت میں ہے کہ:

جب حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو ان کے ذہن پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور بالآخر انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی رسولؐ اللہ فوت ہو چکے ہیں۔ اس یقین کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس روایت کی تردید کے لئے ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ حضرت عمرؓ کی شخصیت کو سامنے لایئے وہ خود بخود بتا دے گی کہ یہ واقعہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ سوچئے کہ جس شخص کا قرآن پر اس قدر عبور ہو (جیسا کہ آگے چل کر ہم تفصیل سے دیکھیں گے) کیا وہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ دوسرے انسانوں کی طرح محمدؐ ابن عبداللہ کی بھی ایک طبیعی زندگی تھی اور طبیعی زندگی، خدا کے طبیعی قوانین کے مطابق، ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے حضورؐ کی حیاتِ طبیعی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے صراحت کر دی تھی اور واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ آپؐ نے بھی ایک دن دنیا سے تشریف لے جانا ہے (39:30)۔ کیا قرآن کی اس صراحت اور (حضرت) عمرؓ کی اس قدر دقیق فراست کے بعد بھی، یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہو کہ رسولؐ اللہ فوت نہیں ہو سکتے؟ یہ عقیدہ کہ آپؐ دنیا سے رُوپوش ہو جانے کے بعد، پھر واپس تشریف لائیں گے اور منافقین کی گردنیں اڑائیں گے، عیسائیت اور مجوسیت کا ''رجعت'' کا عقیدہ ہے جس کی قرآن شدومد سے تردید کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا اس قسم کا عقیدہ کس طرح ہو سکتا تھا!

ہم سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کی وفات پر، حضرت عمرؓ نے یہ مناسب خیال کیا ہو گا کہ آپؐ کی وفات کی خبر جلدی سے عام نہ ہونے پائے اور اس کی خاص وجہ تھی۔ حضورؐ، ایک عظیم مملکت کے سربراہ بھی تھے، اور (باہر تو ایک طرف خود) عرب کے اندر ایسے عناصر موجود تھے جو اس مملکت کے خلاف سَر اٹھانے کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ (رسولؐ اللہ نے ابھی اُسی صبح ایک جری لشکر، حضرت اسامہؓ بن زید کی زیرِ سرکردگی، رُوم کے خلاف روانہ فرمایا تھا)۔ حضرت عمرؓ کی سیاسی ژرف نگہی نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ ان حالات میں، سربراہِ مملکت کی وفات کی خبر اُس وقت تک عام نہیں ہونی چاہئے جب تک اس کے جانشین کا تقرر نہ ہو جائے ــــ یعنی مملکت کو کسی وقت بھی بغیر سربراہ کے نہیں رہنا چاہئے ــــ یہ تھی وہ مصلحت جس کی رُو سے انہوں نے یہ اعلان فرمایا ہو گا کہ حضورؐ کی وفات کی خبر کو سرِدست عام نہ کیا جائے۔ آپ نے اس پر غور فرمایا ہو گا کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو اعلان کیا تھا وہ یہی تھا کہ حضورؐ کی وفات سے یہ نظام ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ مملکت باقی رہے گی یہ نظام آگے چلے گا اور خلیفۃ الرّسولؐ

اس خلاء کو پُر کر دے گا جو حضورؐ کی وفات سے واقع ہو گیا ہے۔

اور نظامِ مملکت کا یہی وہ بنیادی تقاضا تھا جس کی رُو سے' صحابہ کرامؓ نے' سربراہِ مملکت کی جانشینی کا معاملہ حضورؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے طے کر لیا ــــ انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھے۔ وہ دستِ رسالت کے تربیت یافتہ' سیاستِ مملکت کے اس بنیادی تقاضا سے بے خبر نہیں تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زیرِ نظر روایت کا اتنا حصہ صحیح ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ رسولؐ اللہ کی وفات کی خبر کو بہ عجلت عام نہ کریں۔ اس سے زیادہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ زیبِ داستان کے لئے افسانہ طرازوں کا اضافہ ہے' اور ہمارے خیال میں اُس زمانے میں وضع کیا گیا ہو گا جب مسلمانوں میں (ایرانی اثرات کی وجہ سے) ''رجعت'' کا عقیدہ دَر آیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی آخری باب میں ملے گی

آیئے' حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس اعلامیہ کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے' ہم آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ اس پر عمل کس طرح سے ہوا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیسرا باب

خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس آیۂ جلیلہ کو پھر سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡـًٔا ؕ وَسَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ [3:144]

محمدؐ بیش ازیں نیست کہ اللہ کے ایک پیغامبر ہیں۔ اِن سے پہلے بھی اسی طرح بہت سے پیغامبر آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا اگر یہ پیغام رساں (محمدؐ) بھی کل کو وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم سمجھو گے کہ ان کی وفات سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا اور اس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا' خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو اسی روش پر قائم رہے گا تو اُسے اس کی کوششوں کا بھرپور صلہ ملے گا۔

دین اور مذہب کا فرق

اس سے واضح ہے کہ جو نظام رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا' وہ آپؐ کی ذات اور حیات تک محدود نہیں تھا۔ اُسے حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح جاری و ساری رہنا تھا۔ نبوت تو آپؐ کی ذات پر ختم ہو گئی تھی لیکن نبوت کی رُو سے قائم کردہ نظام کا سلسلہ بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام کو جاری رکھنے کے لئے حضورؐ کی جانشینی کو خلافت کہا جاتا ہے اور جن کے ہاتھوں اسے جاری رہنا تھا' انہیں' رسول اللہؐ کے خلفاء (جانشین یعنی Successors)۔ یہیں سے دین اور مذہب کا فرق سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مذہب' اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہوتا ہے جس کا وجود' فردِ متعلقہ کے ذہن سے باہر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ تعلق' پوجا پاٹ' بھگتی یا پرستش کی چند رسومات یا گیان دھیان' مراقبوں' ریاضتوں کی رُو سے قائم کر لیا جاتا ہے یعنی یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے کہ وہ تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خالصۃً انفرادی اور داخلی یا موضوعی (SUBJECTIVE) جذبہ کا نام ہے جس کے لئے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس' دین اس نظام کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی کی

بنیادوں پر قائم کیا جاتا ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور کاروبارِ حیات کے ہر گوشے کو محیط ہوتا ہے۔ اسی کو عصرِ حاضر کی اصطلاح میں، نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ اسلامؔ دین ہے، مذہب نہیں۔ ''مذہب'' کا تو لفظ تک قرآن میں نہیں آیا ــــ اللہ کے رسول، ہمیشہ دینؔ لے کر آتے تھے لیکن ان کے بعد، ان کے نام لیوا، اس دینؔ کو مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے اور مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) اس کی اجارہ داری سنبھال لیتی تھی۔ یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا تھا کہ اللہ کے آخری رسول (محمدؐ) دینِ خداوندی لے کر آئے۔ اس دینؔ (نظامِ مملکت) کے اصول و قوانین عالمگیر تھے، کیونکہ اسے تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیا گیا تھا (81:27)۔ مکمل اور غیر متبدل تھا (6:116) اور اسے قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا تھا (15:9)۔ اس نظام کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے (3:79)۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [12:40]۔ لیکن اللہ تو ایک ایسی بسیط حقیقت ہے جس کا محسوس شکل میں سامنے آ کر حکومت کرنا تو درکنار، وہ ''برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم ہے''۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوا کہ اللہ کی حکومت سے مراد کیا ہے؟ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ اللہ کی حکومت سے مراد ہے اس کی کتاب (قرآنِ مجید) کے قوانین و احکام کی اطاعت۔ یہی مومن و کافر میں خطِ امتیاز ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [5:44] جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

نظامِ مملکت

لیکن اس سے پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کتابؔ تو ایک ضابطہ کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کسی زندہ، محسوس اتھارٹی کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے۔ وہ اتھارٹی کون سی ہوگی۔ اس کے جواب میں کہا کہ وہ اتھارٹی سب سے پہلے یہ رسول ہوگا جو اس نظام کو قائم کرے گا۔ اسی لئے اس رسول سے کہا گیا ہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ [5:48] آپ ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ...... [3:159] امورِ مملکت میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کریں۔ اور اس کے بعد اپنے فیصلہ کو قانونِ حکومت کی حیثیت سے نافذ کیا کریں۔ اس طرح نافذ کردہ فیصلوں کی اطاعت، امتِ مسلمہ پر لازم ہوگی۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد انہی فیصلوں کی اطاعت ہے ــــ یعنی ان فیصلوں کی اطاعت، جو قوانینِ خداوندی کے مطابق سربراہِ مملکت، اپنے رفقاء کے مشورہ سے نافذ کرے۔ اس سے واضح ہے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ نظام رسولؐ اللہ کی ذات اور حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ اسے اسی طرح آگے چلنا تھا، اس فرق کے ساتھ رسولؐ اللہ کی زندگی میں اس مملکت کی سربراہی، خود رسولؐ اللہ کے پاس تھی۔ آپؐ کی وفات کے بعد، اسے آپؐ کے جانشین (خلیفۃ الرّسول) کی طرف منتقل ہو جانا تھا۔ اب ''اللہ اور رسولؐ'' کی اطاعت سے مراد، خلیفۃ الرّسول کے فیصلوں کی اطاعت تھی اور اسی طرح اس سلسلہ کو آگے بڑھتے چلے جانا تھا۔

اس حقیقت کو پھر دہرا لینا چاہئے کہ نہ یہ فیصلے' سربراہِ مملکت کے اپنے ذاتی فیصلے تھے۔ یہ فیصلے سربراہِ مملکت کی حیثیت سے' مندرجہ بالا اصول وضوابط کے مطابق طے اور نافذ کردہ فیصلے تھے' اور نہ ہی یہ مملکت کسی کی ذاتی ملکیت تھی کہ وہ اپنے بعد جسے چاہے اس کا وارث اور مالک بنادے۔ یہ مملکت پوری کی پوری امت کی ملکیت تھی کیونکہ یہ اُن کے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی (24:55) اور اس تمکن (اقتدار) میں وہ سب شریک تھے (22:41)[1]۔

خلیفۃ الرسول کا انتخاب

ان تصریحات سے واضح ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد' رفقائے رسول اللہ (صحابہ کبارؓ) کا سب سے مقدم فریضہ یہ تھا کہ وہ جانشینِ رسول اللہ کا انتخاب کریں کیونکہ مملکت کا ایک لمحہ کے لئے بھی سربراہ کے بغیر رہنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا (اس کی طرف ہم سابقہ باب میں اشارہ کر چکے ہیں)۔ آیئے' ہم دیکھیں کہ اس نہایت اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے صحابہؓ نے کیا کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کی تفصیل سامنے لائیں' ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ہم اس کتاب کے ''مقدمہ'' میں بتا چکے ہیں کہ ہماری موجودہ تاریخ قطعاً قابلِ اعتماد نہیں۔ ضرورت ہے کہ عہدِ رسالتمآبؐ اور عصرِ صحابہؓ کی تاریخ قرآنِ کریم کو معیار قرار دے کر' ازسرِ نو مدوّن کی جائے۔ اُس مقام پر ہم نے اس کی مثالیں نہیں دی تھیں کہ ہماری تاریخ میں' اس دور کے متعلق کیا کچھ کہا گیا ہے جو اس امر کی آپ شہادت ہے کہ وہ وضعی ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد' مدینہ میں' اکابر صحابہؓ کا طبقہ مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھا جن کے متعلق خود اللہ کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ سچّے اور پکّے مومن تھے۔ سورۂ انفال میں ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [8:75] جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا' اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی' یہ سب مومنِ حقّاً' پکّے اور سچّے مومن ہیں۔ ان کے لئے اللہ کی طرف سے مغفرت ہے اور رزقِ کریم کی نوازش''۔ اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اپنے اللہ سے راضی۔ اللہ نے ان کے لئے جنت کے وہ باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جن میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ عظیم کامرانی اور کامیابی ہے (9:100)۔ ان خدائی شہادات سے واضح ہے کہ ان حضرات سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوسکتی تھی جو ایک پکے اور سچے مومن کے شایانِ شان نہ ہو۔ ان کے باہمی تعلقات کے متعلق فرمایا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ [48:29] محمدؐ' اللہ کے رسول اور ان کے رفقاء کا یہ عالم ہے کہ وہ باہمدگر بریشم کی طرح نرم ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یہ کہہ کر کردی کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ [8:63] اللہ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی اور

1۔ اس مقام پر ان اہم نکات کا اختصاراً ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیلاً انہیں' میں نے اپنی کتاب ''معراجِ انسانیت'' کے باب ''نظامِ مملکت'' میں بیان کیا ہے۔ اُسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

یہ ایسی عظیم متاعِ گراں بہا ہے کہ (اے رسولؐ!) اگر آپ ساری دنیا کی دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو اسے کہیں سے خرید نہ سکتے۔ یہ اللہ کا انعام ہے جسے اس نے خاص طور پر ارزانی فرمایا ہے جس سے یہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے (3:102)۔

ہماری تاریخ

یہ ہیں صحابہ کبارؓ کے ایمان اور سیرت و کردار کی وہ شہادات جو خود قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ایسی بلند سیرت کے حاملین کے متعلق ہماری تاریخ میں کیا کہا گیا ہے۔ حدیث کی وہ کتاب جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے یعنی صحیح بخاری، کے باب ''وفات النبیؐ'' میں حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کی روایت سے حسب ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے:

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی علی ابنِ ابی طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا، ابوالحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے تو عباسؓ بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپؐ سے دریافت کر لیں کہ آپؐ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیّت فرما دیں گے۔ (اس[1] پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا)۔ اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری، باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسولؐ اللہ سے دریافت کر لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گی۔ آپ غور فرمایئے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسولؐ اللہ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے

1۔ بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں مگر علامہ عینی نے مراسیلِ شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی' یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ پھر' جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اُس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زَد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا اِجتماع

اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ اِس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (سربراہِ مملکت کی جانشینی) کا معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیّت نہیں فرمائی تا کہ اُمت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا ـــــ مرکزِ ملّت کے بغیر دین کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا ـــــ اس لئے اُمت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اُس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روئداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے' وہ قابلِ غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی۔

حضرت حبابؓ کی تقریر

''اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہلِ عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے''۔

(محمد حسین ہیکل کی کتاب ''ابوبکر صدیق اکبر'' صفحہ 107)

آپ نے غور فرمایا؟ ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدایانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے اِن جذبات کا اظہار اُس وقت ہو رہا ہے جب نبی اکرمؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

حضرت عمرؓ کی تقریر

یہ تو رہا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بات سنئے۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

> ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب کہ رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارات اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائلِ ظاہرہ اور براہینِ قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کرسکتا ہے جب ہم آپ کے جانثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔ (ابوبکر صدیقؓ۔ از ہیکل صفحہ 108)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا:

> اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہی اس کے سب سے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہی ہو۔ تمہی اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کے پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کرسکتے ہو۔ (ایضاً صفحہ 109-108)

اندازِ گفتگو؟

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا:

> اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً صفحہ 109)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا:

> ہمیں نہیں، اللہ تمہیں ہلاک کردے گا۔ (ایضاً صفحہ 109)

یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سرٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ [8:63] ان کے دلوں میں اللہ نے باہمی محبت اور اُلفت ڈال دی۔ وہ محبت اور اُلفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جاسکتی تھی (8:13)۔ اُن صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی

ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حقِ خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

رسولؐ اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے جب ہم آپ کے جانثار اور اہلِ عشیرہ (اہلِ خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسولؐ کے اہلِ خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے؟

الَائمَة مِنَ القَریش

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپؓ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسولؐ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ الائمة من القریش خلافت قریش میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث، متفقہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسولؐ اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآنِ کریم نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریمِ آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ کیا آپ اس امر کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو مجروح کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ سے، اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کبار کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصوّر پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

دست و گریباں

رسولؐ اللہ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں (ہماری تاریخ کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات، اندازِ گفتگو اور اسلوبِ دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آ گیا۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔

ہمارے ہاں سب سے پہلی، مبسوط اور مستند تاریخ اسلام ابن جریر طبری کی سمجھی جاتی ہے (جن کا انتقال چوتھی صدی ہجری میں ہوا) اور سب سے پہلی مبسوط تفسیر بھی انہی کی[1]۔ اس اجتماعِ صحابہؓ کے متعلق طبریؒ کی تاریخ میں لکھا ہے۔

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ[2] سعدؓ کو روند ڈالتے، اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا، اللہ اُسے ہلاک کرے، اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑو۔ اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا، عمرؓ! خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اُٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے، بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے، تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں۔ اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے، وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں، تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے ربّ کے سامنے پیش نہ کر لوں، بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری۔ جلد اوّل، حصہ چہارم، اُردو ترجمہ، شائع کردہ: جامعہ عثمانیہ[3])

معاذ اللہ

اس سے ایک صفحہ آگے ہے:

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقعہ پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اس کے ہاتھ پر وار کیا، تلوار گر پڑی۔ عمرؓ نے اسے اٹھا لیا، اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری

1۔ امام طبریؒ اور ان کی تاریخ اور تفسیر کے متعلق تفصیلی گفتگو اس کتاب کے آخری باب میں کی جائے گی۔

2۔ انصار کی طرف سے امیدوارِ خلافت۔

3۔ ہم، احادیث اور تاریخ کے اقتباسات کا ترجمہ بھی اپنی طرف سے نہیں کرنا چاہتے بلکہ شائع شدہ ترجموں کو پیش کرتے ہیں تاکہ ان میں کسی اشتباہ کا احتمال نہ ہو۔

باری آ کر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دُور رہے۔ جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے‘ کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کر دے‘ یہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر ہاتھ رکھئے اور اس فقرہ کو پڑھئے:

اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔

بہرحال‘ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد‘ دوسرے امیدوار‘ حضرت سعدؓ کا طرزِ عمل کیا رہا؟ سنئے:

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسکِ حج ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔ (طبری صفحہ 8)

ڈاڑھیاں نوچنا

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعہ میں‘ حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی ڈاڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ جب حضرت اُسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلاف رائے ہوا تو

ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے‘ غصے سے اُچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی اور کہا —— اے ابن الخطاب! اللہ تیری ماں کا بُرا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسولؐ اللہ نے اس پر فائز کیا ہے‘ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔ (ایضاً صفحہ 12)

حضرت علیؓ کا ردِّ عمل

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخابِ خلیفہ اوّل کی تاریخی داستان کی طرف آیئے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوّش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا‘ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر اُن کی طرف سے کیا ردِّ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ غور سے سنئے:

مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کی طرف تھا‘ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب‘ فضل بن عباسؓ‘ زبیرؓ بن عوامؓ بن العاصؓ‘ خالد بن سعیدؓ‘ مقدادؓ بن عمروؓ سلمانؓ فارسی‘ ابوذرؓ غفاری‘ عمار بن یاسرؓ‘ براءؓ بن عازبؓ‘ ابی بن کعبؓ —— ابوبکرؓ نے عمرؓ‘ ابوعبیدہ بن جراحؓ‘ مغیرہؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے

ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ ابنِ ابی طالب کے درمیان اختلاف واقعہ ہو جائے گا۔ اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورہ کے مطابق ابوبکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''آپ رسولؐ اللہ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو' جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے''، لیکن عباسؓ نے یہ پیش کش رد کر دی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضا مند نہیں ہو سکتے۔ (ابوبکرؓ از ہیکل۔ صفحہ 119)

اس کے بعد لکھا ہے:

ایک اور روایت میں جس کا یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے' مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃؓ الزہرا بنتِ رسولؐ اللہ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا:

''اللہ کی قسم! رسولؐ اللہ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کر لیجئے''۔

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے اُن کی مُڈ بھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا:

''یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم' میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی''۔

حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب' بیعت سے انکار کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی' سوا حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن

جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ (ایضاً صفحہ 120)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے مؤقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے:

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''زبیر کو پکڑ لو''۔

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا' میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے۔ مگر تم نے اہلِ بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسولؐ اللہ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کر دو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی۔ اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو' تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً صفحہ 122)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسولؐ اللہ کے اہلِ خاندان ہیں) اسے تاریخ نے کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے۔ بہرحال' حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا:

میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً صفحہ 122)

سرگرمیاں

اس کے بعد۔

حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آ گئے اور کہنے لگے۔''عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ آج تم اس لئے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے' انہوں نے کہا۔''علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا''۔

اس پر ابوعبیدہؓ بن جراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا''بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاں دیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسولؐ اللہ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہ' اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل' دینی رتبے' فہم و ذکاء' سابقیتِ اسلام' حسب و نسب اور رسولؐ اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے''۔

یہ سن کر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے''اللہ اللہ اے گروہِ مہاجرین! تم رسولؐ اللہ کی حکومت کو آپؐ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپؐ کے اہلِ بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں کیونکہ ہم اہلِ بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری' دین کا فقیہہ' رسولؐ اللہ کی سنت کا عالم' رعایا کی ضرورت سے واقف' ان کی تکالیف کو دُور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے۔ اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ'' راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا۔''اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کی ہیں' انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے''۔

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بپھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

''اے بنتِ رسولؐ اللہ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم

ضرور ان کی بیعت کر لیتے''۔

یہ سن کر حضرت علیؓ غصہ میں آ کر جواب دیتے۔''کیا میں رسولؐ اللہ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں''ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا''۔ (ایضاً صفحہ 25-122)

بخاری کی حدیث

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے۔

''حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی اطلاع ابوبکرؓ کو نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت[1] نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا نہیں' خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم! میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ[2] نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔''ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے' اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے' ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امرِ خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے[2]۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیقؓ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا' اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حقِ عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بناء پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بناء پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ

1۔ بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابنِ جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے۔''معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابنِ شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں۔ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ بنوہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنوہاشم نے بھی بیعت کر لی''۔

2۔ ابنِ جریر طبری کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنوہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(1) حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے انہیں حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(2) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی۔ لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا وقار باقی نہیں رہا، اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(3) حضرت علیؓ نے اپنے حقِ خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسولؐ اللہ کے قرابت دار ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

صحابہؓ کا اِرتداد؟

تاریخ کے اس بیان کے مطابق حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے، انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ ''جرم'' ہے جس کی بناء پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق سُنی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے۔

> حضرت ابنِ عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا فَٰعِلِينَ [21:104]۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا، یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1] جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِى كُنتَ أَنتَ ٱلرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ [5:117]
>
> (بخاری۔ کتاب الانبیاء ترجمہ۔ شائع کردہ نور محمدؐ تاجر کتب، کراچی، جلد دوم۔ صفحہ 149)

---

1 ابنِ جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نریٰ ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبدوتم بہ علینا یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہم پر استبداد کر کے ہمارا حق ہم سے چھین لیا ہے۔ (ایضاً)

سوچئے کہ بخاری کی اس حدیث کی رُو سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا [8:74] ''یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں''۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہ نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے' تو 'بہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے'' تو سوچئے کہ (ان روایات کی رُو سے) خود نبی اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے؟

ہمارے نزدیک نہ یہ احادیث ہی رسول اللہ کی ہیں اور نہ ہی تاریخ کے یہ واقعات صحیح ہیں۔ یہ افتراء ہے اور اُس دَور کا وضع کردہ جب خلافت' ملوکیت سے بدل چکی تھی۔ (امام بخاری کی وفات 256ھ میں ہوئی تھی اور امام ابنِ جریر طبری کی 311ھ میں۔ یہ عباسیوں کی حکومت کا زمانہ تھا)۔ ہمارے پاس ان داستانوں کے وضعی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان سے اولوالعزم صحابہ کرامؓ کا اس قسم کا کردار سامنے آتا ہے جو ان کے متعلق قرآنی شہادت کے یکسر خلاف ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی تاریخ یا کتبِ روایات میں کوئی ایسی بات سامنے آئے گی جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو' تو ہم قرآنی شہادت کو تسلیم کریں گے اور تاریخ کے بیان کو باطل قرار دیں گے کہ ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں' نہ کہ تاریخ پر[1]۔ ہمارے نزدیک حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب نہایت محبت اور آشتی کی فضا میں' قرآنی اصولوں کی روشنی میں' عمل میں آیا تھا۔ یہ تمام حضرات' دست پروردگانِ رسالتؐ تھے اس لئے دیِن کی لِم اور حقیقت سے اچھی طرح واقف۔ اور ان کی سیرت بھی اتنی بلند تھی کہ ان سے' ہمارے زمانے کی انتخابی مہمات جیسے خلافِ شرفِ انسانیت مظاہر ناممکن تھے۔ قرآنِ کریم نے بتایا کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ [42:38] ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' مملکت کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں جو اس کے وارثوں کی طرف ترکہ کے طور پر منتقل ہو جائے یا کسی خاص قبیلہ میں محصور ہو کر رہ جائے۔ مملکت' پوری کی پوری اُمت کے ایمان و عمل کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی اور انہوں نے اس کے سربراہ کا انتخاب قرآنِ کریم کے اس ابدی اصول کے مطابق کرنا تھا کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ [49:13] تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ احکامِ خداوندی کا پابند ہے۔ وہ جمع ہوئے تھے صرف یہ طے کرنے کے لئے کہ ان میں سے اتقٰی کون ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اتقٰی پایا اور انہیں سربراہی کے لئے منتخب کر لیا۔ اس واقعہ کا تعلق تو حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب سے ہے لیکن ہم نے اسے حضرت عمرِ فاروقؓ کے سوانحِ حیات کے سلسلہ میں اس لئے درج کرنا ضروری سمجھا ہے کہ (جیسا کہ آپ نے دیکھا) اس میں حضرت عمرؓ کے کردار کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ہم پر لازم تھا کہ ہم بتاتے کہ اُن کی جو اس قسم کی تصویر کھینچی گئی ہے' اس کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔

1۔ تاریخ اور روایات کی صحیح پوزیشن کے متعلق اس کتاب کے مقدمہ میں بھی بحث ہو چکی ہے اور اس کے آخری باب میں بھی تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اب ہمیں، حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دورِ خلافت سے آگے بڑھ کر، خلافتِ فاروقی سے آغازِ سخن کرنا چاہئے، لیکن اِس مقام پر دو ایک اصولی باتیں ایسی سامنے آتی ہیں جن کا تعلق "نفسِ خلافت" سے ہے اور وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایسی نہیں جن سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔

خلیفۃ اللہ نہیں

ہمارے ہاں ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کی سند کے طور پر پیش کی جاتی ہے قرآنِ کریم کی وہ آیت جس میں آدمؑ (یعنی نوعِ انسان کے نمائندہ) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً [2:30]۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جانشینی کا سوال کسی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کسی کی موجودگی میں، کوئی اس کا جانشین نہیں ہو سکتا اور خدا چونکہ ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے، اس لئے اس کا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے جو صاحبِ اقتدار مخلوق دنیا میں موجود تھی اور جو اُس وقت پنہاں یا ناپید ہو چکی تھی، نوعِ انساں (بنی آدم) کو اُس کا جانشین بنایا گیا۔ سورۂ حجر میں ہے وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ [15:27] اس میں مِنۡ قَبۡلُ (اس سے پہلے) کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ (تخلیقِ آدمؑ ایک جداگانہ بحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب — ابلیس و آدم — میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے)۔ اس مقام پر صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے صحیح نہیں۔ دیکھئے، اس حقیقت کو حضرت ابوبکرؓ نے کس عمدگی سے واضح کر دیا۔ بیعتِ خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا۔ آپ نے فوراً اُسے ٹوکا اور فرمایا کہ "میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۃ الرسول" ہوں۔ عام مؤرخین، آپ کے اس فقرہ کو، آپ کی منکسر المزاجی پر محمول کر کے آگے بڑھ گئے ہیں لیکن یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ آپ نے اس سے حکومت کے اس تصور کی وضاحت کر دی ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی حکومت، تھیا کریسی (THEOCRACY) نہیں جس میں مذہبی پیشوا، خدا کے قائم مقام بن کر لوگوں سے اپنی اطاعت لیتے ہیں۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنے انتخابِ خلافت کے بعد، سب سے پہلے فقرہ میں اپنے آپ کو اپنے پیشرو سربراہِ مملکت کا جانشین بتا کر، حکومت کے عمومی تصور کا اعلان کر دیا، اور اس طرح خدا کی جانشینی کے عقیدہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔

یہ تھی دست پروردگانِ رسالت کی بصیرتِ فرقانی!

ڈسپلن

(2) رسول اللہؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں، رومیوں کی مدافعت کے لئے ایک لشکر مرتب فرمایا تھا جس کی سپہ سالاری، حضرت زید بن حارثؓ (جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے) کے بیس سالہ بیٹے اسامہؓ کو تفویض فرمائی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے طے فرمودہ پروگرام کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا اور لشکر کو حضرت اسامہؓ بن زید کی قیادت

میں روانہ کر دیا۔ دیگر صحابہؓ کی طرح حضرت عمرؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ پیچھے رہ جائیں‘ تاکہ آپ ان سے مشورے لے سکیں۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ تھے اور نہایت آسانی سے حکم دے سکتے تھے کہ حضرت عمرؓ پیچھے رہ جائیں لیکن جب آپ نے لشکر کی قیادت‘ حضرت اسامہؓ کو سونپ دی تو پھر ان کے معاملات میں دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ آپ نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی اور کہا کہ ”اگر تم چاہو تو میری مدد کے لئے عمرؓ کو چھوڑتے جاؤ“۔ حضرت اسامہؓ نے بڑی خوشی سے اس کی اجازت دے دی۔ اس سے جہاں اس ڈسپلن کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے جس کے قالب میں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا‘ وہاں یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی نگاہوں میں حضرت عمرؓ کی اہمیت کس قدر تھی۔

ایک دوسرے کا احترام

حضرت ابوبکرؓ کی نگاہوں میں حضرت عمرؓ کا مقام کیا تھا‘ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ کو ایک قطعہ زمین عطا کیا اور کہا کہ اس دستاویز پر‘ منجملہ دیگر صحابہؓ‘ حضرت عمرؓ سے بھی گواہی ڈلوا لاؤ۔ جب حضرت عمرؓ نے اس دستاویز کو دیکھا تو حضرت طلحہؓ سے کہا کہ یہ جاگیر بہت بڑی ہے۔ میں اس پر مہر نہیں لگاؤں گا۔ حضرت طلحہؓ برافروختہ ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ

خدا کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ!

آپ نے جواب میں فرمایا کہ ”خلیفہ تو عمرؓ ہی ہیں لیکن انہوں نے قبولِ خلافت سے انکار کر دیا تھا‘ اس لئے یہ بار میرے کندھوں پر رکھا گیا“۔

دوسری طرف‘ حضرت عمرؓ کے دل میں حضرت ابوبکرؓ کا احترام کس قدر تھا‘ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضرت عمرؓ کے خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد‘ کچھ لوگوں نے آپ سے کہا کہ ”واللہ! ہم نے آپ سے زیادہ عادل‘ فیصل‘ حق گو اور منافقین پر سخت اور کسی کو نہیں پایا۔ آپ‘ رسولؐ اللہ کے بعد سب سے بہتر انسان ہیں“۔ اس پر حضرت عوف بن مالکؓ نے کہا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو۔ میں نے رسولؐ اللہ کے بعد عمرؓ سے بہتر ابوبکرؓ کو پایا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

عوف نے سچ کہا ہے اور تم لوگوں نے غلط۔ ابوبکرؓ بُوئے مشک سے بھی زیادہ پاکیزہ تھے۔ رہا مَیں‘ تو مَیں اپنے گھر کے اونٹ سے بھی زیادہ بے راہ رَو ہوں۔

اس قسم کے تھے باہمی قلبی تعلقات ان حضرات کے جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ ...... وہ باہمد گر بریشم سے بھی زیادہ نرم اور محبت خُو ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں آپ (حضرت عمرؓ) مدینہ کے قاضی (مجسٹریٹ) بھی رہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس منصب

ہی کو ختم کر دینا پڑا کیونکہ آپ کی عدالت میں کوئی مقدمہ ہی پیش نہ ہوا۔ اُس دور میں ''مقدمہ بازی'' کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

آیئے! اب، ہم حضرت عمرؓ کی خلافت کی طرف قدم بڑھائیں۔

حضرت عمرؓ کا انتخاب

حضرت ابوبکرؓ کے دورانِ خلافت' حضرت عمرؓ ان کے مشیر اور شریکِ کار رہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنی جانشینی کا مسئلہ اپنے سامنے طے کر دینا چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ احساس بڑی عاقبت اندیشی اور حُسنِ تدبّر پر مبنی تھا۔ موجودہ زمانہ میں جہاں حکومتوں کا مدار آئین (کانسٹی ٹیوشن) پر ہو اور قوم آئین کی خوگر' جانشینی کا مسئلہ چنداں دشواری پیدا نہیں کرتا لیکن اُس زمانے میں' جب مملکت کا کوئی باضابطہ آئین نہیں ہوتا تھا' یہ زیادہ مناسب تھا کہ ایک سربراہ اپنی جانشینی کا مسئلہ خود اپنی موجودگی میں طے کر دے تاکہ بعد میں کسی قسم کا خلفشار نمودار نہ ہو' اس مصلحت کے پیشِ نظر' حضرت ابوبکرؓ کا یہ خیال' ان کی فراست و بصیرت کی درخشاں شہادت ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں' قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ امورِ مملکت' اُمت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے (42:38) لیکن قرآن نے مشاورت کا حکم اصولی طور پر دیا ہے مشاورت کے طریقِ کار (مشینری) کا تعین خود نہیں کیا۔ اس نے اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' مشاورت کی مشینری کا تعین خود کرے۔ جس ضابطۂ حیات کو تمام نوعِ انسان کے لئے' ابدی طور پر' غیر متبدل رہنا ہو' اس کا انداز یہی ہونا چاہیئے۔ اس کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کی جائیں گی۔ یہ جزئیات وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے بدلتی رہیں گی لیکن اصول اپنی جگہ اٹل رہیں گے۔ ثبات و تغیر کا یہی وہ حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک ابدی نظامِ حیات بن سکتا ہے جہاں تک مشاورت کے اصولی حکم کے بروئے کار لانے کے لئے طریقِ کار کا تعلق ہے اس کی ضرورت حضرت ابوبکرؓ کے انتخابِ خلافت کے وقت پیش آئی۔ جو کچھ تاریخ سے مترشح ہوتا ہے' وہ یہی ہے کہ اس مقصد کے لئے مدینہ کے اکابر صحابہؓ (اعیانِ مملکت) کے اجتماع نے یہ فیصلہ کر دیا (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔ اُس زمانے میں' جبکہ سامانِ رسل و رسائل اور ذرائعِ مواصلات آج کی طرح اس قدر عام نہیں تھے' یہ مشکل ہی نہیں' ناممکن تھا کہ ایسے ہنگامی واقعہ کی صورت میں (اتنے تھوڑے نوٹس پر) تمام اُمت کے نمائندگان کو یکجا اکٹھا کیا جا سکتا۔ اعیانِ مدینہ نے باہمی مشاورت سے خلیفہ کو منتخب کیا۔ اس کے بعد' اطراف و اکنافِ مملکت سے اُمت کے نمائندے (مختلف قبائل کے سربراہ) آئے اور انہوں نے بیعت کر لی۔

بیعت کا مفہوم

دین کے نظام میں بیعت کی اصطلاح بڑی بنیادی‘ فلہٰذا اس قابل ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے‘ جب کوئی شخص اُمتِ مسلمہ (کی سوسائٹی) کا رُکن بننا چاہے (یعنی عام اصطلاح میں مسلمان ہونا چاہئے)‘ تو اسے‘ اپنی کامل رضامندی سے‘ ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کی رُو سے وہ شخص اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ [9:111] ''اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض اللہ اسے جنت کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے'' (اِس دنیا کی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی)۔

یہاں سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ایک اَن دیکھی غیر محسوس حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ بیع وشریٰ (خرید وفروخت) کا یہ معاملہ طے کس طرح سے پاتا ہے؟ اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے دیا جا چکا ہے کہ یہ معاملہ طے پاتا ہے اس سربراہِ مملکت کے توسط سے جو احکامِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم کرتا ہے ـــــ اصولاً یوں سمجھ لیجئے کہ انسانوں کے معاملہ میں جس قدر ذمہ داریاں اللہ نے اپنے اوپر لی ہیں (اور جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے) وہ اسلامی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ جو مملکت‘ اللہ کی یہ ذمہ داریاں پوری کرتی ہے اُسی کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائے ـــــ اس اصول کے مطابق‘ اللہ سے بیع وشریٰ (یعنی حقوق اور ذمہ داریوں) کا یہ معاملہ سربراہِ مملکت کی وساطت سے طے پاتا ہے۔ اس کی شہادت خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ جب صلح حدیبیہ سے پہلے‘ جماعتِ مومنین پر سخت نازک وقت آیا جس میں نظر آتا تھا کہ اہلِ مکہ کے ساتھ شدید مقابلہ ہوگا اور اس میں انہیں بے دریغ جانیں قربان کرنی پڑیں گی‘ تو حضورؐ نے‘ بیع وشریٰ کے معاملہ کی تجدید یا یاددہانی کے طور پر‘ جماعتِ مومنین سے ’بیعت‘ لی (بیعت کے معنی ہی خود فروشی‘ یعنی اپنے آپ کو بیچ ڈالنا ہیں)۔ اس مقصد کے لئے صحابہؓ آتے اور (اُس زمانے کے قاعدے کے مطابق) اس معاہدہ کے لئے اپنا ہاتھ حضورؐ کی طرف بڑھاتے اور حضورؐ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر‘ معاہدہ کی توثیق فرماتے تھے۔ اس ''بیعت'' کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ یہ لوگ جو (اے رسولؐ!) آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یہ درحقیقت اللہ کے ساتھ اپنی بیع کا معاملہ طے کرتے ہیں۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ [48:10] ان کے ہاتھ پر‘ نظر بظاہر‘ محسوس طور پر‘ تو آپ کا ہاتھ ہوتا ہے‘ لیکن درحقیقت یہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ آپ ان سے یہ معاہدہ اللہ کے (BEHALF) پر کرتے ہیں[1]۔

یہ تھی وہ بیعت جو مختلف قبائل (نمائندگانِ ملتِ اسلامیہ) خلیفہ کے ہاتھ پر کرتے تھے۔ اس طریق سے‘ اس انتخاب کی

---

1. یہ تھا قرآنِ کریم کی رُو سے ''بیعت'' کا مفہوم لیکن جب دین‘ مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس بیعت کا مفہوم رہ گیا کسی پیر کا مُرید بن جانا اور اس کے لئے ''حضرت صاحب کی بیعت'' کر لینا۔ سچ ہے

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور (اقبالؒ)

توثیق، تمام ملت کی طرف سے ہوجاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کے وقت، مشاورت کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لئے یہ طریقِ کار اختیار کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے جانشین کے انتخاب کے سلسلہ میں، اس طریقِ کار میں ذرا سی تبدیلی کر لی۔ آپ نے لوگوں کو بلایا (اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہلِ مدینہ ہی کے اعیان و ارکان تھے) اور ان سے کہا:

لوگو! جو کچھ میری حالت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اللہ نے تمہیں میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے اور تمہیں اختیار دے دیا ہے کہ تم اپنے لئے ایک سربراہ کا انتخاب کرلو۔ اگر تم میری زندگی میں ایسا کرو گے تو میرے بعد اختلاف سے بچ جاؤ گے۔

لوگوں نے باہمی مشورہ کیا لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم انتخاب کا اختیار آپ کو دیتے ہیں۔ آپ ہی اُمت کے لئے ایک سربراہ منتخب فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس مقصد کے لئے مجھے کچھ مہلت دو تاکہ میں اکابرینِ امت سے مشورہ کرلوں۔

آپ نے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ عمرؓ ابن الخطاب کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس باب میں آپ مجھ سے بھی بہتر طور پر جانتے ہیں۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ ان کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں، میرے نزدیک وہ اس سے بھی بہتر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ پھر آپ نے مہاجرین اور انصار میں سے مختلف منتخب و ممتاز شخصیتوں سے مشورہ کیا تو ان سب نے یہی رائے دی۔ بعض لوگوں نے اتنا اعتراض کیا کہ حضرت عمرؓ سخت مزاج ہیں خلافت پا کر وہ اور زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ اس پر آپ نے کہا کہ نہیں! میرا اندازہ یہ ہے کہ خلافت کی ذمہ داریاں ان کی سختی کو نرمی میں بدل دیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر عمرؓ میرے جانشین ہو جائیں تو میں اللہ سے کہہ سکوں گا کہ میں تیرے بندوں پر تیرے بہترین بندے کو ذمہ دار بنا آیا ہوں۔ اس پر لوگ مطمئن ہو گئے اور آپ نے حسبِ ذیل دستاویز قلمبند کرا دی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ہے وہ وصیّت جو ابوبکرؓ بن قحافہ نے دنیا سے جاتے ہوئے اور آخرت میں داخل ہوتے وقت لکھائی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور فاجر بھی (صداقت کا) یقین کر لیتا ہے، جھوٹا بھی سچ کا اعتراف کر لیتا ہے۔ میں نے اپنے بعد تمہارے لئے (عمرؓ ابنِ خطاب کو) سربراہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا، تم لوگ ان کی سنو اور اطاعت کرو۔ میں نے اللہ، رسول اور دین کے سلسلہ میں اپنی اور آپ لوگوں کی بہتری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگر وہ عدل کریں گے تو میرا خیال درست ثابت ہوگا۔ اگر وہ بدل جاتے ہیں (تو اس کے لئے میں مکلّف نہیں ہوں گا کیونکہ) ہر شخص اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ میں نے (اپنی دانست میں) بھلائی کا کام کیا ہے۔ مجھے غیب کا علم نہیں۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

اس دستاویز پر آپ نے مہر لگائی' اسے لفافہ میں بند کیا اور جھروکے میں سے جھانک کر' نیچے منتظر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! میں نے اس دستاویز میں اپنا فیصلہ لکھ دیا ہے۔ تم اس پر رضا مند ہو'' ۔ سب نے بیک زبان کہا کہ ہم رضا مند ہیں (کیونکہ ہم ہی نے تو آپ کو اس کا اختیار دیا تھا) لیکن حضرت علیؓ نے کہا کہ

> ہم صرف اسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ اس میں عمرؓ کا نام ہو۔ (بحوالہ طنطاوی)

آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس میں عمرؓ ہی کا نام ہے۔ اس پر سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کی بیعت کر لی۔ ازاں بعد' حضرت ابوبکرؓ نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بدرگاہِ ربّ العزت عرض کیا کہ

> بارِ الٰہا! میں نے ان لوگوں کی بھلائی کا ارادہ کیا ہے میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تجھے معلوم ہے۔ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق' میں نے ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کیا ہے جو ان میں سے سب سے بہتر ہے۔ صاحبِ قوت بھی ہے اور طالبِ رُشد و ہدایت بھی۔ تو اسے میرا صحیح جانشین ثابت کر دے۔ یہ تیرے بندے ہیں اور ان کے معاملات تیرے ہاتھ میں ہیں۔ تو ان کے امیر کو صلاح اور فلاح کی توفیق عطا فرما اور اُن خلفائے راشدین میں سے بنا جو نبیٔ رحمت کی عطا کردہ راہنمائی کا اتباع کریں۔

اس کے بعد' حضرت ابوبکر صدّیقؓ وفات پا گئے اور خلافتِ فاروقی کا آغاز ہو گیا۔ یہ 23 جمادی الآخر 13ھ (مطابق 22 اگست 632ء) کی بات ہے۔

پہلا خطبۂ خلافت

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد' ان خلفائے عظام کا پہلا خطبہ خاص اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ وہ اس میں اپنی ذمہ داریوں' افرادِ معاشرہ کے حقوق و فرائض اور مملکت کے مقاصد و منتہیٰ کا بڑی وضاحت سے اعلان کر دیتے تھے۔ آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ وہ ان کا منشور ہوتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ

اس نہج سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے خطبۂ خلافت کو بھی درج کر دیا جائے۔ انہوں نے اللہ کی حمد کے بعد فرمایا تھا۔

> اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح (نیک) کام کروں تو اس میں میری مدد کرو اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں' اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں

اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمے ہے۔ جو قوم خدا کی راہ میں جہاد ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ ذلّت اور خواری مسلّط کر دیتا ہے۔ اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر مصائب اور تباہی کا عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ

تاریخی روایات میں' حضرت عمرؓ کے خلافت کے یومِ اوّل کے دو خطبے مذکور ہیں۔ ایک مختصر ہے اور دوسرا مفصّل۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختصر خطبہ' صبح کی نماز کے وقت ارشاد فرمایا تھا اور مفصّل خطبہ ظہر کی نماز کے وقت جب اجتماع زیادہ تھا۔ یہ خطبات' بادنیٰ لفظی اختلاف' کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں۔ مختصر خطبہ میں آپ نے' حمد و ثنا کے بعد' حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل و مناقب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

لوگو! میں تمہیں میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔[1]

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکسار کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔ چنانچہ اُنہوں نے محسوس کیا کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے جو کہا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سختی کو نرمی سے بدل دیں گی' وہ درست تھا۔

اس کے بعد' حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین[2] کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا:

بارِ الٰہا! میں سخت ہوں' مجھے حق کی موافقت' اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا' تو آپ نے دوسری دُعا مانگی کہ:

یا اللہ! میں کمزور ہوں مجھے قوی بنا دے تا کہ میں دین کے دشمنوں' منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا تو آپ نے بدرگاہِ ربّ العزت عرض کیا کہ

یا اللہ! میں بخیل ہوں مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے لیکن اس سخاوت میں ریا کاری کا شائبہ نہ ہو۔

1۔ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر میں دیکھتا کہ کوئی اور صاحب اس بار کو مجھ سے بہتر طور پر اُٹھا سکنے کے قابل ہیں تو میں اسے قبول نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء)

2۔ آمین عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں —— ہاں! یقیناً ایسا ہو گا —— اس میں یقین کا تصور غالب ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ ایمان ہے جس کے بنیادی معنی اس یقین کے ہیں جس سے قلب کو امن (اطمینان) حاصل ہو۔

مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا:

یَآیُّھَا النَّاسُ! اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد، مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہوگا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہوگی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعیّن کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا اگر غلط رویہ اختیار کریں گے تو انہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو، اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد، پھر اپنے لئے ایک اور دُعا مانگی جس میں کہا کہ

بارِالٰہا! مجھے تفکّر و تدبّرِ قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اُسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔

یااللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۔

یہ مختصر خطبہ تھا۔ دوسرے قدرے مفصّل خطبہ میں آپ نے حمد و ثنا کے بعد برسرِ منبر فرمایا۔

مفصّل خطبہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے خائف اور میری درشتی سے لرزاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب ہم رسولؐ اللہ کے سایۂ عاطفت میں تھے اور اس وقت بھی جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت صدیق اکبرؓ حائل تھے۔ لیکن اب کیا ہوگا جب ہم میں نہ رسولؐ اللہ موجود ہیں نہ ابوبکر صدیقؓ اور معاملات تمام کے تمام اس کے ہاتھ میں ہیں۔

جو شخص بھی یہ کہتا ہے وہ ٹھیک کہتا ہے لیکن ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتا ہے کہ مجھے رسولؐ اللہ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا اور میں ان کا فرماں پذیر تھا۔ وہ سراپا نرمی اور رحمت تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ وہ مومنین کے لئے رافت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ بارگاہِ رسالتؐ میں میری حیثیت ایک شمشیرِ برہنہ کی سی تھی۔ جب حضورؐ چاہتے اس شمشیر کو اذنِ کار عطا کر دیتے اور جب چاہتے اسے نیام میں رکھ لیتے۔ میں حضوؐر کی خدمت میں اسی طرح رہا تا آنکہ

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یاد فرمالیا۔حضورؐ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں' اور اس سعادتِ عظمیٰ پر مجھے فخرو ناز ہے۔

اس کے بعد اُمت کی زمامِ کار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کر دی گئی جن کے تحمل اور نرمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان کا بھی خادم اور مددگار تھا اور اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا تھا۔میں حسبِ سابق ایک برہنہ تلوار تھا جسے وہ جس وقت چاہتے بروئے کار لاتے' اور جب چاہتے زیرِ نیام کر لیتے۔میں اسی طرح ان کے ساتھ رہا یہاں تک کہ اللہ نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔وہ بھی آخر دم تک مجھ سے خوش رہے۔اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور یہ سعادت میرے لئے وجہِ مسرت ہے۔

اور اب کہ' اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے۔تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔رہے وہ لوگ جو امن وسلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں' تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اُسے اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے لیکن اس تمام سختی کے باوجود' میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مالِ غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفاف کے لئے لوں' لیکن اسے ناحق نہ لوں۔

تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔

اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔تمہیں بلاضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں۔اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل وعیال کی نگہداشت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! میرا ہاتھ بٹاؤ۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔میں یوم الحساب کا منتظر ہوں جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اُترے اور نماز پڑھائی۔

یہ تھے وہ پہلے خطبات جن سے خلافتِ فاروقی کا آغاز ہوا۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر اہم موقعہ پر امت سے خطاب کرتے تھے۔ آگے چل کر آپ کے یہ خطبات ہمارے سامنے آئیں گے' ان سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اس بطلِ جلیل کو معاملات کے سمجھنے' سلجھانے اور لوگوں کے سامنے انہیں پیش کرنے کی کس قدر وسیع' بلند اور عمیق صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ یوں تو خطابت اور بلاغت' عربوں کی سب سے بڑی خصوصیت تھی لیکن عربی ادب کے ماہرین اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ حضرت عمرؓ کے خطبات' فنِ خطابت اور فصاحت و بلاغت میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

امیر المومنین کا لقب

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' جب حضرت ابوبکرؓ کو کسی نے ''خلیفۃ اللہ'' کہہ کر پکارا تو آپ نے اسے ٹوکا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں (خلیفۃ اللہ کوئی نہیں ہو سکتا) میں خلیفۃ الرسولؐ ہوں' چنانچہ آپ خلیفۃ الرسولؐ کہلاتے رہے۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو لوگوں نے آپ کو ''خلیفۂ خلیفۃ رسولؐ اللہ'' کہنا شروع کیا۔ اس پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اگر یہی انداز جاری رہا تو بعد میں آنے والے خلفاء کا لقب بہت لمبا ہو جائے گا اس لئے کوئی ایسا لقب اختیار کرنا چاہئے جو سب کے لئے موزوں قرار پائے۔ تاریخ کے ایک بیان میں ہے کہ عراق کے گورنر نے ایک دفعہ عبید بن ربیعہ عامری اور عدی بن حاتم طائی کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ مسجد میں ان کی ملاقات حضرت عمرو بن عاصؓ سے ہوئی تو انہوں نے ان سے کہا کہ امیر المومنین کو ہماری آمد کی اطلاع کر دیجئے۔ انہوں نے یہ سن کر کہا کہ کیسا اچھا لقب ہے جس سے تم نے خلیفہ کو پکارا ہے — ہم سب مومن اور وہ ہمارے امیر — جب حضرت عمرؓ تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے بھی اسے پسند کیا اور اس کے بعد' خلفاء کے لئے یہی لقب اختیار کر لیا گیا۔

امیر کے معنی

واضح رہے کہ آج تو ہمارے ہاں امیر کے معنی کچھ اور لئے جاتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں بنیادی طور پر اس کے معنی کچھ اور تھے۔ عربوں کے قافلے صحراؤں میں سفر کرتے تھے جہاں نہ پختہ شاہراہیں ہوتی تھیں نہ سنگِ میل۔ وہ لوگ' چھوٹے چھوٹے پتھروں سے راستوں میں نشان لگا دیتے تھے۔ انہیں اَلْاَمَرَۃُ وَالتَّامُوْرُ کہا جاتا تھا۔ بنا بریں' امر کے بنیادی معنی علامت' نشان یا راہنمائی کے تھے — یہیں سے اس کے معنی مشورہ کرنے کے آتے ہیں۔ اَلْاِئْتِمَارُ کے معنی ہیں مشورہ کرنا۔ ان بنیادی معانی کے پیشِ نظر' امیر المومنین کے معنی ''مومنین کا حاکم'' نہیں' بلکہ ان کے لئے نشاناتِ راہ متعین کرنے والا' ان کی راہنمائی کرنے والا ہوں گے' یا ان سے مشورہ کرنے والا۔ آپ نے دیکھا کہ خود اس لقب (امیر المومنین) سے بھی خلافت اور

ملوکیت یا حاکمیت کا فرق کس طرح نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے؟ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اسے پسند اور اختیار فرمایا۔

خلافت اور ملوکیّت میں فرق

ملوکیت یہی نہیں کہ باپ کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہو جائے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنالینا، ملوکیت ہے۔ خواہ اس کی شکل کوئی سی ہو — قدیم زمانے کی بادشاہت، عصرِ حاضر کی ڈکٹیٹرشپ، اور مغربی جمہوریت جس میں انسانوں کا ایک گروہ (اکثریتی پارٹی) دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منواتی ہے، سب ملوکیت میں شامل ہیں۔ قرآنِ کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ [3:79]

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ اُسے ضابطۂ قوانین، حکومت کے اختیارات یا نبوت بھی کیوں نہ دے دے، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اُس کتابِ خداوندی کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے، اور اس کے معانی پر غور و فکر کرتے رہتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔ وہ (اللہ) اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا [18:26]۔ لہٰذا، خلافت، احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا ہے، اور ملوکیت دوسروں سے اپنے احکام منوانا۔ قرآن نصبِ خلافت کا حکم دیتا اور ملوکیّت کو حرام ٹھہراتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیّت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

انسان اپنے لئے جو نظام بھی خود وضع کرے گا وہ ملوکیت ہی کی کوئی نہ کوئی شکل ہوگی۔ اسے حقیقی آزادی اُسی وقت نصیب ہوگی جب وہ انسانوں کی ہر قسم کی محکومی سے نکل کر صرف احکامِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں:

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کاوش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دِینش ملوکیّت حرام است (اقبالؒ)

خلافت قائم کرنے والا، سب سے پہلے خود احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ [6:163] ''سب سے پہلے میں اُس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں'' — اور پھر دوسروں سے اُسی کے احکام کی اطاعت کراتا ہے۔ اسی کا نام الاسلام ہے، یہی نظام رسول اللہؐ نے قائم کیا۔ اسی کا اتباع حضرت صدیقِ اکبرؓ نے کیا، اور اسی

روش پر حضرت فاروقِ اعظمؓ گامزن رہے' اور ہر موقعہ پر خلافت اور ملوکیت کے فرق کو نمایاں کر کے دکھاتے اور سمجھاتے رہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا۔ اجمالاً وہ ملوکیت اور خلافت کے اسی بنیادی فرق کی تشریح ہوگی جس کی جھلک مختلف پہلوؤں سے وجہِ فروغِ دیدہ و دل ہوگی۔ مثلاً فتح قادسیہ کے بعد' حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

> واللہ! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنالوں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ اس نے میرے سپرد ایک امانت کر دی ہے۔ اگر میں اسے اس طرح استعمال کروں کہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں اور تمہیں گھر بیٹھے سیراب کر دوں تو میں سعادت مند ہوں اور اگر میں اس امانت کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں تو میں سخت بدبخت ہوں گا کہ چند دن عارضی طور پر خوش ہولوں اور پھر ابدی غم و الم میرے حصے میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس خیانت کے جرم سے مجھے کبھی معافی نہیں مل سکے گی اور نہ میں واپس بھیجا جاؤں گا کہ تمہیں آ کر راضی کر لوں۔

اللہ کی محکومی سے حاصل کیا ہوتا ہے' اسے حضرت عمرؓ نے ایک مختصر سے فقرہ میں ایسی جامعیت سے واضح کر دیا ہے کہ آپ جس قدر اس کی گہرائی میں جائیں وہ حقیقت عمیق سے عمیق تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک دن آپ اپنے رفقاء کے ساتھ مصروفِ سفر تھے۔ ایک وادی سے گزرے تو بِلا کچھ کہے' اونٹ سے اُترے اور زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ اُٹھے تو آنکھیں اشکبار تھیں۔ ساتھیوں کے دریافت کرنے پر کہا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں' مَیں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت گیر تھا۔ مجھ سے مشقت بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ وہ منظر سامنے آیا تو دل سے یہ آواز اُبھری کہ:

> عمرؓ! تو کس قدر خوش نصیب ہے۔ ایک دن وہ تھا اور ایک دن یہ ہے کہ آج تیرے اور تیرے اللہ کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔ اس پر میرا سرِ نیاز بدرگاہِ ربّ العزت بیتابانہ تشکر کے لئے جُھک گیا۔

یہ ہے نظامِ خلافت کا نتیجہ کہ ''انسان اور اس کے اللہ کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی''۔۔۔ یعنی انسان احکامِ خداوندی کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ یہی تھا وہ جذبہِ تشکر جس کے متعلق حضرت انسؓ نے بیان کیا تھا کہ ''میں عمرؓ کے ساتھ تھا کہ وہ ایک احاطہ میں داخل ہو گئے اور دیوار کے پیچھے سے میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا ۔۔۔ خطابؓ کا بیٹا عمر اور امیر المومنین! سبحان اللہ! خطاب کے چھوکرے' خدا سے ڈر' ورنہ وہ تجھے ضرور اس کی سزا دے گا''۔

انہوں نے خلافت و ملوکیت کا یہ فرق محض اپنی تقاریر و خطبات کے ذریعے نہیں سمجھایا بلکہ اپنے اعمال و افعال اور سیرت و کردار سے اسے اس طرح نمایاں کر دیا کہ دوسرے بھی اسے اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ ''اگر آپ نے مسلمانوں سے ایک درہم' یا اس کے کم و بیش' وصول کیا اور اسے صحیح مقام پر صَرف نہ کیا تو آپ بادشاہ ہیں' خلیفہ نہیں''۔ اس جواب پر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک اور روایت ہے کہ آپ نے کہا ''میں کہہ نہیں سکتا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ۔ اگر بادشاہ ہوں تو اس سے بُری بات اور کیا

ہوسکتی ہے؟'' مجمع میں سے فوراً ایک شخص برجستہ بولا کہ ''خلافت اور شہنشاہیت میں فرق ہے۔ خلیفہؓ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے، وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے، نہ ناجائز خرچ کرتا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔ بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے''۔ عام مسلمانوں کے ذہن میں خلافت اور بادشاہت کا فرق اس قدر واضح تھا کہ جب رومؔ کا سفیر مدینہؔ پہنچا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے، تو اُسے یہ جواب ملا کہ مالنا ملک۔ بل لنا امیر ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، البتہ ہمارا امیؔر ہے ـــــ یعنی ہمارے لئے صحیح راستے کی نشاندہی کر کے، خود بھی اس پر چلنے اور ہمیں بھی اس پر چلانے والا۔

آیئے، اب دیکھیں کہ اس انسانیت ساز اصول کو محسوس پیکروں میں کس طرح ڈھالا گیا تھا۔ اسی کا نام سیرتِ فاروقیؓ ہے۔

حکمرانے بُود و سامانے نداشت
دستِ اُو جز تیغ و قرآنے نداشت
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اَند
کائناتِ زندگی را محور اَند!
(اقبالؒ)

چوتھا
باب

حسبنا کتاب اللہ

دستِ اُو جز تیغ و قرآنے نداشت

تاریخ میں واقعۂ قرطاس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی وفات سے تین روز پہلے' جب آپؐ کو درد کی شدت تھی' فرمایا کہ قلم اور دوات لاؤ' میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھ دوں گا جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آنحضرتؐ کو درد کی شدت ہے اور ـــــ حسبنا کتاب اللہ ـــــ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعض نے یہ بھی کہا کہ حضورؐ اس وقت' بیماری کی شدت کی وجہ سے (معاذ اللہ) بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

یہ ہے واقعۂ قرطاس جو چودہ سو سال سے بحث و نزاع کا موضوع بنے چلا آ رہا ہے جس کی بنیاد فرقہ وارانہ اختلاف ہے۔ چونکہ ہم اس کتاب کو گروہ بندانہ تفریق و اختلاف سے بالا رکھنا چاہتے ہیں' اس لئے ہم اس نزاع میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ یہ روایت' بخاریؔ میں موجود ہے لیکن علامہ شبلیؒ نے اس پر جو تنقید کی ہے اس سے اس کی صحت ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ (مبیّنہ) واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہؓ موجود تھے لیکن اس کے متعلق' بجز حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے' کسی سے ایک لفظ بھی منقول نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی عمر اس وقت 13-14 سال کی تھی اور تعجب یہ کہ وہ خود اُس وقت وہاں موجود بھی نہیں تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس واقعہ کے مشکوک ہونے کے لئے ایک اور دلیل سب سے قوی ہے اور وہ یہ کہ یہ واقعہ جمعرات کا بتایا جاتا ہے اور رسولؐ اللہ اس کے بعد چار دن تک زندہ رہے (حضورؐ کی وفات سوموار کو ہوئی تھی) اور اس دوران میں آپؐ کی حالت بھی نسبتاً بہتر ہو گئی تھی۔ اگر آپؐ نے کچھ تحریر کرانا ہوتا تو اس کے لئے چار دن کی مدت موجود تھی لیکن اس سلسلہ میں کہیں ایک لفظ بھی مذکور نہیں کہ حضورؐ نے کچھ لکھایا ہو یا اس واقعہ کی یاد دہانی ہی کرائی ہو۔ اس کے برعکس' ان دنوں میں آپؐ نے اور بہت سی ہدایات ارشاد فرمائیں۔

لیکن قطع نظر اس واقعہ کے حضرت عمرؓ نے اگر کسی سلسلہ میں بھی یہ الفاظ (حسبنا کتاب اللہ) کہے ہوں تو یہ مستبعد نہیں۔

یہ حقیقت (کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے) خود قرآنِ کریم کے دعویٰ کے عین مطابق ہے۔ رسولؐ اللہ کی بھی یہی تعلیم تھی اور حضرت عمرؓ کا عہدِ خلافت اس کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن کی کفایت

دین کو قرآن کے اندر مکمل کر دیا گیا ہے وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ [6:115] ''تیرے ربّ کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا''۔ جو کچھ دین کے متعلق کہنا مقصود تھا' اسے اس کتاب میں کہہ دیا گیا اس میں کسی قسم کی کمی نہیں رہ گئی۔ مَا فَرَّطۡنَا فِى الۡكِتٰبِ مِنۡ شَىۡءٍ [6:38] ''ہم نے الکتاب[1] میں کسی بات کو نہیں چھوڑا''۔ یہ کتاب ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ [16:89] ''اور ہم نے اے رسولؐ! آپ کی طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے''۔ جماعتِ مومنین سے بہ صراحت کہا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ [7:3] ''جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے' اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی بڑے کا اتباع مت کرو''۔ خود رسولؐ اللہ سے بھی یہی ارشاد ہوا جب کہا کہ وَاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰٓى اِلَيۡكَ [10:109] ''جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کریں''۔ خود بھی اسی کا اتباع کریں اور دوسروں کے معاملات کے فیصلے بھی اسی کے مطابق کریں۔ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ [5:48] ''جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کیا کرو''۔

یہ تھی قرآن کی پوزیشن جس کے پیشِ نظر یہ کہا گیا تھا کہ اَوَلَمۡ يَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ [29:51] کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب نازل کر دی' جسے اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اگر حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ فرمایا تھا' تو وہ قرآنِ کریم کے اسی استفہام — اَوَلَمۡ يَكۡفِهِمۡ — کا مثبت جواب تھا۔ یعنی اللہ نے یہ کہا تھا کہ کیا ان کے لئے یہ کتاب کافی نہیں' تو (جیسا کہ ہر مسلمان کو کہنا چاہیئے) حضرت عمرؓ نے اس کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ہاں! ہم اس کا اقرار و اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

اور یہی وہ اعلان تھا جسے نبی اکرمؐ نے' حجۃ الوداع کے خطبہ میں' قریب ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع کے سامنے ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:

قَدۡ تَرَکۡتُ فِیۡکُمۡ مَّا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدَہٗ' اَبَدًا اِنِ اعۡتَصَمۡتُمۡ بِہٖ کِتَابَ اللّٰہِ۔ (بخاری — باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے کتاب اللہ۔

1۔ الکتاب میں صحیفۂ فطرت بھی شامل ہے اور انسانوں کے لئے ضابطۂ قوانین (قرآنِ مجید) بھی۔

لہٰذا' حضرت عمرؓ کا یہ اعلان کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ اسی فرمانِ نبویؐ کی صدائے بازگشت تھا۔ یہی اتباعِ رسالت کا تقاضا تھا اور اسی نشیدِ حیات آور کے دوبارہ سننے کی تڑپ تھی جو علامہ اقبالؒ کے لبوں پر ان الفاظ میں آ گئی تھی کہ "ضرورت ہے کہ عالمِ اسلامی' قانون سازی کے سلسلہ میں عمرؓ کی روح کو ساتھ لے کر بڑھے ـــ وہ عمرؓ جو اسلام میں پہلا تنقیدی اور آزاد ذہن تھا اور جس نے نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا تھا کہ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ [1] "۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں' اُمت (جماعتِ مومنین) کا مسلک ہی تمسک بالقرآن تھا' حتیٰ کہ وہ میدانِ جنگ میں' جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے بھی اسی کا اعادہ کرتے تھے۔ جنگِ یمامہ (عہدِ صدیقیؓ) میں حضرت ابوحذیفہؓ پکار پکار کر کہتے تھے کہ:

اے اہلِ قرآن! اپنے اعمال سے قرآن کی عزت افزائی کا موجب بنو۔

اور جب وہ شہید ہو گئے اور علَم' ان کے (غلام) حضرت سالمؓ نے اٹھایا تو فرمایا کہ

اگر میں آج ثابت قدم نہ رہوں تو میں بدترین حاملِ قرآن ہوں گا۔ ("ابوبکر" از ہیکل)

اور اسی پکار کے ساتھ وہ بھی داخلِ فردوسِ بریں ہو گئے۔ ان حضرات کی محیر العقول کامیابیوں کا راز انہی نعروں میں تھا۔

حضرت عمرؓ کا مسلک

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اپنے لئے یہ دُعا مانگی تھی کہ:

یااللہ! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔

اور سامعین سے کہا تھا کہ:

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔

یہی ان کی مملکت کا منشور تھا۔ "وہ ہمیشہ آیاتِ قرآنی کی حکمت و غایت دریافت کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے تھے [2] "۔ اور لوگوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ قرآن پڑھا کریں اور اس کے معانی پر غور و فکر کیا کریں [3]۔ آپ احکامِ قرآنی کی تعمیل میں کس قدر احتیاط برتتے تھے' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ ایک دفعہ ایک بدو نے آپ سے کہا کہ میں نے حالتِ احرام میں ایک ہرن مار ڈالا ہے' اب میں کیا کروں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ کہیئے! آپ کی اس باب میں کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک بکری فدیہ میں دے دے۔ آپ نے کہا کہ ٹھیک ہے' میری بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ آپ نے بدو کو یہ فیصلہ سنا دیا۔ اس نے فیصلہ سن کر کہا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ

1 خطباتِ تشکیلِ جدید۔ (انگریزی آکسفورڈ ایڈیشن' صفحہ 154) 2 القضاء فی الاسلام 3 الاغانی

امیرالمومنین کو اتنا سا مسئلہ بھی نہیں آتا تھا کہ اُس نے دوسرے شخص سے فتویٰ طلب کیا۔ آپ نے کہا کہ بات یہ نہیں' بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ اس امر کا فیصلہ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ [5:95] کریں۔ یعنی دو صاحبِ عدل ـــ سو میرے لئے ضروری تھا کہ میں' ایک اور صاحبِ عدل کو بھی اپنے ساتھ شامل کرتا۔ سو میں عمرؓ ابن خطاب ہوں اور یہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہیں۔

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ "میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری بات مانیں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ آپ اِس کے مطابق مشورہ دیں"۔

آپ کے عہد میں' عمّالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلیں معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن جانتے ہیں۔ جب مکّہ کے گورنر نافع بن عمر بن عبدالحارثؓ نے عبدالرحمٰن بن ابزیٰؓ کو وادی کا حاکم مقرر کیا تو آپ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہے۔ اس پر گورنر نے کہا کہ وہ شخص "قرآن کا قاری اور فرائضِ دین کا عالم ہے" تو آپ خوش ہوئے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں قاری سے مراد قرآن کو محض صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے والا نہیں تھا۔ اس سے مراد قرآن میں تفقہ کرنے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب قرآن کے قاری تو بہت ہوں گے لیکن فقیہہ بہت کم ہوں گے"۔ ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ "لوگو! قرآن پڑھو۔ قرآن دانی کی بناء پر تم میں امتیاز کیا جائے گا۔ قرآن پر عمل کرو اور اس طرح اہلِ قرآن کہلاؤ"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انہیں اِس کی تنبیہہ بھی کرتے رہتے تھے کہ قرآن خوانی سے مقصد حصولِ اجرِ خداوندی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا:

> ایک وقت تھا جب میں سمجھا کرتا تھا کہ جو شخص بھی قرآن پڑھتا ہے وہ اللہ' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کا طالب بن کر قرآن پڑھتا ہے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ اس لئے بھی قرآن پڑھتے ہیں کہ اس طرح مخلوقِ خدا سے کچھ حاصل کرلیں۔ سنو! قرآن پڑھو تو صرف اجرِ خداوندی کے متلاشی بنو اور اپنے ہر عمل کا مقصود اُسی اجر کو ٹھہراؤ۔

سب تمہارے لئے' تم اللہ کے لئے

صرف "اللہ کے ہاں سے اجر" (لِلّٰہ) سے کیا مراد ہے' اسے آپ نے دو جملوں میں اس حسن و جامعیت سے واضح کر دیا کہ اس سے نگۂ بصیرت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ نے قرآنِ کریم کی آیت ...... سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ...... (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ نے اسے تمہارے لئے مسخّر کر رکھا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ "یاد رکھو! اللہ نے ساری مخلوق کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے اور تمہیں اپنے لئے"۔ "اپنے لئے" سے مراد ہے اللہ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے۔ اس سے مومن کی زندگی کا مطلوب و مقصود اور مآل و منتہیٰ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اور یہی مطلب ہے خدا کے ہاں سے اَجر پانے کا۔

واللہ اعلم مت کہو

حضرت عمرؓ کی مجلس میں اکثر قرآنی آیات کے حقائق وغوامض کے متعلق بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہی مجالس میں سے ایک کا ذکر ہے کہ ایک آیت زیرِ غور آئی تو لوگوں نے واللہ اعلم کہہ دیا (یعنی خدا بہتر جانتا ہے)۔ آپ کو اس جواب پر سخت غصہ آیا اور کہا کہ اگر تمہیں کسی بات کا علم نہیں تو صاف صاف کہو کہ میں نہیں جانتا۔ واللہ اعلم کہنے کا کیا مطلب؟ اس کے بعد آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن معمر صحابہؓ کی موجودگی میں اپنی کم عمری کی وجہ سے کچھ متأمل سے ہیں۔ آپ نے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ علم کے معاملہ میں عمر کا کوئی لحاظ نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا جھجک کہو۔ اسی بناء پر بخاری میں ہے کہ "حضرت عمرؓ کے اہلِ مجلس ومشاورت اربابِ علم وبصیرت تھے' خواہ بوڑھے ہوں اور خواہ جوان"۔

قرآن سُن کر غصہ اُتر جاتا

قرآن کے ساتھ آپ کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو غصہ آیا ہو اور سامنے سے کسی نے قرآن کی آیت پڑھ دی ہو تو آپ کا غصہ فرو نہ ہوگیا ہو۔ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے حضرت اسلمؓ سے آپ کا (حضرت عمرؓ کا) حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں شبہ نہیں کہ آپ تمام انسانوں سے بہتر ہیں لیکن جب آپ کو غصہ آجاتا ہے تو غضب ہوجاتا ہے۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ اس وقت تم کوئی آیت کیوں نہیں پڑھ دیا کرتے کہ سارا غصہ اُتر جائے۔

وہ چلتے پھرتے لوگوں سے کچھ نہ کچھ نصیحت کرتے رہتے اور اس کے ساتھ قرآن کی آیت پڑھتے۔ (مثلاً) ایک دفعہ فرمایا کہ تین باتوں کا اللہ خود ضامن ہے۔ ان کے بارے میں کبھی وعدہ خلافی نہیں ہوسکتی۔

اِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ [9:120] اللہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ اَنَّ اللهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ [12:52] خدا مکاروں کی مکاری کے لئے کشاد کی راہ نہیں نکالتا۔ اِنَّ اللهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ [10:81] اللہ فساد انگیزوں کے پروگرام کو کبھی نہیں سنوارتا۔

قرآن سے اَستنباطِ نتائج

آپ کو قرآن فہمی کا کس قدر بہرۂ وافر عطا ہوا تھا' اور قرآنی اصولوں سے استنباطِ نتائج و ترتیبِ جزئیات میں آپ کس ژرف نگہی سے کام لیتے تھے' اس کی مثالیں آگے چل کر' جہاں آپ کا قائم کردہ سیاسی اور معاشی نظام سامنے آئے گا' قدم قدم پر ملیں گی۔ اس وقت ہم' اس نکتہ کی وضاحت کے لئے دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

(1) جب عراق فتح ہوا تو اس کی مزروعہ اراضی کے وسیع رقبات مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے۔ اس سے پہلے ایسا اتفاق کہیں نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک کے عام دستور کے مطابق، مجاہدین نے مطالبہ کیا کہ ان قطعاتِ اراضی کو، دیگر مالِ غنیمت کی طرح، ان (مجاہدین) میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کی نگہ، دوررس قرآن کی اس حقیقت تک پہنچ چکی تھی کہ ذرائع پیداوار تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ اس لے ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رہنا چاہئے، انفرادی ملکیت میں نہیں دے دینا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ مجلسِ شوریٰ میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے —— ایک ان اراضیات کی تقسیم کے حق میں تھا، دوسرا حضرت عمرؓ سے متفق۔ معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر بڑی تفصیلی بحث ہوتی رہی اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلا۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ تک پہنچنے کے لئے مہلت طلب کی تا کہ اس پر اچھی طرح سے غور و فکر کر لیا جائے۔ کچھ دنوں کے غور و تدبر کے بعد، آپ نے پھر مجلس کا اجلاس منعقد کیا اور اپنے رفقاء سے کہا کہ میں نے اس معاملہ کے ہر پہلو پر انتہائی غور و فکر کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے بالآخر قرآنِ مجید سے راہنمائی مل گئی۔ سورۂ حشر میں جہاں مالِ فے کی تقسیم کے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں وہاں ان گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد، جو اس وقت ہم میں موجود ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ [59:10] جو اِن کے بعد آئیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان اراضیات کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو ان میں آنے والی اُمت کا حصہ نہیں رہ سکتا۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں اور ان کی پیداوار سے مملکت، موجودہ افرادِ معاشرہ کے رزق کا انتظام کرے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بھی بڑھتا جائے۔ آپ کے الفاظ یہ تھے کہ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے مراد اولادِ آدم ہے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے۔ یہاں اللہ نے بعد میں آنے والوں کو بھی مالِ غنیمت میں قیامت تک کے لئے شریک کر دیا ہے اور اس کی عملی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ان اراضیات کو افراد کی ذاتی ملکیت میں نہ دیا جائے۔ صحابہؓ اس دلیل سے مطمئن ہی نہیں، بہت خوش ہوئے اور اراضیات افراد میں تقسیم نہ کی گئیں۔

یہ تھا قرآنی اصولوں کی روشنی میں حضرت عمرؓ کے تفقہ اور اجتہاد کا انداز! (تفصیل اس واقعہ کی معاشی نظام سے متعلق عنوان میں ملے گی)۔

مسئلہ تقدیر

(2) تقدیر کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور پریشان کُن ہے (یا ایسا بنا دیا گیا ہے) کہ حکمائے یونان کے زمانہ سے لے کر اب تک یہ دنیائے مذاہب اور جہانِ فلسفہ میں باعثِ ہزار دردسری بنا رہا ہے (اور بنا ہوا ہے) اور کیفیت اب تک یہ ہے کہ —— ڈور کو سُلجھا رہے ہیں اور سِرا ملتا نہیں —— مَیں نے اس مشکل ترین مسئلہ کو (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنِ کریم کی روشنی میں، اپنی تصنیف —— کِتَابُ التَّقۡدِیۡر —— میں حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اربابِ فکر و نظر نے میری اس کوشش کو سراہا ہے۔

یہاں نہ اس کی فرصت ہے' نہ موقعہ کہ میں اس مسئلہ کی تفصیلات میں جاؤں۔ میں یہاں مختصر الفاظ میں اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ (قرآنِ کریم کی رُو سے) اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر متبدل قوانین متعیّن فرمائے ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق راستہ اختیار کرے یا ان سے انحراف برتے۔ اگر وہ ان کے مطابق روش اختیار کرے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار اور تعمیری ہوگا' اگر ان کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ بالفاظِ دیگر' انسان کے سامنے دو ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے اختیار کر لے۔ ان ممکنات کو تقدیراتِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ تقدیرات اٹل ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی حد تک انسان صاحبِ اختیار ہے اور اپنے اس اختیار و انتخاب کی بناء پر اپنے فیصلوں اور اعمال کا ذمہ دار۔

آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے' حضرت عمرؓ نے تقدیر کے اس قرآنی مفہوم کو کس عمدگی سے سمجھا اور کس حُسن و خوبی سے اپنے رفقاء کو سمجھایا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ آپ شام کے سفر کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جب راستے میں تبوکؔ کے قریب پہنچے تو ادھر سے اطلاع موصول ہوئی کہ شام اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ میں طاعون' وبا کی صورت میں پھوٹ پڑی ہے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ آپ وہیں رُک گئے اور سوال پیدا ہوا کہ آپ کو آگے جانا چاہئے یا نہ۔ رفقاء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ نے کہا کہ آپ شام کی طرف ایک مقدس اور بلند و بالا مقصد کے لئے راہ پیما ہیں۔ وباءؔ کو آپ کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ موت تو قضاءِ الٰہی سے آتی ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ آپ کو صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت کے ساتھ اس طرح موت کے منہ میں نہیں جانا چاہئے۔ آپ نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور علی الصبح اعلان کر دیا کہ میں واپس جا رہا ہوں' تم بھی واپس چلو۔

حضرت ابوعبیدہؓ کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ''عمر! کیا تقدیرِ الٰہی سے فرار اختیار کرتے ہو''؟ اب وہ جواب سامنے آتا ہے جس کے لئے ہم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ''ابوعبیدہ! کاش کوئی اور یہ بات کہتا۔ میں تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف فرار کر رہا ہوں''۔

اس جواب کے چار الفاظ تقدیر جیسے مشکل ترین مسئلہ کو جس ایجاز اور حسن و خوبی سے حل کر کے رکھ دیتے ہیں' اس کی داد اہلِ فکر و نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اقبالؒ نے اسی بصیرتِ فاروقیؓ سے کسبِ ضیاء کرتے ہوئے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ

گر زِ یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دِگر
تُو اگر تقدیرِ نَو خواہی روا ست   زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہا است

حضرت عمرؓ نے اپنے اس جامع اور مانع فقرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی وضاحت کے لئے کہا کہ ''ابوعبیدہ! ذرا غور کرو کہ اگر تمہارے پاس کچھ اونٹ ہوتے اور تم انہیں ایسی وادی میں لے جاتے جس کا ایک حصہ سرسبز و شاداب اور دوسرا حصہ بنجر ہوتا۔ تم

اگر اپنے اونٹوں کو بنجر علاقہ میں چھوڑتے تو کیا یہ تقدیرِ الٰہی کے مطابق نہ ہوتا؟ اور اگر انہیں سرسبز و شاداب رقبہ کی طرف لے جاتے تو کیا یہ بھی تقدیرِ الٰہی کے مطابق نہ ہوتا؟'' کس قدر بلیغ ہے یہ انداز بات سمجھانے کا! تقدیر جیسے پیچیدہ ترین مسئلہ کا قرآنِ کریم کی روشنی میں اس آسانی سے سمجھ لینا اور پھر اسے اس انداز سے سمجھانا' دست پروردگانِ رسالتؐ ہی کا حصہ ہوسکتا تھا!

رزق خدا کے ہاتھ میں ہے کا مفہوم

(3) ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ رزق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے اور جتنا چاہے عطا کردے۔ انسان کی سعی و کاوش سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی درحقیقت تقدیر ہی کے غیر قرآنی تصور کا پیدا کردہ عقیدہ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عقیدہ کی واضح الفاظ میں تردید کردی جب کہا کہ وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا جب ان لوگوں سے جو اَبدی صداقتوں کے قائل نہیں' کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے کُھلا رکھو' تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ ۖ تم کیا کہتے ہو؟ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں' تو وہ انہیں خود روٹی کھلا دیتا۔ یہ جو بھوکے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا انہیں روٹی دینا چاہتا ہی نہیں۔ اس لئے تم' ہم سے ایسی بات کس طرح کہتے ہو جو منشاء اور مشیّتِ خداوندی کے خلاف ہے! اس کے جواب میں قرآن نے صرف اتنا کہا کہ ان سے کہہ دو کہ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ [36:47] تم کھلی ہوئی گمراہی کی باتیں کر رہے ہو۔ بات بالکل واضح ہے یعنی اس جہانِ اسباب و ذرائع میں' اللہ کسی کو براہِ راست روٹی نہیں دیتا۔ اس نے سامانِ رزق پیدا کر دیا ہے لیکن اس کی تقسیم انسانوں کے اختیار پر رکھ دی ہے۔ اس طرح وہ محتاجوں کے رزق کا بندوبست دوسرے انسانوں کے ہاتھوں کراتا ہے۔ اس انتظامِ خداوندی کی آخری اور مکمل شکل اسلامی مملکت کی صورت میں سامنے آتی ہے جو ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا فریضہ ادا کرتی ہے جن کا وعدہ اللہ نے انسانوں سے کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نہایت عمدگی سے منشائے خداوندی کی وضاحت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

> اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے فارغ ہوکر نہ بیٹھ جائے اور یہ کہتا رہے کہ اے اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے کوئی مُن نہیں برستا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ آپ نے کہا کہ:

> متوکّل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا (کے قانون) پر بھروسہ کرتا ہے۔

علماء ومشائخ کا اتباع نہ کرو

آپ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی فکرونظر کا محور' اوراعمال وافعال کا مرکز' قرآنِ مجید رہے گا' یہ صحیح راستے سے نہیں بھٹکیں گے۔ اگر انہوں نے اسے چھوڑ کر' انسانی خیالات ونظریات کو اپنے لئے وجہِ کشش قرار دے لیا تو پھر انہیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس لئے وہ اس باب میں بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ''کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں! تو آپ نے فرمایا کہ

یادرکھو! تم سے پہلی اُمتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے احبار ورہبان (علماء ومشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہوگیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آپ انسانی علوم حاصل کرنے کی مخالفت کرتے تھے۔ قطعاً نہیں۔ انسانی علوم کی تحصیل کے سلسلہ میں تو آپ کا یہ عالم تھا (کہ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) آپ جہاں جاتے' وہاں کے علماء وحکماء سے التزاماً ملتے۔ مدینہ میں آپ یہودیوں کی مجالس میں شرکت کرتے۔ حتیٰ کہ آپ نے ان کی کتابوں کو براہِ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ آپ نے جو کچھ اس شخص سے کہا تھا اس کی بنیاد ایک بلیغ حکمت پر تھی۔ انسانی خیالات ونظریات کا علم حاصل کرنا اس شخص کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو ان کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کرسکنے کے قابل ہو۔ جسے اس قدر صلاحیت حاصل نہ ہو' وہ غلط اور صحیح اور حق و باطل میں تمیز نہیں کرسکے گا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے باطل خیالات کی رَو میں بہہ جائے۔ عوام کے لئے یہی راہِ صواب ہوتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مرکز کے ساتھ متمسک رہیں۔ یہی حضرت عمرؓ نے اس شخص سے کہا تھا۔ مسلمانوں کے فکر وعمل کا مرکز کتاب اللہ ہے اور اعتصام بکتاب اللہ ہی سے وہ اس منزل تک پہنچ سکتے ہیں جو ان کی زندگی کا منتہیٰ ومقصود ہے۔

قوموں کی موت وحیات کے فیصلے

مسلمان ہی نہیں' ان پر تو یہ حقیقتِ کبریٰ بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی تھی کہ اب عدالتِ خداوندی کے میز پر ایک ہی کتاب ہے جس کے مطابق قوموں کے عروج وزوال اور اُمتوں کی موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اور وہ ہے القرآن العظیم۔ چنانچہ آپؐ کا یہ ارشاد' ہمارے ہاں کلاسک کی طرح مشہور ومنقوش ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ یَرۡفَعُ بِھٰذَا الۡکِتَابِ اَقۡوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیۡنَ (ازالۃ الخفاء)

اللہ' اس قرآن میں عطا کردہ اصولوں کے مطابق بعض قوموں کو بلندیاں عطا کر دیتا ہے اور بعض کو پستیوں میں گرا دیتا ہے۔

وصیّت

قرآنِ کریم کی اہمیت وعظمت آپ کے رگ و پے میں اس شدت سے سرایت کئے ہوئی تھی کہ جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقع ہوگئی تو کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آ چکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیّت فرما دیجئے، تو آپ نے ان سے کہا کہ

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بیقرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں اللہ نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردّد نہ ہوں جہنم کی آگ آپ کے جسم کو مَس تک نہ کر سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور کہا کہ نہ بھائی! تمہارا علم اس معاملہ میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف پر نچھاور کر دیتا۔ آپ نے یہ آخری الفاظ کہے تو حضرت ابنِ عباسؓ نے، جو پاس بیٹھے تھے، کہا کہ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حصے برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔ یہ سُن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابنِ عباسؓ! کیا تم میرے لئے خدا کے ہاں اس کی شہادت دو گے؟ وہ خاموش ہو گئے تو آپ نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا اور دوبارہ کہا کہ کہو! ابنِ عباس! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا، اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔

وفات کے بعد گواہی

اور آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے (حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کے الفاظ میں) اس کی عام گواہی دی کہ

عمرؓ ـــــ کتابِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہہ۔

کتاب اللہ کے اتنے جیّد عالم تھے لیکن چونکہ ایک عملی (PRACTICAL) انسان تھے اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کی زیادہ کاوش نہیں کیا کرتے تھے۔ سورۂ عبسؔ میں زمینی پیداوار کی مختلف چیزوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں فَاكِهَةً وَّاَبًّا [80:31] کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ شہری لوگ باقی چیزوں کے متعلق تو جانتے تھے لیکن اَبًّا ایک قسم کی گھاس تھی جسے دہقان پہچانتے تھے۔ حضرت عمرؓ اس لفظ کے معانی معلوم کرنے کے لئے کاوش کرتے رہے۔ جب معلوم نہ ہو سکا تو اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور خفیف سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ

اے عمر کی ماں کے بیٹے! یہ تکلّفات کس لئے! کیا ہوا اگر تجھے اَبًّا کے معنی معلوم نہیں! اور بعد میں معلوم کر لئے۔

فقط لَا اِلٰہ کہنے سے جنت نہیں مل سکتی

کتاب اللہ کا یہ علم محض نظری نہیں تھا بلکہ اس پر غور وفکر سے مقصود یہ تھا کہ قرآنی اصول وہدایات کو عملی زندگی پر کس طرح منطبق کیا جائے ـــــ اور یہی، ہمارے نزدیک، حضرت عمرؓ کا سب سے بڑا درخشندہ و پائندہ کارنامہ ہے۔ بنگاہِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ ان کے ایک ایک فیصلہ اور ایک ایک اقدام کی بنیاد کس طرح قرآنِ مجید کے کسی نہ کسی اصول وقانون پر ہوئی تھی اور اس باب میں وہ کس جرأت و بیباکی سے کام لیتے تھے۔ تفصیلات ان امور کی تو بعد میں سامنے آتی رہیں گی، اس وقت دو واقعات ایسے ہیں جو بے ساختہ میرے عمقِ قلب سے اُبھر کر نوکِ قلم پر آ گئے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کے واقعہ ہونے میں تو مجھے شبہ ہے لیکن اس میں جو بات حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرمؐ کسی طرف تنہا تشریف لے گئے۔ جب آپؐ کی واپسی میں دیر ہوگئی تو صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی، اور وہ آپؐ کی تلاش کے لئے اِدھر اُدھر نکلے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپؐ کو ایک باغ کے اندر پالیا۔ حضورؐ نے انہیں اپنے نعلین (جوتے) عنایت فرمائے اور کہا کہ انہیں لے جاؤ اور جو شخص بھی باہر ملے اسے میری طرف سے خوشخبری دے دو کہ جس شخص نے بھی کلمہ شہادت پڑھ لیا وہ جنت میں چلا جائے گا۔ وہ باہر آئے تو سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ جب انہوں نے آپ کو حضورؐ کی دی ہوئی خوشخبری سنائی تو آپ (حضرت عمرؓ) نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا کہ ابو ہریرہؓ! اسی وقت رسولؐ اللہ کی طرف واپس چلو۔ جب یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ابو ہریرہؓ کو اس خوشخبری کے عام کر دینے سے کیوں روکا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ

> حضورؐ ایسا نہ کیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ انہیں عمل کرنے دیجئے۔

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا! انہیں عمل کرنے دو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مجھے یہ واقعہ یکسر وضعی نظر آتا ہے۔ نہ حضورؐ ایسا فرما سکتے تھے، نہ حضرت عمرؓ کی طرف سے بارگاہِ رسالتؐ میں ایسی گستاخی ہوسکتی تھی لیکن جو بات اس میں کہی گئی ہے وہ قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ کوئی شخص محض یہ کہہ دینے سے کہ میں ایمان لے آیا، جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ سورۂ عنکبوت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ [29:2] کیا لوگ یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں حق و باطل کے تصادمات کی بھٹیوں میں سے گزرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی؟ (اس سلسلہ میں ان آیات کو سامنے لے آنا بھی مفید رہے گا (2:214 , 3:141 , 6:159 , 9:16 , 33:10)۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ کسی اور موقعہ پر کہے ہوں۔ ان کا

قلب و دماغ قرآنی تعلیمات کا چھلکتا ہوا ساغر تھا اور اس باب میں وہ جو کچھ کہتے تھے دوٹوک کہتے تھے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

شجرِ رضوان کو کٹوا دیا

اور دوسرا واقعہ ایسا ہے جس کے صحیح ہونے میں مجھے کوئی شبہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ہے ایسا نازک کہ میں جب بھی اس کا تصور کرتا ہوں تھرتھرا اُٹھتا ہوں۔ انسانی زندگی میں وہ لمحات مشکل ترین ہوتے ہیں جب اس کے جذبات کا تقاضا کچھ اور ہو اور دین کا مطالبہ کچھ اور۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں اس سے زیادہ نازک اور دشوار گزار مقام شاید ہی کوئی اور آیا ہو۔ اس دشوار ترین مرحلہ پر' حضرت عمرؓ نے جس ہمت اور حوصلہ سے' اپنے جذبات کو قربان کر کے' دین کے تقاضے کو ترجیح دی' اس کے احساس سے میری نظروں میں عظمتِ فاروقیؓ' تا بہ ثریا پہنچ جاتی' اور اس کے احترام میں میری نگہِ نیاز بے ساختہ جھک جاتی ہے لیکن اس واقعہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی اصولی تعلیم کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

شخصیت پرستی

تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے' خواہ یہ شخصیت پرستی دنیاوی حکمرانوں کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو' اور خواہ ''روحانی پیشواؤں'' کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی یہ دوسری شکل' پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید' محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ حکمرانوں کی محکومیّت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقیّد کر سکتی ہیں لیکن ''روحانی پیشوائیت'' کی محکومیّت کا تصور انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہوتا ہے۔ اگر کسی ''حضرت صاحب'' کی شان کے خلاف کوئی خیال تک ان کے کسی عقیدت مند کے دل میں گزر جائے تو وہ ڈرتا ہے' کانپتا ہے' لرزتا ہے — کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے وہ ان کے حضور دست بستہ حاضر ہو کر روتا ہے' گڑگڑاتا ہے' معافیاں مانگتا ہے' پاؤں پکڑتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ سوچئے' کہ شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے بڑھ کر کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو عظیم انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا اس کی رُو سے اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔ اس نے' سب سے پہلے یہ کہہ کر کہ حقِ حکومت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں' انسانی حکمرانی کے تصور تک کو مٹا دیا۔ پھر یہ کہہ کر اللہ کی یہ حکومت' اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے رُوبہ عمل آئے گی' یہ اعلان کر دیا کہ اطاعت' قانون کی ہوگی' کسی انسان کی نہیں ہوگی۔ آپ سورۂ آلِ عمران کی اس آیۂ جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لایئے جسے اس سے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے' اور دیکھئے کہ اس منشورِ خداوندی نے کس طرح' ہر قسم کی شخصیت پرستی کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰـكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ [3:79]

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت کے اختیارات اور نبوت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کی حکمت پر غور و خوض کرتے ہوئے ربّانی بن جاؤ۔

جماعتِ مومنین کے نزدیک اللہ کے بعد، سب سے زیادہ واجب الاحترام، حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ اگر وہ (سابقہ امتوں کی روش کے اتباع میں) کسی کو فوق البشر تصور کرتے تو سرِفہرست حضورؐ ہی کی ذاتِ گرامی آتی۔ قرآنِ کریم نے، اسی احساس کے پیشِ نظر خود حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بار بار کہلوادیا کہ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ [18:110] میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، اس فرق کے ساتھ کہ مجھے اللہ سے وحی ملتی ہے۔ جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر انسان ہونے کی حیثیت سے تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مخالفین کی اعجوبہ پسند ذہنیت کو یہ بات حیرت انگیز نظر آتی کہ ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ وہ تعجب سے کہتے کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ [25:7] یہ کس قسم کا رسول ہے کہ عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے! انہیں جواب دیا جاتا کہ یہی رسول ایسا نہیں، اس سے پہلے بھی جتنے رسول آئے، سب اسی طرح کے انسان تھے۔ کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (25:20)۔ لیکن یہ، بعد میں ان کے نام لیوا تھے، جنہوں نے انہیں مقامِ الوہیّت تک پہنچادیا اور انہیں عجیب وغریب سی مخلوق بنا کر اپنے جذبۂ استعجاب پسندی کی تسکین کر لی۔ لیکن اس سے نہ وہ رسول، رسول رہا، نہ اس کا پہنچایا ہوا دین، دین ــــ رسول، فوق البشر ہستی بن گیا اور اس کا پہنچایا ہوا دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا۔

شخصیت پرستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں، انسانی زندگی کے تمام سہارے اس شخص کی ذات سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ اس کی موت سے یہ سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو بے آسرا محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ اپنی بے کسی اور ''بے آسرگی'' کا یہی احساس تھا جس سے مجبور ہو کر انسان نے اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا کہ ایسی ہستیاں کبھی مرتی نہیں ــــ وہ یا تو زندہ آسمان پر چلی جاتی ہیں، اور اگر ہمارے سامنے مر بھی جاتی ہیں تو وہ درحقیقت مرتی نہیں، زندہ ہوتی ہیں اور ہماری ہر دُعا کو سنتی، اور مُرادیں بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ ''آنے والے کا انتظار'' اور قبر پرستی کا شعار، اسی خود فریبی کے مظاہر ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس خود فریبی کے پردوں کو بھی چاک کر دیا۔ اس نے کہا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡــًٔا [3:144] ''محمدؐ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے پہلے، اسی قسم کے کئی رسول آئے اور اپنی اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے

چلے گئے۔ سو اگر کل کو یہ بھی طبعی وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام تو اسی شخصیت کے سہارے پر قائم تھا ـــــ وہ شخصیت نہ رہی تو وہ نظام بھی ختم ہوا ـــــ پھر اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو تم میں سے ایسا کرے گا' وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا''۔ اس نے یہ کلیہ بیان کر دیا کہ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ [21:34] ''ہم نے (اے رسول) آپ سے پہلے بھی کسی انسان کو اس دنیا میں حیاتِ دوام (ہمیشہ کی زندگی) عطا نہیں کی۔ سو آپ اگر وفات پا جائیں گے تو کیا یہ آپ کے مخالف ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ ہمیشہ زندہ کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے' دینؔ میں اطاعت احکامِ خداوندی کی ہوتی ہے اور اس اطاعت میں خود رسول بھی دوسروں کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ [6:15] اگر میں بھی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے میں بھی نہیں بچ سکتا۔ مجھے بھی اس کا خوف رہتا ہے۔

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد' دین کا نظام آگے چلا جس میں قانونِ خداوندی کی اطاعت' حضورؐ کے جانشینوں کی وساطت سے ہوتی تھی۔ شخصیت پرستی کا تصور نہ حضورؐ کی زندگی میں پیدا ہوا تھا' نہ اس کے بعد۔ حضورؐ نے خود احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی اور اس سے ایسی پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کا ثبوت دیا جسے اللہ نے دوسرے انسانوں کے لئے ماڈل قرار دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [33:21]۔ حضورؐ کے جانشینوں (خلفائے راشدینؓ) نے بھی اپنے سامنے یہی اسوۂ حسنہ رکھا اور شخصیت پرستی کے شائبہ تک کو شریکِ تصورات نہ ہونے دیا۔

اس تمہید کے بعد اس واقعہ کی طرف آیئے جسے ہم نے حضرت عمرؓ کی زندگی کا نازک ترین مقام قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کے وقت' ایک درخت کے نیچے' صحابہؓ سے بیعت لی تھی (اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے)۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے نماز ادا کرتے ہیں۔

عمومی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو بات معمولی سی تھی۔ لوگ نہ اس درخت کی پرستش کرتے تھے' نہ اس سے مرادیں مانگتے تھے صرف اس کے نیچے جا کر نماز پڑھتے تھے۔ لیکن عمرؓ کی نگہ حقیقت شناس اور دوررس اس بظاہر معصوم سے عمل کے نیچے مہیب خدشات دیکھتی تھی ـــــ حضرت عمرؓ کی نگاہیں اس درخت پر تھیں اور آنکھوں کے سامنے وہ حسین و جمیل منظر' سینما کے فلم کی طرح وجہ فروغِ دیدہ ہو رہا تھا' جب اسلام پر سخت نازک وقت آیا تھا اور نظر آتا تھا کہ مخالفینِ مکہ سے اب فیصلہ کن تصادم ہوگا ـــــ حضورؐ کی دعوت پر صحابہ کبارؓ پروانہ وار آ رہے تھے اور اس تصادم میں اپنی جانیں قربان کر دینے کے عہد کی تجدید کر رہے تھے۔ حضورؐ توثیقِ عہد کے لئے اپنا دستِ مبارک صحابہؓ کے ہاتھ پر رکھتے تھے اور اُدھر سے یہ ندائے جمال باعثِ فردوس گوش ہو رہی

تھی کہ تمہارے ہاتھوں پر بظاہر رسولؐ کا ہاتھ ہے لیکن اُسے تم اللہ کا ہاتھ سمجھو کہ تمہارا یہ عہد اللہ ہی کے ساتھ ہو رہا ہے جو تمہیں اس جاں فروشی کے عوض جنت کی بشارت دیتا ہے۔

کیسا فردوس بداماں تھا یہ منظر اور کس قدر جنت بآغوش تھی اس کی یاد — اور یہ درخت اس یاد کا مظہر تھا۔

طبیعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی' دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ قرآنی حقائق' رسولؐ اللہ کا اسوۂ حسنہ اور امم سابقہ کی تاریخ حضرت عمرؓ کے سامنے تھی۔ آپ جانتے تھے کہ اس قسم کے خطرات کی ابتداء معصوم سے انداز سے ہوا کرتی ہے لیکن آگے چل کر یہ مہیب تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ لہٰذا' فتنے کے امکان کو ابتداء ہی سے کچل دینے کا اصول اس کا مقتضی تھا کہ اس روش کو یہیں ختم کر دیا جائے لیکن اس کے حتمی طور پر ختم کرنے کا طریقہ تو ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کے لئے یہ فیصلہ کس قدر ہمت طلب اور جذبات آزما تھا لیکن عمرؓ فاروقِ اعظم کس طرح بنتا اگر دین کا تقاضا اس کے جذبات پر غالب نہ آ جاتا۔ دین کا تقاضا جذبات پر غالب آیا اور آپ نے حکم دے دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کاٹ دیا گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ انما هلک من کان قبلکم بهذا یتبعون اثار انبیاء هم فاتخذوها کناس وبیعا تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے انبیاء کے آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنا لیا[1] — کیسی دوررس تھی نگاہ اس حقیقت شناس کی! آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا' لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ امت ''اس درخت کے بیجوں'' کی جھولیاں بھر بھر کر لے جائے گی۔ اور انہیں ساری دنیا میں اس طرح بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سو سو پرستش گاہیں نمود میں آ جائیں گی' جہاں اس توحید کی مدعی قوم کے سر' اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے! بہرحال' عمرؓ فاروق اِن بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی ایسی جڑ کاٹی تھی کہ اس پر اللہ اور اس کے فرشتے آپ پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہوں گے اور انبیاءِ سابقہ جنت میں حضورؐ کو ہزار ہزار مبارک دیتے ہوں گے کہ آپؐ کی تعلیم و تربیت نے کیسے کیسے جوہرِ گراں مایہ پیدا کئے ہیں اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [33:56]۔

اسی طرح آپ ایک دفعہ حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس کی طرف لوگ دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسولؐ اللہ نے ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ لوگ تبرکاً اس میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جس شخص کو اس مسجد کے قریب نماز کا وقت

1۔ علامہ طنطناوی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں اراء کم ایها الناس رجعتم الی العُزّیٰ۔ (صفحہ 334)

آ جائے' وہ تو اس میں جا کر نماز پڑھ لے لیکن بہ تکلف اور بہ تعمد اس میں کوئی نماز نہ پڑھے۔

آپ نے ایک دفعہ سنا کہ ایک قبر ہے جسے لوگ حضرت دانیالؑ کی قبر سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے حکم دے دیا کہ اس قبر کو چھپا دیا جائے۔

حجرِ اسود

ہمارے ہاں' حجرِ اسودؑ (دیوارِ کعبہ میں نصب' سیاہ پتھر کے ٹکڑے) کا چومنا' مناسکِ حج میں قرار دیا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں نہ حجرِ اسود کا ذکر ہے' نہ اس کے چومنے یا چھونے کو مناسکِ حج میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ چیز عربوں میں' زمانہ قبل از اسلام سے چلی آ رہی تھی۔ ہم بہ تیقّن تو نہیں کہہ سکتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوارِ کعبہ میں دوسرے رنگ کا ایک پتھر اس مقصد کے لئے لگایا گیا ہوگا کہ اس سے' طوافؑ (کعبہ کے گرد چکروں) کے شمار میں آسانی رہے یعنی بآسانی معلوم ہو جائے کہ یہاں سے ہم نے چکر شروع کیا تھا اور یہیں آ کر ایک چکر ختم ہو گیا۔ یا شاید اس کی لِم یہ ہو کہ سامی اقوام میں پختگیٔ عہد کا طریقہ یہ تھا کہ عہد کرنے والا' دوسرے فریق کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا (یہ طریق بالعموم ساری دنیا میں پایا جاتا ہے)۔ دورِ ابراہیمی میں جب حج کی ابتداء ہوئی تو اس کا بنیادی مقصد خدا سے یہ عہد کرنا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کی معبودیت (محکومیت) اختیار نہیں کریں گے۔ اس عہد کی توثیق کے لئے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا تو ممکن نہیں تھا' اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے بطورِ علامت (SYMBOLICALY) یہ طے کیا گیا ہو کہ بیت اللہ (خدا کے گھر) میں نصب شدہ پتھر پر ہاتھ مارنے سے سمجھا یہ جائے کہ تم خدا سے توثیقِ عہد کر رہے ہو۔ جس طرح ''خدا کے گھر'' کے گرد گھومنے سے مقصد یہ بتانا تھا کہ ہم خدا کے لئے اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار ہیں' کیونکہ کسی کے گرد گھومنے سے مقصد اس پر نثار ہو جانا ہوتا ہے۔

اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ لوگ کہیں حجرِ اسود کی پرستش ہی نہ شروع کر دیں حضرت عمرؓ نے اس کی طرف اشارہ کر کے علانیہ کہا تھا کہ ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان''۔ یہ تھا توحید کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم!

بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے' نہ نفع دے سکتا ہے' نہ نقصان۔ واللہ اگر میں رسول اللہؐ کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا''۔ ہمارے خیال میں اس روایت کا آخری حصہ وضعی ہے اور بعد کا اضافہ۔ رسول اللہؐ اس پتھر کو چومتے نہیں ہوں گے' نہ ہی حضرت عمرؓ نے ایسا کہا ہوگا۔ اس لئے کہ کسی پتھر کو چومنے سے اس کی تقدیس (مقدس ہونے) کا تصور ابھرتا ہے اور یہ چیز توحید کی اس تعلیم کے منافی ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔

قرآنِ کریم نے بعض چیزوں کو ''شعائر اللہ'' قرار دے کر ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ شعائر (مادہ ش۔ ع۔ ر ـــــ جس سے لفظ شعور بنتا ہے) کے معنی ہیں وہ محسوس علامات (SYMBOL) جن سے کوئی مستور حقیقت سمجھ میں

آ سکے۔ وہ (CODE WORDS) جو جنگ میں علامات کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے' شعارؔ کہلاتے تھے۔ نیز ایسی علامات جن سے اپنے قافلے کی پہچان ہو سکے۔ اسی طرح جن جانوروں کو وہ حج میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے ان پر نشانات لگانے کو اِشعار کہتے تھے۔ قرآنِ کریم نے' مناسکِ حج کے سلسلہ میں بعض چیزوں (صفا و مروہ کی پہاڑیوں' اور حج میں ساتھ لئے جانے والے اونٹوں) کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے (2:158; 22:34) اور کہا ہے کہ ان کا احترام کرو۔

شعائر اللہ کے احترام سے مفہوم کیا ہے اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ ہر مملکت کا ایک جھنڈا ہوتا ہے۔ جھنڈے کی ذاتی حیثیت تو اتنی ہی ہوتی ہے کہ وہ مشتمل ہوتا ہے ایک لمبی سی لکڑی اور کپڑے کے ٹکڑے پر' لیکن وہ علامت بن جاتا ہے اس سلطنت کی (اسی لئے اسے عَلَم کہا جاتا ہے)۔ اس جھنڈے کی سرفرازی اس سلطنت کی سرفرازی کی علامت ہوتی ہے اور اس کا سرنگوں ہو جانا اس سلطنت کی نکبت کی نشانی ـــــ اس جھنڈے کا احترام' اس مملکت کے افراد پر لازم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ احترام اس جھنڈے کا نہیں ہوتا' اس مملکت کا ہوتا ہے۔ جو شخص اس جھنڈے کا احترام نہیں کرتا اس کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کے دل میں اس مملکت کا احترام نہیں اور یہ چیز اس مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف قرار پاتی ہے فلہٰذا' سنگین جرم۔ شعائر اللہ سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی وہ چیزیں جنہیں حکومتِ خداوندی کی محسوس علامات قرار دیا جائے۔ سورۃ المائدہ میں ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَرَامَ وَلَا الۡهَدۡیَ وَلَا الۡقَلَآئِدَ وَلَاۤ آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ [5:2] اے جماعتِ مومنین! تم شعائر اللہ کی بے حرمتی نہ کرو۔ نہ ہی ان مہینوں کی جن میں جنگ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ نہ ہی ان تحائف اور نشان زدہ جانوروں کی جو اس اجتماعِ عظیم میں بھیجے جاتے ہیں اور نہ ہی اس اجتماع میں شرکت کے لئے جانے والوں کی۔ یہاں ''بے حرمتی نہ کرنے'' کا مطلب واضح ہے۔ یعنی ان چیزوں کے متعلق جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں' انہیں ملحوظ رکھا جائے' انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دوسرے مقام پر اس ''احترام'' کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ [22:32] شعائر اللہ کی تعظیم دراصل اس امر کا اظہار ہے کہ تمہارے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی اہمیت کا احساس ہے۔ یعنی ان محسوس علامات کا احترام' مقصود بالذّات نہیں یہ اس امر کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں قوانین و احکامِ خداوندی کا احترام ہے اور یہ ان کے احترام کا محسوس مظاہرہ ہے۔

یہ ہے شعائر اللہ کے احترام کا مطلب۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہ شعائر (محسوس علامات) فی ذاتہٖ مقدس نہیں بن جاتیں جس طرح کسی مملکت کا جھنڈا (خواہ وہ مملکتِ خداوندی ہی کا جھنڈا کیوں نہ ہو) مقدس نہیں ہو جاتا۔ اگر کوئی شخص اس جھنڈے کو چومنے لگ جائے تو یہ اس (جھنڈے) کا احترام نہیں ہوگا' پرستش ہو جائے گی۔ بُت پرستی کی ابتداء بھی تو اسی طرح ہوئی تھی۔ بتوں کے متعلق ان کے پرستار یہی کہتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہمارے غیر مرئی معبودوں کی محسوس و مرئی علامات ہیں۔ لیکن جب ان علامات کو فی ذاتہٖ مقدس تصور کر لیا گیا تو وہ خود معبود بن گئیں۔ قرآنِ کریم چونکہ شرک کی تمام راہوں کو بند کر دینا چاہتا ہے' اس لئے وہ کسی علامت کو مقدس نہیں بننے دیتا۔ وہ علاماتِ حکومتِ خداوندی کے احترام کا حکم دیتا ہے' انہیں مقدس بنا لینے کا

نہیں۔ اور تو اور‘ اس نے کعبہ کو بھی ’’مسجد الحرام‘‘ کہہ کر پکارا ہے ـــــ یعنی واجب الاحترام مرکزِ اطاعتِ خداوندی۔ کسی چیز کے واجب الاحترام ہونے اور اُن معنوں میں مقدس ہونے میں‘ جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے‘ کیا فرق ہے اسے قرآنِ کریم نے نہایت عمدگی سے واضح کر دیا ہے۔ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو‘ قرآنِ کریم نے‘ شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از اسلام میں عرب انہیں مقدس تصور کرتے تھے اس لئے ان میں چلنا پھرنا گناہ سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے یہ اعلان کیا کہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے تو ہیں[1] لیکن فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا [2:158] ان میں گھومنا پھرنا گناہ کا موجب نہیں ـــــ یعنی شعائر اللہ کا احترام تو کیا جائے گا انہیں مقدس نہیں تصور کر لیا جائے گا۔ اس سے احترام اور تقدیس کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآنِ کریم نے ان اونٹوں کو بھی شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے جنہیں عازمینِ حج اپنے ساتھ لاتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ ان جانوروں کو مقدس نہ سمجھ لیا جائے۔ سفر میں ان سے عام جانوروں کی طرح کام لیا جائے اور پھر‘ مکّہ میں قیام کے دوران‘ انہیں ذبح کر کے‘ ان کا گوشت خود بھی کھایا جائے اور دوسرے ضرورت مندوں کو بھی کھلایا جائے (22:28,32,33,36)۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بناء پر ہم سمجھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ حجرِ اسود کو چومتے نہیں ہوں گے۔ اوّل تو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) قرآنِ کریم نے حجرِ اسود کو شعائر اللہ میں شمار نہیں کیا (قرآنِ کریم میں اس کا ذکر تک نہیں آیا)۔ لیکن اگر اسے مملکتِ اسلامیہ نے منجملہ شعائر قرار دیا تھا تو اس کا فقط احترام مقصود تھا۔ اسے پرستش کی شے بنانا مقصود نہیں تھا۔

اور اسی بناء پر‘ ہم نے کہا ہے کہ اس روایت کا یہ حصہ (جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں رسول اللہؐ کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا) صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے توحید کا ایسا بلند اور منزّہ تصور دیا ہے کہ اگر وہ پیشِ نظر رہے تو پھر اسلام میں اس قسم کی چیزیں بار ہی نہیں پا سکتیں۔ اور اگر توحید کا یہ تصور (معاذ اللہ) رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کے بھی پیشِ نظر نہیں تھا‘ تو پھر اور کس کے پیشِ نظر ہو گا۔

1۔ صفا اور مروہ کے شعائر اللہ قرار دیئے جانے کی وجہ کیا ہے‘ اسے قرآنِ کریم نے بیان نہیں کیا۔ لیکن یہ جو ہمارے ہاں روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو‘ ایک مشکیزہ پانی دے کر لق و دق صحرا میں‘ بے یار و مددگار‘ تنہا چھوڑ گئے تھے اور حضرت حاجرہ پیاس سے بیتاب بچے کے لئے پانی کی تلاش میں ان پہاڑیوں پر دوڑ دوڑ کر چڑھتی اترتی تھیں‘ تورات کے بیان پر مبنی ہے اور بالبداہت نظر آتا ہے کہ وضعی ہے۔ خدا کے ایک عظیم پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ (ایسا تو عام انسان بھی نہیں کرتے۔ تفصیل اس کی میں نے اپنی کتاب ’’جُوئے نور‘‘ تذکرۂ حضرت ابراہیمؑ میں دی ہے)۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے جو زمانہ جاہلیت کی اس توہّم پرستی کو ختم کیا جس کی رُو سے وہ اس وادی میں چلنا پھرنا گناہ سمجھتے تھے اور کہا کہ ان میں گھومنا پھرنا حرج کی بات نہیں‘ تو اسی اجازت نے سعیٔ بین الصفا و المروۃ کی موجودہ شکل اختیار کر لی ہو گی۔ بہر حال‘ یہ ہمارا قیاس ہے۔ قرآنِ کریم میں اس ’’سعی‘‘ کا بھی ذکر نہیں۔

احادیثِ نبویؐ اور عمر فاروقؓ

آثار سے آگے بڑھیئے تو احادیثِ رسولؐ اللہ کے معاملہ میں بھی آج اکثر لوگوں کو حضرت عمرؓ کا مسلک عجیب سا نظر آئے گا۔ لیکن جن کی نگاہیں دین (اسلامی نظام) کی کُنہ و حقیقت پر ہیں، وہ سمجھ جائیں گے کہ جو کچھ انہوں نے اس باب میں کیا وہ تقاضائے دین کے عین مطابق تھا۔

جیسا کہ ہم مجملاً دیکھ چکے ہیں (اور جسے تفصیلاً آگے چل کر "اسلامی نظام" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا)۔

(1) اسلام میں اطاعت، اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآنِ مجید) کی ہے۔

(2) چونکہ اس کتاب کو تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا تھا اس لئے اس میں (چند تفصیلی احکام کے سوا) صرف اصول دیئے گئے ہیں، اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ، ان اصولوں کی جزئیات، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، خود متعین کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ ثبات و تغیر کے اس حسین اِمتزاج سے، دین کا نظام ہمیشہ کے لئے رواں دواں رہے گا۔

(3) قرآنی اصولوں کی روشنی میں جُزئیات، سب سے پہلے اس اسلامی مملکت نے مرتب کیں، جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ حضورؐ کو جو اللہ کا حکم تھا کہ معاملات کے طے کرنے میں، جماعتِ مومنین سے مشورہ کیا کریں تو اس کا تعلق انہی جزئیات کی تعیین سے تھا۔

(4) اس مملکت کے نافذ کردہ فیصلوں کی اطاعت کا نام "اطاعتِ اللہ اور رسولؐ" (اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ) تھا — یعنی اس نظامِ خداوندی کے فیصلے جسے رسولؐ اللہ نے قائم فرمایا۔

(5) رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد، یہی نظام آگے چلا۔ اس وقت اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا عملی مفہوم تھا خلافتِ راشدہ (اسلامی مملکت) کے فیصلوں کی اطاعت۔

(6) جو فیصلے رسولؐ اللہ کے زمانے میں صادر ہوئے تھے چونکہ انہیں ابدی طور پر غیر متبدل رہنا مقصود نہیں تھا اس لئے حضورؐ نے ان فیصلوں (یعنی اپنی احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا۔ اُمت کو صرف قرآن دیا اور مکمل اور محفوظ شکل میں دیا — اسی شکل میں جس میں وہ آج ہمارے پاس ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپؐ نے ایسا مجموعہ خود مرتب فرما کر نہیں دیا بلکہ حکم دے دیا کہ

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ۔ ومن کتب عنی غیر القراٰن فلیمحه۔ (مسلم)

مجھ سے قرآن کے سوا کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کوئی اور چیز لکھی ہؤا سے مٹا دے۔

(7) اسی بناء پر' ان احادیث کا کوئی مجموعہ' نہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مرتب فرمایا نہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے۔ نہ ہی' ان کے بعد' دیگر خلفائے عظام یا صحابہ کرامؓ نے (یہ مجموعے صدیوں بعد جا کر مرتب ہوئے جب اسلامی نظام باقی نہیں رہا تھا)۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایسے مجموعے خود مرتب نہ کئے بلکہ (ارشادِ رسولؐ کے مطابق) اس کے لئے امتناعی حکم جاری کر دیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر ایسے مجموعے مرتب ہو گئے تو لوگوں کی عقیدت انہیں' ان کی طرف مائل کر دے گی' اور دین کی یہ اصل کہ اطاعت' قرآنی اصولوں کی روشنی میں موجودہ اسلامی حکومت کے فیصلوں کی' کی جائے گی' نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی اور اُمت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں عام صحابہ کبارؓ اور خلفائے عظام کا مسلک کیا تھا' اسے ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں[1]۔

احادیث کے متعلق صحابہؓ کا مسلک

مسند امام احمد میں ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا:

> ہم لوگ جو کچھ رسولؐ اللہ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ تب ایک دن رسولؐ اللہ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں)۔ تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہئے) پھر فرمایا (ستھری کرو' خالص رکھو) اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو۔ (صحابیؓ کہتے ہیں کہ) تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔ (تدوینِ حدیث صفحہ 249' از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم)

امام ذہبیؒ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

> حضرت ابوبکرؓ صدیق نے رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسولؐ اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہئے کہ رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کرو۔ پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ــــ بحوالہ تدوینِ حدیث صفحہ 321)

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے رسولؐ اللہ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔

1۔ ان تفاصیل کو ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ــــ مقامِ حدیث ــــ سے لیا گیا ہے' جو حدیث کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے جامع تالیف ہے۔

پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سُن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں)۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔ (تدوینِ حدیث صفحہ 88-285)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے' علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے:

عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوالیا جائے۔ تب انہوں نے رسول اللہؐ کے صحابیوںؓ سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوالی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ

کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا' جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب چھوڑ بیٹھیں۔ اور قسم ہے اللہ کی میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

(تدوینِ حدیث۔ صفحہ 394)

اور یہ اس لئے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہئے کہ اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ احادیث کو جمع اور مدوّن نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ چنانچہ طبقات میں ہے کہ

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیئے۔ تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ (طبقات' جلد 5' صفحہ 141)۔ (تدوینِ حدیث صفحہ 399)

یعنی حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے انہیں جلایا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر' ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذرِ آتش کر دیا۔

یہ کچھ دارالخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا' اس کے متعلق حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

عمرؓ ابن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلمبند کرلیا جائے۔ مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلمبند کرانا اُن کا مناسب نہ ہو گا۔ تب الاحصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو' چاہئے کہ اسے محوکردے یعنی ضائع کردے۔ (جامع بیان العلم' جلد1' صفحہ 65)۔ (تدوین حدیث صفحہ 400)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے ''قرنِ اوّل میں حکومت کی طرف سے حفاظت واشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امرِ اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت ہے''۔ انہوں نے اس سے پہلے امام ابنِ حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک' اور عراق سے شام تک' شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے' ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ (تدوینِ حدیث صفحہ 286)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ جب قرآنِ کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہوسکتا تھا' انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

یہ ہے کیفیت صحابہ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی —— یعنی

(1) رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

(2) صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور پر لکھی تھیں انہیں' انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔

(3) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدون کردہ مجموعۂ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

(4) حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدون نہیں کرنی چاہئیں۔

(5) حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

(6) اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوئی ہوں تو وہ انہیں ضائع کردے۔

اور

(7) یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا بلکہ' مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں' ایسا دیدہ دانستہ کیا گیا۔

مزید شدت

حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کردی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے

غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ' ابودرداؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا (ان تمام روایات کے لئے دیکھئے ''تذکرۃ الحفاظ'')۔ ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِّ نظر قرار دے دیا جائے' حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عملِ رسول اللہؐ کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ' ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے' نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے' اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں' تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا ان کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآنِ کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا' خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہؐ کے بعد خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا[1]۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کا مسلک' قرآن اور حدیث کے بارے میں۔ جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے' ان کا عہدِ خلافت' اسی مسلک کی محسوس تفسیر ہے ___ یعنی حکومت کے فیصلوں کا مرکز' قرآنِ کریم' اور جو فیصلے سابقہ ادوار (عہدِ نبی اکرمؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے دوران) صادر ہوئے تھے' ان کی حیثیت نظائر (PRECEDENT) کی' جو صرف تائید کا کام دیتے تھے' ناقابلِ تغیر نہیں تھے۔ حضرت عمرؓ کی قرآنِ کریم سے اس درجہ والہانہ وابستگی (اعتصام و تمسّک) اسی بناء پر تھی کہ وہ مرکز و محور تھا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا۔

جمع القرآن

قرآنِ کریم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف بعض ایسی روایات منسوب کی جاتی ہیں' جو بالبداہت وضعی نظر آتی ہیں' لیکن چونکہ انہیں ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) صحیح مانا جاتا ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

پہلے تمہیداً یہ سمجھ لیجئے کہ دین کا تمام تر مدار یقین پر ہے۔ یقین اس امر کا کہ جس بات کو ہم دینی کہتے ہیں وہ بلاشک و شبہ

1۔ اس مقام پر صرف یہیں تک لکھا جا رہا ہے۔ بعد میں احادیث کے مجموعے کس طرح مرتب ہوئے اس کے متعلق آخری باب میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔

اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر اس بنیاد میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آ گرتی ہے۔

قرآنِ کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ اصولی طور پر دین، حضرت نوحؑ سے لے کر نبی اکرمؐ تک ہر رسول کو یکساں طور پر اللہ کی طرف سے ملتا رہا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انبیاءِ سابقہ کی تمام اُمتوں (یہود و نصاریٰ وغیرہ) سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔ اس کی وجہ (منجملہ دیگر وجوہات) وہ یہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو اُن کے انبیاء کو اللہ کی طرف سے ملی تھیں۔ ان میں تحریف و الحاق ہو چکا ہے۔ لہٰذا، اب اس آسمان کے نیچے اللہ کا دین، اپنی حقیقی اور غیر محرّف شکل میں صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے (قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ کس طرح حرفاً حرفاً حقیقت پر مبنی ہے، اُسے میں نے اپنی کتاب ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' میں بدلائل و شواہد واضح کر دیا ہے)۔ چونکہ نبی اکرمؐ اللہ کے آخری نبی تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ اس نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے جو کچھ دینا تھا اسے مکمل شکل میں قرآن میں دے دیا ہے۔ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی (6:116)۔ اس کے ساتھ ہی اللہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ [15:9] ''ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ حفاظتِ قرآنِ کریم کی یہی اہمیت اور ذمہ داری تھی جس کے پیشِ نظر، کتابتِ وحی کے لئے بارگاہِ رسالتؐ میں، ایک چھوڑ چھبیس چھبیس کاتب موجود رہتے تھے۔ اس طرح کتابت کردہ قرآن کی ''ماسٹر کاپی'' (جسے مصحفِ استوانہ یا الامام کہا جاتا تھا) مسجد نبوی میں رکھی رہتی تھی جس سے دیگر صحابہؓ اپنے اپنے نسخے نقل کرتے تھے اس طرح قرآنِ کریم کے متعدد نسخے، رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل اور مرتب شکل میں اُمت کے پاس موجود تھے۔ ان کے علاوہ ہزار ہا کی تعداد میں حفاظ تھے، جنہوں نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھا تھا رسولؐ اللہ کے علاوہ، بڑے بڑے جید صحابہؓ سب حافظِ قرآن تھے۔ قرآنِ کریم کو اس اہتمام کے ساتھ محفوظ کیا گیا تھا۔

لیکن ہماری کتبِ احادیث میں ایسی روایات ملتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم، رسولؐ اللہ کی زندگی میں جمع اور مرتب ہی نہیں ہوا تھا اور یونہی اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ ان روایات میں، سب سے پہلی روایت خود حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی، ملاحظہ فرمائیے۔

> امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کے ساتھ جنگ ہوئی، (حضرت) ابوبکرؓ نے مجھے (یعنی حضرت زید بن ثابتؓ کو) بلایا۔ وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (حضرت) عمرؓ نے مجھ سے کہا ہے کہ قرآن کے حفاظ بڑی تعداد میں شہید ہو چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسولؐ اللہ نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ لیکن (حضرت) عمرؓ اس پر برابر زور دیتے رہے تا آنکہ خدا نے میرا بھی شرح صدر کر دیا اور میں عمرؓ سے متفق ہو گیا۔

(حضرت زیدؓ نے کہا کہ) ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہؐ کی وحی بھی لکھتے رہے ہو‘ لہٰذا تم اس کام کا ذمہ لے لو۔ (حضرت) زیدؓ نے بعد از بسیار تردّد و تامّل اس کام کا بیڑہ اٹھالیا اور قرآن کو جمع کرنے لگ گئے۔ اس کے لئے انہوں نے‘ کاغذوں کے ٹکڑوں‘ کھجور کے پٹھوں‘ پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے اس کی تلاش شروع کردی۔ (انہوں نے کہا کہ) اس طرح میں نے اسے مرتب کرلیا۔ لیکن ایک آیت جسے میں حضورؐ کو پڑھتے سنا کرتا تھا کہیں سے نہ مل سکی۔ میں نے اپنی تلاش جاری رکھی تا آنکہ وہ خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور اسے بھی میں نے قرآن میں درج کردیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک روایت نے قرآنِ مجید کی محفوظیت کے متعلق اس یقین کے کس طرح پرخچے اڑا دیئے ہیں جس پر دین کی عمارت استوار ہے! لیکن ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت زیدؓ کے جمع کردہ قرآن میں آیۂ رجم نہیں تھی (یعنی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ زانی کو سنگسار کرنا چاہیئے)۔ حضرت عمرؓ اس آیت کو لے کر حضرت زیدؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اصول یہ طے کر رکھا ہے کہ جو شخص کوئی آیت لے کر آئے‘ اسے اس وقت درجِ قرآن کیا جائے جب وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک گواہ بھی لائے۔ حضرت عمرؓ کوئی گواہ نہ لاسکے اس لئے یہ آیت قرآن میں درج نہ کی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ ہم رسول اللہؐ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ وہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ:

> قرآن کی دو آیتیں کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی میرے صحیفہ میں موجود تھیں ـــ ایک آیۂ رجم اور دوسری آیۂ رضاعت (جس میں کہا گیا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے)۔ جب رسول اللہؐ نے وفات پائی تو اس حادثے میں مشغول ہو گئے۔ میری بکری آئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اس لئے اب یہ آیتیں تمہیں کہاں سے مل سکیں گی)۔ (ابنِ ماجہ)

اس طرح یہ دو آیتیں قرآن میں درج نہ ہوسکیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ قرآن میں درج نہیں ہوسکیں تو کوئی بات نہیں ہم ان پر عمل اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے (غالباً ان کے دورِ خلافت میں) کہا گیا کہ جب آپ کو اس قدر یقین ہے کہ آیۂ رجم قرآن کی آیت ہے تو آپ اسے داخلِ قرآن کیوں نہیں کر دیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

> اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو ضرور داخلِ قرآن کر دیتا۔

آیت قرآن میں داخل تو نہ ہوئی لیکن عمل اس کے مطابق ہوتا رہا۔

ضمناً، رجم (یعنی زنا کی سزا سنگسار کرنے) کے حکم کی تائید میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت درج ہے۔ (حضرت) عمر ابن میمونؓ کہتے ہیں کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا۔ ان سب نے اُسے سنگسار کر دیا۔ میں نے ان کے ساتھ اسے سنگسار کیا۔[1]

(بخاری۔ پارہ پندرہ۔ باب قیامت)

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس قسم کی وضعی روایات جن سے قرآن کریم کی محفوظیّت کے متعلق شکوک در شکوک ابھرتے چلے آئیں، (منجملہ دیگر صحابہؓ) حضرت عمرؓ کی طرف بھی منسوب کی گئی ہیں۔ یہ قرآن (اسلام) کے خلاف بڑی گہری سازش تھی۔ اس کے متعلق وضاحت سے آخری باب میں لکھا جائے گا۔

فقۂ عمرؓ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ اللہ سے تدبّر فی القرآن کی دعائیں مانگتے رہے۔ وہ ساری عمر اللہ کی اس کتابِ عظیم میں خود بھی غور و فکر کرتے رہے اور دیگر صحابہؓ کو بھی اس کی تاکید اور تلقین کرتے رہے۔ وہ تاکید کیا کرتے تھے کہ قرآن کے محض قاری (پڑھنے والے) نہ بنو، اس کے فقیہہ بھی بنو۔

اِسلامی مملکت کے سربراہ کے لئے تفقہ فی القرآن کی ضرورت

قرآنِ کریم میں تفقہ یوں تو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ خود قرآنِ کریم نے بار بار اس کا حکم دیا ہے، لیکن جس شخص نے اسلامی مملکت کے امور کی سرانجام دہی کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں، اس کے لئے تفقہ فی القرآن لاینفک ہو جاتا ہے، اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآنِ کریم میں، (چند جزئی احکام کے سوا) کلّی قوانین اور اصولات دیئے گئے ہیں، اور یہ چیز اسلامی مملکت پر چھوڑی گئی ہے کہ وہ، ان اصول و قوانینِ کلّی کی روشنی میں، اپنے اپنے حالات کے مطابق، جزئی یا فروعی قوانین خود مرتب کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام، تفقہ فی القرآن کے بغیر ناممکن ہے۔ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مملکت بڑی وسیع ہو گئی تھی، اور نت نئے حالات اور تقاضے سامنے آتے تھے، اس لئے، ان تقاضوں کے حل کے لئے قرآنِ کریم سے استنباطِ احکام، ایک مستقل فریضہ قرار پا گیا تھا (اس اجمال کی تفصیل، آگے چل کر اُس باب میں دی جائے گی جس کا عنوان ''سیاسی نظام'' ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس باب کے بھی اس ذیلی گوشے میں جس کا تعلق اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اصول سے ہے)۔ اس وقت ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جب تفقہ فی القرآن حضرت عمرؓ کا عام زندگی میں بھی معمول تھا، تو خلافت کی

1۔ ان امور کی تفصیل کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' ملاحظہ فرمایئے۔

ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہوگا۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء خلافتِ راشدہ کے احوال و کوائف کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ایک مبسوط تصنیف ہے اور اس میں عہدِ فاروقیؓ کی سرگزشت قریب ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہے —— رسالہ در مذہب فاروقِ اعظمؓ۔ اس میں انہوں نے ان فقہی مسائل سے بحث کی ہے جنہیں حضرت عمرؓ نے قرآنِ کریم سے مستنبط فرمایا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ فقہ کے جس قدر مسائل حضرت عمرؓ سے منقول ہیں ان کی تعداد یوں تو ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن ان میں جن مسائل کو تقدّم حاصل ہے' ان کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہیں۔ اور شاہ ولی اللہؒ نے انہی مسائل کی تفصیل اپنے رسالہ میں دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ان تمام مسائل کی تفصیل اپنی کتاب میں دے سکیں۔ اس لئے ہم ان کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

صرف عملی مسائل کے متعلق

مذکورہ بالا تعداد کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی چاہئے۔ ہمارے ہاں فقہ کی کتابوں میں دیکھئے' باب در باب' ایسے مسائل کے متعلق بحث و تمحیص کے لئے وقف ہوں گے جو درحقیقت کسی کو پیش نہیں آئے لیکن فرض کرلیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہو تو پھر کیا فتویٰ دیا جائے ان ''لو فرضنا'' کی بیکار بحثوں اور ان کی تائید و تردید میں لاطائل دلیلوں نے جہاں ہماری کتبِ فقہ کو خواہ مخواہ ''زنبیلِ عمر'' بنا دیا ہے وہاں اسے اس قدر الجھا دیا ہے کہ اس بھول بھلّیاں سے نکلنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ حضرت عمرؓ عملی انسان تھے اس لئے وہ کبھی ایسے مسائل کے متعلق گفتگو نہیں کیا کرتے تھے جو عملاً درپیش نہ ہوں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے ایک ایسے مسئلہ کا جواب معلوم کرنا چاہا جو اسے دراصل پیش نہ تھا' تو آپ نے اس سے کہا کہ ''ضرورت پیش آنے سے پیشتر' فرضی طور پر ذہن میں سوال قائم نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی اس کے جواب کی تلاش میں مارے مارے پھرنا چاہئے''۔ ایسا کرنے والے کو آپ نے سختی سے ڈانٹا اور ملعون قرار دیا اور اس کا برسرِ منبر اعلان کیا۔ لہٰذا' فقہِ عمریؓ انہی مسائل پر مشتمل ہے جو اُس زمانے میں درحقیقت پیش آئے تھے۔

فقہِ عمریؓ کی مثالیں

(1) قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرلینے کی اجازت دی ہے (5:5)؛ چنانچہ مسلمان ان سے نکاح کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان (اہلِ کتاب کی) عورتوں کے' مسلمانوں کے گھروں میں آجانے سے' فتنے کا دروازہ کھل رہا ہے تو آپ نے اس کی ممانعت کردی۔ حتیٰ کہ حضرت حذیفہؓ (گورنر مدائن) نے جس یہودی عورت سے شادی کرلی تھی' آپ نے لکھا کہ اسے طلاق دے دی جائے۔

اس سے ایک نہایت اہم قانونی مسئلہ مستنبط ہوا۔ اور وہ یہ کہ جن امور (کا قرآن نے حکم نہیں دیا بلکہ ان) کی محض اجازت دی ہے' اسلامی مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ اس سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے' تو اس اجازت کو معطل قرار دے

دے۔ (وہ اسے منسوخ نہیں کرسکتی، مصالحِ اُمت کے پیشِ نظر اس اجازت کو وقتی طور پر روک سکتی ہے)۔

(2) قرآنِ کریم میں زانی مرد اور زانی عورت کے لئے سزا مقرر کر دی گئی ہے (24:2) لیکن اس میں زنا بالجبر کے سلسلہ میں بالتصریح کچھ نہیں کہا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک ایسا مقدمہ سامنے آیا جس میں عورت سے بالجبر زنا کیا گیا تھا۔ آپ نے اسے سزا نہیں دی۔

اس سے بھی یہ اہم قانونی نکتہ مستنبط ہوا کہ مجبور مستوجب سزا نہیں ہوتا۔ اور یہ منشائے قرآنی کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جُرم وہی قابلِ مواخذہ ہے جس کے ساتھ دل کا ارادہ شامل ہو (33:5) اور اسی بناء پر اس نے قتلِ عمد اور قتل بالخطاء میں فرق کر دیا ہے (4:92-93)۔

(3) قرآنِ کریم نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ ''قاتل، مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا''۔ آپ نے دیکھا کہ اس فیصلے سے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ بند کر دیا گیا جس کی رُو سے ہمارے ہاں جائیدادوں کی خاطر آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ سے یہ جزئیہ بھی مستنبط ہوگیا کہ اسلامی حکومت، قرآنِ کریم کے کسی مطلق حکم کو (یعنی جس میں کوئی شرط نہ عائد کی گئی ہو) مقیّد کر سکتی ہے ___ یعنی اس پر عندالضرورت شرائط عائد کر سکتی ہے۔

(4) ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مَرد صرف زانیہ (عورت) سے، اور زانیہ عورت، صرف زانی مرد سے نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کی سند میں قرآنِ کریم کی آیت (24:3) پیش کی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک، اس آیۂ قرآنیہ کا مطلب یہ نہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا اس سے ایک اور قانونی نکتہ واضح ہوتا ہے۔

ایک شخص نے اپنی لڑکی کا عقد ایک آدمی سے کر دیا لیکن اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ میری وجہ سے تمہاری خفت نہ ہو کیونکہ مجھ سے ایک مرتبہ زنا کا ارتکاب ہو چکا ہے۔ یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ کیا اس عورت نے توبہ کی ہے؟ جواب ملا کہ اس نے توبہ کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تب اس سے نکاح جائز ہے۔

نکتہ یہ مستنبط ہوا کہ توبہ کے بعد (جسے عدالت تسلیم کرلے، اور اس طرح سزا معاف کر دے) اس جرم کا دھبہ مجرم سے مٹ جاتا ہے اور اس کے عواقب باقی نہیں رہتے۔

(5) ہمارے ہاں یہ، وجۂ تذلیلِ انسانیت اور یکسر خلافِ قرآن رسم عام ہے (اور اسے بدقسمتی سے مشروع سمجھا جاتا ہے) کہ خاوند، کھڑے کھڑے بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیتا ہے۔ اس سے بیوی پر ایسی طلاق پڑ جاتی ہے جس کے بعد یہ دونوں آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ نکاح اُسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ اسے، شب بسری کے بعد، طلاق دے دے۔ اس شرم و حیا سے عاری رسم کو حلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میرے

پاس حلالہ کرنے والا' اور جس کے لئے حلالہ کیا جانا مقصود ہو' لایا گیا تو میں دونوں کو رجم (سنگسار) کی سزا دوں گا۔ حتیٰ کہ آپ نے ایک واقعہ میں' اس عورت کو بھی سزا دی جو اس فعلِ شنیع میں واسطہ (دلالہ) بن رہی تھی۔

اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ جن امور کو قرآنِ کریم نے بالتصریح جرم قرار نہیں دیا' اسلامی مملکت انہیں' روحِ قرآنی کی روشنی میں' جرم بھی قرار دے سکتی ہے اور ان کی سزا بھی مقرر کر سکتی ہے۔

(6) مروجہ قانون کی رُو سے' قانون کی عدم واقفیت' ارتکابِ جُرم کا عذر نہیں قرار پا سکتی۔ یعنی کوئی شخص یہ کہہ کر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ ایسا کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ قانون کا یہ مسئلہ آج ساری دنیا میں رائج ہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ ایک مقدمہ میں یہ ثابت ہو گیا کہ مجرم کو واقعی علم نہیں تھا کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس دفعہ اسے معاف کیا جائے۔ لیکن اس کے بعد اگر یہ اس جرم کا اعادہ کرے' تو پھر مستوجبِ سزا قرار پائے گا۔ فلہٰذا' آپ نے ایسا انتظام کیا کہ قانون کا علم عام ہو جائے۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی منشائے قرآنی کے عین مطابق ہے۔ سورۃ انعام میں ہے کہ مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ہمارے پیغام بر آئے تھے جنہوں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اور جب وہ اس کا اقرار کریں گے کہ انہیں ایسا بتا دیا گیا تھا تو پھر انہیں سزا ملے گی (6:131)۔ حضرت عمرؓ کا استنباط اس آیۂ جلیلہ سے تھا۔

ہم انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ حضرت عمرؓ کس طرح قرآنِ کریم پر غور و تدبر کرتے تھے' اور اس کی کلیات سے استنباطِ جزئیات کرنے کے لئے ان کا انداز اور مسلک کیا تھا۔ ان امور کی تفاصیل آئندہ (متعلقہ) عنوانات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔ وبیدہ التوفیق۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پانچواں
باب

زِندگی جُہد است و اِستحقاق نیست

رسولؐ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ فرمایا کہ جب جہاد ہورہا ہو تو اُس میں شریک ہو اور جب نہ ہورہا ہو تو اُس کی تیاری میں مصروف ہو۔

سابقہ باب کے سرِعنوان ہم نے لکھا تھا ـــــ دستِ اُو جز تیغ و قرآنے نداشت ـــــ قرآن کی بات اُس باب میں کی گئی تھی' اب تیغ کی باری آتی ہے۔

جہاد کے معنی ہیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہدِ مسلسل' سعیٔ پیہم' عملِ متواتر' تگ و تازِ لامنتہیٰ۔ یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ جدوجہد' یہ تگ و تاز' یہ سعی و کاوش' یہ حرکت و عمل' بالآخر کس مقصد کے لئے؟ مقصد کی وضاحت تو بعد میں کی جائے گی' علمائے علم الحیات اور نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خود زندگی کا تقاضا ہے' بلکہ خود زندگی ہے۔ زندگی نام ہی سعیٔ مسلسل اور حرکتِ پیہم کا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں' ـــــ زندگی جُہد است و اِستحقاق نیست ـــــ حرکت' علامت ہے حیات کی ـــــ ہستم اگر می رَوم' می نَروم نیستم۔

اس حد تک حرکت و حرارت اور سعی و عمل' ہر ذی حیات کا فطری شعار ہے جس میں انسان بھی شامل ہے۔ اس کا مقصد جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) ہے۔ زندگی جہاں بھی ہے وہ اپنا تحفظ چاہتی ہے' اور اس کی سعی و کاوش اسی مقصد کے لئے ہے۔ لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر' اس سعی و عمل کا مقصد' طبیعی زندگی کی حفاظت کے علاوہ' ایک اور بھی ہوتا ہے۔ اس کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اگر یہ مقصد سامنے نہ ہو تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اِنسانی سطحِ زندگی

کائنات میں خیر و شر' حق و باطل' تعمیری و تخریبی قوتیں ہر وقت مصروفِ جدوجہد رہتی ہیں لیکن ان کی یہ جدوجہد ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے کے لئے ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ [21:18] ''حق اور باطل ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے رہتے ہیں''۔ حق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کا غلبہ رہے

تا کہ انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائے۔ چونکہ ان اقدار کا غلبہ وتسلط' استحصال پسند گروہوں کی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے' اس لئے وہ اس سعی و کاوش کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح ان دونوں جماعتوں میں مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے۔

جہاد اور قتال

اس تصادم کی آخری جولانگاہ میدانِ کارزار ہوتا ہے جہاں یہ قوتیں' جان کی بازی لگا کر' ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہو جاتی ہیں۔ جہاد کی اس آخری منزل کو قتال (جنگ) کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاد صرف قتال کو نہیں کہتے' زندگی کی ہر جدوجہد کو جہاد کہا جاتا ہے اور قتال بھی جہاد میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے بعض اوقات' لفظ جہاد کو قتال کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرمؐ کا جو ارشادِ گرامی زیبِ عنوان ہے' اس میں جہاد کا لفظ قتال کے معنوں ہی میں استعمال کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے' ہر مومن' مجاہد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد میدانِ جنگ میں لڑنے والا سپاہی ہی نہیں اس کا مطلب' زندگی کے ہر گوشے میں حق کی خاطر مصروفِ جدوجہد اور سرگرمِ عمل رہنے والا' حرکت اور حرارت کا زندہ و پائندہ پیکر' مردِ خدا ہے۔ قرآنِ کریم نے مجاہدین کے مقابلہ میں قاعدین کا لفظ لا کر' اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط مومنوں میں سے قاعدین (بجز اس کے کہ وہ کسی وجہ سے معذور ہوں) مجاہدین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ قاعدہ کے معنی ہوتے ہیں' بیٹھا رہنے والا' یا کسی کام میں سُستی اور تاخیر کرنے والا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے' بیٹھے رہنے والے یا سُست خرام لوگ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کی راہ میں مصروفِ جدوجہد اور مشغولِ حرکت و عمل رہیں۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ط...... فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا [4:95] اللہ نے' مجاہدین کو قاعدین کے مقابلہ میں بلند درجہ اور اجرِ عظیم عطا کیا ہے۔ دیکھئے' یہاں مجاہدین صرف انہی کو نہیں کہا جو اپنی جانوں کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ اس نے ان لوگوں کو بھی مجاہدین کہا ہے جو اپنے مال و دولت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو زندگی کے ہر گوشے میں' اس مقصد کے حصول کے لئے جو اللہ نے مقرر کیا ہے' ہر آن مصروفِ سعی و کاوش رہتے ہیں اور جب مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ کا آخری مرحلہ سامنے آتا ہے تو شمشیر بدست اور کفن بدوش میدانِ جنگ میں باہر نکل آتے ہیں اور یہ جہاد کا بلند ترین مقام اور افضل ترین درجہ ہے۔

ہجرت سے مقصود

زندگی کی اس جدوجہد کا پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں انسان کو' حصولِ مقصد کی خاطر' بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے —— آرام و

آسائش کو چھوڑنا پڑتا ہے' خورد ونوش کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے' گھر بار کو چھوڑنا پڑتا ہے' اہل وعیال اور خویش واقارب کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ بڑی بڑی دلکش اور جاذبیت کی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے حتیٰ کہ اگر دیکھا جائے کہ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے' اپنے وطن کے مقابلہ میں کوئی دوسری جگہ زیادہ سازگار ہے تو وطن کو بھی تیاگ دینا پڑتا ہے۔ حق کی خاطر' زندگی کی ان آسائشوں اور دامن کشیوں کو چھوڑ دینا' قرآن کی اصطلاح میں ہجرت کہلاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح میدانِ جنگ میں قتال بھی جہاد کہلاتا ہے' اسی طرح ہجرت کا لفظ بھی عام طور پر ترکِ وطن کے لئے بولا جاتا ہے لیکن جس طرح جہاد کو میدانِ جنگ تک محدود کر دینا صحیح نہیں اسی طرح ہجرت کو محض ترکِ وطن قرار دے دینا بھی اس کے وسیع مفہوم کو مقیّد کر دینا ہے۔ ہجرت' ہر اس شے سے کنارہ کشی کے مُرادف ہے جو حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے اور اس کی آخری شکل ترکِ وطن ہے۔ سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ ہجرت' دین کے عظیم پروگرام کا حصہ لا ہے اور جہاد اس کا مرحلۂ اِلّا۔ مردِ مومن (جسے اللہ کا سپاہی کہنا چاہئے) مہاجر بھی ہوتا ہے اور مجاہد بھی۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے اس حصہ لا (یعنی ہجرت) کی وضاحت کس انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ ''اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دیں کہ اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد' تمہارے خویش واقارب اور بیویاں' تمہارے اہلِ خاندان اور مال ودولت' تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف ہوتے ہو' اور تمہارے محلّات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو''۔ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے نزدیک' اللہ اور رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو گئی' تو فَتَرَبَّصُوْا انتظار کرو۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ تاآنکہ تمہارے متعلق اللہ کا فیصلہ تمہارے سامنے آ جائے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [9:24] مقصدِ خداوندی کے حصول کے راستے میں اگر ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے دامن گیر ہو گئی تو اُسے فسق کہا جائے گا اور قومِ فاسقین پر رُشاد کی راہیں کبھی نہیں کھلتیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہجرت کا مرحلہ لا کس طرح جہاد کے لئے شرطِ اوّلین (PRE-REQUSITE QUALIFICATION) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں حصے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ جس شخص کا دامن' راستے کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ جائے' وہ منزلِ مقصود تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں' زِ اسبابِ ثباتِ مسلم است

مہاجرین اور مجاہدین

ثباتِ زندگی' جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے اور اس جدوجہد کا مرحلۂ اوّلین' ہر اس شے سے قطع تعلق کر لینا ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہو۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے مہاجرین اور مجاہدین کو ایک ہی سکہ کے دو رُخ اور ایک ہی حقیقت کے دو گوشے قرار دیا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْفَآئِزُوْنَ [9:20] جن لوگوں نے قوانینِ خداوندی کی صداقت کا اقرار کیا' پھر اس کی راہ میں جس چیز کو چھوڑنے کی ضرورت پڑی' اسے بِلا تکلف و بلا تأمل چھوڑ دیا' اور حصولِ مقصد کے لئے اپنے مال اور جان سے مصروفِ جدوجہد رہے' اللہ کے ہاں اُن کے درجات بہت بلند ہیں اور یہی لوگ ہیں جنہیں کامیاب و کامران کہا جائے گا۔ نہیں! ایک قدم اور آگے بڑھئے اور جو بات سورۂ انفال میں کہی گئی ہے اسے بڑے غور سے سنئے۔ کہا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ [8:74] جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اور جن لوگوں نے انہیں ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی' یہ سب پکے اور سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزقِ کریم کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس سے ذرا پہلے اس کی بھی وضاحت کردی کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا [8:72] جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن انہوں نے (بلا عذر) ہجرت نہیں کی تو ان کی حفاظت کا ذمہ تمہارے اوپر عائد نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ ہجرت نہ کریں۔ یہ اس لئے کہ' جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے' ہجرت جہاد کی منزلِ اوّل ہے۔ جو اس منزلِ اوّل میں پورا نہیں اُترتا وہ منزلِ دوم میں کیا کرے گا!

جان دے دینا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مومن کی زندگی ہجرت اور جہاد سے ترتیب پاتی ہے۔ یعنی اُس کی زندگی کا جو مقصد اللہ نے مقرر کر دیا ہے (یعنی دنیا میں قرآن کے نظامِ حق و صداقت کو قائم کرنا اور غالب رکھنا) اس کے راستے میں جو شے حائل ہوتی ہو' اسے بلا تأمل چھوڑ دینا' اور اس (مقصد) کے حصول کے لئے مثبت طور پر ہر قسم کی جدوجہد کرنا' حتیٰ کہ اگر اس کے لئے جان بھی دینی پڑے تو اُسے بھی بلا تذبذب و بلا توقف حاضر کر دینا۔ اس مقصد کی خاطر جان دینے کو اللہ نے بلند ترین عمل اور منتہائے جہاد قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ انسان (بلکہ حیوانات) کے متعلق جس قدر تحقیقات عمل میں آئی ہیں' ان کا ایک نتیجہ ایسا ہے جسے متفق علیہ اور ہر اعتبار سے یقینی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ نتیجہ یہ ہے کہ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) زندگی کا اوّلین' بنیادی اور اٹل تقاضا ہے۔ یعنی (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) زندگی جہاں بھی ہے وہ ہر حال میں' اور ہر قیمت پر' اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ زندگی کے اوّلیں جرثومہ سے لے کر حیوانات تک' ان کا انفرادی اور اجتماعی مقصد' تحفظِ خویش (اور اس کے بعد افزائشِ نسل) سے زیادہ کچھ نہیں' بلکہ یوں کہئے کہ افزائشِ نسل بھی درحقیقت تحفظِ خویش ہی کا ایک ذریعہ ہے یعنی یہ انواع اپنے افراد کے طبیعی خاتمے کے بعد' اپنا تحفظ اور بقاء اپنی نسل کے تسلسل سے قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے سامنے اس سے بلند مقصد اور کوئی نہیں۔ انسان کی طبیعی زندگی بھی حیوانی زندگی ہی ہے اور اس کے تقاضے بھی وہی جو دیگر حیوانات کی زندگی کے تقاضے ہیں۔ ان میں' جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے' تحفظِ خویش کا تقاضا اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن انسانی زندگی' حیوانی زندگی سے ایک حیثیت سے متمیز ہے' اور وہ یہ کہ انسان کے

سامنے طبیعی تقاضوں کے علاوہ' اوران سے بلند ایک اور تقاضا بھی ہے اور وہ تقاضا ہے نظامِ حق وصداقت کو بلند اور غالب رکھنا۔ جن علائق کو ہم نے اس راستے میں رکاوٹیں کہا ہے' وہ درحقیقت وہ مقامات ہیں جہاں زندگی کے کسی طبیعی تقاضے اور انسانیت کے اس بلند مقصد میں ٹکراؤ واقع ہوتا ہو۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر' ان طبیعی تقاضوں کو چھوڑتے چلے جانا' ہجرت ہے۔ لیکن اس تصادم میں آخری مقام وہ آجاتا ہے جس میں خود زندگی اور اس بلند مقصد میں تصادم واقع ہوجاتا ہے' یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے جان دے دینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ چونکہ تحفّظِ خویش' زندگی کا بنیادی تقاضا ہے' اس لئے یہ مقام بڑی سخت آزمائش کا ہوتا ہے اور جو یہاں پورا اُترے وہ طبیعی اور حیوانی زندگی کی سطح سے بلند ہوکر' زندگی کی اگلی ارتقائی منزل میں پہنچنے کے قابل قرار پاجاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے دعویٰ ایمان کے پرکھنے کا معیار قرار دیا ہے۔ اس نے اسلامی نظام کے مخالفین سے کہا کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [2:94] اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔

ایمان سے کیا مراد ہے

سوال یہ ہے کہ وہ ایمانؔ' وہ دعویٰ کیا ہے جس کی صداقت کے پرکھنے کا معیار موت کی تمنا قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی بھی دیگر حیوانات کی طرح بس طبیعی زندگی ہے۔ انسان بھی حیوانات کی طرح کھاتا پیتا' سوتا جاگتا' افزائشِ نسل کرتا اور اس کے بعد مرجاتا ہے اور موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کو وہ کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ [47:12] کفر کا شیوہ اختیار کرنے والوں کا انداز یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور دیگر متاعِ دنیا سے فائدہ اٹھاتے ہیں (اور اس کے بعد مرجاتے ہیں)۔ ان کے برعکس' مومن کی کیفیت یہ ہے کہ — وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ [2:4] وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ زندگی ایک جوئے رواں کی طرح آگے بھی چلتی ہے اور اللہ کی وحی وہ ضابطۂ حیات عطا کرتی ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان' زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی ہو' اس کے لئے تحفّظِ خویش بنیادی اور آخری مقصدِ حیات ہوگا۔ وہ کبھی مرنا نہیں چاہے گا۔ وہ موت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اور یہ جاننے کے باوجود کہ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ [4:78] تم کہیں بھی ہو' موت تمہیں ضرور پکڑ لے گی۔ موت سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں' اس نے آکر رہنا ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود' موت سے بھاگے بھاگے پھرے گا' اور اس کے سامنے آنے کے احساس سے ہر وقت تَرساں و لَرزاں رہے گا۔ اس کے برعکس' ایمان بالآخرت کا حامل' موت کو ایک نئی منزل میں داخل ہونے کا دروازہ سمجھے گا اور تبسم بَرلب اس کا استقبال کرے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈال کر موت کے منہ میں چلا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ اسے حق وصداقت کے تحفظ اور اعلائے کلمۃ اللہ (اللہ کے متعیّن کردہ نظریۂ حیات) کے غلبہ و

کامرانی کے لئے جان تک بھی دینی پڑے، تو وہ جان بچانے کی خاطر بھاگ نہیں جائے گا۔ وہ مردانہ وار موت کا سامنا کرے گا اور ہنسی خوشی جان دے دے گا۔ یوں موت کی تمنا اس کے دعوائے ایمان کی صداقت کی شہادت قرار پا جائے گی۔

شہادت

اس طرح جان دینے والوں کو، جو عام اصطلاح میں، شہید کہا جاتا ہے تو وہ اسی لئے کہ ان کی موت، ان کے دعوائے ایمان کی شہادت (گواہی) دیتی ہے۔ کشمکشِ حیات میں موت کے ڈر سے، راہِ فرار اختیار کرنے والوں کو قرآن مُردے کہہ کر پکارتا ہے۔ ایسے مُردے جو اپنی لاشیں اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ تم نے ان کی حالت پر بھی غور کیا جو اگرچہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، لیکن جب دشمن کے ساتھ مقابلہ کا وقت آیا تو اپنا گھر بار چھوڑ کر، موت کے ڈر سے بھاگ اٹھے۔ وہ بھاگ اُٹھے تو فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا [2:243] خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پیچھے سے آواز دی کہ تم موت کے ڈر سے بھاگ نکلے ہو، اور یوں اپنے آپ کو زندہ خیال کرتے ہو۔ یہ تمہاری خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔ تم سانس ضرور لیتے ہو لیکن موت تو تم پر طاری ہو چکی ہے۔ تمہارا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا، تم مُردہ ہو۔ ان کے برعکس، جو لوگ حق و باطل کی کشمکش میں اعلائے حق کی خاطر جان دے دیں، ان کے متعلق کہا کہ اگرچہ طبیعی نقطۂ نگاہ سے وہ مر چکے ہیں، بَلۡ اَحۡيَآءٌ [2:154] لیکن وہ درحقیقت زندہ ہیں۔ انہیں تم مُردہ مت سمجھو، مُردہ مت کہو (3:168)۔ قرآن کی دعوت، انسان کو موت کے خوف سے نجات دلا کر حیاتِ ابدی عطا کرنے کی دعوت ہے۔ اسی لئے اس نے کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ [8:24] تم اللہ اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں حیاتِ ابدی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس زندگی کو قابلِ رشک، حیاتِ خوش آئند اسی لئے کہا ہے کہ اس میں موت کا خوف دامن گیر نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس قسم کی موت مرنے والا، خود نہیں مرتا بلکہ موت کو مار دیتا ہے اور فاتح و منصور، رقصاں و فرحاں، یہ پکارتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى [37:58-59] ہم نے اس طرح مر کر، موت کو مار دیا ہے، اب ہم کبھی نہیں مر سکتے۔

جنت کا راستہ

اسی کو جنت کی زندگی کہتے ہیں، جس تک پہنچنے کا راستہ، باطل کی قوتوں کے ساتھ تصادمات و تزاحمات سے پٹا پڑا ہے۔ اسی لئے کہا کہ:

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم ہنوز ان جانگداز اور صبر آزما مراحل میں سے نہیں گزرے جن میں سے ان لوگوں کو گزرنا پڑا تھا جو تم سے پہلے ان راستوں پر چلے تھے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیتیں۔ شدائد و مشکلات سے ان کا دل دہل جاتا۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار

اُٹھتے کہ بارِالٰہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ہمت شکن اور جرأت آزما تصادمات کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں (2:214)۔

تمہیں بھی، جنت میں داخل ہونے کے لئے انہی مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔

دوسری جگہ ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ [3:142] کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تم میں سے مجاہد کون ہے اور کون کس حد تک مشکلات اور مصائب میں ثابت قدم رہتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے، یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی ان (اور اسی قسم کی دوسری) آیات کا، یہ مطلب نہیں کہ جو شخص جنگ کی مشکلات وصعوبات سے دوچار نہیں ہوتا وہ جنت میں جا ہی نہیں سکتا —— ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص (حتیٰ کہ ایک قوم) کی زندگی میں جنگ کا موقعہ ہی نہ آئے۔ خود نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کی زندگی میں مکّہ کے تیرہ سال ایسے گزرے جس میں جنگ کا موقعہ نہیں آیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو مومنین اس زمانے میں وفات پا گئے وہ جنت کے کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ اِن ارشاداتِ خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہے جس میں ہر قسم کے خطرات کا ہر وقت امکان ہے۔ اس لئے اسے ان خطرات کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ اگر ان حالات میں، کسی وقت خطرہ سچ مچ سامنے آجائے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ اس مقابلہ میں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے۔ اور اگر ایسا وقت نہ آئے تو اس میں اس کا قصور نہیں۔ وہ تو اس کے لئے ہر وقت آمادہ اور تیار تھا۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کہہ دیا ہے کہ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ [3:157] اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ یا تمہیں ویسے ہی موت آجائے، تو ہر دو صورتوں میں تم اللہ کی مغفرت کے حقدار ہو جاؤ گے۔

مجاہدین کے اعمالِ صالحہ

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، جنت کی طرف جانے والا راستہ، خطرات اور مشکلات سے پٹا پڑا ہے اور انہی کے مقابلہ سے انسانی ذات کی وہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں جو اُسے حیاتِ ابدی کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور یہی وجہ ہے کہ اس راستہ پر چلنے والے، مردانِ جفاکیش و ثبات طلب کے ہر قدم کو عملِ صالح کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ

(اللہ کے یہ سپاہی) بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو جھیلتے ہیں، جس تکان اور مشقت کو وہ برداشت کرتے ہیں، ان کا ہر قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جو دشمن کے لئے غیظ وغضب کا موجب ہوتا ہے، حتیٰ کہ ہر نقصان جو انہیں مخالفین کی طرف

سے پہنچتا ہے اور ہر گزند جو وہ اٹھاتے ہیں' ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ کا قانونِ مکافات کسی کا حُسن کارانہ عمل ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح' یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں —— خواہ تھوڑا ہو یا بہت —— یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں' وہ سب ان کے اعمالنامہ میں لکھ لئے جاتے ہیں تاکہ اللہ ان کے حُسنِ عمل کا انہیں بہترین بدلہ دے (9:120-21)۔

اس لئے کہ کسی بلند مقصد کے حصول کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں (بشرطیکہ وہ ذرائع ضابطۂ خداوندی کے مطابق ہوں) وہ خود اس مقصد کا جزو بنتے چلے جاتے ہیں' اور ان ذرائع کو اختیار کرنے والے' ان مفادات کے برابر کے حقدار جو اس مقصد کے حصول سے مرتب ہوں۔ خواہ وہ باقی افرادِ کارواں کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا راستے ہی میں وفات پا جائیں۔ سورۂ نساء میں ہے:

جو اپنا گھر بار' سب کچھ چھوڑ چھاڑ' اللہ کی راہ میں نکل کھڑا ہو' اسے منزل پر پہنچنے کے بعد سامانِ حفاظت اور زندگی کی خوشگواریاں بافراط میسر آ جائیں گی۔ لیکن اگر وہ منزل تک نہ بھی پہنچ سکے اور اُسے راستے ہی میں موت آ جائے تو بھی اس کا اجر اللہ کے ذمہ واجب ہو جائے گا (4:100)۔

یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ اللہ کے متعیّن فرمودہ مقصد کے حصول کے لئے' اٹھ کھڑا ہو اور دنیاوی مفاد و متاع کی جس قدر جاذبیتیں اور لذائذ و حظائظ کی جس قدر دلکشیاں اس کی دامن کش اور عناں گیر ہوں' انہیں جھٹک کر الگ کر دے۔ راستے میں جس قدر مشکلات و خطرات سامنے آئیں' ان کا ڈٹ کر' مَردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس میں موت آ جائے تو بھی اس کی خوش نصیبی' اور منزلِ مقصود تک زندہ پہنچ جائے تو بھی بیدار بختی۔ قرآن کے الفاظ میں:

اس راستے میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا' کہیں سامانِ خورونوش کی کمی ہوگی۔ کہیں مال کا نقصان ہوگا کہیں جان کا اتلاف' کہیں فصلیں اجڑیں گی اور باغات تباہ ہوں گے۔ یہ تمام خطرات اور نقصانات سامنے آئیں گے لیکن کامرانیوں اور فائز المرامیوں کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہ اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹے گی کہ —— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہمارا مقصد اللہ کے پروگرام کو پورا کرنا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلات آتی ہیں تو آئیں ہم ان سے ڈر کر' منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے (2:156)۔

یہ ہیں وہ اربابِ عزم و ہمم' اور پیکرانِ ثبات و استقامت جن کے متعلق کہا کہ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْمُهْتَدُوْنَ [2:157] ان کے نشو ونما دینے والے کی طرف سے ان پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اوران پر نوازشاتِ خداوندی کی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر کہا کہ "نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف — نیکی یہ ہے کہ تم (علاوہ دیگر امور) مخالفین کے ساتھ مقابلہ کے وقت مشکلات ومصائب میں کس حد تک ثابت قدم رہتے ہو (2:177)۔ چھوٹی موٹی مصائب اور مشکلات تو ایک طرف' اُن کے عزم و یقین اور ثبات و استقامت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ — جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے دشمنوں نے تمہارے خلاف ایک لشکرِ جرار جمع کرلیا ہے اس لئے تمہیں ان سے ڈرنا چاہئے فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ تو اس سے ان کا ایمان اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ [3:173] اور وہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بہت بڑا ہے تو ہوا کرے' قانونِ خداوندی کی نصرت اور تائید ہمارے شاملِ حال ہے اور یہ وہ قوت ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ [3:174] یہ اس عزم و یقین کے ساتھ میدانِ کارزار میں آگے بڑھتے ہیں اور کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر' نعمائے خداوندی کی جھولیاں بھر بھر کر واپس آتے ہیں — حقیقت یہ ہے کہ قانونِ خداوندی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا پُر ثمر اور بارآور واقع ہوا ہے۔

منافقین کی حالت

یہ مومنینِ حقّا — پکے اور سچّے مومنین کی خصوصیات ہیں۔ ان کے برعکس' قرآنِ کریم نے ایک اور طبقہ کا بھی ذکر کیا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ معاملہ اگر رسمی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ تک رہے تو وہ چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہیں گے لیکن اگر کہیں جنگ کی بات آجائے تو ان پر کپکپی چھا جائے گی۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ نساء میں کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا کہ جب تک دین کا نظام اپنے ابتدائی مراحل سے گزرتا رہا جس میں تمہیں ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا تھا' اور تمہاری جماعت' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ابتدائی تربیتی منازل سے گزر رہی تھی' تو وہ بہت خوش تھے۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ لیکن جب دین کا اگلا پروگرام سامنے آیا جہاں مخالفین سے ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا اور انہیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ' انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگ گیا جیسے خدا کے قانونِ مکافات سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ۔ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ اور کہنے لگا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض قرار دے دیا لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو ہمیں کچھ عرصہ کے لئے مہلت دے

دے تا کہ ہم متاعِ حیات سے اور نفع اندوز ہو جائیں۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۚ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا [4:77]
اے رسولؐ! ان سے کہئے کہ تم دنیاوی زندگی کا کتنا ہی ساز و سامان کیوں نہ اکٹھا کرلو' وہ اُخروی زندگی کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں بہرحال قلیل بھی ہوگا اور کہتر بھی۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تا کہ ان نعماء سے فیض یاب ہو سکو۔ تمہاری کوششوں کے نتائج میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ:

جماعتِ مومنین کی بے تابیٔ تمنا کا یہ عالم ہے کہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب جہاد کا حکم ملے۔ ان کے برعکس' یہ منافقین ہیں کہ جب کوئی ایسی آیت نازل ہو جس میں متعین طور پر جنگ کا ذکر کیا گیا ہو تو اے رسولؐ! وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگ جاتے ہیں گویا انہیں ابھی غش آ جائے گا —— یہ کیسے شوریدہ بخت اور بدنصیب لوگ ہیں (47:20)۔

قتال فرض قرار دیا گیا

یہی وہ منافقین کا گروہ تھا جن کی اس قلبی کیفیت کے پیشِ نظر کہا گیا تھا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ تم پر قتال (جنگ) فرض قرار دیا گیا ہے خواہ تمہیں یہ ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ وحیٔ خداوندی کے پیشِ نظر تمہاری یا کسی اور کی خوشگواری یا ناگواری نہیں ہوتی۔ وہ ابدی حقائق بیان کرتی ہے خواہ وہ کسی کو ناگوار گزریں یا خوشگوار محسوس ہوں۔ انسان اپنے اپنے مفادِ عاجلہ کی رُو سے کسی بات کے خوش آئند یا ناگوارِ خاطر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے اور وحی کے سامنے مطلق صداقتیں (ABSOLUTE TRUTHS) ہوتی ہیں۔ اس لئے وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک بات کو ناپسند کرو' اور وہ حقیقت میں تمہارے لئے نفع رساں ہو' یا ایک چیز تمہیں بہت مرغوب ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لئے نقصان رساں ہو۔ تم خیر اور شر یا نفع اور نقصان کا معیار' اپنی پسند یا ناپسند کو قرار نہ دو۔ اس کے لئے مستقل اقدارِ خداوندی کو معیار قرار دو۔ اس لئے کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [2:216] تمہارا علم محدود بھی ہوتا ہے اور ذاتی جذبات و میلانات سے متاثر بھی۔ اس کے برعکس علمِ خداوندی محیطِ کلّی ہوتا ہے اور ہر قسم کے اثرات سے مبرّا اور بالا۔ تم صرف اپنے نفع' نقصان تک سوچ سکتے ہو اور وحیٔ خداوندی کے سامنے پوری کائنات اور جملہ نوعِ انسان کا نفع نقصان ہوتا ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ (جاوید نامہ)

انسان کو وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہی اس لئے تھی (اور ہے) کہ انسانی فکر' ذاتی میلانات اور اپنے ماحول کے عواطف سے غیر متاثر رہ کر' معروضی طور پر (OBJECTIVELY) کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ اور وحیٔ خداوندی ان تمام میلانات و رجحانات سے غیر متاثر ہوتی ہے اور اس کے پیشِ نظر کائنات اور عالمِ انسانی کا کلّی مفاد ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو ان لوگوں سے' جن کے قلوب مفادِ خویش کے میلانات سے متاثر تھے' کہا گیا کہ تم پر جہاد (قتال) فرض قرار دیا گیا' خواہ تمہیں یہ ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔

ضمناً یہ طبقہ جس پر جہاد (قتال) سے متعلق احکام ناگوار گزرتے تھے' عہدِ رسالتمآبؐ تک ہی محدود نہیں تھا' مسلمانوں میں ایسے لوگ ہر دَور میں رہے ہیں جنہیں یہ امر سخت شاق گزرتا تھا کہ قرآن میں جہاد بالسّیف کی آیات کیوں ہیں۔ ان کا اس پر تو اختیار نہیں تھا کہ وہ ان آیات کو قرآن سے نکال دیتے لیکن وہ ان کی ایسی ایسی تاویلات کرتے تھے (اور کرتے ہیں) جن سے جہاد محض وعظ و نصیحت یا نفس کشی بن کر رہ جائے۔

جنگ کے مقاصد

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ مقاصد کیا ہیں جن کے لئے' اور وہ کیا حالات ہیں جن میں' جنگ کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کے نظام کے ابتدائی مراحل میں "ہاتھ روک رکھنے" کی ہدایت تھی۔ یہ رسولؐ اللہ کی مکّی زندگی تھی۔ اس کے بعد' حضورؐ اپنی جماعت کے ساتھ مکّہ چھوڑ کر' دُور' مدینہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ اب اہلِ مکہ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن انہوں نے وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور ایک لشکرِ جرار لے کر' مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ سورۂ حج میں ہے:

> جن لوگوں پر مخالفین اس طرح جنگ کے لئے چڑھ دوڑے ہیں' اب انہیں بھی جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان پر بڑے ہی ظلم ہوئے ہیں' اور اللہ اس پر قادر ہے کہ ان مظلومین کی مدد کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا۔ ان کا جرم اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے...... (22:39-40)

یعنی جب سوال زندگی اور موت کا ہو تو پھر تحفظِ خویش کی خاطر جنگ کے لئے میدان میں آ جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ حیاتِ بےشرف کے مقابلہ میں مرگِ باشرف ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔

جہاد زندگی کا ثبوت ہے

جنگِ بدر کے ضمن میں قرآنِ کریم ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لایا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے' انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ پہلے اس پسِ منظر کو سامنے لایئے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت' تیرہ برس تک سردارانِ قریش کے مظالم برداشت کرنے کے بعد' پناہ گزینوں کی حیثیت سے' خالی ہاتھ مدینہ میں آئی۔ مدینہ کے انصار بھی کسی خاص قوت و شوکت اور جاہ و حشمت کے مالک نہیں تھے۔ وہ انہیں صرف پناہ دے سکنے کے قابل تھے۔ ان حالات میں' یہ مہاجرین ابھی یہاں آ کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قریش' ایک ہزار پر مشتمل لشکرِ جرار کے ساتھ ان پر حملہ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ بے سروسامان جماعتِ مومنین (جن کی کل تعداد ـــــ مہاجرین اور انصار ملا کر ـــــ صرف تین سو کے قریب تھی) اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ فطری طور پر وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جنگ

ٹل جائے۔ اتفاق سے، قریش کا ایک قافلہ مدینہ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ان (مومنین) میں سے بعض کا مشورہ یہ تھا کہ قریش کے لشکر کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے، ہمیں ان کے قافلہ پر حملہ کر دینا چاہئے۔ اس طرح اس امر کا امکان ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو جائیں اور ہم جنگ سے بچ جائیں۔

نظر بظاہر یہ تدبیر مفید مطلب تھی لیکن دیکھئے کہ اس مقام پر اللہ نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہو کہ قریش سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے، لیکن اس طرح ڈر ڈر کر، سہمے ہوئے زندگی بسر کرنا زندگی نہیں۔ یہ صرف نفس شماری ہے، حیاتِ بے شرف ہے۔ زندہ رہنے کا حق اُسی کو حاصل ہے جو خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد، یہ ثابت کر دے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور اگر اس میں اس کی صلاحیت نہیں تو پھر مردانہ وار جان دے دے۔ لہٰذا، ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تم قریش کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں نکلو لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٖ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٖ [8:42] تاکہ جسے زندہ رہنا ہے وہ زندہ رہنے کا ثبوت بہم پہنچا کر زندہ رہے، اور جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں وہ بھی اس امر کا ثبوت بہم پہنچا کر موت کے آغوش میں چلا جائے۔ خطرات سے ڈر کر، چھپے چھپے پھرنا، اور یوں اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ ہم زندہ ہیں، زندگی نہیں۔

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است (اقبالؒ)

جہاد (یا قتال) اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے کہ ہم میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

یہ دو قوموں کی جنگ نہیں تھی

جنگِ بدرؔ کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ لڑائی محض دو قوموں کی باہمی جنگ تھی یا اس کی تہہ میں کچھ اور بھی تھا؟ اس سوال کا جواب، ہمیں اسی آیت میں مل جاتا ہے جو کہا گیا ہے کہ اِلَّاۤ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ [22:40] یعنی یہ دو قوموں کی جنگ نہیں تھی یہ دو نظریوں کی جنگ تھی۔ ان دونوں کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہ تھا کہ یہ لوگ ''خدا کو اپنا نشو ونما دینے والا'' مانتے تھے اور فریقِ مخالف انہیں اس کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہِ مخالفت مکّہ میں تھی اور یہی بنائے نزاع مدینہ آنے کے بعد بھی رہی اور اسی بناء پر انہوں نے ان کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔ اس بناء پر یہ جنگ، عام قومی جنگ نہ رہی، دیؔن کی جنگ ہو گئی۔ یہی وہ لطیف نکتہ ہے جس کی وضاحت دوسرے مقام پر اس طرح کر دی گئی کہ:

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ [8:60]

تم ان مخالفین کی مدافعت کے لئے امکان بھر سامانِ حفاظت تیار رکھو۔ اپنی سرحدوں کو ایسا مضبوط رکھو کہ اس سے ان لوگوں کے دل پر جو تمہارے بھی دشمن ہیں اور اللہ کے بھی دشمن، خوف طاری رہے اور وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

دین کے دشمن

یہاں دیکھئے عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ کی تخصیص و تمیز سے کس طرح بات واضح کر دی۔ عَدُوَّکُمْ (تمہارے دشمن) قومی سطح پر ہیں اور عَدُوَّ اللّٰہِ سے مراد ان کی وہ عداوت ہے جو دین کی بناء پر ہے۔ قومی سطح پر باہمی عداوتیں تو دنیا کی مختلف اقوام میں اکثر رہتی ہیں لیکن جنگ، جہاد فی سبیل اللہ کی حیثیت اس وقت اختیار کرتی ہے جب اس عداوت کی بناء دین ہو یعنی قومِ مخالف، اس نظام کو مٹانے کے لئے یورش کرے جسے یہ قوم بحیثیتِ دینِ خداوندی قائم کرنا اور مستحکم رکھنا چاہتی ہو۔ ان کی طرف سے مخالفت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ دینِ خداوندی کے خلاف طعن و تشنیع پر اُتر آئیں۔ انہیں، اس سے باز رہنے کے لئے سمجھانا چاہیئے۔ انہیں بتانا چاہیئے کہ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ ہم تمہارے معبودوں کے خلاف بھی سُوءِ ادبی اور گستاخی کے الفاظ زبان پر نہ لائیں، حالانکہ ہم انہیں باطل معبود سمجھتے ہیں (6:109)۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تمام مذاہب کے بانیوں کی تعظیم کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کے فرستادہ انبیاء ہوں۔ اگر وہ انبیاء تھے تو ہم ان کی نبوت پر ایمان لانے کے لئے مکلّف[1] ہیں۔ لہٰذا تم، کم از کم، ہمارے دین کے خلاف طعن و تشنیع سے تو باز رہو۔ لیکن اگر ان میں اتنی سی شرافت اور انسانیت بھی باقی نہ رہی ہو تو پھر انہیں تلوار کے زور سے اس سے روکا جائے گا۔ سورۂ توبہ میں ہے وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ [9:12] اگر یہ لوگ، اس قسم کا عہد و پیمان کرنے کے بعد، اس سے پھر جائیں، اور تمہارے دین میں طعن و تشنیع سے باز نہ آئیں تو پھر تم کفار کے ان سرغنوں کے خلاف جنگ کرو۔

اُس سرزمین کی حفاظت

یہاں تک ان جنگوں کا ذکر ہے جو اپنے دین کی مدافعت کے لئے لڑنی پڑیں۔ (1) واضح رہے کہ چونکہ قرآن کی رُو سے، دین صرف اپنی آزاد مملکت میں زندہ حقیقت بن سکتا ہے، اس لئے اُس مملکت کی حفاظت کے لئے جنگ، جس میں دین کا نظام متمکّن ہوا یا جسے اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا ہو، قتال فی سبیل اللہ کہلائے گا۔ مدینہ کی پہلی جنگ (جنگِ بدر) اس زمانے میں لڑی گئی تھی جب ہنوز اسلامی مملکت عملی شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ بایں ہمہ، اس سرزمین کی حفاظت اس لئے ضروری تھی کہ اس میں اس مملکت کے وجود میں آنے کا امکان تھا۔ اگر وہ سرزمین نہ رہتی تو اسلامی مملکت کا وجود شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکتا۔ یہ ہے قتال فی سبیل اللہ کی پہلی شکل۔

مذہب کی آزادی

(2) اس کی دوسری شکل، سورۂ حج کی اس آیت کے اگلے حصے میں سامنے لائی گئی ہے جس کا پہلا حصہ اوپر مذکور ہے۔ اس

[1] اس سے مراد حضور نبی اکرمؐ سے پہلے کے انبیاءؑ ہیں کیونکہ سلسلۂ نبوت حضورؐ پر ختم ہوگیا۔

میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا [22:40] اور اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ ایک جماعت کی دست درازیوں کی روک تھام' دوسری جماعت کے ہاتھوں ہو جائے تو یہودیوں کی عبادت گاہوں' عیسائیوں کے گرجوں' راہبوں کی خانقاہوں اور مسلمانوں کی مسجدوں (جن میں اللہ کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے) میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتی — سب منہدم ہو جاتیں۔ اس آیۂ جلیلہ میں' جہاں تک مسجدوں کی حفاظت کا تعلق ہے وہ اس زمرہ میں آ جاتی ہیں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے — یعنی دین کے نظام کی حفاظت کے لئے مخالفین کے حملوں کی روک تھام۔ لیکن اس میں تو مسلمانوں پر تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ ''پرستش گاہوں کی حفاظت'' سے مراد ہے مذہبی آزادی۔ اس حکم خداوندی سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا برقرار رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے' اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اگر انہیں جنگ بھی کرنی پڑے تو جنگ کرنی ہوگی۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

اس سے ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ جس قوم کا فریضہ یہ ہو کہ وہ جان دے کر بھی دوسرے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھے' کیا اس کے لئے کسی صورت میں بھی جائز ہوگا کہ وہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر مسلمان بنائے' یا جو (بدقسمت) مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہے' اسے اس سے بزورِ شمشیر روکے۔ یہ تصور قطعاً غلط اور اسلام کے اساسی اصولوں کے خلاف ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [2:256] اس کا بنیادی اصول ہے اور فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [18:29] جس کا جی چاہے ایمان لے آئے جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے'' — اس کا عالمگیر منشور۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ [2:193] تو اس سے بھی یہی مراد تھی۔ یعنی اگر کوئی قوم کسی دوسرے کی مذہبی آزادی سلب کرنا چاہے' تو تم اس مستبد قوم کے خلاف جنگ کرو' اور اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھو جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ مذہب صرف اللہ کی خاطر اختیار کیا جائے۔ اس میں کسی قسم کے خارجی اثر یا دباؤ کا دخل نہ رہے۔ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ عالمگیر مذہبی آزادی کا ایسا ابدی منشور ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اس شکل میں بھی جنگ مدافعانہ ہی رہتی ہے لیکن اس میں صرف اپنی اور اپنے دین کی مدافعت نہیں بلکہ دنیا بھر کے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کی مدافعت مقصود ہے۔

یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری شکل ہے۔ اب آگے بڑھئے۔

انسانی حقوق کا تحفظ

(3) مذہبی آزادی ہی نہیں بلکہ اس میں غلامی کی اور بھی بہت سے شکلیں شامل ہیں جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے۔ سورۃ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے۔ ایک راستہ سہل انگاریوں' مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کا

ہے ''کنارِ آب رکنا باد گل گشت و مصلّٰی'' کا راستہ۔ دوسرا راستہ اَلْعَقَبَۃُ کا ہے ـــــ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کا راستہ بڑا دشوار گزار ہوتا ہے۔ اس پر قدم قدم پر سانس پُھولتی ہے لیکن ہر قدم' انسان کو پہلے سے زیادہ بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ راستہ کیا ہے؟

(1) فَكُّ رَقَبَةٍ [90:13] جو گردنیں کسی دوسرے کی محکومی میں جکڑی ہوئی ہوں' انہیں اس سے آزاد کرانا۔

(2) أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ [90:14] جس زمانے میں افلاس وغربت عام ہو جائے اس میں دوسروں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ کن لوگوں کے کھانے پینے کا؟

(3) يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ [90:15] ان کا جو بھرپور معاشرہ میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔ اور

(4) أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ [90:16] یا ان محنت کشوں کا جو دن بھر خاک آلود رہنے کے باوجود اس قابل نہ ہو سکیں کہ ان کی زندگی کی گاڑی آگے چلے۔

یہ ہے الدّین ـــــ وہ گھاٹی جس پر چڑھنا بڑا دشوار ہے۔ ان میں سے شقِ اوّل فَكُّ رَقَبَةٍ ہے۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں غلامی کی ایک ہی شکل تھی جسے عرفِ عام میں (SLAVERY) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان غلاموں کو چھوڑانے کے لئے مختلف طریق تجویز کئے اور آئندہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ دنیا آج بڑے فخر سے کہتی ہے کہ اس نے غلامی کو مٹا دیا ہے۔ لیکن اِس زمانے میں' جسے دورِ تہذیب کہا جاتا ہے' غلامی کی ایسی ایسی شکلیں وضع کی گئی ہیں جن کا تصور بھی اُس (دورِ جہالت) میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان شکلوں کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جن حقوق کو قرآن نے بنیادی حقوقِ انسانیت قرار دیا ہے' انہیں سلب کر لیا جاتا ہے اور اکثر اوقات سلب بھی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ' جسے مصلوب کیا جاتا ہے اسے اس کا احساس تک نہیں ہونے پاتا یا نہیں ہونے دیا جاتا۔ ان سلب کردہ حقوق کا بحال کرانا بھی فَكُّ رَقَبَةٍ میں آ جائے گا۔ ہمارے زمانے میں (U.N.O) نے بنیادی حقوقِ انسانیت کا منشور شائع اور اختیار کر رکھا ہے لیکن اس کی رُو سے' کمزور انسانوں اور قوموں کے حقوق کا جس انداز سے تحفظ ہوتا ہے' وہ ظاہر ہے۔ یہ فریضہ جماعتِ مومنین ہی ادا کر سکتی ہے۔

مظلوموں کی امداد کے لئے جنگ

ان حقوق کی شدید ترین پامالی کو قرآن ظلم سے تعبیر کرتا ہے اور مظلوموں کی امداد کے لئے (عند الضّرورت) جنگ کے لئے اُٹھنا' جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ (مثلاً) جب مدینہ میں مسلمانوں کی مملکت قائم ہو گئی تو وہ قریشِ مکہ کے دستِ تظلّم سے محفوظ ہو گئے لیکن مکہ میں ایسے مسلمان رہ گئے جنہیں وہ جورَ واِستبداد کا تختۂ مشق بناتے تھے۔ قرآنِ کریم نے مسلمانانِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال فی سبیل اللہ کے لئے اُٹھتے نہیں حالانکہ حالت یہ ہے کہ (مکّہ کے) کمزور و ناتواں'

بے کس و بے بس مسلمان —— مرد' عورتیں' بچے چلّا چلّا کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر دے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں۔ تو اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار بھیج جو ہمیں ان کے جَور وستم سے نجات دلائے (4:75)۔

چنانچہ مدینہ کے مسلمان اٹھے اور انہوں نے مکہ فتح کر کے' اِن مظلوموں کو اُن کے مظالم سے نجات دلائی۔ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس ابدی اصول کی وضاحت کر دی کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں کسی قوم اور کسی ملک کے مظلوموں کی فریاد ان تک پہنچے' وہ ان کی مدد کے لئے اٹھیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو جو دعوت نامے ارسال فرمائے تھے' ان میں یہی کہا گیا تھا کہ تمہاری مملکت میں کسانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں' اگر تم نے ان کا تدارک نہ کیا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ اس قسم کی جنگیں' اس لحاظ سے مدافعانہ کہلائیں گی کہ یہ اُن مظلوموں کی مدافعت کے لئے لڑی جائیں گی۔

فساد روکنے کے لئے جنگ

(5) اسی قسم کی مدافعانہ ایک اور جنگ بھی ہے جسے قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں (حضرت) طالوت اور جالوت کے معرکہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ [2:251] اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ ایک سرکش اور امن شکن گروہ کی جارحیت کی روک تھام' دوسرے گروہ کے ہاتھوں کرائی جائے' تو زمین میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن چونکہ اللہ اہلِ دنیا پر اپنا فضل رکھنا چاہتا ہے' اس لئے فساد برپا کرنے والوں کی دراز دستیوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتی رہنی چاہئے' اور ظاہر ہے کہ اللہ کا یہ پروگرام اولاً اور تاسیساً جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہو گا کہ انہی کو اس نے حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ [9:14] تم ان کے خلاف جنگ کے لئے اٹھو۔ اس لئے کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان متکبرین کو ان کی سرکشی کی سزا تمہارے ہاتھوں سے دلائے اور ان کی گردن جھکائے تا کہ وہ پھر فساد کے لئے نہ اُٹھ سکیں۔

فساد سے مفہوم

فساد ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جو قرآنِ کریم میں بے شمار مقامات پر آئی ہے اور اس نے مفسدین کا شمار اکابر مجرمین میں کیا ہے۔ ارتقائے انسانیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ معاشرہ میں امن و امان رہے۔ لوگوں کی جان' مال' عزت' آبرو' عصمت ہر طرح سے محفوظ ہو اور اس طرح انہیں اطمینان اور سکون میسر ہو۔ جس معاشرہ سے یہ سکون اُٹھ جائے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس میں فساد برپا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ' فساد کا مختصر ترین مفہوم ہے۔ قرآنِ کریم نے فسادؔ کو صلاحؔ کی ضد بتایا ہے اور صلاحؔ کے معنی ہیں ایسے حالات جن میں انسانی صلاحیتیں بیدار رہوں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل

طے کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ نیز جن میں معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور ناہمواریاں دُور ہو جائیں۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے، اس کا ٹھیک اسی حال میں ہونا اور ہر کام کا وقت کے تقاضے اور قوانینِ خداوندی کے مطابق سرانجام پائے جانا۔ جب معاشرہ کی حالت ایسی نہ رہے تو اسے فسادؔ سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس میں قانون و ضوابط کا احترام اُٹھ جائے گا اور فوضویت (انارکی) عام ہو جائے گی۔ ایسی حالت کو رُو بہ اصلاح لانے کے لئے (عند الضرورت) جنگ کو بھی قتال فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ خواہ وہ کہیں پیدا ہو۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نے اُمتِ مسلمہ کو شہداء علی الناس کہہ کر پکارا ہے —— یعنی تمام نوعِ انسان کے امور کی نگران۔ اور نگران کا فریضہ ہے کہ وہ دیکھے کہ کہیں فساد برپا نہ ہو جائے۔

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے لئے قرآنِ کریم نے جنگ کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ ان مقاصد کی خاطر جنگ، قتال فی سبیل اللہ ہے، اور اگر مقصد کچھ اور ہے تو وہ قتال فی سبیل اللہ نہیں قتال فی سبیل الطّاغوت ہے اور یہ کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ سورۂ نساء میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ [4:76] مومنین، اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں۔ یہی قتال فی سبیل اللہ جہادؔ کی حدِ آخرین اور مومن کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہے۔

جنگ کی شرائط

یہ تو ہیں وہ مقاصد جن کے لئے جنگ لڑی جائے گی۔ ان کے ساتھ ہی کچھ شرائط بھی ہیں جنہیں ملحوظ رکھا جائے گا۔ مختصر الفاظ میں وہ شرائط یہ ہیں:

(1) پہلی شرط یہ ہے کہ —— وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا [2:190] جو تمہارے خلاف جنگ پر اُتر آئیں، ان سے جنگ کرو لیکن حدود سے تجاوز مت کرو —— لَا تَعْتَدُوْا کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ اس باب میں جو حدود اللہ نے مقرر کی ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جنگ کو وہیں تک محدود رکھو، اور ایسے حالات نہ پیدا ہونے دو کہ وہ متعدی امراض کی طرح پھیل کر عالمگیر بن جائے، یہ آگ ایسی بھڑکے کہ ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو۔

(2) دوسری شرط یہ ہے کہ جہاں تک دشمن کی قوت توڑنے کا تعلق ہے وہیں تک اسے نقصان پہنچاؤ، خواہ مخواہ ہلاکتِ حرث و نسل نہ کرو (2:205)۔ نہ کھیتیاں تباہ و برباد کرو، نہ عام آبادی کو ہلاک کرو۔ ایسا کرنا فسادؔ میں شامل ہو جائے گا اور وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ [2:205] اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

(3) مفتوحہ علاقہ کو برباد مت کرو، نہ ہی وہاں کے معززین کو ذلیل کرو۔ یہ اندازِ ملوکیّت ہے جس کی نظامِ خداوندی

میں گنجائش نہیں (27:34)۔

(4) بین الاقوامی معاہدات کی رُو سے یہ اصول طے کرلو کہ جنگ کہیں' اور کسی کے خلاف بھی کیوں نہ ہو' اسے مسلسل جاری نہیں رہنا چاہیئے۔ سال میں کچھ مہینے ایسے مقرر ہو جانے چاہئیں جن میں جنگ اصولاً بند کر دی جائے۔ اس متارکہ سے فریقین کے جذباتِ مخاصمت کی شدت میں کمی واقعہ ہو جائے گی اور اس بات کا امکان پیدا ہو جائے گا کہ دشمن' نامعقولیت کو چھوڑ کر' صلح کی معقول شکل اختیار کر لے۔ اسی طرح بعض مقامات بھی ایسے ہونے چاہئیں جہاں پہنچ جانے پر' ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ اور مامون پائے (2:217)۔

(5) جب دشمن صلح کی طرف جُھکے تو اس کی ''سفید جھنڈی'' کا احترام کیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے میں وہ تمہیں دھوکا دیتا ہو لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر صلح چاہتا ہو۔ اس لئے تمہارا ردِّ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دھوکا دیتا ہے بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صلح کا آرزومند ہے (8:61)۔ خُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ [4:71] اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان رکھو اور پھر اس سے صلح کی بات کرو۔

(6) صلح کرنے میں بھی دشمن کے ساتھ عدل کرو۔ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا‌ ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى [5:8] کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو' ہر ایک کے ساتھ عدل کرو۔ اس لئے کہ تم نے تقویٰ کی زندگی بسر کرنی ہے اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔

(7) دشمن کے قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ معاہدۂ صلح کے بعد' انہیں یا تو اپنے قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دو' یا فدیہ لے کر۔ لیکن اگر دیکھو کہ ان میں سے کسی صورت کا امکان نہیں تو انہیں بطورِ احسان چھوڑ دو۔ اس کا اثر بڑا گہرا ہو گا (47:4)۔ قیدی تو ایک طرف' اس نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر دشمن کا کوئی فرد تمہارے پاس پناہ لینے کے لئے آئے تو اُسے پناہ دو۔ اسے قرآن کی تعلیم سے آگاہ کرو اور اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اسے اپنی حفاظت میں اس کے مامن تک پہنچاؤ (9:6)۔

(8) دشمن (یا ویسے بھی دیگر اقوام کے ساتھ) جو معاہدات کرو' ان کا احترام کرو (5:11)۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ [8:58] اگر تمہیں اس کا خدشہ ہو کہ قومِ مخالف' معاہدہ کی آڑ میں تم سے خیانت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے' تو تم' معاہدہ کی اوٹ میں اس کے خلاف خیانت مت کرو۔ تم اس معاہدہ کو اُن کی طرف لوٹا دو۔ انہیں بتا دو کہ وہ معاہدہ باقی نہیں رکھا جا سکتا اور اس طرح دونوں ایک سطح پر اُتر کر' جو مناسب سمجھو کرو۔

(9) اور آخری بات یہ کہ تم سرکش گروہوں کے خلاف جنگ کر کے' ان کی قوت کو توڑو' تو اس لئے کہ اس طرح مختلف قوموں میں قوتوں کا توازن پیدا ہو جائے اور کسی کو دوسرے کے خلاف دست درازی کی جرأت نہ ہو اور یوں دنیا سے جنگ

کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآنِ کریم کے نہایت جامع الفاظ میں، تم دشمن کی قوت توڑنے کے لئے جنگ کرو حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا...... [47:4] تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ ہے جماعتِ مومنین، اُمتِ مسلمہ کی جنگ کا مقصود و منتہیٰ —— دنیا سے جنگ کا خاتمہ۔

جنگ کی ہدایات

ان شرائط کے ساتھ قرآنِ کریم نے جنگ کے سلسلہ میں کچھ اصولی ہدایات بھی دی ہیں، جن کا مختصر سا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ (مثلاً) اس نے کہا ہے کہ:

(1) جیسا کہ شروع میں بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے، ہر مومن مجاہد ہے، اور اُمتِ مسلمہ پوری کی پوری حزب اللہ (اللہ کا لشکر) لہٰذا، ہر مسلمان کے لئے عسکری تربیت اسلامی زندگی کا اساسی جزو ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دورِ حاضرہ میں، جنگ اس قدر فنی ہو چکی ہے کہ اس کے لئے فنونِ حرب کے ماہروں کی ضرورت لاینفک ہے۔ اس مقصد کے لئے بیشک، ایک ہمہ وقتی جماعت الگ ہونی چاہیئے لیکن ہر مومن کے لئے سپاہی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کا تصور اور ہدایت یہی ہے —— ہر مومن اللہ کا سپاہی۔

(2) فوج کی کمان کرنے والوں کے انتخاب کا معیار، دولت یا خاندانی وجاہت نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کا معیار جوہرِ ذاتی ہونا چاہیئے۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ [2:247] یعنی فنونِ حرب سے پوری پوری واقفیت، اور جسمانی صحت و توانائی۔ واضح رہے کہ پاکباز زندگی (تقویٰ) ہر مومن کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے اِن افسروں کے انتخاب میں اس کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [49:13] معیارِ خداوندی کے مطابق، تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں تک کہہ دیا کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا [18:28] جس شخص کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ قوانینِ خداوندی کو فراموش کر دے اور اپنی خواہشاتِ نفس ہی کے پیچھے دوڑتا رہے اور اس دوڑ میں تمام حدود پھاندتا چلا جائے، اس کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے اتار پھینکو۔ وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا، اگر کسی افسر کی سیرت و کردار ملوث ہو جائے، وہ پاک بین و پاک باز نہ رہے تو اسے کمان سے برطرف کر دینا چاہیئے، کیونکہ ایسے افسر کے رفقاء کی نظروں میں اس کا وقار اور اس کے ماتحتوں کے دل میں اس کا احترام کبھی باقی نہیں رہ سکتا اور جس کا احترام نہ رہے، اس کے احکام کی اطاعت، میکانکی طور پر تو ہو سکتی ہے دل کی رضامندی سے نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے تو صاحبِ کمان کا مقام یہ بتایا ہے کہ اس کے حکم اور فیصلوں کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کبیدگی اور گرانی محسوس نہ ہو (4:65)۔

(3) اگر سپاہیوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے صاحبِ کمان کے حکم کی تعمیل دل کی کامل رضامندی سے کریں تو صاحبِ کمان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے لئے سپر بنا رہے اور ان کی اس طرح حفاظت اور نگہداشت کرے جس طرح مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت اور نگہداشت کرتی ہے (26:215)۔

(4) صاحبِ کمان کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ رہنا چاہئے۔ جنگی ضروریات کے لئے ایسا کرنا اور بات ہے ورنہ عام حالات میں چُھپ کر پیچھے نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ کریم نے بتایا ہے — واضح رہے کہ عساکرِ مومنین کے لئے حضورؐ کی پوزیشن' آج کی اصطلاح میں' کمانڈر انچیف کی بھی تھی — کہ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ [3:121] میدانِ جنگ میں آپؐ اپنے سپاہیوں کی پوزیشن متعیّن کیا کرتے تھے۔

(5) ڈسپلن فوج کی رگِ حیات ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب (حضرت) طالوت اپنی فوج کو لے کر جالوت کے مقابلہ کے لئے چلے تو سپاہی پیاسے تھے اور راستے میں ایک ندی آتی تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص ندی سے پانی نہ پیئے۔ یونہی حلق تر کرنے کے لئے ایک گھونٹ کی اجازت ہے۔ بات بظاہر چھوٹی سی تھی لیکن اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ آپ نے کہا کہ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ [2:249] جو پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود بہت سے سپاہیوں نے پانی پی لیا- اور قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے کہ جب لشکرِ جالوت سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ [2:249] ہم میں' جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ ڈسپلن درحقیقت اس بات کا ٹسٹ ہوتا ہے کہ فوج میں خطرات کے مقابلہ کی صلاحیّت کہاں تک پیدا ہو چکی ہے۔

(6) اور ڈسپلن کے ساتھ اِستقامت' جسے قرآن صبر کی عظیم اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ [2:249] اللہ کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ثبات اور استقامت کے ساتھ خطرات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ اگر تعداد میں کم بھی ہوں تو بھی دشمن پر غالب آسکتے ہیں۔

(7) میدانِ جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی شکست بھی۔ شکست سے دل برداشتہ اور افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت' اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ [3:140] اگر تم نے آج دشمن کے ہاتھوں زخم کھائے ہیں تو کل تم نے بھی تو اُسے کاری ضربیں لگائی تھیں۔ حالات کی یہ گردشِ دولابی جاری ہے۔ اس تغیر سے ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ ایسے وقت میں سوچنا یہ چاہئے کہ اس شکست کے اسباب کیا تھے۔ اگر تم اس پر غور کرو گے تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ یہ تمہاری ہی کسی غلطی کا نتیجہ تھی هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ [3:165] [4:79]۔ جیوشِ اسلامیہ کو جنگِ اُحد میں جو عارضی شکست ہوئی تھی' اس کی وجہ بتاتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا:

> تم قانونِ خداوندی کے اتباع میں دشمن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا اور اس طرح اللہ کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا لیکن عین اس وقت تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیشِ نظر میں تم نے

باہمی تنازعہ شروع کر دیا۔ تم میں اختلاف پیدا ہو گیا اور تمہارے کمانڈر نے جو حکم دے رکھا تھا تم نے اس کی خلاف ورزی کی' حالانکہ فتح و کامرانی جو تمہارا محبوب مقصد تھا' تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی —— تمہیں معلوم ہے ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ پیش پا افتادہ مفاد پر ٹوٹ پڑے اور کچھ ایسے رہ گئے جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ یوں تمہارا رُخ دشمن کی طرف سے ہٹ کر' دوسری سمت کو پھر گیا۔ (تمہیں شکست ہوگئی اور اس شکست سے) تمہیں معلوم ہو گیا کہ تم میں کیا خامی تھی (3:152)۔

اس واقعہ سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے جسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ بہر حال یہاں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اپنی شکست سے ہمت نہیں ہار دینی چاہئے بلکہ ان اسباب پر غور کرنا چاہئے جن کی وجہ سے وہ شکست ہوئی اور پھر ان کا تدارک یا ازالہ کرنا چاہئے۔

میدانِ جنگ میں بھی غور و تدبر

جنگ کے متعلق ذہن میں یہی آتا ہے کہ اس میں صرف جذبات کی شدّت کام آتی ہے غور و فکر کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ میدانِ جنگ میں بھی اگر غور و فکر اور تدبر و تعقل سے کام نہ لیا جائے تو اس کا نتیجہ شکست ہوتی ہے۔ جنگِ بدر میں قریش کو جو شکستِ فاش ہوئی تو قرآن نے اس کی بنیادی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہ اس لئے ہوا کہ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ [8:65] انہوں نے فکر و تدبر سے کام نہ لیا بلکہ اپنے جذبات کی رَو میں اندھا دھند بہے چلے گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی میں جذبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جذبات ہی عمل کے محرک ہوتے ہیں لیکن جذبات کو ہمیشہ عقل و فکر کے تابع رکھنا چاہئے —— حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی —— اور عقل کو وحیٔ خداوندی کے تابع —— یہی اسلام ہے۔

(8) اور اگلی ہدایت یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں چاہئے۔ ایسا کرنا کس قدر سنگین جرم اور ناقابلِ معافی حرکت ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ میدانِ بدر میں' خود رسول اللہؐ کے زیرِ لِوا' صحابہ کبارؓ کی جماعت' صف بستہ کھڑی ہے یہ وہ سپاہی ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کر کے' سر بکف باطل کے مقابلہ کے لئے میدانِ کارزار میں آ گئے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے متعلق ابھی ابھی حضور نبی اکرمؐ نے بدرگاہِ ربّ العزت بصد الحاح وزاری عرض کیا ہے کہ بارِ الٰہا! اگر آج اس جماعت کو شکست ہوگئی تو دنیا میں قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ سرفروشوں کی یہ جماعت میدانِ جنگ میں کھڑی ہے کہ کمانڈ و کا حکم ملے تو وہ شیروں کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑیں۔ عین اس وقت یہ آیت نازل ہوتی ہے کہ یاد رکھو:

اے جماعتِ مومنین! (یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے قانون کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ ہے اور تمہیں فتح و کامرانی کی نویدِ جانفزا بھی سنائی گئی ہے۔ بایں ہمہ' اسے بگوشِ ہوش سن لو کہ) جب تمہارا مقابلہ دشمن کی فوج سے ہو تو انہیں پیٹھ مت دکھانا۔ یاد رکھو! جو ایسے وقت میں پیٹھ دکھائے گا' وہ خدا کے عذاب کا مُورد بن جائے گا اور سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم

میں جا گرے گا اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں مگر جو جنگ کی تدبیر کے پیشِ نظر اپنا پینترا بدل لے' یا اپنی پارٹی کی طرف پلٹنا چاہے اور اس طرح اپنے مقام سے ہٹ کر ادھر اُدھر ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں (8:15-16)۔

سرفروشوں کی جو جماعت اس وقت رزمگاہ میں تھی اس نے تو دشمن کو کیا پیٹھ دکھانی تھی۔ یہ دراصل ایک اصولی ہدایت تھی کہ فتح و کامرانی انہی کا حصہ ہوتی ہے جو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اس کی سختی سے ڈر کر بھاگ نہ اٹھیں۔ حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ [8:67] تا آنکہ دشمن کی قوت ٹوٹ جائے اور وہ مغلوب ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اُس کے میدان سے بھاگ جانے پر یہ قیاس نہ کرلو کہ وہ شکست کھا گیا ہے۔ یہ اُس کی جنگی چال ہو سکتی ہے اس لئے اس کا تعاقب کرو اور پیچھے سے اس پر بھرپور وار کرو۔ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ [4:104] اس کے تعاقب میں سُستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔ اس طرح اس کی کمر یوں ٹوٹے گی کہ وہ دوبارہ سرکشی کی ہمت نہیں کرے گا۔

اِسلامی نظام کی جھلک

یہ ہدایات ہیں تو جنگ سے متعلق لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اس سے خود اسلامی نظام کی ایک جھلک سامنے آ جاتی ہے۔ دشمن کے خلاف جنگ کی جائے اور کب کی جائے' اس کا فیصلہ سربراہِ مملکت اپنے اہل الرائے اعیان کے مشورہ سے کرے گا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ [3:159] آپ امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کریں اور اس مشاورت کے بعد جب آپ کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں تو پھر پورے عزم اور ہمت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو جائیں اور قانونِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ رکھیں (یہ خود رسول اللہؐ سے ارشاد ہے)۔ ایسا فیصلہ ہو جانے کے بعد جنگ سے متعلقہ افسر' اس کے مطابق پلان مرتب کریں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [42:38] (یہ اُمت سے کہا گیا ہے) اس پلان کو افسرانِ زیریں تک پہنچا دیا جائے تا کہ وہ' وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق اس کی جزئیات خود مرتّب کریں۔ ان جزئیات کے مطابق وہ احکامِ جنگ نافذ کریں۔ ان احکام کی اطاعت سپاہیوں پر بے چون و چرا لازم ہوگی۔ سوچئے کہ اگر سپاہی ''آزادیٔ رائے اور حریّتِ فکر'' کو اپنا حق سمجھیں اور میدانِ جنگ میں ہر سپاہی وہ کچھ کرے جو اس کا اپنا فیصلہ ہو تو میدانِ جنگ کا نقشہ اور اس قوم کا حشر کیا ہو جائے؟ انفرادی آزادیٔ فکر ہی نہیں' اگر سپاہیوں کو ''حقِ جمہوریت'' دے دیا جائے اور وہ میدانِ جنگ میں' افسرانِ بالا کی ہدایات کے مطابق قدم اٹھانے کے بجائے وہ کچھ کریں جو ان میں سے اکیاون کا فیصلہ ہو تو بھی نتیجہ ظاہر ہے؟ آزادیٔ رائے اور حریّتِ فکر کا ایک دائرہ ہے اور اسے وہیں تک محدود رہنا چاہئے۔ اس کے بعد پابندیٔ ہدایات ضروری ہو جاتی ہے۔ آزادی اور پابندی کے اسی امتزاج کا نام اسلامی نظام ہے۔ قرآنِ کریم نے جو اسلامی جیوش و عساکر کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ [61:4] کس قدر محبوب ہیں یہ لوگ اللہ کی نگاہ میں جو اس کے راستے میں یوں صف بستہ لڑتے ہیں گویا ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں' تو سپہ سالار سے لے کر سپاہی تک' سب اس دیوار کی اینٹیں

ہوتی ہیں جن میں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ وہ سب باہمدگر مربوط ہوتی ہیں (''سیسہ پلائی ہوئی'' سے یہی مراد ہے)۔ یہی وہ رابطہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ [3:200]

اے جماعتِ مومنین! مصافِ زندگی میں اس طرح گامزن رہو کہ تم میں سے ہر ایک خود بھی ثابت قدم ہو اور اپنے ساتھیوں کی ثابت قدمی کا موجب بھی۔ تم اس انداز سے بانہوں میں بانہیں ڈالے نہایت محکم ربطِ باہمی سے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ' فتح و کامرانی تمہارے قدم چوم لے گی۔

مومن کی زندگی میں تیغ کا مقام

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے مومن کی زندگی میں ''تیغ'' کا مقام' وہ تیغ جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ [57:25]

ہم نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا۔ ہر رسول اپنے ساتھ ایک ضابطۂ قوانین لاتا تھا اور اسے دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا تھا تاکہ لوگ عقل و بصیرت سے کام لے کر ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف ہو لیکن مستبد قوتیں ایسا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان کی روک تھام کے لئے ہم نے (ضابطۂ قوانین کے ساتھ) شمشیرِ خارہ شگاف بھی ''نازل کی'' جس میں بڑی صلابت ہوتی ہے۔ چونکہ یہ شمشیر' مظلوموں اور کمزوروں کی حفاظت کے لئے اٹھائی جاتی ہے اس لئے یہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو نظامِ خداوندی کی ایسے وقت میں مدد کرتے ہیں جب ہنوز اس کے نتائج و اثمار محسوس شکل میں سامنے نہیں آئے ہوتے۔ اس طرح خدائے قوی و غالب کا پروگرام انسانی دنیا میں غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

یہی ہے وہ شمشیر جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

حضرت عمرؓ کا جہادِ مسلسل

عہدِ فاروقی ''فولاد اور فقر کی تلوار'' کے حیات بخش ''شعر'' کا تابندہ مظہر تھا جس کا ''وزن'' سیرتِ فاروقی کی میزان سے قائم تھا۔ حضرت عمرؓ کی ساری زندگی جہادِ مسلسل کی درخشندہ داستان تھی۔ ان کے زمانہ قبل از اسلام کی زندگی میں ان کے ذہنی اور فکری جہاد کا ثبوت ہمیں اس سے ملتا ہے کہ وہ تجارت کی غرض سے دور دراز ممالک میں جاتے تھے تو اپنا فارغ وقت وہاں کے اربابِ فکر و نظر اور اعیانِ علم و بصیرت کی ملاقاتوں میں گزارتے تھے۔ جو شخص آباء و اجداد کے مسلک پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، اس کا ذہن جامد، اور اس کی فکر مُردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نہ اپنے نظریات و معتقدات کو محکِ علمی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، نہ تحقیق و تجسّس کی احتیاج۔ اس کے برعکس، زندہ ذہن، موروثی نظریات و مسالک کو پرکھتا ہے اور اگر ان میں کوئی سقم پاتا ہے تو تلاشِ صداقت میں سرگرداں رہتا ہے۔ تجسّسِ حقیقت کی یہی کاوش تھی جس کے متعلق حضورؐ نبی اکرم کے متعلق کہا گیا کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى [93:7] ''اے رسولؐ! ہم نے آپ کو تلاشِ صداقت میں سرگرداں پایا تو زندگی کے صحیح راستے کی طرف آپ کی راہنمائی کر دی''۔ تلاشِ حقیقت کی یہی سرگردانی تھی جو عمرؓ ابن خطاب کو بھی کبھی مختلف اربابِ فکر و نظر کی محفلوں کی طرف کَشاں کَشاں لئے جاتی تھی، اور کبھی راتوں کی تنہائیوں میں جانبِ حرم رواں دواں، کہ وہاں خاموشی سے اِس نئے داعیٔ انقلابؐ کے پیغام کا مطالعہ کیا جا سکے۔ جب تک ابن خطابؓ نے حقیقت کو نہیں پا لیا وہ اس دعوتِ انقلاب کا شدید ترین مخالف رہا کیونکہ وہ بزعمِ خویش، اسے اپنی قوم کے لئے مضرت رساں سمجھتا تھا۔ اس کی یہ مخالفت بھی اس کے ''جہاد'' (جدوجہدِ مسلسل) کی آئینہ دار تھی اگرچہ اس وقت اس کا رُخ غلط سمت کی طرف تھا۔ اور جب (رسولؐ اللہ کی وساطت سے، انسانوں تک پہنچی ہوئی) حقیقت اپنا نقاب الٹ کر سامنے آ گئی تو اس کی مدافعت و حفاظت کے لئے برہنہ شمشیر باہر آ نا بھی، اسی جذبۂ جہاد کا مظہر تھا۔ ہجرت اسی جہدِ للحق کا حصّہ لا تھا اور اس کے بعد حضور نبی اکرمؐ کے زیرِ لوا، ہر میدانِ سعی و عمل میں بھرپور شرکت، اس کا گوشۂ اِلّا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی رفاقت میں، ہر معرکہ میں شرکت بھی اسی قلبِ متحرک کی تڑپ اور خلش کی مظہر تھی، اور اس کے بعد، جب خلافت کی ذمہ داریاں خود سنبھالیں، تو ساری زندگی اور اس کے بعد شہادت، بھی اسی جہادِ مسلسل کی برق آسا داستان، اور یہی وہ کوندا تھا جس کی لپک آپ کے رفقاء (دیگر صحابہؓ) کی سیرتوں میں بھی تڑپتی نظر آتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ [2:157]

فوجوں کا کمانڈر

صدرِ اوّل میں سربراہِ مملکت ہی فوجوں کا کمانڈر اِن چیف ہوتا تھا؛ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ نبی اکرمؐ خود عساکرِ اسلامیہ کی صف بندی فرمایا کرتے تھے (3:120)۔ یہی کیفیت حضرت عمرؓ کی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ فوجوں کی روانگی کے وقت

جنگ کے متعلق پوری پوری ہدایات دیتے تھے بلکہ جنگ کے حالات سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے، اور مدینہ میں بیٹھے، محاذِ جنگ کے پلان مرتب کر کے بھیجتے رہتے تھے۔ اپنے زمانۂ خلافت میں آپ بہ نفسِ نفیس کسی معرکہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ کیا تھی، اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ آپ نے 14ھ میں ارادہ کیا کہ عراق جا کر ایک لشکر کی کمان خود سنبھال لیں۔ آپ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود رختِ سفر باندھ لیا۔ ابھی مدینہ کے باہر پہلے پڑاؤ تک پہنچے تھے (جو وہاں سے قریب تین میل پر واقع تھا) کہ صحابہؓ نے اس معاملہ پر مزید غور و فکر کیا اور ان کے نمائندہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے آپ سے کہا کہ:

امیر المومنین! آپ خود تشریف نہ لے جایئے۔ ایک لشکر بھیج دیجئے اور اس کی کمان کی خدمت میرے سپرد کر دیجئے۔ اگر لشکر شکست کھا گیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہو گی۔ لیکن اگر آپ شکست کھا گئے اور وہ بھی سب سے پہلے لشکر میں، تو اس کا اثر بڑا مضرت رساں ہو گا۔ اور اگر آپ شہید ہو گئے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ کا نام لینے والا کوئی بھی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ —— ''ہاں! میں بھی آپ جیسا ایک انسان ہوں اور آپ کے مشوروں کا محتاج۔ اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو میں رُک جاتا ہوں''۔ چنانچہ آپ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔

سپہ سالاروں کا اِنتخاب

آپ سپہ سالاروں کا انتخاب بڑی دُور نگہی اور ژرف بینی سے کرتے تھے۔ ان کی عسکری صلاحیتوں کے علاوہ، ان کے جوہرِ ذاتی، پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے انتخاب پر انہیں ضروری ہدایات دیتے اور جب کسی لشکر کو کسی مہم پر روانہ کرتے تو جملہ اہلِ لشکر کو خاص نصیحتیں فرماتے۔ اصولاً ان سے کہا کرتے تھے کہ

یاد رکھو! ہماری جنگ ظلم، تغلّب، استعمار یا استحصال کے لئے نہیں۔ یہ نہایت عادلانہ اور رحیمانہ جنگ ہے جس کے خاص قواعد وضوابط اور اصول واقدار ہیں۔ ان کی خاص طور پر پابندی کرنا۔

عام ہدایات میں اس کی بھی تاکید کی جاتی تھی کہ غیر متحارب آبادی کو (یعنی جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں، انہیں) قتل نہ کیا جائے۔ عورتوں اور بچوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہ اٹھایا جائے، درختوں کو نہ کاٹا جائے۔ فصلوں کو تلف نہ کیا جائے۔ مقتولینِ جنگ کا مُثلہ نہ کیا جائے (عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے سرداروں کی لاشوں کے مختلف اعضاء ناک، کان وغیرہ کاٹ ڈالتے تھے، اسے مُثلہ کہتے تھے) اور دُشمن سے کبھی بدعہدی نہ کی جائے۔

ہدایات

آپ نے جب حضرت خالد بن ولیدؓ کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ کو سپہ سالار مقرر کیا، تو انہیں لکھا:

میں تمہیں خوفِ خدا کی نصیحت کرتا ہوں جو ہمیشہ باقی رہے گا اور اس کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اُسی نے ہمیں تاریکیوں

سے نکال کر زندگی کی روشن راہوں پر چلایا۔ تمہیں ایک نہایت ذمہ دار منصب پر تعینات کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھنا۔ مالِ غنیمت کے لالچ میں مجاہدین کو ہلاکت میں مبتلا نہ کر دینا اور نہ کسی ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں پہلے سے جاسوس بھیج کر وہاں کے جملہ احوال وکوائف سے واقفیت اور وہاں کے راستوں کی معلومات حاصل نہ کر لی ہوں۔ لشکر بھیجنا تو بھاری تعداد میں بھیجنا۔ دنیاوی جاذبیتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور ان سے اپنے دل کو پاک رکھنا۔ خبردار! دنیاوی کشش تمہیں ہلاک نہ کر دے جیسا کہ وہ پہلوں کو ہلاک کر چکی ہے۔

جب حضرت سعدؓ کو جنگِ عراق کا سپہ سالار مقرر کیا تو فرمایا:

اے سعد! اے سعد بن وہیب!! دیکھنا کہیں اس بات سے دھوکا نہ کھا جانا کہ تم رسولؐ اللہ کے ماموں اور آپؐ کے صحابی کہلاتے ہو۔ اللہ کے ہاں نسب کوئی شے نہیں بس اطاعتِ خداوندی کام آتی ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ وہ سب کا پروردگار ہے۔ البتہ اطاعتِ خداوندی اور سلامت رَوی کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ بُرائی کو بُرائی کے ذریعے نہیں مٹاتا' وہ بُرائی کو بھلائی سے مٹاتا ہے۔ رسولؐ اللہ کے اُسوۂ حسنہ پر نگاہ رکھو۔ اگر تم نے اس سے رُوگردانی کی تو تمہارے سب اعمال بیکار ہو جائیں گے اور تم بھی ان میں سے ہو جاؤ گے جو تباہ ہو گئے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ کسی میدانِ کارزار میں بذاتِ خویش شریک نہیں ہوئے۔ لیکن وہ مدینہ میں بیٹھے اس طرح ہدایات جاری کیا کرتے تھے گویا میدانِ جنگ ان کے سامنے ہے۔ میدانِ جنگ ہی نہیں بلکہ وہ سارا ملک' اس کے نشیب و فراز' وہاں کے احوال وکوائف' سب ان کے نظروں کے سامنے ہیں۔ مثلاً حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سپہ سالار کی حیثیت سے ایران جاتے ہیں تو حضرت عمرؓ انہیں ایک تفصیلی خط لکھتے ہیں۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

اب تم مجاہدین کی معیت میں ایران کی طرف بڑھو اور قوانینِ خداوندی کی محکمیّت پر پورا پورا بھروسہ رکھو اور تمام امور میں اُسی کی اعانت طلب کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم ایک ایسی قوم پر حملہ کر رہے ہو جس کی طاقت بہت زیادہ ہے' تعداد بھی بڑی کثیر ہے۔ ساز و سامان کی افراط ہے۔ ان کا ملک بڑا محفوظ ہے' زمین اگرچہ وہاں کی نرم ہے (سنگلاخ نہیں) لیکن دریاؤں' سیلابوں اور جنگلوں سے اس طرح پٹی پڑی ہے کہ وہاں کے راستے بڑے دشوار گزار ہیں۔ ان امور کو پیشِ نظر رکھو۔ ایک بات اور بھی یاد رکھو' اور وہ یہ کہ ان پر جب بھی حملہ کرو' پوری شدت کے ساتھ' بھرپور حملہ کرو۔ ان کی کثرتِ تعداد سے نہ گھبرانا' لیکن ان کے دھوکے میں نہ آنا۔ یہ بڑی مکار قوم ہے' ان کی طبائع تمہاری طبائع سے بالکل مختلف ہیں' وہ مکار بہت زیادہ ہیں لیکن جدوجہد میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی ـــــ تم قادسیہ تک پہنچ جاؤ تو یوں سمجھو جیسے تم ایران کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب ہے۔ اس سے ورے دریا ہیں اور دریاؤں پر پل ہیں۔ تم اپنی چھاؤنی اس کی سرحد پر بنانا لیکن اس قدر مضبوط چھاؤنی بنانا کہ تمہیں وہاں سے ہٹنا نہ پڑے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ مدینے میں بیٹھے ہوئے' ایران کے متعلق کس قدر تفصیلی ہدایات دے رہے ہیں اور ایسی جزئی ہدایات اُس زمانے میں دے رہے ہیں جب سامانِ رسل و رسائل کا اس قدر فقدان اور مواصلات کی اس قدر کمی تھی۔ اُس زمانے میں' دشمن کے ملک سے اتنی دور بیٹھے' وہاں کی جزئیات تک سے اس قدر باخبر ہونا' ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے بڑی دور نگہی' جزرسی' کاوش اور کاہش کی ضرورت اور ہر وقت عقابی نظروں سے حالات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کی صلاحیت اور عادت لاینفک تھی۔

حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کی افواج کے سپہ سالار تھے۔ جب مصر کی فتح میں تاخیر ہوگئی تو آپ نے انہیں ایک اِنتباہی چٹھی لکھی جس میں کہا کہ:

> مجھے تعجب ہے کہ تم اس وقت تک مصر کیوں نہ فتح کر سکے حالانکہ تمہیں لڑتے ہوئے دو برس ہو گئے۔ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ غالباً تم لوگ بھی دنیاوی جاذبیتوں سے اسی طرح محبت کرنے لگ گئے ہو جس طرح تمہارا دُشمن کرتا ہے۔ اس صورت میں تم کبھی ان پر غالب نہیں آسکو گے۔ یاد رکھو! اللہ کسی قوم کو فتح عطا نہیں کرتا جب تک اس کی نیتیں درست نہ ہوں۔

سپاہیوں کا کردار

''نیتوں کی درستی'' سے کیا مفہوم تھا' اسے ایک واقعہ سے سمجھئے۔ ایک جنگ میں' دشمن کا ایک سردار اس بے جگری اور جرأت و بسالت سے لڑتا تھا کہ اسے مغلوب کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ مجاہدین کے سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص اس سردار کا سر کاٹ کر لے آئے گا' اُسے ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس سردار کا سر سپہ سالار کے خیمے کے باہر پڑا ہے اور کسی کو پتہ نہیں کہ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تو سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جس مردِ جری نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے میں اُسے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے۔

یہ سن کر ایک غیر معروف سا سپاہی سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپہ سالار نے پوچھا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے' اس نے کہا' ہاں! تو سپہ سالار نے کہا کہ یہ لو تمہارا انعام۔

اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے یہ خدمت اللہ کے لئے سرانجام دی ہے' انعام کی خاطر نہیں۔ سپہ سالار بہت خوش ہوا۔ اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ وہ بولا — آپ میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں اس کا شہرہ کریں۔ آپ اس طرح میرا اَجر بھی ضائع کر دیں گے اور میرے نفس کو بھی خراب کر دیں گے۔ مجھے جانے دیجئے۔

کامیابی کا راز

یہ تھا مطلب نیتوں کی اصلاح کا اور اسی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک خط میں لکھا:

میں تمہیں اور تمہارے لشکریوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں کیونکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے سب سے زیادہ موثر ہتھیار اور سب سے زیادہ کامیاب تدبیر' خوفِ خدا ہے — خوفِ خدا کے معنی ہیں احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے دشمن کی نسبت' اخلاقی خرابیوں سے زیادہ بچو کیونکہ اہلِ لشکر کی اپنی اخلاقی خرابیاں ان کے حق میں دشمنوں کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتح صرف اس لئے ہوتی ہے کہ دشمن کے اخلاق اُن سے زیادہ پست ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو مسلمان کبھی ان کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ اس لئے کہ نہ ہماری فوج' تعداد میں ان کی فوج کے برابر ہے نہ ساز و سامان میں۔ لہٰذا' اگر گناہگاری یعنی بداخلاقی اور بدکرداری میں ہم اور وہ ایک سطح پر ہوئے تو پھر وہ کون سی چیز ہوگی جس کے بَل بوتے پر ہم ان پر غالب آ سکیں گے۔ اگر ہم حُسنِ سیرت میں ان سے آگے ہوں گے تو ہم ان پر فتح حاصل کرسکیں گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے اوپر کراماً کاتبین مقرر ہیں جو تمہاری ہر بات کو جانتے ہیں۔ ان سے شرماؤ (اور اس طرح ظاہر و باطن ہر بداخلاقی اور معصیت سے بچو)۔ یہ کبھی خیال نہ کرو کہ ہم بُرے ہی سہی' لیکن دُشمن ہم سے زیادہ بُرا ہے' اس لئے خدا یہ کبھی نہیں کرے گا کہ خواہ ہم برائی ہی کیوں نہ کرتے رہیں' وہ ہم پر مسلط ہو جائے۔ تاریخ میں دیکھو' کتنی قومیں ایسی تھیں کہ ان سے زیادہ بُری قومیں ان پر مسلّط ہوگئیں۔ بابل کا بخت نصر بنی اسرائیل پر کس طرح مسلّط ہو گیا حالانکہ بنی اسرائیل بہرحال خدا کو مانتے تھے اور اہلِ بابل کافر و مشرک تھے۔ (لہٰذا' اپنا اور دشمن کا مقابلہ برائیوں کے پیمانے سے نہیں' اچھائیوں کے پیمانے سے کرو۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے)۔

حُسنِ کردار اور پاکیزگیٔ اخلاق کا معیار یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تمہارے معاملات کیسے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے نام خط میں ایک فقرہ ایسا لکھا جس میں فلسفۂ اخلاق کی ساری تفصیل سمٹ کر آ گئی ہے۔ آپ نے لکھا:

اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے ہاں ہے۔

اسی طرح سپہ سالار اور لشکری' حاکم اور رعایا' امیر اور عوام کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں' حضرت عمرو بن عاصؓ کے نام ایک مکتوب گرامی میں ایک فقرہ ایسا لکھا جو اپنی جامعیت اور صداقت کے اعتبار سے یوں کہئے گویا اَبد درکنار ہے۔ آپ نے لکھا کہ

تم اپنی رعایا (ماتحتوں) کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے اگر تم رعایا (ماتحت) ہو تو اپنے امیر کو دیکھنا چاہو۔

انہی کے نام ایک اور خط میں لکھا:

یادرکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بد بخت وہ انسان ہے جس کی وجہ اس کی رعایا بد بخت ہو جائے۔

سپہ سالاروں کا برتاؤ سپاہیوں کے ساتھ

انہی نصائح کا اثر تھا کہ سپہ سالاروں نے' اہلِ لشکر کے ساتھ ـــــ مَن تُو شُدم تُو مَن شُدی ـــــ (دو قالب و یک جان کا) سارشتہ استوار کر رکھا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ عمواس میں تھے کہ وہاں طاعون کا مرض وبائی شکل میں پھوٹ پڑا۔ حضرت عمرؓ کو خطرہ لاحق ہوا کہ ''اِمین الامت'' (یہ حضرت ابوعبیدہؓ کا لقب تھا) کہیں اس کی گرفت میں نہ آ جائیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں لکھا کہ:

مجھے ایک ضروری کام کے سلسلہ میں آپ سے بالمشافہ گفتگو کرنی ہے۔ تاکید ہے کہ اس خط کے دیکھتے ہی میرے پاس پہنچ جاؤ۔

حضرت ابوعبیدہؓ خط پڑھتے ہی حضرت عمرؓ کے مقصد کو بھانپ گئے۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ:

میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری کیا ضرورت ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس بلا میں چھوڑ کر خود محفوظ ہو جاؤں۔ لہٰذا' میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس ارشاد کی تعمیل سے معذور قرار دیں اور اپنے لشکر میں رہنے دیں۔

خط پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا (حضرت) ابوعبیدہؓ وفات پا گئے؟ آپ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا کہ وفات پا تو نہیں گئے ـــــ پا جائیں گے۔

اور دوسری اطلاع یہ موصول ہوئی کہ امین الامت' وفات پا گئے۔

اور یہی حضرت ابوعبیدہؓ تھے کہ جب عراق کے سرداروں کے ساتھ صلح کی گئی تو انہوں نے آپ کو کھانے پر مدعو کیا۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے ایرانی کھانے چُنے ہوئے تھے۔ آپ نے انہیں دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا تمام اہلِ لشکر کو اسی قسم کے کھانے دیئے گئے ہیں یا یہ میرے ہی لئے مخصوص ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ وہ صرف آپ کے لئے ہیں تو آپ نے اپنا بڑھایا ہوا ہاتھ یہ کہہ کر دسترخوان سے کھینچ لیا کہ جب تک تمام اہلِ لشکر کو یہی کھانے نہیں دیئے جائیں گے' میں انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

اور جب تک تمام اہلِ لشکر کے لئے انہی جیسے کھانوں کا اہتمام نہیں ہوا' آپ نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔

سقاطیہ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ ان میں وہ کھجوریں بھی تھیں جو ایران کے بادشاہوں کے لئے مخصوص تھیں۔ یہ کھجوریں تمام اہلِ لشکر میں اسی طرح تقسیم کی گئیں جس طرح سپہ سالار کو ملیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ایران کے شاہنشاہ ان کھجوروں کو اپنے تک محدود رکھتے تھے اور ان کاشتکاروں کو بھی نہیں دیتے تھے جن کی محنت کے پسینے سے ان

درختوں کی آبیاری ہوتی تھی تو انہوں نے ان غریب کاشتکاروں کو بھی ان میں برابر کا شریک کر لیا۔

حمص کا واقعہ

مفتوحہ علاقہ کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی لشکرِ اسلام کا یہی سلوک تھا جس سے وہ انہیں خود اپنوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ جب مسلمانوں نے حمصؔ کو فتح کر لیا تو وہاں کی عیسائی رعایا سے جزیہ وصول کیا۔ (جزیہ اور ذِمیوں کے متعلق تفصیلی بحث کسی دوسری جگہ ملے گی۔ اس وقت اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ مسلمان جس علاقہ کو فتح کرتے' وہاں کے باشندوں کو اجازت ہوتی کہ وہ چاہے تو اسلام قبول کر کے' خود فاتح قوم کا جزو بن جائیں اور چاہے اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ اس دوسری صورت میں مسلمان اُن غیر مسلم مفتوحین کی جان' مال' عزت' آبرو' مذہب' معابد کی حفاظت کا ذمہ لیتے۔ اسی نسبت سے انہیں ذِمّی یا اہل الذّمہ کہا جاتا — یعنی وہ جن کی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ مسلمانوں نے لے لیا ہو۔ اس حفاظتِ کُلّی کے عوض' وہ لوگ' ایک نہایت معمولی سا ٹیکس ادا کرتے جسے جزیہ کہا جاتا۔ یہ ٹیکس درحقیقت ایک علامت (TOKEN) ہوتی تھی اس بات کی کہ ان لوگوں نے مملکتِ اسلامیہ کی حفاظت قبول کر لی ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلمانوں نے حمصؔ کے عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا)۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں (مسلمانوں) نے دیکھا کہ رومیوںؔ کا لشکر حمصؔ کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ' جنگی تدبیر کے پیشِ نظر' حمصؔ کو خالی کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے وہاں کے پادریوں اور سرداروں کو بلایا اور کہا کہ چونکہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں اور تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے (اس حفاظت کے لئے) تم سے جو جزیہ کی رقم وصول کی تھی' ہمیں اب کوئی حق حاصل نہیں کہ اس رقم کو اپنے پاس رکھ لیں' اس لئے ہم تمہیں وہ رقم واپس دیتے ہیں۔

حمصؔ کے یہ باشندے بھی عیسائی تھے اور رومی جو یہاں سے چلے گئے تھے لیکن اب دوبارہ واپس آ رہے تھے وہ بھی عیسائی۔ لیکن اہلِ حمصؔ کا یہ عالم تھا کہ وہ روتے تھے اور مسلمانوں کے لشکر سے درخواستیں کرتے تھے کہ آپ یہاں سے نہ جایئے۔

تُو نخلِ خوش ثمرے کیستی' کہ سرو و سمن
ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

مسلمان سپاہیوں کا یہی کردار تھا جو اس سرعت کے ساتھ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ زمینیں تو تلوار سے فتح کر سکتے ہیں' انسانی قلوب تلوار سے فتح نہیں کئے جا سکتے۔ وہ صرف حُسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار ہی سے فتح کئے جا سکتے ہیں اور قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے' غیر اقوام کے قلوب کو اس طرح فتح کیا تھا۔ امام ابن تیمیہؒ کا یہ قول کس قدر مبنی بر حقیقت ہے کہ:

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کو دوسری قوموں کی طرف منتقل نہیں کیا تھا بلکہ ان قوموں کو اسلام کی طرف منتقل کیا تھا۔

مقوقس کا تأثر

یعنی ان (مسلمانوں) کے حُسنِ سیرت وکردار سے متأثر ہوکر یہ قومیں کشاں کشاں اسلام کی طرف چلی آئی تھیں اور اس کے مظاہر ہمیں، ان سپاہیوں کے نقوشِ پامیں، قدم قدم پر ملتے ہیں۔ جب مقوقس نے اپنے ایلچی، حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس بھیجے، جو مصر میں جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار تھے، تو وہ دو دن تک وہاں رُکے رہے۔ مقوقس کو اندیشہ لاحق ہوا کہ عربوں نے کہیں ان ایلچیوں کو قتل نہ کر دیا ہو۔ جب وہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرو ابن عاصؓ نے انہیں اس مقصد کے لئے روک لیا تھا کہ وہ مسلمان فوجیوں کا بنظرِ خویش مشاہدہ اور بنگاہِ غائر مطالعہ کر سکیں۔ ان ایلچیوں کے رئیس نے مقوقس سے کہا کہ:

> ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد زندگی سے زیادہ موت، اور غرور و نخوت سے زیادہ خاکساری پر جان دیتا ہے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو دنیا سے کوئی بھی غرض یا دلچسپی رکھتا ہو۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہیں۔ گھٹنوں پر رکھ کر کھاتے ہیں۔ ان کا امیر گویا انہی میں کا ایک فرد ہے۔ ان میں شریف اور کمینے، آقا اور غلام کا کوئی فرق نہیں۔ (ان میں کامل مساوات ہے اور اس کا عملی مظاہرہ) نماز کے وقت ہوتا ہے جب سب ایک طرح وضو کرتے اور ساتھ مل کر نہایت خضوع و خشوع سے اپنے ربّ کے حضور جھک جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لشکریوں کے یہ اوصاف سن کر مقوقس سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے بعد، اس نے سر اٹھا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "قسم اس ذات کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ چاہیں تو پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اگر ہم آج ان سے صلح نہ کر سکے جب انہیں نیل نے گھیر رکھا ہے تو کل، جب وہ اس خطرہ سے نکل گئے تو انہیں ہم کسی طرح بھی صلح پر آمادہ نہیں کر سکیں گے"۔

ہرمزان کا تبصرہ

اور تستر (ایران) کے گورنر، ہرمزآن نے اس تمام تفصیل کو سمیٹ کر ایک فقرہ میں سمو دیا تھا۔ جب وہ (فتح ایران کے بعد) گرفتار ہو کر مدینہ آیا ہے (ہیکل نے اس کی آمد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے)۔ وہ مدینہ کے قریب پہنچا تو اس نے دیبا کی زرکار پوشاک زیبِ تن کی، موتیوں اور جواہرات سے مرصّع تاج سر پر رکھا، خالص سونے کا عصائے شاہی جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں لئے "مسلمانوں کے بادشاہ" حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے چلا۔ اس نے خیال کیا کہ حضرت عمرؓ پہرے داروں کی حفاظت میں، رونق افروزِ ایوان شاہی ہوں گے اور ایوان کے دروازے پر حاجب و دربان متعین ہوں گے۔ حضرت انس بن مالکؓ اور احنف بن قیسؓ نے (جو ہرمزآن کو ساتھ لائے تھے) دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ مسجد میں ہیں۔ ہرمزآن مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ بیٹھے چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں اور ایک طرف ایک شخص جُبّہ سرہانے رکھے، سو رہا ہے۔ ہرمزآن نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ "شاہنشاہ عمر کہاں ہیں؟"۔ انہوں نے اس سونے

والے شخص کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہیں' تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ اسے باور کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھا کہ عرب و عجم کا شاہنشاہ اور یوں فرشِ خاک پر محوِ استراحت ہو۔ جب اسے یقین دلایا گیا کہ (حضرت) عمرؓ وہی ہیں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ "اس شخص کو پیغمبر ہونا چاہئے اور اگر یہ پیغمبر نہیں تو اس کا عمل ضرور پیغمبروں کا سا ہے"۔

نیند سے بیدار ہونے پر حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو دیکھا تو آپ نے اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ ہرمزان! یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم' ایرانی' ہم لوگوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے اور نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا جو تم نے ہم لوگوں کے ہاتھوں اس قدر ذلّت آمیز شکست کھائی۔ اس نے جواب دیا —— اور یہی وہ اس کا جواب ہے جس تک پہنچنے کے لئے ہم نے یہ ابتدائی گفتگو کی ہے —— اس نے کہا کہ "عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایامِ جاہلیت میں' ہم اور تم اکیلے ایک دوسرے سے نپٹتے تھے اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت' ہم اکیلے ہوتے ہیں' اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں"۔

ایک ایران ہی نہیں جب تک "خدا اُن کے ساتھ رہا" دنیا کا کوئی ملک بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ اور خدا کے ساتھ ہونے کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ (رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ) اللہ کے متعین کردہ نصب العین کی خاطر' باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراتے تھے اور اس ٹکراؤ میں اللہ کے مقرر کردہ قوانین و اقدار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی دُور رَس نگاہوں نے اس خدشہ کو بھانپ لیا تھا کہ قرآنی تعلیم و تربیت نے ان مجاہدین کی سیرت کو جس قالب میں ڈھال دیا تھا' اگر ان کا اختلاط غیر اسلامی تصورات اور عجمی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہو گیا' تو ان میں یہ جوہر باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے ہدایات نافذ کر دی تھیں کہ مسلمان سپاہی' ایرانی شہروں میں نہ بسیں' بلکہ ان کی بستیاں الگ بسائی جائیں جو ان کے لئے چھاؤنیوں کا بھی کام دیں۔ آپ نے کوفہ اور بصرہ کی بنیاد اسی مقصد کے لئے ڈالی تھی۔ جب تک یہ کیفیت باقی رہی' مسلمانوں کی مجاہدانہ روح بدستور تازہ اور شاداب رہی۔ جب ان کا اہلِ عجم کے ساتھ خلا ملا شروع ہوا' ان کی زندگی کی حرارت بھی افسردہ ہونی شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ یہ سراپا برق و رعد اُمت' راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ (لیکن یہ داستان الگ ہے جس کی تفصیل آخری باب میں ملے گی)۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق

ان حضرات کے دل میں جذبۂ جہاد کس شدت سے موجزن تھا اور انہیں اس کی اہمیت کا کس قدر شدید اور عمیق احساس تھا' اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایئے۔ فتحِ ایران کے سلسلہ میں' معرکۂ قادسیہ نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی تھی کہ ہر شخص اس کے متعلق تازہ ترین خبریں حاصل کرنے کے لئے بے حد مضطرب و مشوّش رہتا تھا۔ خود حضرت عمرؓ کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ آپ ہر صبح' اس راستے پر جدھر سے قادسیہ کے پیغامبر آیا کرتے تھے' میلوں باہر نکل جاتے تا کہ کوئی قاصد مل جائے اور وہ

اس سے حالات معلوم کرسکیں۔ اس طرح وہ ہر صبح باہر نکل جاتے اور دوپہر کو واپس تشریف لاتے۔ ایک دن وہ اسی طرح اس راستے پر جارہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار آتا دکھائی دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ قادسیہ سے آرہا ہے۔ آپ نے اس سے، یہ بتائے بغیر کہ آپ کون ہیں، کہا کہ وہاں کی کوئی خبر ہو تو سناؤ، اس نے وہاں کے حالات سنانے شروع کئے تو حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کردیا۔ وہ وہاں کی فتح کی خوشخبریاں سنا رہا تھا اور حضرت عمرؓ فرطِ مسرت سے رقصاں و جنباں، اس کے ساتھ بھاگتے چلے جارہے تھے، بھاگتے چلے جارہے تھے اور زبانِ حال سے کہتے جارہے تھے کہ

کہے جا پیامِ قاصد، یونہی جانِ ناتواں سے
کہ ہوا بدل چلی ہے تری جنبشِ زباں سے

کہ اتنے میں وہ مدینہ کے قریب آگئے اور لوگوں نے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کہنا شروع کیا۔ جب اس طرح اس سوار کو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کون دوڑے چلا آیا ہے تو اس نے انتہائی استعجاب کے عالم میں کہا کہ یا امیر المومنین! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے مجھ سے اپنا تعارف کیوں نہ کرادیا! آپ نے نہایت سادگی سے کہا کہ اگر میں اپنا تعارف کرادیتا تو جس بے تکلفی سے تم نے باتیں کی ہیں، ویسے نہ کرسکتے۔ اس پر اس نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا وہ خط آپ کی خدمت میں پیش کیا جس میں نویدِ ظفر مرقوم تھی۔

نماز میں بھی یہی خیال مرکزِ توجہ رہتا تھا

جہاد کے ساتھ آپ کی قلبی وابستگی اور والہانہ شیفتگی کا یہی ثبوت نہیں کہ آپ مجاہدین کے حالات معلوم کرنے کے لئے مدینہ سے اتنی دُور تک باہر چلے جاتے تھے۔ ان کے جذب و انہماک کی کیفیت اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ بعض اوقات نماز میں بھی مجاہدین کی صف بندی کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کا ذکر، کہ آپ نماز میں بھی مجاہدین کی بابت سوچتے رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے خود ہی دوسروں سے کیا ہوگا کیونکہ جب تک سوچنے والا خود ہی کسی دوسرے سے ذکر نہ کرے، کسی شخص کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ فلاں شخص کیا سوچتا ہے اور اگر اس کا ذکر حضرت عمرؓ نے خود کیا تھا تو ہمارے نزدیک اس میں بھی ان کی بلندئ کردار کی جھلک موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ ''اللہ والوں'' کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بحالتِ نماز، دنیا تو ایک طرف، انہیں خود اپنے آپ کی بھی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اس وقت وہ کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ نماز میں جذب و محویت بجا اور درست، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُس وقت انسان کو دنیا یا خود اپنی ذات کا بھی احساس نہیں رہتا۔ نماز میں ہم اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے حضور اپنی آرزوئیں پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان دُعاؤں میں دنیا یا اپنی ذات سے قطع تعلق نہیں ہوجاتا۔ ہم، انفرادی یا اجتماعی طور پر

خود اپنے لئے کچھ مانگتے ہیں' اس لئے اس میں خود فراموشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اور جو کچھ ہم مانگتے ہیں اس میں دنیا بھی ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ جب ہم کہتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً [2:201] ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا فرما اور آخرت میں بھی خوشگواریاں'' تو اس میں نَا (ہم) کا احساس ہمارے سامنے ہوتا ہے اور دُنیا اور اس کی خوشگواریوں کا احساس بھی۔ یہ احساسات مٹ جائیں تو رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کا کچھ مفہوم نہیں رہتا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو اس میں ''ہم'' کا احساس سب سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان اقوام کا تصور نگاہوں کے سامنے جن پر انعاماتِ خداوندی کے سحابِ کرم کی بارشیں ہوئیں اور اس کے ساتھ ان انعامات کی تفصیل بھی۔ آپ سوچئے کہ ان دعاؤں میں اپنی ذات کی فراموشی اور دنیاوی معاملات سے قطع تعلق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

رسول اللہؐ بحالتِ نماز

اس سے ایک قدم اور بھی آگے بڑھیے۔ حضور نبی اکرمؐ سے زیادہ نماز میں محویت کی کیفیت اَور کس پر طاری ہوسکتی تھی۔ بایں ہمہ' حضورؐ کے متعلق' کتبِ احادیث میں ہمیں اس قسم کی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً بخاری کتاب الصلوٰۃ میں ہے:

(1) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک ایسی خمیصہ میں نماز پڑھی جس میں نقش تھے تو آپؐ کی نظر ان نقوش پر پڑی۔ جب آپؐ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میری اس خمیصہ کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور مجھے ابوجہم کی انبجانیہ لادو کیونکہ اس خمیصہ نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کردیا — (انبجانیہ ایک قسم کی چادر کو کہتے ہیں۔)

(2) انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک پردہ تھا کہ اسے انہوں نے اپنے گھر کے گوشے میں ڈالا تھا' تو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہمارے پاس سے یہ اپنا پردہ ہٹادو' اس لئے کہ اس کی تصویریں برابر میرے سامنے آرہی ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

(3) میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ میں اس میں طول دوں۔ لیکن بچے کے رونے کی آواز سن کر میں اپنی نماز میں اختصار کردیتا ہوں' اس بات کو بُرا سمجھ کر کہ میں اس کی ماں کی تکلیف کا باعث ہوجاؤں گا۔

بحالتِ نماز دل میں خیالات گزرنے کے سلسلہ میں'

(4) حضرت عقبہؓ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو بہت جلد کھڑے ہوگئے اور اپنی بعض بیبیوں کے پاس تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آئے اور آپؐ نے لوگوں کے چہروں میں اپنے جلد تشریف لے جانے کے سبب سے تعجب کے آثار دیکھے تو فرمایا کہ مجھے نماز میں

ایک (سونے کا) ٹکڑا جو ہمارے ہاں تھا یاد آ گیا تو میں نے بُرا سمجھا کہ وہ شام کو یا شب بھر ہمارے ہاں رہے۔ لہٰذا میں نے اس کے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا[1]۔

(5) حضرت ابوقتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرمؐ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ابو عاصؓ کی بیٹی امامہ (یعنی حضورؐ کی نواسی) آپؐ کے کاندھے پر ہے۔ آپؐ رکوع میں جاتے تو بچی کو نیچے اتار دیتے اور سجدے سے فارغ ہو کر اسے پھر مونڈھے پر بٹھا لیتے۔ (صحیحین)

(6) حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپ گھر میں نماز پڑھتے تو دروازہ بند کر لیتے۔ میں باہر سے آتی تو آپؐ دروازہ کھول دیتے اور پھر بدستور نماز میں مشغول ہو جاتے۔ (احمد داؤد' بحوالہ مشکوٰۃ)

(7) حضرت بلالؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نماز میں مشغول ہوتے' ہم لوگ سلام کرتے تو آپؐ ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دے دیتے۔ (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

ان روایات سے بھی واضح ہے کہ بحالتِ نماز اس قسم کے جذب و انہاک کا تصور' جس میں انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے' حضورؐ کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے تصورات کہ ''اللہ والے'' بحالتِ نماز دنیا و مافیہا حتیٰ کہ خود اپنی ذات تک سے بے خبر ہوتے ہیں اور وہ خالصتہً خدا سے لَو لگائے ہوتے ہیں' اُس دَور میں پیدا ہوئے جب مسلکِ خانقاہیّت (روحانیّت یا تصوّف) مسلمانوں میں در آیا[2]۔ اس مسلک کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ روحانیت اور مادیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دنیا اور اس کی جاذبیتیں مادہ کی مظاہر ہیں اس لئے اس قابل کہ ان سے دُور بھاگا جائے' ان سے نفرت کی جائے۔ جس قدر کوئی شخص دنیاوی آلائشوں سے قطعِ تعلق کرے گا اتنا ہی ''روحانیت'' میں آگے بڑھتا جائے گا۔ اور نماز کا تعلق چونکہ خالصتہً ''عالمِ روحانیت'' سے ہے اس لئے اس میں دنیاوی خیالات قطعاً دِل میں نہیں آنے چاہئیں۔ یہ وجہ ہے جو ''اللہ والوں'' کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ نماز کی محویّت میں وہ دنیا و مافیہا سے قطعاً بے خبر ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے خیالات ان کے دل و دماغ کے قریب تک آنے نہیں پاتے۔ ان (عام) اعتقادات و تصورات کے پیشِ نظر کوئی شخص جو ''اللہ والا'' ہونے کا مدعی ہو وہ کسی سے کبھی یہ نہیں کہے گا کہ وہ نماز کی حالت میں دنیاوی معاملات کے متعلق سوچتا ہے۔ لہٰذا' اگر حضرت عمرؓ نے ایسا کہا' اور آپ کے رفقاء نے اسے قابلِ قدر جذبہ سمجھا (جبھی تو اسے حضرت عمرؓ کے محاسن کے طور پر روایت کیا) تو اس سے واضح ہے کہ اُس دَور میں ''اللہ والے ہونے'' کا معیار وہ نہیں تھا جو بعد میں پیدا ہوا۔ وہ حضرات دین کی حقیقت سے باخبر تھے۔ ان کے نزدیک دین نام تھا باطل کی

1۔ اس حدیث پر ذرا وہ حضرات غور فرمائیں جو بڑے دھڑلّے سے کہتے ہیں کہ ''اسلام میں بے حد و نہایت'' دولت جمع کرنے کی اجازت ہے۔ تفصیل ان امور کی متعلقہ باب (معاشی نظام) میں ملے گی۔

2۔ اس کے متعلق گفتگو آخری باب میں کی جائے گی۔

قوتوں پر غلبہ پا کر‘ حق کی اقدار کے مطابق‘ نظام قائم کرنا اور ایسا کرنے والے ہی ان کے نزدیک ’’اللہ والے‘‘ تھے۔ بِنا بریں‘ اگر حضرت عمرؓ بحالتِ نماز میدانِ جہاد کے متعلق سوچا کرتے تھے‘ تو اس سے ظاہر ہے کہ باطل کو مغلوب اور حق کو غالب کرنے کا خیال کس شدت سے ان کے دل و دماغ پر مستولی رہتا تھا ـــــ اور یہی سچے ’’اللہ والوں‘‘ کی نشانی ہے۔

بھائی کا مرثیہ

جہاد‘ اور اس میں‘ مقتولین فی سبیل اللہ کی عظمت کا تصور ان حضرات کے دلوں میں کس قسم کا انقلاب پیدا کر دیتا تھا‘ اس کا اندازہ ایک ایسے واقعہ سے لگایئے جس کا تعلق بھی حضرت عمرؓ کے جذبات سے تھا۔ حضرت عمرؓ کے ایک بھائی زیدؓ شہید ہو گئے تھے۔ ان سے انہیں (حضرت عمرؓ) کو بڑی محبت تھی اس لئے ان کی جدائی ان پر بڑی شاق گزری۔ وہ اکثر بھائی کی یاد میں غم آلود اور افسردہ خاطر رہتے تھے۔

ایک شخص مالک بن نویرہ‘ ان میں سے تھا جنہوں نے عہدِ صدیقیؓ میں مملکت کے خلاف بغاوت کی تھی وہ گرفتار ہوا اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے (جو باغیوں کے خلاف مہم کے کمانڈر تھے) اسے قتل کر دیا (تفصیل اس کی حضرت خالدؓ سے متعلق باب میں آئے گی)۔ مالکؔ کا ایک بھائی تھا ـــــ متمم بن نویرہ۔ وہ شاعر تھا‘ اس نے اپنے بھائی کے قتل پر ایسے جگر پاش اور جانگداز مرثیے کہے جس سے دلوں کی دنیا دہل گئی۔ عرب میں اس کے مرثیوں کا عام چرچا تھا۔ ایک دن وہ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے سامنے آ گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ مجھے بھی اپنا کوئی مرثیہ سناؤ کیونکہ تمہارا اور میرا غم ایک ہی جیسا ہے۔ اس نے مرثیہ سنایا تو آپ نے کہا کہ ہاں! اسے کہتے ہیں نوحہ۔ اللہ زیدؓ بن خطاب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس کے غم میں اسی قسم کے مرثیے کہتا۔

متمم بولا! امیر المومنینؓ! یہ آپ نے کیا کہا۔ اگر میرے بھائی کو وہ موت نصیب ہو جاتی جو آپ کے بھائی کے حصے میں آئی ہے (یعنی شہادت) تو میں اس کے غم میں ایک آنسو بھی نہ بہاتا۔

آپ نے کہا‘ نویرہ! اس قسم کی تعزیت اس سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کی‘ اس سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔

یہ تھا ان لوگوں کے نزدیک شہادت کا مرتبہ!

مساوات کا ماحول

اس میں شُبہ نہیں کہ اُن حضرات کے دلوں میں شوقِ شہادت میں جان دے دینے کا جذبہ بیش بیش تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس سے سرشار ہو کر اُن مجاہدین نے وہ کچھ کر کے دکھایا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھ آج تک ترستی ہے لیکن اس سلسلہ میں‘ ذمہ دار اربابِ بست و کشاد نے جو فضا پیدا کر دی تھی اس میں اس کا بھی بڑا دخل تھا۔ (مثلاً) نسبی افتخار عربوں کی گھٹی

میں پڑا تھا۔ اپنے اپنے قبیلہ کی طرف نسبت' ان کے لئے دنیا جہان کی عزت وعظمت سے زیادہ وقیع تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جن قبائل کو گھٹیا تصور کیا جاتا تھا ان کے افراد' اپنے آپ کو معاشرہ میں ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے ہندوؤں کے ہاں شُودر۔ اور جب خود عربوں کے بعض اپنے قبائل کے افراد کا یہ عالم تھا' تو ان کے معاشرہ میں بیچارے غلاموں کی جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے' خواہ وہ غلام آزاد کردہ ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن اسلام نے یہ ذہنیت ہی بدل ڈالی۔ اس نے حسب ونسب کے تمام امتیازات مٹا کر اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ [49:13] کو معیارِ فضیلت وتکریم قرار دے دیا۔ اس سے ایسی مساواتِ انسانیہ کی جنّت وجود میں آ گئی جس میں ــــ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز ــــ آپ ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس میں' رومیوں کے خلاف جس لشکرِ عظیم کو تیار کیا اس کی سپہ سالاری کے لئے (عام الفاظ میں) ایک غلام (حضرت زیدؓ) کے بیٹے (حضرت اسامہؓ) کو منتخب فرمایا ــــ یعنی ایک غلام ابن غلام سپہ سالار اور اس کی ماتحتی میں عرب کے بلند ترین قبائل کے نامور سردار' سپاہی۔

جہاں تک قبائلی اور خاندانی نسبتوں کے تصور کو مٹانے کا تعلق تھا' حضرت عمرؓ اس باب میں اِس قدر محتاط تھے کہ ایک دفعہ آپ تک یہ اطلاع پہنچی کہ فوج میں دو سپاہیوں میں کوئی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلہ کا نام لے کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ اس پر آپ سخت برافروختہ ہوئے۔ اس لئے کہ اس سے' نہ صرف یہ کہ سینوں میں کمتری اور برتری کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں بلکہ رنگ اور خون کے امتیاز سے اخوتِ اسلامیہ کی جڑ کٹ جاتی ہے جس پر امت کی تشکیل کا مدار ہے۔ اسلام میں نسبت صرف ایک ہی باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے دین کی نسبت' ایمان کی نسبت (دورِ حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی نسبت)۔ اگر مسلمان کہلانے کے بعد بھی رنگ' نسل' خون' وطن کے امتیازات باقی رہ جاتے ہیں' تو سمجھ لیجئے کہ اسلام کا یہ دعویٰ صرف زبان اور الفاظ تک محدود ہے (قرآن کے الفاظ میں) ''ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا'' (49:14)۔ یہ وجہ تھی کہ اس خبر کے ملنے پر حضرت عمرؓ اس قدر برافروختہ ہوئے کیونکہ یہ اسلام لانے کے بعد پھر جاہلیّت (حالتِ کفر) کی طرف پلٹ جانے کی غماز تھی۔ چنانچہ آپ نے فوراً مدار المہام حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک تفصیلی مراسلہ بھیجا۔ اس میں مرکزی واقعہ تو مدد کے لئے ''قبیلے کو پکارنا'' تھا لیکن ضمناً مزید ایسی ہدایات بھی آ گئی تھیں جن کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں آپ نے لکھا:

> جب بھی کبھی دو ایسے معاملات سامنے آئیں جن میں ایک ''اللہ کے لئے'' ہو' اور دوسرا دنیا (کے طبیعی مفاد) کے لئے' تو دنیا سے متعلق حصہ پر' اللہ سے متعلق حصہ کو ترجیح دو (یعنی دنیاوی مفاد کو ہمیشہ مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع رکھو)۔ اگر کبھی قبائلی تنازعہ اُبھرے اور کوئی شخص ''یا آلِ فلاں'' کہہ کر آواز دے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والوں کی تلوار سے خبر لو' تا آنکہ وہ اللہ اور اپنے امام کی طرف رجوع کر لیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ ضبہ کے بعض افراد نے ''یا آلِ ضبہ'' کہہ کر پکارا ہے۔ (اگر یہ سچ ہے تو) میرا مراسلہ پہنچتے ہی انہیں سخت سزا دو تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی

حرکت نہ کریں۔

جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے یکساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود سرانجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم انہی میں کے ایک فرد ہو' اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا پہنتے' ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں' جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ اللہ کے بندے! بچ' کہیں تیرا حال اس جانور کا سا نہ ہو جائے جس کا گزر ایک شاداب وادی پر ہوا تو سوائے پُرخوری اور فربہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہا' حالانکہ وہی پُرخوری اور فربہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعیّت بدبخت ہو جائے۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم' اور اس قسم کی تھیں ان کی ہدایات جو وہ ذمہ دار اربابِ مملکت' اور سپہ سالارانِ جیوش وعساکر کو بھیجتے رہتے تھے۔

میدانِ جنگ میں آپ اس قسم کی ہدایات بھیجتے رہتے۔ جہاں تک' مجاہدین کے بال بچوں کا تعلق تھا' حضرت عمرؓ نے اعلان کر رکھا تھا کہ سپاہیوں کی عدم موجودگی میں ''ان کے بچوں کا باپ عمرؓ ہے''۔ چنانچہ آپ خود اُن سپاہیوں کے گھروں پر جا کر دریافت فرماتے کہ ان کے بال بچوں کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔ جن گھروں میں مرد نہ ہوتے' ان کا سودا سلف خود خرید کر لا دیتے۔ ان کے مویشیوں کو چارہ ڈالتے۔ ان کا دودھ تک دوہ دیتے۔ خط آتے تو خود جا کر انہیں پڑھ کر سناتے اور وہیں زمین پر بیٹھ کر' ان کے اہلِ خانہ کی طرف سے جوابی خطوط لکھتے۔ خطرہ کے وقت راتوں کو ان کے گھروں کا پہرہ دیتے۔ چپکے سے ان کے حالات معلوم کرتے' اور انہیں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی' بہم پہنچاتے (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ ایک رات پاسبانی کے دوران سنا کہ ایک عورت اپنے گھر کے اندر' کچھ اشعار گنگنا رہی ہے جن میں ہجر کی راتوں کا ذکر تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا شوہر میدانِ جہاد میں گیا ہوا ہے اور ایک عرصہ ہوا' لوٹا نہیں۔ آپ نے عام حکم جاری کر دیا کہ سپاہیوں کو اس انداز سے رخصت دی جائے کہ وہ ایک معقول وقفہ کے بعد گھروں سے ہو آیا کریں۔

شکست خوردہ فوج کی حوصلہ افزائی

مجاہدین کو عام طور پر ہر میدان میں فتح و کامرانی نصیب ہوئی تھی۔ لیکن جنگ' پھر جنگ ہے' اس میں فتح کے ساتھ شکست کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ خود حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں بھی جیوشِ اسلامیہ کو شکستیں ہوئیں' اگرچہ وہ شکستیں عارضی

تھیں اوران کے دوبارہ سنبھل جانے پرمبدّل بہ فتح وظفر ہوگئیں۔اسی طرح عہدِ فاروقیؓ میں بھی بعض محاذوں پر عساکرِ اسلامیہ کو شکستیں ہوئیں۔ان میں (ایران پر حملہ کے سلسلہ میں) جسر کی شکست بڑی ہمت شکن تھی۔ جب یہ شکست خوردہ سپاہی مدینہ آئے تو یہ خود مارے شرم کے سَر اٹھا کرنہیں چلتے تھےاوران کے اَعزہ واقارب انہیں سخت ملامت کرتے تھے۔حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے ان ملامت کرنے والوں کوسختی سے ڈانٹا اور ان سپاہیوں کی ایسی ہمت افزائی کی کہ وہ تازہ دم ہوکرٗ ہر مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے۔حضرت عمرؓ کا اس قسم کا حقیقت پسندانہ رویّہ اور مجاہدین کے ساتھ شفقت ورافت کا سلوک تھا جس نے ان کے سینوں میں سکون واطمینان کی جنّتیں آباد کر دی تھیں — اور یہی تھا وہ سکون واطمینان جس کی وجہ سے ان میں کا ایک ایک ٗ دس دس کا مقابلہ کیا کرتا تھا —!

جب سپاہی کی اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہےٗ شہادت کے متعلق اس کا ایمان ہو کہ اس سے وہ سیدھا جنّت میں چلا جائے گا اوراس بات کا اُسے کامل یقین ہو کہ اُس کے بعدٗ اُس کے بال بچےٗ لاوارث نہیں رہ جائیں گے بلکہ ان کی نگہ پرداخت اُس سے بھی بہتر ہوگی جیسی اس کی زندگی میں ہوسکتی تھیٗ تو اس سپاہی کی بے جگری کا مقابلہ دنیا کی کون سی طاقت کرسکتی ہے؟

اور یہی تھی ان کی وہ بے جگری جس سے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا اُن کے زیرِ نگین آ گئی تھی۔آیئے ہم دیکھیں کہ یہ کیسے ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھٹا
باب

علم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ اُو در سینۂ اُو آرمید

یورپ کے متشرقین اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب تک رسولؐ اللہ مکہ میں رہے' چونکہ وہاں آپ کے پاس قوت نہیں تھی' اس لئے آپؐ نے ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اس کے بعد' جب مدینہ میں قوت حاصل ہوگئی تو آپؐ نے مملکت قائم کر لی اور خود اس مملکت کے فرمانروا بن گئے۔ ہمارے ہاں سے جن لوگوں نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی' انہوں نے بڑی معذورانہ (APOLOGETIC) روش اختیار کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا خیال بھی یہ ہے کہ اگر رسولؐ اللہ ایسا نہ کرتے (یعنی مملکت قائم نہ کرتے بلکہ مذہبی پیشواء کی زندگی بسر کرتے رہتے) تو زیادہ اچھا ہوتا۔ لیکن چونکہ آپؐ نے مملکت قائم کر لی اس لئے ہمیں اس کے جواز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی چاہیے۔

عیسائیت کی تعلیم

جہاں تک معترضین کا تعلق ہے' ان میں سے جنہوں نے نیک نیتی سے اعتراض کیا ہے' اس کی وجہ' ان کی حقیقت سے بے خبری اور دین سے لاعلمی ہے — اور یہی کیفیت ان کی ہے جنہوں نے اس کے جواب میں معروضانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان دونوں گروہوں نے اسلام کو ایک مذہب سمجھا ہے' دین نہیں سمجھا۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے' اس کے متعلق تیسرے باب (خلافت) میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ عیسائیوں کے سامنے دین کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ وہ صرف مذہب کو سمجھ سکتے ہیں۔ اناجیل میں' حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے' وہ ایک گلیم پوش درویش اور بے نوا فقیر کی سی زندگی ہے۔ یہودیوں نے انہیں پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا جہاں انہوں نے (معاذ اللہ) کس مپرسی کے عالم میں جان دے دی۔ ''کس مپرسی'' اس لئے کہ ان کے کل بارہ شاگرد تھے جن میں سے ایک نے غداری کی اور چند سکوں کے عوض انہیں گرفتار

کرادیا' اور باقی گیارہ کے گیارہ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ ہے (عسائیت کی رُو سے) زندگی حضرت عیسیٰؑ کی۔ باقی رہی وہ تعلیم جو اناجیل میں پیش کی گئی ہے' سو اس کی حیثیت وعظ کی سی ہے' بطورِ ضابطۂ حیات ان میں کچھ نہیں۔ ان میں صرف ایک قانون ملتا ہے' اور وہ یہ کہ بیوی کو' بجز ارتکابِ زنا' کسی حالت میں طلاق نہیں دی جاسکتی۔ یہی نہیں کہ ان میں دنیاوی امور کے متعلق کوئی ضابطہ یا قانون نہیں ملتا' ترکِ علائق اور ترکِ دنیا' ان کی تعلیم کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان کے ولیوں (SAINTS) نے جس انداز سے خانقاہیت کی زندگی بسر کی' تاریخ کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے۔ ان حالات میں' کسی عیسائی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ کسی مذہب کے بانی کو مملکت (STATE) سے کوئی واسطہ ہوسکتا ہے۔ جب روما کے شاہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت اختیار کی تو ایک عیسائی مملکت وجود میں آئی لیکن وہ مملکت عیسائیوں کی تھی' عیسائیت کی نہیں تھی۔ چرچ (کلیسا) نے اپنا اقتدار بڑھایا تو مملکت میں تھیا کریسی قائم ہوگئی۔ لوتھر نے قوم کو کلیسا کے استبداد سے نجات دلائی تو مملکت سیکولر ہوگئی جس میں مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ لہٰذا سیکولر اسٹیٹ کے تصور کے حاملین کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا کہ مملکت کا قیام مذہب کا تقاضا ہوسکتا ہے۔ یہ ہے وہ ذہنی پس منظر جس کی رُو سے یورپ کے (نیک نیت) مُستشرق بھی یہ اعتراض کردیتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی زندگی کا حقیقی اور بنیادی مقصد تو مذہب کی نشر و اشاعت تھا۔ مملکت کا قیام' بعد کا خیال تھا جو مدنی زندگی کی بعض اتفاقی وجوہات کی بنا پر پیدا ہوگیا۔ اسے رسول اللہؐ کے حقیقی مشن سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ یہ چیز اس مشن کی نقیض تھی۔

مسلمانوں کا تصورِ مملکت

بدقسمتی سے خود مسلمانوں میں بھی صدیوں سے' اسلام کا تصور ایک مذہب کا سا چلا آرہا ہے' اور مملکت کا تصور سیکولر' جو اسلام کو مذہب تصور کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔ ان کے تصورِ مملکت کی رُو سے پرسنل (شخصی) اور پبلک (ملکی) قوانین الگ الگ ہیں۔ شخصی قوانین علماء کی تحویل میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے' مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا یہ گوشہ تھیا کریسی کا حامل ہوتا ہے اور امورِ مملکت حکومت کی تحویل میں' جن میں مذہب دخل نہیں دے سکتا۔ اس نہج سے مملکت ان کے ہاں بھی سیکولر قرار پاجاتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے ہاں کے جواب دینے والے متعذرانہ روش اختیار کرتے ہیں۔ اگر اسلام بحیثیتِ دین کسی کے سامنے ہو' تو پھر نہ تو حضورؐ کے خلاف (نیک نیتی ہی سے سہی) یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ آپؐ نے مدنی زندگی میں مملکت کیوں قائم فرمائی' اور نہ اس اعتراض کے جواب میں ہمیں کسی قسم کی جھجک محسوس کرنے کی ضرورت لاحق ہوسکتی ہے۔

دین اور سیاست

دین نام ہے اس نظامِ زندگی کا جس میں احکامِ خداوندی' بحیثیتِ قوانین نافذ ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا اسی صورت میں' اور اسی وقت ممکن ہے جب دین کے مدعیوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ مذہب پر ہر مملکت میں عمل کیا جاسکتا ہے لیکن اسلام پر

صرف اسی صورت میں عمل پیرا ہوا جاسکتا ہے جب اپنی آزاد مملکت ہو اور اس میں حکمرانی احکام و اقدارِ خداوندی کی ہو۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [22:41] ''یہ جو ایک نئی اُمت وجود کوش ہو رہی ہے' انہیں جب' ملک میں تمکّن حاصل ہوگا' تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔ یعنی جن امور کو خدا نے پسندیدہ قرار دیا ہے' انہیں حکماً نافذ کریں گے اور جنہیں اس نے ناپسندیدہ کہا ہے انہیں قانوناً ممنوع قرار دیں گے۔ غرضیکہ ان کے تمام امور آخرالامر' خدا کی طرف لَوٹیں گے۔ یعنی ان کا ہر فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوگا''۔ آپ دیکھئے اس آیۂ جلیلہ میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ''تمکّن فی الارض'' کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور تمکّن فی الارض کے معنی ہیں اپنی آزاد' خود مختار مملکت۔ اسی کو استخلاف فی الارض کہا جاتا ہے' اور (قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ) استخلاف فی الارض' ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ سورۂ نور میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْــــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [24:55]

جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور ہمارے تجویز کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم انہیں دنیا میں حکومت عطا کر دیں گے۔ اسی طرح جس طرح ہم نے اس طرح زندگی بسر کرنے والی قوموں کو ان سے پہلے حکومت عطا کی تھی۔ اس حکومت سے مقصد یہ ہوگا کہ وہ نظامِ زندگی (الدین) جسے ہم نے ان کے لئے پسند اور تجویز کیا ہے' مستحکم ہو جائے' ان کا خوف امن سے بدل جائے اور اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف ہمارے احکام و قوانین کی اطاعت کریں اور دنیا کی کوئی قوت انہیں اس پر مجبور نہ کر سکے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار کریں۔

یہ سلسلہ اس وقت تک قائم و دائم رہے گا جب تک یہ لوگ اس پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے۔ جب یہ اس روش کو چھوڑ دیں گے تو یہ تمکّن اُن سے چھن جائے گا۔ کیونکہ یہ تو نتیجہ تھا ایمان و اعمالِ صالحہ کا اور جب یہ بیج ہی باقی نہیں رہے گا تو اس کے ثمرات کس طرح حاصل ہو سکیں گے؟

اس سے واضح ہے کہ جب ایک رسول ''ایمان و اعمالِ صالحہ'' کی دعوت دیتا تھا تو وہ گویا تخم ریزی کر رہا ہوتا تھا اس فصل کی جس کا حاصل تمکّن فی الارض تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ مکّی زندگی میں تو رسول اللہ کے پیشِ نظر محض ''مذہبی وعظ و نصیحت'' تھی اور جب مدنی زندگی میں کسی طرح قوت حاصل ہوگئی' تو آپؐ کے دل میں مملکت قائم کرنے کا خیال ابھر آیا۔ آپ پہلے

دن سے دین کے داعی تھے؛ اس لئے آپ کا ہر قدم اسی نصب العین (دین کے استحکام یعنی قیامِ مملکت) کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس پروگرام کا پہلا حصہ ایک ایسی جماعت کی تشکیل تھا جس کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض تھا۔ مکی زندگی اس پروگرام کا مرحلۂ اوّل تھی۔ اس کے بعد جب آپؐ نے دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا، اس مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہے، تو آپؐ اپنی جماعت کے ساتھ ہجرت کر کے، وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں کی فضا میں، اس تخمِ صالحہ (یعنی جماعت کے ایمان و اعمالِ صالحہ کے شجرِ طیّب) نے بارآوری شروع کر دی ——— ''ہجرت'' اس لئے کہ مقصد کسی خاص مقام (مکہ) میں مملکت قائم کرنا نہیں تھا، مقصد اس قسم کی مملکت کا قیام تھا، خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں ہو اور یہ اس لئے کہ خود مملکت بھی مقصود بالذات نہیں تھی۔ مقصد احکام و اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی تھا اور مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔

مکّی زندگی میں تصورِ مملکت

یہ حقیقت کہ مکّی زندگی میں حضورؐ کے پیشِ نظر یہی مقصد تھا، متعدد تاریخی شواہد سے واضح ہے۔ تاریخ الکامل ابنِ اثیر میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں، خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا تھا:

> یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت (خداوندی) کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس فرمان کو درج کرنے کے بعد ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ نبوت کے تیسرے سال آپؐ نے، ان لوگوں کو ''خدا کے حکم'' کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ یاد رکھو! ''یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا اور یا میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا''۔

قبیلہ عامر کے سردار کو جواب

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بھی قابلِ غور ہے جو تاریخ الکامل ہی میں مذکور ہے۔ شدّاد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبویؐ میں حاضر تھے کہ قبیلہ بنی عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصا ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضورؐ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لكل قول حقيقة وماحقيقة قولك ہر دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسیٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں، اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو

پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا:

نِعَمَ النَّصرُ وَالتَّمۡکِیۡنُ فِی الۡبِلَادِ

خوش آئندہ فتوحات اور ملکوں پر حکومت

اور یہ محض قیاس آرائی نہیں تھی۔ خدا کے اس وعدہ پر یقینِ محکم کا فطری نتیجہ تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ ایمان واعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے (24:55)۔ یہی وہ یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر حضورؐ کبھی اعلان فرماتے تھے کہ "زمین کے مشرق ومغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں"۔ کبھی اپنے صحابہؓ سے کہتے کہ "قیصر وکسریٰ کی شاہنشاہیتوں کا خاتمہ ہوجائے گا"۔ کبھی اس تصریح کے ساتھ کہ "یمن فتح ہوجائے گا' شام فتح ہوجائے گا' عراق فتح ہوجائے گا اور عرب وعجم کے علاقے فتح ہوجائیں گے"۔ (یہ تمام ارشادات تاریخ کی کتابوں میں بھی منقول ہیں اور کتبِ احادیث میں بھی موجود)۔ ان حقائق وشواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہ قیامِ مملکت بعد کا خیال (AFTER THOUGHT) تھا' حقیقت سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ مقصودِ رسالت' دینِ خداوندی کا تمکن تھا' اور دین کا تمکن اپنی مملکت کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔

کسی کی مملکت چھینی نہیں جاتی

اس مملکت کے قیام کے سلسلہ میں' ایک اور حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ دین کے تمکّن کے لئے قیامِ مملکت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی دوسرے کی مملکت چھین کر اس میں دین کو متمکن کر دیں۔ "کسی دوسرے کی مملکت چھین لینا" 'جُوعِ الارض ہے اور استبدادِ ملوکیت' جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں۔ حضورؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں کسی کی مملکت قائم نہیں تھی ــــ مملکت تو عرب کے اس پورے علاقے میں کسی کی نہیں تھی۔ وہاں مسلمان (انصار) پہلے سے موجود تھے۔ جب ان کے ساتھ مہاجرین شامل ہوگئے تو یہ جماعت بڑی مؤثر ہوگئی اور انہوں نے' قرآنی اصولوں کے مطابق' اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل کر لی۔ اسی کا نام سب سے پہلی اسلامی مملکت ہے۔ اس کے بعد گردوپیش کے قبائل بھی' بطیبِ خاطر اسلام لاتے گئے۔ اس طرح یہ جماعت (اُمتِ مسلمہ) بھی وسیع ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ان کی مملکت بھی دقیع۔ پھر جس طرح اس مملکت کا قیام' دین کا تقاضا تھا' اسی طرح اس کا تحفظ بھی دین ہی کا تقاضا تھا۔ اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر تاکید کی تھی (8:60)۔ زیرِ نظر کتاب کا تعلق' حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں کی تاریخ سے نہیں؛ اس لئے اس میں' اُس دَور کی لڑائیوں اور فتوحات کا تذکرہ نہیں آ سکتا۔ اس کے لئے میری دوسری تصنیف ــــ معراجِ انسانیت ملاحظہ فرمایئے جو مشتمل ہے حضورؐ ختمی مرتبت کی سیرتِ طیّبہ پر۔ اِس وقت صرف اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا' کہ حضورؐ کے عہد کی لڑائیاں اولاً اور اساساً اس مملکتِ خداوندی کی حفاظت کے لئے تھیں۔

اِسلامی جنگوں کے خلاف اعتراضات

ہم جہاؔد کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا حکم ہے کہ دنیا کے کسی علاقہ سے کوئی مظلوم مدد کے لئے پکارے تو اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کی مدد کے لئے پہنچے۔ لہٰذا' بعض لڑائیاں اس مقصدِ جلیل کے لئے بھی لڑی گئیں۔ مقصد ان سے بھی نہ جوع الارض تھا نہ تغلّب و تسلّط۔ ان لڑائیوں کے سلسلہ میں ایسا بھی ہوا کہ فساد مٹانے اور امن و انصاف قائم کرنے کے لئے وہاں کا نظم و نسق بھی حکومتِ اسلامیہ کو سنبھالنا پڑا۔ اس طرح اس مملکت کی حدود میں وسعت بھی ہوگئی۔ رسولؐ اللہ کی وفات تک عرب کے تمام قبائل اسلام لا چکے تھے' اور اس طرح یہ تمام علاقہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر آ گیا تھا۔ یہ سلسلہ حضورؐ کے بعد بھی جاری رہا لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہء دراز کے ساتھ' عہدِ صدیقیؓ میں سے ہوتے ہوئے عہدِ فاروقیؓ تک پہنچیں' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑائیوں کے ضمن میں عام طور پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں' ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ یہ اعتراضات بالعموم اس نوعیت کے ہوتے ہیں:

(1) اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا۔

(2) جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا گیا۔

(3) غیر مسلموں کو ذِمّی بنایا گیا اور ان سے جزیہ وصول کیا گیا۔

اِسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا؟

قبل اس کے کہ ہم ان اعتراضات کے متعلق گفتگو کریں' ہم اس اصولی بات کو ایک بار پھر دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں' جسے ہم اس سے پہلے بالتصریح پیش کر چکے ہیں ــــ یعنی یہ کہ قرآنی شہادات کے مطابق صدرِ اوّل کے مؤمنین (محمد رسول اللہ والذین معہؐ) قرآن کے متبع تھے۔ لہٰذا' اگر ان کے اعمال و کردار کے متعلق تاریخ میں کوئی ایسی بات ملے جو قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہو' تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ تاریخی روایت غلط ہے۔ باقی رہے بعد کے مسلمان' سو ان کا کوئی عمل یا فیصلہ' اسلام کے متعلق سند نہیں قرار پا سکتا۔ اسلام کے سلسلہ میں سند اور حجت بہرکیف خدا کی کتاب ہے۔

اس اصولی بحث کے بعد آگے بڑھیئے۔ جہاں تک اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلانے کے اعتراض کا تعلق ہے' یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' انسان کا امتیازی شرف جس کی رُو سے وہ حیوانات سے متمیز اور مختص ہوتا ہے' اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ اِسی سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے' اور اس کی یہی ذمہ داری' اسے جزا یا سزا (اعمال کے نتائج) کا مستوجب بناتی ہے۔ جس فیصلہ یا عمل میں انسان کے ارادے کو دخل نہیں' وہ اس کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جاتا۔ یعنی قرآن اُسے اس فرد کا فیصلہ یا عمل تسلیم ہی نہیں کرتا۔

ایمان نام ہی قلب و دماغ کی رضامندی کا ہے

ایمان یا کفر' انسانی زندگی کے عظیم ترین اساسی فیصلہ کا نام ہے ـــــ یعنی اس فیصلہ کا کہ وہ اپنی زندگی میں کس راستے پر چلنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ' یہ فیصلہ اپنے قلب و دماغ کی کامل رضامندی' اپنے پورے پورے اختیار و ارادے سے نہ کرے' یعنی اس میں کسی قسم کا جبر یا دباؤ شامل ہو' تو اسے اس فیصلہ کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بار بار واضح کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [18:29] ''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے ربّ کی طرف سے آ گیا ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے''۔ سورۂ دھر میں ہے کہ ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان دے دیئے۔ پھر اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ صحیح راستہ اس کے سامنے نکھار اور ابھار کر رکھ دیا۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا [76:3] اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کر لے' جی چاہے مسترد کر دے۔ اور سورۂ بقرہ کی یہ آیت کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ [2:256] ''دین کے معاملہ میں کسی قسم کے جبر یا دباؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غلط اور صحیح راستے متمیز ہو کر اس کے سامنے آ چکے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں رہی''۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

ایک طبیبِ مشفق کی طرح' رسول اللہ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ غلط راستے پر چلنے والے' اس راہ کو چھوڑ کر' صحیح راستہ اختیار کر لیں اور اس طرح تباہی سے بچ جائیں۔ (قرآن کی شہادت کے مطابق) حضورؐ ان کی تباہی کے خیال سے' ان کے غم میں گھلتے رہتے تھے (18:6)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [10:99] اے رسولؐ! کیا آپ لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے ہیں۔ اگر زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ انسان کو بھی حیوانوں کی طرح مجبور پیدا کر دیتا اور اس طرح دنیا کے تمام باشندے ایک ہی راہ پر چلتے رہتے لیکن اس کی مشیت کا یہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے' اس لئے اسے صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنِ کریم سے اس مضمون کی متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جبر اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان کے معنی ہیں' دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے صداقت کا تسلیم کر لینا۔ لہٰذا' اگر کوئی شخص کسی قسم کے دباؤ سے ایمان کے الفاظ دہرا دیتا ہے تو قرآن اُسے مومن تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ مومنین کی تعریف (DEFINITION) یا خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا [25:73] یہ وہ لوگ ہیں کہ' اور تو اور' جب ان کے سامنے ان کے ربّ کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے آگے بہرے اور اندھے بن کر نہیں جُھک جاتے۔ وہ انہیں بھی عقل و بصیرت کی رُو سے تسلیم کرتے ہیں۔ ''بزورِ شمشیر'' تو ایک طرف' وہ اس ایمان کو بھی ایمان تسلیم

نہیں کرتا جو محض تقلیداً یا وراثتاً اختیار کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر‘ قرآن مجید کی رُو سے کسی شخص کو محض اس بنا پر مومن تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا‘ نہ ہی اس کی اس دلیل کو صحیح مانا جا سکتا ہے کہ اس نے فلاں مسلک اس لئے اختیار کیا ہے کہ اسلاف سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) ایمان‘ قلب و دماغ کی کامل‘ بلا جور و اکراہ‘ رضامندی سے‘ صداقت کو قبول کرنے کا نام ہے‘ اور جب تک کوئی شخص اس (صداقت کو) اس طرح قبول نہیں کرتا‘ اسے صاحبِ ایمان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآنِ کریم کہاں تک آگے جاتا ہے‘ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوئی تو بعض بدوی قبائل نے‘ اس کی شوکت و حشمت کو دیکھ کر‘ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح اپنے آپ کو مومن شمار کرنے لگ گئے۔ قرآنِ کریم نے انہیں فوراً ٹوکا‘ اور کہا اپنے آپ کو مومن مت کہو۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ [49:14] ”ان سے کہو کہ اپنے آپ کو ابھی مومن مت کہو۔ یہ کہو کہ تم نے اسلامی حکومت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے۔ اپنے آپ کو مومن اس وقت کہنا اور سمجھنا جب ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جائے۔ ابھی تو ایسا نہیں ہوا“۔

آگے بڑھنے سے پہلے‘ اس مقام پر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ جو لوگ پیدائشی مسلمان ہوں گے‘ یا یونہی رسماً اسلام قبول کر لیں گے‘ انہیں غیر مسلم نہیں کہا جائے گا۔ وہ مسلمان ہی کہلائیں گے اور مسلمان قوم کے افراد ہوں گے لیکن وہ مومن اس وقت کہلائیں گے جب ”ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے گا“۔ قرآنِ کریم کی رُو سے‘ کسی کو جبراً مومن بنانا تو ایک طرف‘ اسے جبراً مسلمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جس قرآن کا مؤقف اور تعلیم یہ ہو‘ کیا اس کے ماننے والوں (خلفائے راشدین اور صحابہؓ کبار) کا مسلک یہ ہوگا کہ وہ غیر مسلموں کو تلوار کے زور سے مسلمان کرتے ہوں گے! عام حالات تو ایک طرف‘ جنگ کی حالت میں بھی قرآنِ کریم کی تعلیم یہ تھی (اور ہے) کہ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ [9:6] اگر دشمن کا کوئی فرد تم سے پناہ طلب کرے تو اُسے پناہ دو۔ اسے قرآن سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے مامن (جائے حفاظت) کی طرف جانا چاہے تو اُسے بحفاظت وہاں تک پہنچاؤ۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ تمہاری دعوت اور تعلیم کو اچھی طرح سمجھتے نہیں (اس لئے تمہاری مخالفت کرتے ہیں)۔

حضرت عمرؓ کا عیسائی غلام

ان تصریحاتِ قرآنیہ کے بعد‘ اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بایں ہمہ‘ ہم عہدِ فاروقی کے دو ایک واقعات درج کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اُس دَور میں‘ اسلام کی اشاعت میں جبر کا کس قدر ہاتھ تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک رومی نژاد غلام تھا‘ جس کا نام وثیق تھا ــــ وہ عیسائی تھا۔

حضرت عمرؓ! ان کا دُرّہ (یعنی وہ دُرّہ، تاریخ جس کا غلط تصور پیش کرتی ہے) پھر ان کا غلام اور عیسائی!! کہاں گیا وہ جبر جس کی رُو سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا جاتا تھا؟

بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی۔ جب مملکت وسیع ہوئی تو اس کا حساب کتاب رکھنے کے لئے کسی ماہر حساب دان (اکاؤنٹنٹ) کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عربوں کے ہاں ایسے ماہر حساب داں کہاں ہوسکتے تھے جو مملکت کا حساب کتاب رکھ سکتے۔ وثیق ماہر حساب دان تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اسے اس کام پر مامور کردیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ کسی غیر مسلم کو رموزِ مملکت میں شریک نہیں کیا جاسکتا (3:117)۔ اس لئے لاینبغی ان استعین علی امانتھم من لیس منھم "یہ جائز اور مناسب نہیں کہ مسلمانوں کی امانت کے کام میں، میں اس شخص سے مدد لوں جو ان میں کا نہیں[1]"۔ ہاں، اگر وہ اسلام لے آئے تو پھر اس کے سپرد یہ خدمت کی جاسکتی ہے۔ وثیق سے کہا گیا تو اس نے اسلام لانے سے انکار کردیا۔ وہ عمر بھر عیسائی رہا ـــــ "عمرؓ کا دُرّہ" خود اپنے غلام کے خلاف بھی حرکت میں نہ آیا حالانکہ اس سے مملکت کی ایک اہم ضرورت بھی رُکی رہی۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ فتح مصر کے وقت بہت سے قبطی اور رومی گرفتار ہوئے جو مذہب عیسائیت کے پیرو تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے دربارِ خلافت کو لکھا کہ ان کے متعلق کیا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں کہا کہ ان سے کہہ دو کہ انہیں اختیار ہے کہ وہ جی چاہے مسلمان ہوجائیں اور جی چاہے اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہیں۔ اگر یہ مسلمان ہوجائیں گے تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے جو باقی مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اگر عیسائی رہنا چاہیں گے تو انہیں صرف جزیہ دینا ہوگا۔ حضرت عمروؓ بن عاص نے ان قیدیوں کو بھی بلایا اور ان کے سرداروں کو بھی، اور انہیں دربارِ خلافت کا فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ ان قیدیوں میں بعض ایسے تھے جنہوں نے اس دوران میں اسلام کا مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ مسلمان ہونا چاہتے تھے، باقی عیسائی رہنا چاہتے تھے۔ طبریؔ میں ہے کہ ایک طرف عیسائی سردار بیٹھ گئے اور دوسری طرف مسلمان اور درمیان میں یہ ہزاروں قیدی۔ جب کوئی قیدی اسلام کا اظہار کرتا تو مسلمان جوشِ مسرت سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے لیکن کوئی عیسائیت کا اعلان کرتا تو تمام عیسائیوں میں مُسرت کی لہر دوڑ جاتی اور مسلمان ایسے غمزدہ ہوجاتے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

ایک فاتح قوم کے افراد، غم سے آنسو تو بہاتے لیکن اپنی مفتوح قوم کے قیدیوں کو اسلام لانے پر مجبور نہ کرتے، کہ وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کی رُو سے ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس دَور میں کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان بنایا گیا ہوگا؟ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی فرد، کسی قبیلہ یا کسی قوم نے، اسلامی مملکت کی شان و شوکت سے متأثر ہوکر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم، اور اس طرح اسلام قبول کرلیا ہو، تو اسے مسلمان تسلیم کرلیا ہوگا ـــــ اور ایسا کرنا بھی

1۔ یہ اسلامی نظام اور نظریۂ قومیت کا بڑا بنیادی اصول ہے جس کی تشریح اس کے مقام پر کی جائے گی۔

چاہئے تھا ــــ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآنِ کریم نے اس طرح مسلمان ہونے اور ایمان لانے میں جس لطیف فرق کی وضاحت کی ہے' انہوں نے اسے ملحوظ رکھا ہوگا۔

غلام اور لونڈیاں

جہاں تک ''غلام اور لونڈیوں'' کا تعلق ہے' عربوں کے ہاں رواج اور معمول تھا کہ وہ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں میں مَردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ غلاموں سے ہر قسم کی خدمت لیتے اور لونڈیوں سے جنسی تمتع کرتے۔ ظہورِ اسلام کے وقت' عربی معاشرہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار تھی۔ وہ اس معاشرہ کا جزو بن چکے تھے۔

نزولِ قرآن کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کر دے۔ اس سلسلہ میں اس نے اساسی طور پر اعلان کر دیا کہ ہر انسان' محض انسان ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے (17:70)۔ اس کے ساتھ ہی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اُسے قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں' یا حکومت مل جائے' حتیٰ کہ خواہ اُسے نبوت بھی کیوں نہ مل جائے' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے غلام اور محکوم بن جاؤ'' (3:78)۔ سوچئے کہ جس قرآن کی یہ تعلیم ہو وہ کبھی گوارا کر سکتا تھا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنا دیا جائے! وہ انسانیت کی اس تحقیر و تذلیل کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا' اس کے نزدیک' غلامی کا رواج بارگاہِ خداوندی میں معصیتِ کبیر اور انسانیت کی عدالت میں جرمِ عظیم تھا۔ وہ اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔

لیکن اسلام ایک عملی نظام تھا اس لئے وہ اپنے عالمگیر' ابدی اصولوں کی عملی تنفیذ میں' اپنے زمانہ اور قومِ مخاطب کے احوال وظروف پر نگاہ رکھتے ہوئے' اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچاتا تھا۔ اگر وہ حکم دے دیتا کہ غلاموں اور لونڈیوں کو یک لخت آزاد کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف اس معاشرہ کے نظم و نسق میں انتشار واقعہ ہو جاتا بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کے لئے بھی عجیب عملی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اپنی حکمتِ بالغہ کی رُو سے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے اُن کے معاشرہ سے غلاموں اور لونڈیوں کا وجود بتدریج ختم ہو جائے۔ یہ جو آپ قرآنِ کریم میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے متعلق احکامات دیکھتے ہیں! یہ وہی تدابیر ہیں جن کی رُو سے غلامی کا بتدریج ختم کیا جانا مقصود تھا۔ آپ سارے قرآن میں دیکھئے' ان احکامات کے سلسلہ میں آپ کو ہر جگہ ماضی کا صیغہ (ملکت) ملے گا ــــ یعنی وہ ''جنہیں تم غلام یا لونڈیاں بنا چکے ہو''۔ کہیں یہ نہیں ملے گا کہ ''جنہیں تم غلام اور لونڈیاں بناؤ'' اُن کے متعلق یوں کرو[1]۔ قرآنِ کریم میں آپ کو ہر جگہ غلاموں کو آزاد کرنے کے احکام ملیں گے' کسی ایک جگہ بھی غلام بنانے کا حکم نہیں ملے گا۔

---

1. غلام اور لونڈیاں ــــ اور لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ کے موضوع پر' ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ ــــ ''قتلِ مرتد ــــ اور ــــ غلام اور لونڈیاں'' ملاحظہ فرمائیے۔

یہ تو رہا ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق‘ جو اِنسدادِ غلامی کے متعلق حتمی حکم نازل ہونے سے پہلے‘ غلام بنائے جا چکے تھے اور نزولِ قرآن کے وقت عربی معاشرہ میں موجود تھے۔ جہاں تک آئندہ کا تعلق تھا‘ غلام اور لونڈیوں کا بنیادی سرچشمہ ایک ہی تھا‘ یعنی جنگ کے قیدی‘ ان کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہو کر آئیں:

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً [47:4] انہیں یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو‘ اور یا بطورِ احسان۔

سارے قرآن میں‘ جنگ کے قیدیوں کے متعلق یہی ایک حکم ہے۔ آپ اس حکم کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس میں کسی پہلو سے بھی انہیں غلام بنانے کی صورت نکل سکتی ہے؟ کیا اس سے اس قسم کا گمان بھی گزر سکتا ہے کہ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بناؤ‘ ان کی عورتوں سے جنسی تمتّع کرو اور پھر انہیں جب جی چاہے‘ بھیڑ بکریوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دو! سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ [23:91]۔

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کے بعد‘ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں جو جنگیں ہوئیں‘ اُن میں گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ لیکن ہماری تاریخ میں‘ اس عہد میں بھی‘ عربی معاشرہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار دکھائی جاتی ہے۔ (جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں‘ اسلام کے معاملہ میں ساری مصیبتوں کی جڑ ہماری تاریخ ہے) ہوا یہ کہ صدرِ اوّل کے بعد‘ جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی‘ تو ان بادشاہوں نے وہی کچھ کیا‘ جو باقی دنیا کرتی چلی آ رہی تھی اور کر رہی تھی۔ لیکن ان میں ہنوز اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس خیال کو عام ہونے دیتے کہ وہ خلافِ اسلام حرکات و شعار کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ جو کچھ خلافِ قرآن کرنا چاہا‘ اس کی تائید میں یا تو کوئی حدیث وضع کر دی اور یا صدرِ اوّل کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ درج کر دیا جس سے اس کا جواز مل جائے۔ ہماری تمام ''مستند'' کتبِ احادیث‘ جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے‘ ہماری سب سے پہلی تفسیر قرآنِ کریم (یعنی امام طبری کی تفسیر) اور سب سے پہلی مبسوط تاریخ (اِنہی امام طبری کی مرتب کردہ تاریخ) سب عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوئیں اور ان میں یہ وضعی روایات‘ کہیں حدیث کی شکل میں‘ کہیں حدیث پر مبنی تفسیر کے رنگ میں اور کہیں تاریخی واقعات کی صورت میں‘ جمع ہو گئیں۔ اس کے بعد‘ انہی کی روشنی میں ہماری فقہ مرتب ہوئی اور ان کا مجموعہ‘ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اُمت میں رائج ہو گیا اور متوارث چلا آ رہا ہے۔ اسی اسلام کی رُو سے اب ''شریعت'' کا فیصلہ یہ ہے کہ

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے‘ چاہے ان سے فدیہ لے‘ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں

اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم[1] القرآن' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جلد اوّل صفحہ 340' ایڈیشن 1951ء)

اس جنسی تمتع کے لئے نہ نکاح کی ضرورت ہے نہ تعداد کی شرط۔ ایک شخص جب تک جی چاہے' اور جتنی تعداد میں چاہے' انہیں اپنی ملکیت میں رکھے اور جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دے یا فروخت کر دے[2]۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا تھا لیکن یہ دروازہ اس وقت کھلا جب وضعی روایات اور تاریخی تلبیسات کو دین میں سند تسلیم کیا جانے لگا۔ (مثلاً) جب مودودی صاحب پر اعتراض کیا گیا کہ غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں' وہ قرآن کے خلاف ہے تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ:

(معترض کی) غلطی کا اصلی سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ (تفہیمات۔ ایضاً صفحہ 392)

یعنی انہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ اگر ''صرف قرآن'' سے غلامی کے متعلق قانون اخذ کیا جائے' تو وہاں سے غلامی کا جواز نہیں مل سکتا۔ اس کے جواز کے لئے خارج از قرآن مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

ہمارا ایمان بہر حال یہی ہے کہ دین میں سند خدا کی کتاب ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اسی قرآن کے متبع تھے۔ اس لئے اگر کتبِ روایات و تاریخ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب شدہ ملتی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو وہ روایت' یا تاریخ کا بیان وضعی ہے۔ عہدِ فاروقی میں ہمیں تاریخ میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو رہا کیا جاتا تھا' غلام نہیں بنایا جاتا تھا۔ مثلاً جب خوزستان کے شہر اہواز کو فتح کیا ہے (جسے ایرانی ہرمز کہتے تھے) تو وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں قید ہو کر آئے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے۔ فتح مصر کے وقت گرفتار شدگان کو کس طرح نہ صرف آزاد کیا گیا بلکہ انہیں مذہبی آزادی بھی دی گئی' اس کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا' صحیح بات یہی ہے کہ اُس زمانے میں جنگ کے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا کیونکہ قرآنِ کریم کا یہی حکم تھا۔ اگر اُس دَور کے کسی شخص کے نام کے ساتھ ''غلام'' کا لفظ آئے تو اس سے مراد ایسا شخص ہوگا جو اس معاشرہ میں پہلے سے بحیثیتِ غلام موجود تھا' اور یا تو بعد میں آزاد ہو چکا تھا یا ہنوز آزاد نہیں ہوا تھا۔ انہیں آج کل کی اصطلاح میں گھریلو ملازم سمجھنا چاہئے جیسے وثیق (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) جو پہلے سے غلام چلا آ رہا تھا اور جسے حضرت عمرؓ نے بعد میں آزاد کیا تھا۔ اُس عہد میں جدید غلاموں یا لونڈیوں کا بہر حال سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا۔

1۔ ہم نے ''تفہیم القرآن'' کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ یہ ہمارے زمانہ کی (اُردو میں) یوں کہئے کہ (LATEST) تفسیر ہے جس میں متقدمین کی تفاسیر کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

2۔ ملاحظہ ہو مودودی صاحب کی کتاب 'تفہیمات' حصہ دوم۔ ایڈیشن 1951ء صفحات 290 تا 324۔

جزیہ اور ذِمّی

جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ اس کے لغوی معانی' اور جس مقام پر قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہے' اس سے اس کا پورا پورا مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ ذمّی یا اہل الذّمہ کے الفاظ قرآنِ کریم میں نہیں آئے۔ یہ جزیہ کا لازمی یا فطری نتیجہ تھے یا یوں کہئے کہ جزیہ اور ذمہ لازم و ملزوم تھے۔ اب ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لایئے۔

قرآنِ کریم میں' جن مقاصد کے لئے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی ہے' یا جن حالات میں ان پر جنگ کرنا فرض ہو جاتا ہے' ان کی تفصیل سابقہ باب (جہاد) میں دی جا چکی ہے' اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ مختصراً یہ کہ اسلام میں جنگ کی اجازت (یا حکم) حسبِ ذیل حالات میں ہے:

(1) اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے۔

(2) مظلومین کی امداد کے لئے' خواہ وہ کوئی ہوں' اور کہیں بھی ہوں۔

(3) اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے اور کوئی قدرِ انسانیت محفوظ نہ رہے' تو اس کی روک تھام کے لئے۔

(4) غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لئے۔

جب اسلامی مملکت ان مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی تھی تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر یکایک حملہ کر دیا جاتا تھا' وہ وہاں کی حکومت اور باشندوں پر واضح کرتی تھی کہ اُن کے خلاف اس اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ اس کے بعد ان کے سامنے تین شرطیں رکھ دی جاتی تھیں۔

(1) اگر تم برضاء و رغبت' دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' اسلام کو سچا دین سمجھو تو اسے اختیار کر لو۔ اس صورت میں' تم ہم میں سے ہو جاؤ گے۔

(2) اگر ایسا نہیں چاہتے تو صرف ہمارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لو۔ تمہاری مملکت بھی تمہارے پاس رہے گی اور ہم تمہاری جان' مال' عزت' آبرو' مذہب' معابد' غرضیکہ ہر قابلِ حفاظت شے کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور

(3) اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔

یہ صورت تھی جنگ سے پہلے کی۔ اگر معاملہ جنگ تک پہنچ جاتا اور اس علاقہ کو فتح کر لیا جاتا تو اس مفتوح قوم کے سامنے' پہلی دو شکلیں پھر سے رکھ دی جاتیں۔ یعنی اگر بطیبِ خاطر اسلام لانا چاہو تو ہم میں سے ہو جاؤ اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر ہمارے اقتدار کی برتری تسلیم کر کے' ہماری ذمہ داری قبول کر لو۔ جو قوم اس پر رضامند ہو جاتی اس سے معاہدہ کر لیا جاتا — یعنی مفتوح قوم کے ساتھ معاہدہ — اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوتے تو پھر ان کے ملک کو اپنے زیرِ اقتدار لے آیا جاتا۔ جو قوم اس دوسری شرط کو قبول کر لیتی' یعنی اسلامی مملکت کے زیرِ حفاظت آ جانے کی شرط کو' تو اس سے تھوڑا سا ٹیکس وصول کر لیا جاتا۔

اُسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ جزیہ کے لغوی معنی ہیں کسی خدمت کا صلہ یا معاوضہ ـــــ ایسا معاوضہ جو اس خدمت کے لئے کافی سمجھا جائے اور اس سے زیادہ کچھ اور طلب نہ کیا جائے۔ اگرچہ بظاہر یہ ٹیکس' اس حفاظت کے بدلے میں لیا جاتا تھا جس کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر عائد ہو جاتی تھی لیکن درحقیقت یہ علامت (TOKEN) ہوتی تھی اس امر کی کہ اس قوم نے اسلامی حکومت کے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیا ہے اور عہد کیا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہیں کرے گی۔ (لغت میں' لفظ جزیہ معاہدہ کے معنوں میں بھی آتا ہے)۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جس مقام پر یہ لفظ آیا ہے' وہاں سے اس مفہوم کی وضاحت سامنے آ جاتی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ [9:29] تاآنکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر' تمہارے اقتدار کی برتری تسلیم کر لیں (وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

جزیہ کی رقم

جزیہ کی رقم کتنی ہوتی تھی' اس کے متعلق تاریخ میں مختلف بیانات ملتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی مقدار ہر قوم کے حالات کے مطابق مختلف ہوتی تھی۔ لیکن تاریخ میں جو زیادہ سے زیادہ شرح ملتی ہے اُسے امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس طرح درج کیا ہے کہ مالداروں سے اڑتالیس درہم سالانہ' متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم اور کم آمدنی والوں سے بارہ درہم۔ واضح رہے کہ درہم تقریباً ایک چوّنی کے برابر ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بارہ روپے فی کس سالانہ اور کم از کم تین روپے سالانہ ہوتی تھی۔ عورتیں' بچے' بوڑھے' اپاہج' محتاج' اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ یہ قلیل سی رقم انہیں ادا کرنی پڑتی تھی اور اس کے عوض انہیں' ان کی جان' مال' عزت' آبرو' مذہب' معابد' حتیٰ کہ اُن کی مملکت کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی تھی۔ آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں اس سے زیادہ سستا سودا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! آپ صرف اپنے گھر کی رکھوالی کے لئے چوکیدار ملازم رکھیں' تو ایک روپیہ ماہوار (بارہ روپے سالانہ) پر وہ بھی نہیں ملے گا! اور پھر یہ معاملہ کیا جاتا تھا مفتوحہ قوم کے ساتھ! یہ ضمانت' زبانی کلامی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے ان کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوتا تھا۔ ان معاہدات کی تفصیل تو ''فتوحات'' کے سلسلہ میں سامنے آئے گی لیکن اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ اتنی سی رقم کے عوض' مفتوحہ اقوام کو کس کس قسم کے تحفظات کی ضمانت دی جاتی تھی' اس مقام پر دو ایک معاہدات کا (مثال کے طور پر) درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ذمیوں کے ساتھ معاہدات

نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ خود حضور رسالتمآبؐ نے جو معاہدہ کیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے نجران اور اس کے گردو پیش کے باشندے اللہ کے جوار (ہمسائیگی) اور محمدؐ رسول اللہ کی ذمہ داری میں ہیں۔ ان کے اموال' جانیں' اراضیات' مذہب' ان کے غائب اور حاضر خاندان' ان کی عبادت گاہیں' غرضیکہ ان کی ہر چیز جو ان کے قبضہ میں ہے

تھوڑی ہو یا بہت' سب محفوظ رہیں گی۔ کسی پادری کو اس کے منصب سے' کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے' کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ نہ کوئی شخص ان کے کسی فرد کو نقصان پہنچائے گا' نہ ہی ان پر کسی قسم کی سختی کی جائے گی' نہ ہی کوئی اوران پر حملہ آور ہو سکے گا۔ ان میں کا جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا' اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اس طرح کہ ان میں نہ کوئی ظالم ہو گا نہ مظلوم۔ کسی کے جرم کی وجہ سے کسی اور کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

رسولؐ اللہ کے بعد' حضرت صدیق اکبرؓ نے اس معاہدہ کی باقاعدہ تجدید کی اور ایسا ہی حضرت عمرؓ نے بھی کیا۔ لیکن ان کے دَورِ خلافت میں' اہلِ نجران نے سازشیں اور بغاوتیں شروع کر دیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ شام اور عراق کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں انہیں یہ فرمان لکھ کر دیا کہ:

ان میں سے جو شخص جانا چاہے وہ ہر طرح سے محفوظ رہے گا اور کوئی مسلمان انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ رسولؐ اللہ اور ابوبکرؓ کے معاہدات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے گی۔

انہیں اس امر کی ضمانت دی اور عراق اور شام کے گورنروں کو لکھ کر بھیجا کہ

(1) جس علاقے میں یہ اہلِ نجران آباد ہوں' انہیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔

(2) مسلمان ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کریں۔

(3) کوئی دوسرا بھی ان پر ظلم نہ کرنے پائے۔ اگر اس کی نوبت آ جائے تو مسلمان خود اِس کی مدافعت کریں۔

(4) انہیں دو سال تک سرکاری محاصلات کی معافی دی جائے۔

اسی طرح جب' خیبر کے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا' تو ان کی تمام غیر منقولہ جائیداد (باغات اور زمینوں) کا حساب لگا کر' رقم ان کے حوالے کر دی۔

(2) دوسرا عہد نامہ جسے ہم مثال کے طور پر درج کرنا چاہتے ہیں' وہ ہے جسے حضرت عمرؓ نے باشندگانِ ایلیاء (بیت المقدس) کو لکھ کر دیا تھا۔ وَھُوَاھٰذا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یہ وہ امان نامہ ہے جو عبداللہ[1] (اللہ کے بندے) عمرؓ امیر المومنین نے اہلِ ایلیا کو لکھ کر دیا ہے۔

یہ امان' ان کی جان' مال' گرجا' صلیب' تندرست' بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ ان کے گرجاؤں کو ڈھایا جائے گا' نہ انہیں مسکن بنایا جائے گا۔ حتیٰ کہ ان کے احاطے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ نہ ان

1۔ اپنے آپ کو عبداللہ (اللہ کا بندہ' محکوم) کہنا از رہِ انکسار نہیں۔ یہ عظیم انقلابی اعلان ہے۔ مومن دنیا میں کسی (بڑی سے بڑی) طاقت کا بھی محکوم (عبد) نہیں ہوتا۔ وہ صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ اسی لئے (قرآنی شہادت کے مطابق) ہر رسول سب سے پہلے اسی عبدیّت (صرف خدا کی محکومیّت) کا اعلان کر کے دنیا کی ہر طاقت کے خلاف بغاوت کا عَلَم بلند کرتا تھا۔ یہی اعتراف و اعلان ان رسولوں کے متبعین کرتے تھے —— خدا کے عبد اور ساری کائنات کے حاکم۔

کی صلیبوں یا ان کی جائیدادوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائے گا۔ نہ ہی ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جائے گی۔ ایلیآء میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔ اہلِ ایلیاء پر فرض ہوگا کہ وہ دیگر شہروں کی طرح جزیہ ادا کریں اور یونانیوں اور چوروں کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا' اس کی جان اور مال محفوظ رہیں گے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جائے۔ جو ایلیاء ہی میں رہنا چاہے اسے بھی امن ہوگا بشرطیکہ وہ بھی اہلِ ایلیآء کی طرح جزیہ ادا کرے۔ ایلیآء والوں میں سے جو لوگ یونانیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں ان کے جان' مال اور صلیبوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنی فصلوں کے کاٹنے تک یہاں رہنا چاہیں' تو بھی انہیں ہر طرح کا امن ہوگا۔

جو کچھ اس امان نامہ میں تحریر ہے اس پر خدا و رسولؐ کا' خلفاء کا اور تمام مسلمانوں کا ذمہ ہے۔

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک مکتوب میں لکھا:

اپنے لشکر کو' ذمیوں کی بستیوں سے دُور ٹھہراؤ اور وہاں صرف وہی لوگ جائیں جن کی دیانت پر تمہیں پورا پورا اعتماد ہو' وہاں کے کسی باشندے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیونکہ ان کی عزت اور حرمت کا تم نے ذمہ لے رکھا ہے اور تم پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اہلِ ذمّہ پر کسی قسم کا ظلم کر کے' دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔

معاہدات کی پابندی کی اِحتیاط کی اِنتہاء

اُس دورِ ہمایوں میں' پابندیٔ عہد کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر آج کا انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ حضرت عبآدہ بنؓ صامت' ایک دفعہ دمشق کے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ رفیقِ سفر سے کہا کہ گاؤں کے کسی درخت سے مسواک کاٹ لائیے۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ آپ نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ اُن کے ساتھ جو معاہدہ ہوا ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی' اس لئے ہمیں یہاں سے مسواک نہیں لینی چاہئے۔ اسی طرح' حضرت ابو درؓداء کا جب کسی اہلِ ذمہ کے گاؤں پر سے گزر ہوتا اور آپ وہاں پانی پیتے' یا جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو روانگی کے وقت' ایک ایک پائی کا حساب کر کے قیمت ادا کر دیتے۔ اور اس میں یہ کہہ کر کچھ زائد بھی شامل کر دیتے کہ ہم ان کے درختوں کے سائے تلے بھی تو بیٹھے تھے' اس آسائش کا بھی معاوضہ دینا چاہئے۔

اسے نہ بھولئے کہ یہ اِن کے مفتوحہ علاقے تھے اور وہاں کے باشندے اِن کے محکوم!

اہلِ الذّمہ کے شخصی قوانین

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اہلِ الذّمہ اپنے مذہب کے معاملات میں آزاد ہوتے تھے۔ ''مذہب'' میں ان کے عقائد' پرستش اور دیگر مذہبی رسوم ہی شامل نہیں تھے۔ اس میں ان کے شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) بھی شامل تھے اور ان

معاملات میں وہ اپنے مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کر لینے کے مجاز تھے۔ انہیں اپنے رسوم و رواج کی کس حد تک آزادی تھی' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو اذرعات کے عیسائی' باجے بجاتے اور پھول برساتے آپ کے استقبال کے لئے نکلے۔ آپ نے انہیں روکنا چاہا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے آپ سے کہا کہ انہیں ان کے حال پر رہنے دیجئے' روکئے نہیں' انہیں ان کے رسوم و رواج کی آزادی ہے۔ (اس سے واضح ہے کہ اگر کسی معاہد قوم کے رسوم و رواج ہمارے دین سے نہیں ٹکراتے' تو انہیں اس کی بھی آزادی ہوگی کہ وہ اس کا مظاہرہ خود مسلمانوں کے سامنے بھی کر سکیں)۔

اُن کی زبان

عیسائی اہل الذمہ کو اس کی بھی اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی عید کے دن صلیب کا جلوس نکال لیں اور دن رات میں جب جی چاہے ناقوس بجائیں' البتہ نماز کے اوقات اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے[1]۔ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی دفاتری زبان بھی نہیں بدلی تھی۔ اسلام سے پہلے عراق کا دفتر فارسی زبان میں' شام کا رومی زبان میں اور مصر کا قبطی زبان میں تھا۔ ان ممالک کے فتح ہونے کے بعد' دفاتری کاروبار انہی زبانوں میں باقی رکھا گیا۔

بہر حال' یہ ہے جزیہ کی حقیقت' اور ذمیوں کے ساتھ صدرِ اوّل کی اسلامی حکومتوں کا سلوک! اُس جزیہ کی حقیقت اور اُن ذمیوں کے ساتھ سلوک جن کے متعلق غیر مسلم مصنفین (بالخصوص عیسائیوں) نے اس قسم کا پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ ان الفاظ کے سنتے ہی' ایک ناواقف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو دنیا کی وحشی ترین قوم خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت تھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی جن کی حکومت اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل تھی اور جن کی سیرت حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی۔

مسلمان بادشاہوں کی روش

ان کے بعد' سلاطین نے کیا کیا' اس کا ذمہ دار نہ اسلام ہے' نہ صدرِ اوّل کے مسلمان۔ اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں —— لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے جرائم کی سزا (بیچارے) اسلام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ میری اس کوشش کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ صدرِ اوّل کی صحیح تاریخ (یعنی قرآنی معیار کے مطابق صحیح تاریخ) دنیا کے سامنے پیش کی جائے تا کہ اسلام کے دامن سے وہ دھبے دُھل سکیں جو ہماری نادانستہ عاقبت' نااندیشیوں یا دانستہ مفاد پرستیوں نے اس پر ڈال رکھے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

اس تمہید کے بعد' اب آیئے فتوحات کی طرف۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی ایک بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا اساسی مقصد' حضرت عمرؓ (والذین معہٗ) کی سیرت کو نمایاں طور پر سامنے لانا ہے' نہ کہ ان کے عہد کی تفصیلی تاریخ

1۔ فقہ کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کے خنزیر یا خمر کو ضائع کر دے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ (دُرالمختار)

مرتب کرنا‘ لہٰذا‘ (اس عہد کے دیگر گوشوں کی طرح) فتوحات کے سلسلہ میں بھی انہی واقعات کو درج کیا جائے گا جن میں ان حضرات کے حُسنِ سیرت و کردار کے کسی نہ کسی گوشے کی جھلک سامنے آتی ہو۔ دیگر جزئیات و تفاصیل کو چھوڑ دیا جائے گا‘ کیونکہ ان تفاصیل کے لئے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ ویسے بھی وہ تاریخ کی ہر کتاب میں مل جائیں گی۔ میرا مطمحِ نگاہ‘ عام وقائع نویسی سے الگ ہے۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ قوت

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

سلسلۂ فتوحات

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا [7:137]

اور جس قوم کو انتہائی کمزور کر دیا گیا اور اسے بڑی ناتواں سمجھا جاتا تھا۔ اسے ہم نے اس بابرکت ملک کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا۔

عہدِ فاروقی کے سلسلۂ فتوحات کو بنظرِ غائر دیکھنے کے لئے اس کے پس منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے اور اس پس منظر کا نقطۂ آغاز‘ عہدِ رسالتمآبؐ میں ملے گا۔ اس لئے سلسلۂ کلام وہیں سے شروع ہونا چاہیے۔

عرب کا جغرافیہ

نقشہ پر نگاہ ڈالئے‘ محلِ وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس‘ جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقع ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ عربوں جیسی آب نادیدہ اور عطش گزیدہ قوم کے نزدیک‘ دریا بھی سمندر سے کم نہیں ہوتا —— چنانچہ ان کے ہاں جس جگہ بھی کچھ پانی جمع ہو وہ بحر کہلاتا ہے۔ وہ دریا کو بھی کبھی بحر اور کبھی یم کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے ملک کو جزیرہ نما نہیں بلکہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں۔

بازنطینی حکومت

ظہورِ اسلام کے وقت‘ خلیج فارس کے اُس پار مجوسیوں کی قدیم اور عظیم سلطنت (ایران) تھی اور شمال میں‘ عیسائیوں کی وسیع مملکت (بازنطین)۔ رومن ایمپائر (مملکتِ روم) قدیم دنیا کی وسیع و عریض اور نہایت متمدّن مملکت تھی۔ قیصرِ قسطنطین (CONSTANTINE) نے عیسائیت قبول کر کے‘ بازنطین کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ چوتھی صدی

عیسوی میں، سلطنتِ رومادو حصوں میں بٹ گئی تو مغربی حصہ کا دارالخلافہ روم (ROME) قرار پایا اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ۔ اس (مشرقی مملکت) کو بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا تھا۔ ویسے مؤرخین کبھی انہیں رومی کہہ دیتے ہیں اور کبھی بازنطینی۔ بعثتِ نبویؐ کے زمانے میں، ہرقل، بازنطینی مملکت کا شاہنشاہ تھا۔ شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرِ نگیں تھے۔ حدودِ شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کر لیا تھا۔ انہی قبائل کے رؤساء ہرقل کی طرف سے اِن علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسّانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے جس قدر تصادمات اِن علاقوں میں ہوئے، وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سر زمین کا شہنشاہ تھا، لیکن بلا واسطہ، غسّانی حکمرانوں سے ہوئے، جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے۔

ایران اور روم کی سلطنتوں کی باہمی آویزش کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا تھا کہ دونوں برابر کی ٹکر کی طاقتیں تھیں، لیکن عرب، بیرونی مداخلت سے مامون تھا ـــــ اس بے برگ و گیاہ قطعۂ زمین کو لے کر کسی نے کیا کرنا تھا! (البتہ یمن کا علاقہ جو سرسبز و شاداب تھا، ان آویزشوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا) جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا تعلق تھا، عرب کبھی ایک مملکت بنا ہی نہیں تھا۔ وہاں کی بیشتر آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی، جن کا نظام بھی (سیدھا سادہ) قبائلی تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کبھی کسی کے محکوم نہیں ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی، سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ اجتماعی زندگی کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔ اسلام نے نہ صرف اُنہیں اجتماعی زندگی سے آشنا کیا بلکہ پورے ملک کو ایک مملکت میں تبدیل کر دیا۔ اور جب یہ ملک ایک مملکت کی شکل اختیار کر گیا تو ظاہر ہے کہ اس کا وجود، ایران اور روم (بازنطین) دونوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔

عہدِ رسالتمآبؐ میں

جن لوگوں کی نگاہیں تاریخ پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ سلطنتِ ایران اور روم[1] (اور ان کے مقبوضہ علاقوں) کی غریب، کمزور، محنت کش رعایا پر کس قدر مظالم توڑے جاتے تھے۔ وہ کیسی بے کسی اور کسمپرسی کی انسانیت سوز زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ حضورؐ نبی اکرم جب اندرونِ عرب نظامِ امن و اطمینان قائم کر چکے، تو آپؐ نے ان سلطنتوں کے فرمانرواؤں اور ان کے زیرِ اقتدار حکمرانوں کے نام پیاماتِ امن و اصلاح ارسال فرمائے (ان کی تفصیل کا یہ مقام نہیں)۔ جہاں تک حدودِ شام کے حکمرانوں کا تعلق ہے، تاریخ میں دو روایات سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے ذات الطلح کے مقام پر پندرہ نفوس پر مشتمل ایک وفد بھیجا

1۔ اہلِ روما کے متعلق مشہور مغربی مؤرخ ہنری تھامس بکل لکھتا ہے:

پانچویں صدی کے آخر میں جب سلطنتِ روما کا شیرازہ بکھرا ہے تو اس کے بعد اس قوم پر جہالت اور جرائم کا ایک طویل عرصہ گزرا جسے بجا طور پر ازمنۂ تاریک کہا جا سکتا ہے۔ حالت یہ تھی کہ اس زمانے میں اس قوم کے بڑے بڑے دانشور بھی توہّم پرستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اقتدار کلیتہً پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے ضمیر پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔

(ہسٹری آف سویلیزیشن اِن انگلینڈ، جلد دوم صفحہ 108)

ایران کی حالت جس قدر ابتر تھی اس کے لئے براؤن کی تاریخِ فارس زندہ شہادت ہے۔

لیکن انہوں نے' ان کے رئیس کے سواسب کو قتل کر دیا' حالانکہ قاصدوں کا قتل' خود ان کے سیاسی اصولوں کی رُو سے بھی جائز نہیں تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپؐ نے قیصر کے نام ایک خط لکھا جسے شام کے سرحدی علاقہ کے حکمران ـــــ شرجیل بن عمرو ـــــ کی وساطت سے قیصر تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ شرجیل نے آپؐ کے نامہ بر (حضرت حارث بن عمیرؓ) کو قتل کر دیا۔ یہ اس کی ایسی خلافِ ضابطہ و قانون حرکت تھی جسے ایک عالمگیر امن کی داعی مملکت کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے قصاص کے لئے حضورؐ کو فوج کشی کرنی پڑی۔ یہ پہلی مہم تھی جو اپنی مملکت سے باہر وقوع پذیر ہوئی۔

جنگِ موتہ 8ھ بمطابق 630ء

حضورؐ کے آزاد کردہ غلام (حضرت زیدؓ بن حارث) اس فوج کے سپہ سالار تھے' اور حضرت خالد بن ولیدؓ پہلی بار اسلامی فوج میں رضا کارانہ طور پر' سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ اُدھر شرجیل نے کم و بیش ایک لاکھ فوج مقابلہ کے لئے تیار کی اور اس کے ساتھ ہی خود ہرقل' قبائلِ عرب کی ایک کثیر فوج ساتھ لے کر کمک کے لئے پہنچ گیا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ رومی سلطنت کے نزدیک' اس سب سے پہلے' تصادم کی اہمیت کس قدر تھی اور عربوں کی اس نوزائید مملکت کو وہ کن نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

موتہ کے مقام پر جنگ ہوئی اور اسلامی فوج کے تین جیّد سپہ سالار' حضرت زید بن حارثؓ' حضرت جعفرؓ طیار اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے یہ دیکھا تو فوج کی رضامندی سے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ دشمن کا مقابلہ مشکل ہے اس لئے اس وقت اپنی فوج کو بچا کر لے جانا ہی دانشمندی اور مصلحت اندیشی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بکمال حسنِ تدبر' باقی ماندہ فوج کو بعافیت مدینہ واپس لے آئے۔ یہ 8ھ کا واقعہ ہے۔

تبوک کی مہم 9ھ بمطابق 630ء

جیوشِ اسلامیہ کی اس پسپائی میں رومیوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے اور انہوں نے اسی وقت سے جارحانہ تیاریاں شروع کر دیں۔ رجب 9ھ میں' مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ رومیوں کا لشکر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ حضورؐ نے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ فرمایا کہ دشمن کے حملہ کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کی طرف سبقت کی جائے۔ مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر' حضورؐ نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور لشکر' شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ تبوک کے مقام پر (جو مدینہ اور دمشق کی قریب نصف مسافت پر واقع ہے) معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی۔ وہاں آپؐ نے قریب بیس روز تک قیام فرمایا' اور گرد و نواح کے رؤسا کے ساتھ امن و اطاعت کے معاہدات کر کے' واپس تشریف لے آئے۔

تبوک کی مہم کے وقت یہ خبر تو بے شک غلط ثابت ہوئی کہ رومی' مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے تھے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ہر وقت اس گھات میں تھے کہ جب بھی موقعہ ملے' اس نوزائیدہ خطرہ (اسلامی مملکت) کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے؛

چنانچہ اس قسم کی خبریں اکثر آتی رہتی تھیں۔ ان خیالات کے پیشِ نظر حضورؐ نے ضروری سمجھا کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت اس انداز سے کی جائے کہ یہ آئے دن کے خطرات وخدشات باقی نہ رہیں۔

لشکرِ اسامہ بن زیدؓ — 11ھ بمطابق 632ء

چنانچہ جب آپؐ حجتہ الوداع سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لائے، تو آپؐ نے ایک جرار لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ لشکر تیار ہوا تو آپؐ نے اس کی سپہ سالاری کے لئے (حضرت زید بن حارثؓ کے بیٹے) حضرت اسامہؓ کو منتخب فرمایا — یعنی دنیا کے عام الفاظ میں، ایک غلام ابنِ غلام کو، اُس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا جس میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ بطور سپاہی شریک تھے۔ لشکر کی روانگی کے انتظامات ہنوز مکمل بھی ہونے نہ پائے تھے کہ حضورؐ علیل ہو گئے اور یہ علالت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کرنی پڑی۔ اسی علالت میں حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت اسامہؓ کا لشکر روانہ نہ ہوسکا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کے لئے ہم عہدِ صدیقیؓ میں داخل ہوتے ہیں۔

عہدِ صدیقیؓ — 11ھ بمطابق 632ء

حضرت اسامہؓ کی مہم — 11ھ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روانگی کا حکم دے دیا۔ اس لشکر نے اس مقام کے قریب جا کر ڈیرے ڈال دیئے جہاں جنگ مؤتہ ہوئی تھی۔

ان کے مقابلہ کے لئے دشمن کا کوئی لشکر سامنے نہ آیا تو انہوں نے سرحدی علاقوں پر دھاوے بول دیئے۔ اس میں انہیں نمایاں کامیابی ہوئی اور وہ اس اعتبار سے فاتح ومصنور واپس آئے۔ اس سے ایک طرف جیوشِ اسلامیہ کے حوصلے بلند ہو گئے اور دوسری طرف سرحدی علاقوں میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

اندرونی بغاوتیں

اُدھر حضرت اسامہؓ کا لشکر شام کی جانب روانہ ہوا، اور اِدھر، اندرونِ ملک، مختلف بدوی قبائل نے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ آپ سورۂ حجرات کی اس آیت (49:14) کو ایک بار پھر سامنے لایئے جس میں کہا گیا تھا کہ ان بدوؤں سے کہہ دو کہ یہ، یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں؛ یہ سرِدست اتنا ہی کہیں کہ ہم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابھی، ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہی وہ غیر تربیت یافتہ ''نو مسلم'' قبائل تھے جنہوں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، یہ سمجھ

کر کہ مملکت کا استحکام حضورؐ کی ذات سے وابستہ تھا' مرکز سے بغاوت شروع کردی۔ یہی تھے وہ باغی جنہیں تاریخ میں ''مرتدین'' کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ ان کی طرف سے بغاوت کی علامت یہ تھی کہ وہ مرکزی حکومت کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کرتے تھے' اس لئے انہیں ''مانعینِ زکوٰۃ'' بھی کہا جاتا ہے (اس سے زکوٰۃ کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا)۔ یعنی زکوٰۃ' حکومت کے واجبات تھے' جنہیں حکومت کے خزانے ہی میں جمع کرانا تھا۔ بغاوت یہ تھی کہ وہ قبائل ان واجبات کو مرکزی حکومت کے خزانہ میں جمع نہیں کرانا چاہتے تھے۔ چونکہ اس آمدنی کا مقصد افرادِ معاشرہ (اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت) کے لئے سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا تھا' اس لئے اُسے زکوٰۃ کہتے تھے (زکوٰۃ کے معنی نشو ونما ہیں)۔ ضمناً یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ''مرتد'' کی سزا قتل ہے' تو اس میں ''مرتد'' سے مراد حکومت کا باغی ہے نہ کہ مذہب تبدیل کرنے والا۔ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) قرآن کی رُو سے' ہر شخص کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ وہ جونسا مذہب جی چاہے قبول کرے اور جس مذہب کو چاہے چھوڑ دے۔ جب دین میں اکراہ (جبر) نہیں تو مذہب کی تبدیلی پر سزا کیسی؟ بہر حال' یہ تھے وہ قبائل' جنہوں نے حکومت کے خلاف سرکشی اور بغاوت اختیار کی' اور یہ آگ دُور دُور تک پھیل گئی' انہی قبائل میں بعض زیرک اور فطین ایسے بھی تھے جنہوں نے دیکھا کہ نبی اکرمؐ نے دعویٰ نبوت کیا تو انہیں اس قدر عظیم مملکت حاصل ہوگئی۔ اس سے وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہوگئے کہ جو شخص بھی دعوائے نبوت کرے اُسے مملکت حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قبیلہ بنی حنیفہ میں مسیلمہ اور قبیلہ بنی اسد میں' طلیحہ نے دعوائے نبوت کردیا ــــــ حتیٰ کہ ایک عورت' سجاح نے بھی۔ (بعد میں مسیلمہ اور سجاح کی شادی ہو گئی تھی ــــــ پہنچی وہیں یہ خاک' جہاں کا خمیر تھا ــــــ) چونکہ ہمارے پیشِ نظر عہدِ صدیقیؓ کے کوائف واحوال کا تفصیلی تذکرہ نہیں' اس لئے ہم ان بغاوتوں اور ان کے فرو کرنے کی مہموں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کے فرو کرنے کے بعد ملک میں دوبارہ امن وسکون پیدا کرنے میں قریب ایک سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس لئے اس دوران میں' خارجی معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت اور مہلت نہ مل سکی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان مہمات کے سر کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس میں جنگِ یمامہ کو خاص شہرت حاصل ہے۔

اس کے بعد آپ خارجی امور کی طرف آیئے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت (عرب) کی شمالی سرحدوں (شام' فلسطین' عراق وغیرہ) میں عربی قبائل آباد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ شام اور فلسطین' رومی (بازنطینی) سلطنت کے زیرِ اقتدار تھے' اور عراق' ایرانی سلطنت کے قبضہ میں۔ شام اور فلسطین پر' رومیوں کی طرف سے غسّانی حکمران تھے اور عراق کا اقتدار حیرہ کے حاکم کے ہاتھ میں تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آگے چل کر انہی حکمرانوں کے ساتھ تزاحمات ہمارے سامنے آئیں گے۔

ایرانیوں کے ساتھ تصادم

عراق کی سرحدوں پر جن بدوی قبائل نے اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت کی تھی' ایرانی حکومت انہیں بھڑکا بھی رہی تھی اور ان کی مدد بھی کرتی تھی۔ لیکن ان کا مقابلہ وہیں کے مخلص مسلمانوں نے کیا اور اس میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی کہ باغی قبائل تو ایک طرف' خود ایرانی حکومت پر بھی ان کا دبدبہ چھا گیا۔ بحرین کے قبیلہ بکر بن وائل کا ایک مردِ مجاہد ـــ مثنیٰؓ بن حارث ـــ ان کا سردار تھا۔ وہ وہاں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد مدینہ حاضر ہوا اور عراق کے مظلومین کی حالتِ زار' خلیفہ سے بیان کی۔ حضور نبی اکرمؐ نے جو پیغامات روم اور ایران کے شاہنشاہوں کے نام بھیجے تھے' ان میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم لوگوں نے امن وسلامتی کی راہ اختیار نہ کی' تو تمہاری مملکت کے کاشتکاروں اور محنت کشوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں' ان کی ذمہ داری تمہارے سر پر عائد ہوگی۔ مثنیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو بتایا کہ عراق کے کاشتکاروں کی حالت یہ ہے کہ بیچارے سال بھر محنت کرتے رہتے ہیں اور جب ان کی فصلیں پک کر تیار ہو جاتی ہیں' تو ایرانی زمیندار سارا غلہ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور انہیں خیرات کے طور پر چند ٹکے دے دیتے ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ان ستم رسیدگان کی مدد کریں۔

حضرت خالدؓ اور مثنیٰؓ

آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے جنگ کے لئے جو شرائط عائد کی تھیں ان میں سے دو اہم شرطیں یہیں پوری ہو گئیں ـــ یعنی مملکتِ اسلامیہ کی سرحدات کی حفاظت اور مظلومین کی امداد۔ بنا بریں' حضرت صدیق اکبرؓ نے مثنیٰ کو جنگ کی اجازت دے دی' اور اس کی مدد کے لئے' حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا۔ ایرانیوں کی طرف سے ہرمز اس علاقہ کا حاکم تھا اور اردشیر اس زمانے میں ایران کا شاہنشاہ۔ جیوشِ اسلامیہ کا مختلف مقامات پر' ایرانیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا اور انہوں نے ہر معرکہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

جنگِ کاظمہ ـــ 12ھ بمطابق 633ء

سب سے بڑا معرکہ کاظمہ کے مقام پر ہوا جس میں ہرمز قتل ہو گیا اور مسلمانوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حیرہ بھی فتح ہو گیا' جسے مفتوحہ علاقہ کا دارالحکومت بنایا گیا۔ یہ اسلامی مملکت کا پہلا دارالحکومت تھا جو جزیرۃ العرب کے باہر قائم کیا گیا۔

رُومیوں سے ٹکراؤ

جس زمانے میں اسلامی لشکر' عراق کی مہمات میں مصروف تھا' ہرقل اسلامی مملکت پر حملہ کی غرض سے شام کی سرحدات پر لشکرِ جرار جمع کر رہا تھا۔ ایرانیوں کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد مملکتِ اسلامیہ کی توجہ رومیوں کے خطرہ کی طرف

منعطف ہوگئی۔ شام کی سرحدوں پر جو اسلامی فوج متعین تھی اس کے کمانڈر خالد بن سعید بن عاص تھے۔ لیکن وہ وہاں کامیاب ثابت نہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اس مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر مختلف سرکردہ سپہ سالاروں کی زیرِ قیادت کثیر افواج شام کی طرف روانہ کر دیں — حضرت ابوعبیدہؓ، عمرو بن عاصؓ، یزیدؓ بن ابی سفیان وغیرہ — اور ان کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھی اُدھر منتقل کر دیا جو اس وقت عراق میں تھے۔

جنگِ یرموک — 13ھ بمطابق 634ء

یرموک کا معرکہ اور فتح، اسلامی تاریخ کا درخشندہ کارنامہ ہے۔ اس سے رومیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جیوشِ اسلامیہ نے دمشق کا رُخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا اور پھر دمشق بھی فتح ہو گیا۔ اس طرح کہ جب اس کے مشرقی دروازہ سے خالد بن ولیدؓ بطور فاتح داخل ہوئے، تو دوسری طرف رومی سپہ سالار نے حضرت ابوعبیدہؓ سے صلح کر لی۔

فتحِ دمشق — 13ھ بمطابق 634ء

بعد میں یہ سوال سامنے آیا کہ شہر کو مفتوحہ تصور کیا جائے یا معاہد — اور فیصلہ یہ ہوا کہ جب جیوشِ اسلامیہ میں سے کسی ایک نے بھی معاہدہ کر لیا ہو تو اس معاہدہ کو تسلیم کرنا، سارے لشکر پر لازم قرار پا جاتا ہے۔

اور ابھی دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔

مثنیٰ کا ایرانیوں کے ساتھ ٹکراؤ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت خالد بن ولیدؓ اور مثنیٰؓ بن حارث، دونوں عراق میں تھے۔ جب خالدؓ شام کی مہم سَر کرنے کے لئے روانہ ہوئے، وہ نصف فوج اپنے ساتھ لے گئے تھے اور باقی نصف عراق کی حفاظت کے لئے مثنیٰؓ کے زیرِ قیادت تھی۔ ایرانیوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور ایک کثیر لشکر عراق پر چڑھائی کرنے کی غرض سے بھیج دیا۔ وہ لشکر ابھی وہاں سے روانہ ہوا ہی تھا کہ مثنیٰؓ نے پیش قدمی کی اور (ایران کے دارالسلطنت) مدائن سے پچاس میل دُور، بابل کے کھنڈرات کے قریب، ایک اونچے مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔ جب ایرانی لشکر وہاں پہنچا تو عساکرِ اسلامیہ نے اسے ایسی شکستِ فاش دی کہ انہوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا اور مجاہدین نے مدائن کے دروازے تک ان کا تعاقب کیا۔ مثنیٰؓ جانتے تھے کہ اگر اسلامی فوج نے ایک ہلّہ اور بول دیا تو ایران ان کے قبضے میں ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ بڑا اہم تھا اس کے لئے وہ خود مدینہ آئے۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اور حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی آخری وصیت کی

رُو سے اس معاملہ کو حضرت عمرؓ کے سپرد کیا اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے۔

اس مقام پر ہم اسلام کے اس بطلِ جلیل، اس ''ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر'' اس خلوص و دیانت کے مجسمہ، اس کوہِ آسا عزم و ہمت کے پیکر کی بارگاہِ عظمت مآب میں باصد نیاز، ہدیۂ احترام و عقیدت پیش کرنے کے لئے رُکتے ہیں جو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، خلفشار و انتشار کی تلاطم خیزیوں، سرکشیوں اور بغاوتوں کی طوفان انگیزیوں میں روشنی کے مینار کی طرح، ثبات و استقامت کی محکم چٹان بن کر کھڑے رہے، اور اسلام کی کشتی کو، بہ خیر و عافیت ساحلِ مراد تک پہنچا کر، اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو   رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

◆◆◆◆

اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے بعد ہم عہدِ فاروقیؓ کی حدود میں قدم رکھتے ہیں۔

پایم بہ پیش از سرِ ایں کُو، نمی رَوَد
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

◆◆◆◆

عہدِ فاروقیؓ

(جمادی الآخر 13ھ، بمطابق اگست 634ء)

حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجہیز و تکفین کے بعد گھر آئے تو عراق کے متعلق حضرت صدیقؓ کی وصیت اُن کے ذہن میں تھی وہ ساری رات اس معاملہ پر غور کرتے رہے۔ دو تین دن کے غور و تدبر اور صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کے بعد بالآخر یہی طے پایا کہ ایران کی قوت کا توڑنا ازبس ضروری ہے۔ بنابریں، آپؓ نے مثنیٰ کو فی الفور واپس بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر جنگ کی تیاری کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن مسعود الثقفی سے کہا کہ وہ ایک لشکرِ جرار تیار کریں اور اس کے سپہ سالار کی حیثیت سے، مثنیٰ کے ساتھ جا ملیں۔ چنانچہ وہ ایک مہینے کے بعد وہاں پہنچے۔ اب ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں جس میں مملکتِ اسلامیہ کا ایران کے ساتھ فیصلہ کُن ٹکراؤ ہوتا ہے — یہ دَور، مسلمانوں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ اقوامِ عالم کی تاریخ میں عظیم اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے دنیا کا نقشہ بدل گیا۔

تختِ ایران کی ابتری

ایران کی سلطنت کا چوتھا دَور، جو ساسانیوں کا عہد کہلاتا ہے، نوشیرواں عادل کی وجہ سے بہت مشہور ہے نبی اکرمؐ کے زمانے میں، نوشیرواں کا پوتا، خسرو پرویز تخت نشین تھا۔ اس کے زمانے تک یہ سلطنت بڑی طاقتور رہی لیکن اس کے مرنے کے

بعد مملکت میں سخت تباہی پھیل گئی۔ اس کے بیٹے شیرویہ نے کل آٹھ مہینے حکومت کی اور اپنے تمام بھائیوں کو جو کم و بیش پندرہ تھے، قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اُردشیر تخت پر بیٹھا جس کی عمر سات برس تھی۔ ڈیڑھ سال کے بعد' ایک افسر نے اُسے قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ چندروز بعد درباریوں نے اُسے قتل کر کے جواں شیر کو تخت نشین کیا' وہ ایک برس کے بعد مر گیا۔ اب خاندان میں یزدگرد کے سوا (جو اس وقت بچہ تھا) کوئی اولادِ ذکور باقی نہ رہی تو پوراں دخت کو اس شرط پر تخت پر بٹھا دیا کہ جب یزدگرد سنِ شعور کو پہنچے گا تو وہی تخت کا مالک ہوگا۔ چنانچہ جس سال (13ھ) حضرت عمرؓ نے زمامِ خلافت سنبھالی اسی سال یزدگرد سنِ بلوغت کو پہنچ کر ایران کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال اور بعض روایات کی رُو سے اٹھارہ سال کی تھی (ہم نے اس کی عمر کی تصریح کیوں کی ہے' اس کی وجہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ رُستم اس کا وزیرِ اعظم اور وزیرِ جنگ تھا۔

اِیرانیوں کے ساتھ ٹکراؤ

رُستم نے جو جرار لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بھیجے' ان میں سے ایک کا سپہ سالار جابان تھا جس کا (نمارق کے مقام پر) اسلامی لشکر سے مقابلہ ہوا۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی اور جابان کو ایک مسلمان سپاہی نے گرفتار کر لیا۔ (اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا قیدی کون ہے) جابان نے اس سے کہا کہ تم مجھے گرفتار یا قتل کر کے کیا کرو گے؟ یہ لو دو غلام اور مجھے امان دے دو۔ اس نے اُسے امان دے دی۔ وہ چھوٹ کر چلا تو ایک اور سپاہی نے اسے پہچان لیا اور گرفتار کر کے اپنے سپہ سالار (حضرت ابوعبیدہؓ) کے پاس لے آیا۔ جابان نے حضرت ابوعبیدہؓ سے کہا کہ مجھے تمہارے فلاں سپاہی نے امان دے دی ہے آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

ایک سپاہی کے عہد کی سب پر پابندی

حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھیوں نے کہا کہ اسے قتل کر دیجئے۔ یہ ایرانی فوج کا سپہ سالار رہے۔ آپ نے فرمایا کہ سپہ سالار ہے تو پھر کیا۔ جب اسے ایک مسلمان نے امان دے دی ہے تو اس امان کی پاسداری تمام مسلمانوں پر فرض ہوگئی ہے۔ اس لئے اب اسے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسے رہا کر دیا۔

عراقی سرداروں کے ساتھ معاہدات

مسلمانوں کی اسی کامیابی کا اثر تھا کہ عراق کے مختلف سرداروں نے حضرت ابوعبیدہؓ سے صلح کے معاہدے کر لئے۔ یہی وہ سردار تھے جنہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کی وہ دعوت کی تھی جس میں انواع و اقسام کے کھانے دسترخوان پر چُنے گئے تھے لیکن جنہیں' حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ کہہ کر چھونے سے انکار کر دیا تھا کہ جب تک عام لشکر کے لئے اسی قسم کے کھانوں کا اہتمام نہیں

کیا جائے گا' میں انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

اور یہی وہ مقام تھا جہاں اسلامی لشکر نے وہ اعلیٰ درجہ کی کھجوریں جو ایرانی بادشاہوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں' ان کاشتکاروں میں بانٹ دی تھیں' جن کی محنت کے پسینے سے وہ کھجوریں اُگتی اور پکتی تھیں۔

یہ تھے اسلامی لشکر کے سپاہی اور وہ تھا ان کا سپہ سالار! اور اسی میں تھا ان کی فتوحات کا سارا راز ـــــ ان فتوحات کا جن کے تصور سے تاریخ کی آنکھیں حیران اور ششدر رہ جاتی ہیں۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیّلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

معرکۂ جسر (پُل)

ایرانی' اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے' تازہ دم لشکر لے کر پھر میدان میں آ گئے۔ اس دفعہ مقابلہ' دریائے فرات کے کنارے ایک پُل پر ہوا (اسی نسبت سے اسے معرکۂ جسر کہتے ہیں)۔ ایرانیوں کے ساتھ بہت سے جنگی ہاتھی بھی تھے۔ اس مقام پر' کماندار کی ایک تدبیری غلطی سے' نہ صرف یہ کہ مسلمان فوج کو شکست ہوئی بلکہ ان کا بہت زیادہ نقصان بھی ہوا ـــــ اس میں سب سے زیادہ اور ناقابلِ تلافی نقصان' حضرت ابو عبیدہؓ کی شہادت تھی' جنہیں دشمن کے ایک ہاتھی نے کچل دیا تھا۔

حضرت ابو عبیدہؓ ثقفی کی شہادت ـــ 13ھ بمطابق 634ء

یہی وہ معرکۂ جسر تھا جس کے شکست خوردہ سپاہی جب مدینہ پہنچے ہیں تو مارے شرم کے کسی کو منہ نہیں دکھاتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بکمال شفقت و رافت حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔

معرکۂ بویب

اس شکست کے باوجود' مثنیٰؓ نے ہمت نہ ہاری اور جب بویب کے مقام پر ایرانیوں سے پھر مقابلہ ہوا تو انہیں ایسی استخوان شکن شکست دی جس کی صدائے بازگشت نے مدائن کے در و دیوار تک کو ہلا دیا اور ایرانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب عربوں سے فیصلہ کُن جنگ کی جانی ضروری ہے۔ ابنِ خلدون کی روایت ہے کہ اس جنگ میں ایرانیوں کے قریب ایک لاکھ سپاہی کام آئے اور مسلمانوں کے صرف ایک سو مجاہد شہید ہوئے۔

بویب کی فتح سے مدینہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن جب ان تک ایرانیوں کی تازہ تیاریوں کی اطلاع پہنچی تو اس سے بڑی تشویش بھی لاحق ہوئی؛ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک تازہ لشکر تیار کیا گیا۔ یہی وہ لشکر تھا جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بحیثیتِ سپہ سالار خود میدانِ جنگ میں جائیں گے لیکن آپ کے دیگر مشیروں نے آپ کو اس سے روک دیا تھا۔

آپ کی جگہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سپہ سالار منتخب ہوئے۔

مثنیؓ کی وفات — 13ھ بمطابق 634ء

مثنیؓ کو معرکہ جسر میں ایک کاری زخم لگا تھا۔ وہ حضرت سعدؓ کا انتظار کر رہے تھے کہ اس زخم کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اب ایرانیوں کا مقابلہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اگلے معرکہ تک پہنچیں' ضروری ہے کہ ہم مثنیٰ جیسے مردِ جلیل کی یادگار میں ہدیۂ تہنیت کے لئے رُک جائیں۔ یہ نہ قریشی تھے نہ رسول اللہؐ کے صحابی لیکن حضورؐ نے مؤمن کی زندگی کے سلسلہ میں جو فرمایا تھا کہ ''جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاریوں میں مصروف'' تو ان کی ساری زندگی اس کی زندہ شہادت تھی۔ خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں مثنیؓ پر' اور ان کے رفیقِ جلیل' حضرت ابوعبیدہؓ پر' جن کی جرأت و بسالت کے صدقے اسلام کو ایسا قابلِ فخر غلبہ حاصل ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت سعدؓ وہاں پہنچے ہی تھے کہ فاروقِ اعظمؓ کا فرمان پہنچا کہ اپنے لشکر کو لے کر قادسیہ کی طرف بڑھو — وہ قادسیہ کہ جسے تاریخِ انسانیت کا عظیم موڑ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا — چونکہ ایران نے ایک فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا اس لئے' اب خود رستم سپہ سالار کی حیثیت سے میدان میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو لکھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے' اسلامی آئین کے مطابق' یزدگرد کے کے سامنے صلح کی شرائط پیش کر دی جائیں اور اس مقصد کے لئے مدائن (جو ایران کا دارالسلطنت تھا) سفیر بھیجے جائیں۔

اسلامی وفد یزدگرد کے دربار میں

یزدگرد کو سفراء کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے خاص طور پر دربار کو آراستہ کیا — اس نے محسوس کیا کہ اتنی عظیم مملکت کے سفیروں کے شایانِ شان' اہتمامِ تُزک واحتشام کرنا چاہیے۔ لیکن جب سفیروں کا وفد وہاں پہنچا' تو ان کی حالت یہ تھی کہ ستے ہوئے چہرے' کندھوں پر بوسیدہ چادریں' ہاتھوں میں چابک' پاؤں میں مَوزے' دبلے پتلے گھوڑوں پر سوار' جو خاک اڑاتے چلے آ رہے تھے۔ یزدگرد باور نہیں کرتا تھا کہ اس مملکت کے یہی سفیر ہیں۔ اُسے ان سے بات کرنا بھی گوارا نہ تھا لیکن جب اس کے اہلِ دربار نے اس پر زور دیا تو وہ طوعاً وکرہاً ان سے ملنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ وفد دربار میں پہنچا تو ان کے رئیس نے حسبِ معمول' شاہنشاہ ایران سے کہا کہ یا تو اسلام قبول کر کے ہم میں سے ہو جاؤ' یا اسلامی مملکت کے اقتدار کی برتری تسلیم کر

لو تا کہ تم بھی محفوظ رہو اور تمہارا ملک اور اس کے باشندے بھی۔ اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو پھر تلوار کے فیصلے کا انتظار کرو۔

یزدگرد نے یہ سنا تو غصہ کے مارے آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ تم وحشی اور بدتہذیب عرب (فردوسی کے الفاظ میں) سوسمار کھانے اور اونٹوں کا دُودھ پینے والے گنوار، اور تمہاری جرأتوں کا یہ عالم! کیا تم بھول گئے ہو کہ تم ذرا سی سرکشی اختیار کیا کرتے تھے تو ہم (ایرانی) خود تمہارے مقابلہ کے لئے نہیں نکلا کرتے تھے (ہم اسے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے) اپنے سرداروں سے کہہ دیا کرتے تھے اور وہ تمہاری گوشمالی کر کے تمہیں سیدھا کر دیتے تھے۔ اب اگر تم لوگوں کو بھوک اور افلاس نے تنگ کر کے آمادہ بہ جنگ کر دیا ہے تو ہم تمہارے روٹی کپڑے کا انتظام کر دیتے ہیں، جاؤ! آرام سے بیٹھو۔ کیوں اپنی جان کے لاگو ہو رہے ہو۔

رئیسِ وفد نے یزدگرد کی باتوں کو نہایت سکون اور اطمینان سے سنا اور اس کے بعد کہا کہ تم نے ہماری پہلی حالت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اس سے بھی زیادہ جاہل اور زبوں حال تھے لیکن خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی تعلیم و تربیت نے ہمارے اندر جو انقلاب برپا کر دیا ہے، تمہیں اس کا علم نہیں۔ ہم اب ایک اور ہی قوم ہیں۔

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی کج کلاہی کو یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

میں ان تین شرطوں کو پھر سے دہرائے دیتا ہوں جو پہلے پیش کی گئی ہیں۔ کہو تمہارا جواب کیا ہے؟

خاکِ ایران

یہ سن کر یزدگرد آپے سے باہر ہو گیا اور بپھر کر بولا کہ اگر قاصدوں کا قتل کرنا خلافِ آئین نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔ جاؤ! اور جو تمہارے جی میں آئے کرو لیکن جاتے جاتے ایک تحفہ ضرور لیتے جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے مٹی کا ایک ٹوکرا منگایا اور اسے رئیسِ وفد کے سامنے رکھ دیا — انہوں نے ٹوکرا اٹھایا اور شاداں و فرحاں حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے۔ سارا ماجرا سنایا اور اس کے بعد وہ مٹی کا ٹوکرا پیش کرتے ہوئے کہا کہ مبارک ہو، یزدگرد نے خود ہی اپنی زمین ہمارے حوالے کر دی[1]۔

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گلِ کوشند زِ شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس مٹی کے ٹوکرے میں فی الواقعہ ایران کی ساری زمین سمٹ کر آ گئی تھی۔

اِدھر یہ آئے اور اُدھر سے رُستم مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے جلو میں ایک لاکھ اسی ہزار فوج تھی — قریب تین سو جنگی ہاتھی فوج کے ہمراہ تھے اور آلاتِ حرب و ضرب اور سامانِ جنگ کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا — یہ اہتمام تھا اور ایک مُشتِ پَر کے لئے — اس اہتمام کے باوجود رستم جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ مجاہدین سے واقف تھا اس لئے ان کے سامنے آنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مدائن سے قادسیہ تک پہنچنے میں (کہ جن کا درمیانی فاصلہ تیس چالیس میل سے

1۔ تاریخ میں اس وفد سے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم نے یہاں ان سب کا ملخص پیش کر دیا ہے

زیادہ نہ تھا) چھ ماہ صَرف کر دیئے اور جب اس نے دیکھا کہ (یزدگرد کے تقاضوں کے پیشِ نظر) کوئی اور چارہٗ کار نہیں رہا تو قادسیہ کے قریب، مقامِ عتیق میں خیمہ زن ہو گیا۔ چونکہ وہ چاہتا تھا کہ اب بھی کسی طرح مقابلہ کی نوبت نہ آئے اس نے حضرت سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ کسی سفیر کو بھیج دیں تا کہ اس سے گفتگوئے مصالحت ہو سکے۔ چنانچہ حضرت ربعی بن عامرؓ کو سفیر بنا کر رستم کے پاس بھیجا گیا۔

رستم نے بھی (یزدگرد کی طرح) نہایت شان و شوکت اور تجمل و تکلف کے ساتھ دربار کو پیراستہ کیا، سونے کا تخت آراستہ کیا۔ اس کے چاروں طرف حریر و اطلس اور رُومی قالینوں کا فرش بچھوایا۔ اوپر زربفت کے شامیانے لگوائے جن کی جھالریں موتیوں کی تھیں لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!

حضرت ربعیؓ، اپنے مخصوص سکندرانہ جلال لیکن قلندرانہ اداؤں کے ساتھ دربار میں پہنچے۔ ایک خندۂ اِستغناء سے گردو پیش پر نظر ڈالی۔ لبِ فرش اپنا نیزہ گاڑ کر اس کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھا اور نہایت بے تکلفی سے، تخت کے ایک طرف، رستم کے ہمدوش بیٹھ گئے۔ اہلِ دربار نے روکنا چاہا تو آپ نے کہا کہ ہمارے ہاں اس کی سخت ممانعت ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور باقی انسان، اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ رستم نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ان سے تعرض مت کرو۔

سچ کہا ہے اقبالؒ نے کہ

پادشاہاں در قباہائے حریر زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر

سوال جواب یہاں بھی اسی انداز کے ہوئے جسے ہم یزدگرد کے دربار میں دیکھ آئے ہیں۔ دورانِ گفتگو، رستم نے حضرت ربعیؓ سے کہا کہ تمہاری تلوار کا نیام بہت بوسیدہ ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ سپاہی کا مقصد تلوار سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے نیام سے۔ تم نے اس تلوار کی آب کو نہیں دیکھا، اسے دیکھو گے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ کیا ہے؟ پھر اس نے کہا کہ تمہارے نیزے کا پھل بہت چھوٹا سا ہے، یہ لڑائی میں کیا کام دیتا ہوگا۔ آپ نے کہا کہ وہی کام جو ایک چنگاری، نیستاں کے لئے دیتی ہے۔

روایات میں ہے کہ سفراء کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا لیکن مصالحت کی کوئی شکل پیدا نہ ہو سکی —— جو، دو اور دو چار کہتا ہوا حق پر ہو، وہ مصالحت کس بات پر کرے؟ کیا وہ دو اور دو تین یا پانچ مان لے؟ باطل اپنے مقام سے جتنا جی چاہے اِدھر اُدھر ہو جائے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ جیسا، باطل پہلے تھا ویسا ہی باطل پھر رہتا ہے لیکن حق اگر اپنے مقام سے ذرّہ برابر بھی سرک جائے تو وہ حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ غلط جواب سینکڑوں ہو سکتے ہیں، صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو حق، باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ یہی اسلام کا پیغام ہے۔ یہی دین کی بنیاد ہے۔

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

چنانچہ سفیرِ اسلام باطل کے ساتھ مفاہمت کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اس کا نتیجہ قادسیہ کا زلزلہ انگیز معرکہ تھا۔ ایرانی لشکر کی تفصیل ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں، اسلامی لشکر کل تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا جن کے پاس وہی بوسیدہ نیاموں کی تلواریں اور چھوٹی چھوٹی انیوں والے تیر اور نیزے تھے ـــــ لیکن ان کے سینوں میں وہ بیقرار دل تھے جن کے شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا کہ

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دمِ شمشیر کا

معرکۂ قادسیہ ـــ 14ھ بمطابق 635ء

معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ سُوءِ اتفاق کہ حضرت سعدؓ کو عرق النساء (یا بروایت دیگر کاربنکل) کی شدید تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں نہیں آ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ میدانِ جنگ کے ایک سرے پر ایک عمارت میں لیٹے، ہدایات پر ہدایات دیتے چلے جاتے تھے۔ تین دن کے جرأت آزما معرکہ کے بعد، ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ رستم مارا گیا۔ تاریخ ایک اہم موڑ مڑ گئی۔

ابو محجن ثقفی کا نشۂ جہاد

ہم میدانِ کارزار کے شور و شغب میں اس قدر محو، اور شمشیر و سناں کی جھنکار میں اس قدر جذب ہوئے کہ ابو محجن کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کی یاد ہی دل سے اُتر گئی۔ محجن ثقفی عربوں کے مشہور شہ سوار تھے لیکن حضرت سعدؓ نے انہیں قید کر رکھا تھا (یہ آگے چل کر بیان ہو گا کہ انہیں کیوں قید کر رکھا تھا)۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مجاہدین کے نعرہ ہائے تکبیر بار بار ان کے کانوں سے ٹکرائے تو اُن سے نہ رہا گیا۔ پا بہ زنجیر، گھسٹتے ہوئے حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے اور معافی کی درخواست کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت چاہی، لیکن حضرت سعدؓ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ حضرت سعدؓ کی زوجہ محترمہ سلمٰے کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ میری بیڑیاں کھول کر، حضرت سعدؓ کا گھوڑا (بلقاء) مجھے دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا تو انہی بیڑیوں کو خود پہن کر پھر داخلِ زنداں ہو جاؤں گا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا لیکن جب ابو محجن نے بہت زیادہ لجاجت سے کہا تو ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے ان کی بیڑیاں بھی کھول دیں اور گھوڑا بھی دے دیا۔ وہ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ایرانیوں کے لشکر میں جا گھسے اور اس بے جگری سے لڑنا شروع کیا کہ رَن کانپ اُٹھا۔ حضرت سعدؓ اپنے بالا خانے سے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔ بار بار دل میں کہتے کہ اگر ابو محجن قید میں نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ یہ وہی ہے اور اگر میرا گھوڑا اصطبل میں نہ بندھا ہوتا تو مجھے یہ کہنے میں قطعاً تأمل نہ ہوتا کہ وہ بلقاء ہے۔

رن ختم ہوا تو ابو محجن حسبِ وعدہ زنداں کے دروازے پر پہنچ گئے۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا اور خود بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ نے اصطبل میں گھوڑے کو دیکھا تو وہ پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ دریافت کرنے پر بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا۔ آپ ابو محجن کے پاس گئے، معافی قبول کی اور انہیں رہا کر دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ابو محجن کو شراب نوشی کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ لیکن ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان سے پوچھا کہ سعدؓ نے انہیں کس جرم کی پاداش میں قید کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے کسی حرام شے کا استعمال نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میں عہدِ جاہلیت میں شراب پیا کرتا تھا اور شاعری بھی کرتا تھا، اس لئے میری خمریات بھی مشہور تھیں۔ میں ایک دن یونہی اُس زمانے کے اشعار گنگنا رہا تھا، ان میں یہ شعر بھی تھا۔

اذامت فادفنی الیٰ جنب کرمة

تروّی عظامی بعد موتی عروقها

جب میں مر جاؤں تو مجھے پہلوئے تاک میں دفن کرنا تا کہ میری ہڈیاں اس کا رس چوستی رہیں[1]۔

(حضرت) سعدؓ نے سمجھا کہ یہ ظالم ابھی تک میرے منہ سے چُھوٹی نہیں، اس لئے مجھے قید کر دیا۔

ہمارا مقصد جرم کی تحقیق نہیں، اس کا معاملہ خدا سے ہے۔ ہم نے تو دیکھنا یہ ہے کہ ان لوگوں کے جذبہ جہاد اور شوقِ شہادت کا کیا عالم تھا!

(واضح رہے کہ اس معرکہ میں صرف حضرت سعدؓ کی رفیقۂ محترمہ ان کے ہمراہ نہیں تھیں۔ بیشتر فوجیوں کی بیویاں ان کے ہمراہ تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کا کام انہی کے سپرد تھا۔ صدرِ اوّل کے معرکوں میں ایسا ہی ہوتا تھا)۔

اور یہی تھی وہ جنگِ قادسیہ جس کے حالات معلوم کرنے کے لئے حضرت عمرؓ ہر صبح اس راستے کی طرف نکل جایا کرتے تھے جو قادسیہ کی طرف سے آتا تھا۔ بایں امید کہ شاید ادھر سے کوئی آنے والا مل جائے اور اسی کی فتح کی خوشخبری لے کر وہ قاصد آیا تھا جس کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ امیر المومنین دوڑتے اور حالات سنتے مدینہ تک پہنچے تھے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ [9:100]

قادسیہ کی ذِلّت آمیز شکست کے بعد، حالت یہ تھی کہ ایرانی آگے بھاگے جا رہے تھے اور اسلامی فوج ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ مختلف مقامات (بابل، کوثی، بہرہ شیر وغیرہ) پر ان کی جھڑپیں بھی ہوئیں اور ایرانیوں کو ہر میدان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؛ تا آنکہ وہ دریائے دجلہ عبور کر کے مدائن میں جا پہنچے۔

مجاہدین کی نگاہیں مدائن پر تھیں لیکن راستے میں دجلہ اپنی تند و تیز طغیانیوں کے ساتھ حائل تھا اور ایرانی جاتے جاتے تمام

1۔ مر مٹے پر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے   میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے   (ریاض خیر آبادی)

پل توڑ گئے تھے اور اسلامی لشکر کے پاس دریا عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

تو کیا یہ اللہ کے سپاہی' یہ خدا کا لشکر' یہ حزب اللہ' یہ کفن بدوش و شمشیر بکف جانباز' دریا کے کنارے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب ہمارے پاس دریا عبور کرنے کا کوئی سامان ہی نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ نہیں وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے بے سروسامانی کا تصور اگر کسی وقت ذرا بھی ان کے دل میں مایوسی پیدا کرنے کے لئے آگے بڑھتا' تو ان کی قوتِ ایمانی اسے یہ کہہ کر جھٹک دیتی کہ

بے دست و پا نیم' کہ ہنوز از وفورِ عشق
سودا ست در سَرم کہ بہ سامان برابر است

اپنے مقصد کی صداقت اور اس کے حصول کی بے پناہ تڑپ انہیں پکار پکار کر کہتی کہ

میآرا بزم بَر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور یہ ولولہ ان کے نزدیک یونہی شاعری نہیں تھا' ایک زندہ حقیقت تھی اور یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر آسمان کی آنکھ کیا دیکھتی ہے کہ انہوں نے بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا کہہ کر دریا میں گھوڑے ڈال دیئے اور دریا کی پُرجوش طغیانیوں کے ساتھ یوں ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے چلے گئے جیسے نسیم سحری کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے سیرِ چمن کے لئے نکلے ہوں۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے   مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر تیرا پیغام پھرے   اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں' دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ایرانیوں نے انہیں دیکھا تو پہلے تو بے ساختہ پکار اُٹھے کہ یہ ''دیوانے ہیں دیوانے'' لیکن جب وہ اور قریب آ گئے تو یہ کہہ کر بھاگ کھڑے ہوئے کہ یہ انسان نہیں' جنّ ہیں ___ اور جنّات کا مقابلہ کون کرے!

فتحِ مدائن 16ھ بمطابق 637ء

اور اس کے بعد اسلامی لشکر اس مدائن کے اندر تھا جسے یزدگرد اور تمام ایرانی پہلے ہی خالی کر کے' بھاگ چکے تھے۔ جب حضرت سعدؓ شاہنشاہِ ایران کے قصرِ ابیض میں داخل ہوئے تو ان کی زبان پر بے ساختہ قرآنِ کریم کی یہ آیات آ گئیں کہ

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ○ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ [44:25-28]

انہوں نے کس قدر سرسبز وشاداب باغات' خنک وشیریں چشمے' لہلہاتی کھیتیاں اور بلند وبالا مقاماتِ عزوشرف اپنے پیچھے چھوڑ دیئے' یعنی وہ تمام سامانِ آسائش وزیبائش جو ان کی خوش حالیوں کا آئینہ دار تھا' وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ہم نے ایک اور قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

حضرت سعدؓ کی زبان پر یہ عبرت انگیز اور تشکر آمیز آیات تھیں' اور ادھر سے خدا کا قانونِ مکافات پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ [44:29] ان کی اس تباہی پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی انہیں اتنی سی مہلت بھی ملی کہ وہ اس ساز وسامان کو اپنے ساتھ اُٹھا کر لے جاتے۔

مالِ غنیمت

وہی قوم جس کے ساتھ یہ ایرانی ابھی کل تک جنگ کرنا بھی باعثِ ننگ وعار سمجھتے تھے' آج ان کے تخت وتاج' سلطنت وحکومت اور دولت وحشمت' سب کی مالک تھی۔ کیا سورج کی آنکھ نے ایسا محیر العقول انقلاب اس سے پہلے بھی کبھی دیکھا تھا! حضرت سعدؓ فورِ جذباتِ تشکّر وامتنان سے کبھی خدا کے حضور جھکتے' کبھی اٹھتے تھے۔ اتفاق سے یہ جمعہ کا دن تھا۔ انہوں نے صلوٰۃ الجمعہ اسی قصرِ ابیض میں ادا فرمائی اور یوں ایران کے آتشکدوں کی آگ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہوگئی۔ قصرِ ابیض میں جابجا نہایت نادر مجسمے اور شاہکار تصاویر آویزاں تھیں۔ ان عربوں نے' جنہیں یورپ کے تنگ نظر مؤرخ نہایت وحشی کہہ کر پکارتے ہیں' انہیں اسی طرح رہنے دیا کسی کو توڑا پھوڑا نہیں۔ (ہیکل' اور دیگر مؤرخین کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق) حضرت سعدؓ کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس کھرب دینار ملے اور محل میں جو ساز وسامان تھا اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یزدگرد مدائن سے بھاگ کر حلوانؔ چلا گیا تھا۔ مسلمانوں کی فوج نے اس کا پیچھا کیا' تو وہ حلوان چھوڑ کر اور آگے بھاگ گیا۔ یہ لوگ وہاں سے کسریٰ کا موتیوں کا ہار اور جواہرات سے مرصع تاج اور زرکار ریشمی ملبوسات لے کر آئے جن میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ کسریٰ کی زرہ اور تلواریں بھی جواہرات سے مُرصّع تھیں۔ جب اس مالِ غنیمت کا خُمس (پانچواں حصہ) مدینہ پہنچا ہے تو اہلِ مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں' ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ ساٹھ مربع گز کا صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی' جابجا موتیوں کی نہریں تھیں' کناروں پر چمنستان تھا جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے' پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔

سپاہ دیانت دار کیوں تھی

حضرت سعدؓ نے لکھا تھا کہ یہ تمام زرّ وجواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے

جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سُوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا' اس دیانت اور امانت کا راز اُس میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فرق آ جاتا۔ (بحوالہ ہیکل)

دوسری صبح جب سارا مالِ غنیمت صحنِ مسجد میں جمع کر دیا گیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر ایک عبرت آمیز نگاہ ڈالی اور آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! یہ تو مقامِ تشکّر تھا' آپ رونے کیوں لگے۔ آپ نے جواب دیا کہ جس قوم میں دنیا کی فراوانی آ جائے' اس میں رشک اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اس قوم میں تفرقہ پڑ جاتا ہے' میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہمارا حشر بھی ایسا نہ ہو۔

یہ ٹھیک ہے لیکن قوموں میں یہ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دولت کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صَرف نہ کیا جائے۔ جب تک پانی کشتی کے نیچے رہتا ہے' وہ کشتی کے تیرنے کا سہارا بنتا ہے۔ جب وہی پانی کشتی کے اوپر چڑھ آئے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ قوموں کی تباہی کا باعث دولت و ثروت کی فروانی نہیں ہوتی؛ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب اسی دولت کو پست جذباتِ حیوانیہ کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ خود ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے اور یہی حضرت عمرؓ کا خدشہ تھا۔

یزدگرد کی دشت نوردیاں

اس وقت جبکہ امیر المومنین' مالِ غنیمت کی تقسیم میں مصروف ہیں' اور فاتح ایران حضرت سعدؓ قصرِ ابیض میں تکان اتار رہے ہیں' آیئے ہم دیکھیں کہ یزدگرد پر کیا بیت رہی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدائن سے بھاگ کر وہ حلوآن پہنچا تو وہاں بھی جیشِ اسلامیہ نے اس کا تعاقب کیا۔ جلولٓہ کے مقام پر ایرانیوں سے مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر اپنے ''شہنشاہ'' سمیت پھر بھاگ اُٹھے۔ اس کے بعد وہ رَے میں جا کر مقیم ہوا۔ وہاں سے اصفہان کی طرف چلا گیا۔ اصفہان سے کرمآن پہنچا۔ اس کے بعد پھر اصفہان واپس آ گیا۔

نہاوٓند کی جنگ — 21ھ بمطابق 642ء

جب اسلامی جیوش نے صوبہ اَہواز پر قبضہ کر لیا' تو یزدگرد' خراسان کے شہر مرٓو میں آ کر مقیم ہوا۔ وہاں اس نے اِدھر اُدھر سے ایرانی فوج جمع کر کے' اپنی متاعِ بُردہ کی بازیابی کے لئے آخری کوشش کی۔ نہاوٓند کے مقام پر اس نے قریب ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کر لی۔ اس سے اسلامی مملکت کو ایسا خطرہ لاحق ہوا کہ فاروقِ اعظمؓ نے اس کے مقابلہ کے لئے خود جانا ضروری سمجھا لیکن

اپنے رفقاء کے مشورہ پر کار بند ہوتے ہوئے (ایک بار پھر) آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔نہاوند کے معرکہ میں اسلامی فوجوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی۔حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سپہ سالارِ لشکر تھے۔

فاروقِ اعظمؓ کا قاتل' فیروز ابولولو' نہاوند کا باشندہ تھا اور اسی جنگ میں قید ہو کر مدینہ پہنچا تھا۔تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

فتح نہاوند کے بعد' ایران کے مختلف صوبے' یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آتے چلے گئے۔آذر بائیجان' طبرستان' آرمینیہ' 22ھ (مطابق 643ء) میں۔کرمان' سیستان اور مکران 23ھ (مطابق 644ء) میں۔

یزدگرد کا فرار

ہم دیکھ چکے ہیں کہ معرکہ نہاوند کے وقت یزدگرد خراسان کے شہر مرو میں مقیم تھا۔جب اسلامی فوجوں نے یہاں بھی دباؤ ڈالا تو وہ بلخ کی طرف بھاگ گیا اور جب مسلمانوں نے بلخ بھی فتح کر لیا تو یزدگرد کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے ملک (ایران) کو چھوڑ کر ترکستان چلا جائے۔وہاں اس نے خاقان کے پاس سمرقند میں پناہ لے لی۔جب حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو آپ نے مسجدِ نبویؐ میں اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> آج مجوسیوں کی حکومت فنا ہو چکی ہے۔اب وہ اپنے ملک میں چپہ بھر زمین کے مالک بھی نہیں ہو سکیں گے۔مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں مجوسیوں کی زمین' مجوسیوں کی مملکت' مجوسیوں کے مال و دولت کا مالک بنا دیا ہے تا کہ اب یہ دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔لہٰذا' تم احتیاط برتنا اور اپنے احوال میں تغیر پیدا نہ ہونے دینا ورنہ خدائے تعالیٰ تم سے بھی یہ مملکت چھین لے گا اور کسی دوسری قوم کے حوالے کر دے گا۔

یزدگرد کی عبرت آمیز موت

اس کے چند روز بعد حضرت عمرؓ کی شہادت ہوگئی (لیکن اس کا تذکرہ یہاں ضمناً آ گیا ہے)۔یزدگرد ملک بدر بھی ہو گیا لیکن اپنی چھنی ہوئی سلطنت کی بازیابی کا خیال اس کے دل میں پھر بھی کروٹیں لیتا رہا۔اس مقصد کے لئے وہ اہلِ خراسان سے خط و کتابت کرتا رہا۔جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں خراسان میں بغاوت ہوئی تو اس نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ترکستان سے مرو پہنچ کر لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کرنا شروع کر دیا لیکن مسلمانوں نے اس بغاوت کو جلد فرو کر دیا تو یزدگرد پھر بھاگ نکلا لیکن اب اس کے لئے کوئی جائے فرار نہیں تھی کیونکہ مسلمانوں نے اس کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ وہ جہاں بھی ملے اسے گرفتار کر لیا جائے۔اسے جب اس کا علم ہوا تو وہ جان بچانے کے لئے ایک پن چکی میں رُو پوش ہو گیا اور وہاں بُری طرح قتل کر دیا گیا — بعض روایات میں ہے کہ اسے اہلِ خراسان نے قتل کر دیا تھا۔بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ چکی والے ہی نے لالچ میں آ کر اسے قتل کر دیا تھا — قتل کسی نے بھی کیا ہو' کیا اس سے بڑھ کر مقامِ عبرت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ ایران جیسی

عظیم مملکت کا شاہنشاہ اور رُوپوشی کی حالت میں ایک پَن چکی میں مقتول! فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔ یہ 30ھ کا واقعہ ہے۔
ایران فتح ہو گیا اور اس کے آخری کسریٰ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو ایک واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

ہرمزانؔ کی رُوباہ بازیاں

ہرمزانؔ ایران کا ایک نامور گورنر جری سپہ سالار ماہر سیاست دان اور نہایت مکار اور عیار حریف تھا۔ قادسیہؔ میں شکست کھانے کے بعد وہ اہوازؔ کی طرف بھاگ گیا اور وہاں از سرِ نَو فوجوں کو مرتب کر کے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں اُتر آیا۔ جب وہ وہاں بھی مصیبت میں گھرا تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ وہ صلح کرنے کے بعد وہاں سے نکلا تو معاہدۂ صلح کو پسِ پُشت ڈال کر پھر میدانِ جنگ میں آ گیا۔ جب وہاں پھر گھر گیا تو دوبارہ معاہدۂ صلح کی درخواست کی جسے بحکمِ امیر المومنین منظور کر لیا گیا۔

تسترؔ کی فتح 19ھ بمطابق 640ء

اس نے پھر معاہدہ شکنی کی اور رامہرمزؔ کے مقام پر پھر میدانِ کارزار میں اُتر آیا۔ وہاں سے شکست کھائی تو بھاگ کر خوزستان کے دارالسلطنت تسترؔ جا پہنچا۔ ایران میں یہ صوبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اُسے وہیں قتل کرنے کے بجائے امیر المومنین کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے۔

ہرمزان حضرت عمرؓ کے حضور

چنانچہ اُسے انس بن مالکؓ اور احنف بن قیسؓ کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ مدینہ میں یہ جس شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا اور امیر المومنین کو جس عالم میں صحنِ مسجد میں فرشِ خاک پر سوتے ہوئے پایا اس کا ذکر سابقہ باب میں کیا جا چکا ہے۔
حضرت عمرؓ نے اس کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا اور کہا کہ ان کی سزا قتل کے سوا اَور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے مؤرخین نے نہایت ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعہ ایسے ہی ہوا تھا تو وہ تھا ہی ایک ڈرامہ۔ کہا گیا ہے کہ ہرمزانؔ نے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے پانی پلا دیجئے۔ پانی منگایا گیا۔ اس نے پیالہ ہاتھ میں لیا اور اسے لب تک لے جا کر پیچھے ہٹا لیا اور کہا کہ ایسا تو نہیں ہو گا کہ مجھے پانی پیتے ہی میں قتل کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں تم اطمینان سے پانی پیو جب تک تم پانی نہ پی لو گے تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ ہرمزانؔ نے یہ سن کر پانی انڈیل دیا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کے لئے اور پانی لایا جائے۔ اس پر ہرمزانؔ نے کہا کہ نہیں! مجھے پانی کی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنی جان

بچانا چاہتا تھا۔اس پر مجلس میں حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت عمرؓ: تم سزائے قتل کے مستحق ہو میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔

ہرمزان: لیکن آپ تو مجھے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ: تو جھوٹ کہتا ہے۔

انس بن مالکؓ: یہ سچ کہتا ہے' امیر المومنین! آپ اسے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ: انسؓ! تم کیا کہتے ہو؟ میں اس قسم کے غدار اور مسلمانوں کے قاتل کو امان کیسے دے سکتا ہوں۔ تم نے یہ مفہوم میرے کن الفاظ سے اخذ کیا ہے؟

انس بن مالکؓ: آپ نے اس سے کہا تھا کہ جب تک تم پانی نہ پی لو' تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور اس نے پانی پیا نہیں۔

احنفؓ بن قیس اور دیگر حاضرین نے بھی انسؓ کی تائید کی اور کہا کہ امیر المومنینؓ! آپ واقعی ہرمزآن کو امان دے چکے ہیں۔اس پر حضرت عمرؓ نے ہرمزآن پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور کہا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔میں ایک مسلمان کی خاطر تم سے دھوکا کھا رہا ہوں۔اور اسے رہا کر دیا۔

اس کے بعد ہرمزآن نے اسلام قبول کر لیا۔حضرت عمرؓ نے اس کا دو ہزار روپے سالانہ روزینہ مقرر کر دیا اور اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت فرما دی۔اس سے آپ ایران کے معاملات کے بارے میں اکثر مشورے لیا کرتے تھے۔

حیرت اندر حیرت

سفرِ حیات میں بعض مقامات ایسے بھی آ جاتے ہیں جہاں منطق ساتھ چھوڑ دیتی ہے' دلائل مفلوج ہو جاتے ہیں اور فکری کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ اور بکھر جاتی ہیں اور انسان کے سامنے وادیٔ حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔اگر مذکورہ صدر واقعہ اسی طرح ہوا تھا تو پھر یہ مقام ایسا ہی ہے۔

اس المیہ کے دو اہم کردار ہیں ــــ ہرمزان اور حضرت عمرؓ۔پہلے ہرمزان کو لیجئے۔یہ ایران کا ایک نہایت معزز' سربلند' صاحبِ شوکت وحشمت فرزند تھا۔اس ایران کا جس کی عظیم سلطنت کا خاتمہ ابھی ابھی عربوں کے ہاتھوں ہوا تھا' جس کی ہزاروں سال کی پرانی تہذیب' جس پر انہیں اس قدر فخر تھا' پامال ہو چکی تھی' جس کا شہنشاہ' اپنی جان بچانے کے لئے دربدر دھکے کھا رہا تھا۔ سوچئے کہ اس ایران کے باشندوں کے دل پر بالعموم' اور ان کے اس قدر صاحبِ عزت وسطوت اَبناءِ قوم کے جگر پر بالخصوص' ان ذلّت آمیز شکستوں کے زخم کس قدر گہرے ہوں گے اور عربوں کے خلاف ان کی آتشِ انتقام کی حدت کس قدر شدید! خود ہرمزآن ایک صوبہ کا نامور گورنر تھا اس کی ریاست چِھن گئی تھی' اس کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا تھا۔اسے پَے در پَے نہایت رُسواکن

شکستیں ہوئی تھیں اوراب وہ ان عربوں کے سامنے پا بجولاں کھڑا تھا جن کے ساتھ یہ (ایرانی) جنگ کرنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھا کرتے تھے۔ سوچئے کہ اس کے سینے میں غصے اور انتقام کے کیا کیا طوفان نہ اُٹھ رہے ہوں گے!

پھر اسے بھی فراموش نہ کیجئے کہ ایرانیوں کے متعلق عربوں کی حتمی رائے تھی کہ وہ ایک بڑی مکار قوم ہے جس سے محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضمن میں آپ اس خط کو ایک بار پھر سامنے لایئے جسے حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام لکھا تھا اور جو سابقہ باب میں درج کیا جا چکا ہے۔

دوسری طرف حضرت عمرؓ کو لیجئے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان جیسا بالغ نظر' دیدہ ور' دور اندیش' معاملہ فہم' ماہرِ نفسیات سیاست دان' تاریخ کی آنکھ نے کم دیکھا ہوگا۔ ان کی نگاہ کتنی دُور تک پہنچتی تھی' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے کہا کہ بات پوری کرو' ''مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے'' ___ یہ تھے حضرت عمرؓ۔

انہوں نے ہرمزانؔ کے قتل کا فیصلہ یونہی جذباتی طور پر نہیں کیا تھا۔ اس نے بار بار عہد شکنی کی تھی' قدم قدم پر دھوکا دیا تھا۔ متعدد مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔ آپ نے اس کے جرائم کی فہرست اس کے سامنے رکھ دی تھی اور اس کے بعد اس کے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔

اب یہ دیکھئے کہ اس فیصلہ کو بدلا کس طرح گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو امان نہیں دی تھی' اس کے جرائم کو معاف نہیں کر دیا تھا۔ اسے صرف ایک امر کی ضمانت دی تھی کہ وہ اطمینان سے پانی پی لے۔ اس نے الفاظ کے ہیر پھیر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک مکارانہ چال چلی۔ اگر دوسرے لوگ اس کے اس فریب میں آ گئے تھے' تو کم از کم حضرت عمرؓ سے تو اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کے فریب کا پردہ چاک کر دیتے' وہ جانتے تھے کہ ہرمزانؔ دھوکا دے رہا ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ میں ایک مسلمان کی وجہ سے دھوکا کھا رہا ہوں! عمرؓ اور یوں دھوکا کھا جائے!! اگر الفاظ کا ایسا ہی پاس تھا تو ہرمزان کو قید میں رکھنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد جب وہ پیاس سے تنگ آتا تو خود ہی پانی مانگتا اور اسے پی لیتا۔ جب وہ پانی پی چکتا تو اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جاتا اور اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہتا اور پانی نہ مانگتا تو شدتِ پیاس سے ہلاک ہو جاتا۔ حیرت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا بھی نہ کیا اور ایک زخم خوردہ سانپ کو دودھ دے کر پالتے رہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی کر دی' بلکہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی اور اس سے مشورے بھی لیتے رہے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ اس سانپ پالنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

خود حضرت عمرؓ کی شہادت' جو اسی ہرمزان کی سازش سے ہوئی!

تاریخِ انسانیت کا سب سے بڑا الم انگیز حادثہ!!

محرومئ آدم کی خونچکاں داستان!!!

اے کاش! حضرت عمرؓ کو اس کا احساس ہوتا کہ ان کی زندگی اسلام اور عالمِ انسانیت کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی تھی! اگر وہ اپنی طبعی موت مرتے اور اس طرح دس بیس برس اور زندہ رہتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا' انسان' شرف و مجد کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا ہوتا۔

سچ ہے کوئی جتنی بڑی شخصیت ہو' اس کی اجتہادی غلطی اتنے ہی زیادہ دُور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے۔

اور یہی ہیں وہ مقامات جہاں انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جانے کے سوا نہ کچھ کہہ سکتا ہے نہ کر سکتا۔ عام لوگ اسے نوشتۂ تقدیر کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیتے ہیں لیکن جس کی نگاہیں قرآن پر ہوں وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ خود حضرت عمرؓ نے نکتۂ تقدیر کی جو بصیرت افروز تشریح فرمائی تھی' اس کے پیشِ نظر وہ بھی اس حادثہ کو نوشتۂ تقدیر کہنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ تو راہِ صواب یہی ہے کہ کچھ بھی نہ کہا جائے اور ایک سرد آہ کھینچ کر آگے بڑھا جائے اور کہا جائے تو اتنا کہ یہ واقعہ اس طرح سرزد نہیں ہوا ہوگا۔

یزدگرد کی بیٹیوں کا قصہ

ہمارے ہاں ایک قصہ یہ بھی مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد' شاہنشاہِ فارس کی تین بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ انہیں عام لونڈیوں کی طرح سرِ بازار فروخت کر دیا جائے' اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خاندانِ شاہی کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہئے' ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ لگا لیا جائے اور انہیں' اس قیمت کے عوض' معزز اشخاص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے انہیں خود اپنی سپرد داری میں لے لیا' اور ان میں سے ایک حضرت امام حسینؓ کو' ایک محمد بنؓ ابی بکر کو' اور ایک عبدؓ اللہ بن عمر کو عنایت کر دی۔ جو لڑکی امام حسینؓ کو ملی' وہ ان کی زوجۂ محترمہ' شہر بانو' کے نام سے مشہور ہے۔

یہ قصہ بوجوہ ناقابلِ تسلیم ہے۔

(1) جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں' جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح حکم دے دیا تھا کہ انہیں فدیہ لے کر رہا کیا جائے گا یا احساناً۔ انہیں غلام اور لونڈیاں بنانا احکامِ خداوندی کے یکسر خلاف تھا' اس لئے ایسے تمام واقعات جن میں کہا گیا ہو کہ ان حضرات نے جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا تھا' غلط اور وضعی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خلافتِ صدیقی اور فاروقی میں جنگوں کا سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بناتے تو اس وقت تک عرب میں' ان غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد' خود عربوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہو جاتی۔ ان حضرات نے کسی کو نہ غلام بنایا نہ لونڈی۔ اس کے

برعکس، تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے تاکیدی ہدایات نافذ کی تھیں کہ جنگ کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ (تفصیل پہلے آ چکی ہے)۔

(2) ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت سعدؓ مدائن میں داخل ہوئے تو وہ شہر خالی تھا' اور یزدگرد' مع اپنے اہل و عیال کے' پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی مسلمان فوجیں جس مقام پر بھی پہنچیں' یزدگرد پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا' لہٰذا' مدائن یا اس کے بعد کی فتوحات کے ضمن میں یزدگرد کی لڑکیوں کے گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یزدگرد کے اہل و عیال میں سے کوئی گرفتار ہوا ہوگا تو اُس وقت جب وہ پَن چکی میں قتل ہوا ہے لیکن وہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ (30ھ) کا واقعہ ہے۔

(3) امام حسینؓ کی پیدائش 5ھ میں ہوئی اور مدائن کی فتح 16ھ میں۔ اس لحاظ سے اُس وقت اُن کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علیؓ نے انہیں اتنی چھوٹی سی عمر میں لونڈی عطا فرما دی ہو۔

(4) اور سب سے آخر میں یہ کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) یزدگرد 13ھ میں (جب حضرت عمرؓ نے اقتدار سنبھالا) تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ یا اٹھارہ سال کی تھی۔ مدائن کی فتح 16ھ میں ہوئی' اس وقت اس کی عمر زیادہ سے زیادہ انیس یا اکیس سال کی ہو سکتی ہے۔ کیا اس عمر کے لڑکے کے ہاں' تین بیٹیاں اتنی بڑی عمر کی ہو سکتی ہیں کہ وہ تمتّع کے قابل ہو سکیں!

آپ اس ایک قصہ سے اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری تاریخ میں کس کس قسم کے واقعات درج ہیں' اور وہ پھر کس طرح صدیوں سے بلا تحقیق صحیح تسلیم ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

معجزات

آپ قرآنِ کریم پر ایک نگاہ ڈالیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ مخالفین' حضور نبی اکرمؐ سے بار بار تقاضا کرتے تھے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھایئے' تب ہم ایمان لائیں گے لیکن قرآن' ہر بار ان کے اس مطالبہ کو جھٹک دیتا تھا۔ وہ ان سے کہتا تھا کہ معجزہ سے تمہاری مراد یہی ہے ناں کہ کوئی خارقِ عادت واقعہ ظہور میں آئے۔ یعنی ایسا واقعہ جو فطرت کے قانونِ علّت و معلول کے خلاف ہو۔ اگر معجزہ سے یہی مراد ہے تو یہ سارا سلسلۂ کائنات' ایک عظیم' زندہ معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لایا ہے اور کسی شے کا عدم (NOTHINGNESS) سے وجود میں آجانا' فطرت کے قانونِ علّت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے یکسر خلاف ہے۔

جب وہ اس پر بھی نہ مانتے تو آپؐ ان سے کہتے کہ میرا معجزہ یہ قرآن ہے۔ تم عرب ہو' تمہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز ہے۔ یہ قرآن' تمہاری زبان میں ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا کا کلام نہیں' انسان کا کلام ہے' تو تم سب مل کر' اس کی ایک

سورۃ کی مثل، تصنیف کر کے دکھاؤ۔ بات صاف ہو جائے گی۔ انہوں نے اس چیلنج کو بھی قبول نہ کیا لیکن اپنا مطالبہ دہراتے چلے گئے، تو آپؐ نے ان سے کہا کہ آؤ! میں تمہارے سامنے ایک ایسا "معجزہ" پیش کرتا ہوں جس سے اس بات کا حتمی طور پر فیصلہ ہو جائے گا کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا اور وہ "معجزہ" یہ ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ [10:16]

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اپنے دعویٰ نبوت سے پہلے، اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے، تم سوچو اور بتاؤ کہ کیا ایسی زندگی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی!

اور اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس شہادت کو سب نے سچا تسلیم کر لیا اور حضورؐ کا یہ وہ "معجزہ" ہے جو قیامت تک کے لئے زندہ و تابندہ ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی معجزہ یہ کہ آپؐ نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی، غربت کی حالت میں ہجرت کی لیکن اس کے چھ سات سال کے بعد، آپؐ کی سطوت و حشمت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ قیصر و کسریٰ کو پورے جلال کے ساتھ مخاطب کر کے تنبیہ فرماتے ہیں کہ تمہاری مملکت میں کاشتکاروں اور محنت کشوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں، اگر تم نے ان کا سدِ باب نہ کیا تو تم سے اس کا مؤاخذہ کیا جائے گا اور پھر ان سے سچ مچ مؤاخذہ کیا گیا۔

یہ تھے حضورؐ کے "معجزات"، جن کا اقرار ساری دنیا نے کیا۔

کشف و کرامات

حضورؐ کے بعد، آپؐ کے صحابہ کبارؓ کی طرف آیئے۔ ان میں سے بھی کسی نے نہ "روحانیت" کا دعویٰ کیا، نہ ان سے کشف و کرامات سرزد ہوئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس عہد کی زبان میں کشف و کرامات، الہام وغیرہ قسم کی اصطلاحات ہی نہیں ملتیں۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ [68:4] "بے شک آپؐ سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں"، حضورؐ کے اتباع میں یہی خصوصیت آپؐ کے دست پروردگان (صحابہ کبارؓ) کی تھی۔ ان کی سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور نمایاں "کرامت" تھی —— اور اس سے آگے یہ "کرامت" کہ انہوں نے دس سال کی قلیل ترین مدت میں، ایرانؔ اور روماؔ جیسی عظیم مملکتوں کا تختہ اُلٹ دیا اور ان کی جگہ ایک ایسی مملکت متشکل فرما دی جس میں امن و اطمینان کا یہ عالم تھا کہ (حضورؐ کے ارشاد کے مطابق) ایک عورت، زیور میں لدی پھندی، تنہا یمنؔ سے چل کر صحراؤں، جنگلوں، بیابانوں کو عبور کرتی شام تک پہنچ جاتی تھی اور اسے راستے میں نہ کسی قسم کا خوف ہوتا تھا نہ حزن۔ وہ مملکت جس میں رات کو کوئی فرد بھوکا نہیں سوتا تھا اور کسی بدّو کی بچی تک "دودھ میں پانی نہیں ملاتی تھی"۔ (تفصیل آگے چل کر آئے گی)۔

یہ تھیں ان حضرات کی ''کرامات'' جو تاریخ کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے منقوش ملتی ہیں۔ اور جو آج بھی اُسی طرح تحیر انگیز اور اثر آفریں ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، وہ حضرات زبانِ حال سے کہتے تھے کہ

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است زِما نگاہ طلب' کیمیا چہ می جوئی (اقبال)

بعد میں جب مسلمانوں میں تصوف نے بار پایا تو ان حضرات (صوفیاء) کو اپنے مسلک کی سند کے لئے صدرِ اوّل میں ''کشف و کرامات'' کی تلاش ہوئی ـــ ان کے ہاں کوئی اس قسم کی شے ہوتی تو ملتی۔ مگر جب مقصد اپنے دعویٰ کا اثبات ہو، تو ناموجود کو موجود کر دکھانا کونسا مشکل ہوتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی بھی ایک ''کرامت'' وضع کر ڈالی اور اسے تاریخ میں درج کر دیا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

یا ساریہ! الی الجبل

ایرانی مہمات کے سلسلہ میں، ایک مقام پر حضرت ساریہؓ بن زنیم ایک فوجی دستے کے کمانڈر تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کہ آپ نے دفعتہً پکار کر کہا ـــ یا ساریہ! الی الجبل ـــ ساریہ! پہاڑ کی طرف ہٹ جاؤ۔ لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آپ نے اچانک اور غیر متعلق طور پر یہ کیا کہہ دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد ساریہؓ کا قاصد فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ آیا تو لوگوں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ ایک دن ہم ایک مہم میں مصروف تھے اور محویت کا یہ عالم کہ ہماری نگاہ اِدھر اُدھر اُٹھ ہی نہیں رہی تھی کہ اتنے میں ہم نے حضرت عمرؓ کی یہ گرجدار آواز سنی کہ ـــ یا ساریہ! الی الجبل ـــ یہ سن کر ساریہؓ ہمیں فوراً پہاڑ کی اوٹ میں لے آئے۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ دشمن ہماری کمین میں تھا اور اگر ہم اس آواز پر اس طرف کو نہ ہو جاتے تو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے۔

یہ ہے وہ ''کرامت'' جسے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جسے اہلِ تصوف اس دعویٰ کے ثبوت میں بطورِ سند پیش کرتے ہیں کہ اہل اللہ کو غائب کا علم ہوتا ہے اور ان کی نگاہیں وہ کچھ دیکھتی ہیں، جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے اور ان کی آواز وہاں تک پہنچ سکتی ہے جہاں تک ہمارے تصور کی رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہ سند پیش کرتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر حضرات اولیاء کرام کے کشف و کرامات کی فلک بوس عمارات استوار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ہمارا قدامت پرست طبقہ اس روایت کی صحت پر وحیٔ منزّل کی طرح ایمان رکھتا ہے کیونکہ یہ ان کے مقتداؤں کے دعاوی کے لئے سند کا کام دیتی ہے۔ ہیکلؔ اس کے متعلق تذبذب میں ہے اور کہتا ہے کہ

> میں کوئی ایسی علمی توجیہہ نہیں پاتا جو مجھے اس روایت پر مطمئن کر دے۔ اس لئے کہ وحی کا سلسلہ رسولؐ اللہ کی وفات پر ختم ہو گیا تھا اور ''لاسلکی'' پیغام رسانی (WIRELESS) نہ صرف یہ کہ اُس زمانے میں نامعروف تھی بلکہ اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ پھر یہ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات ''انتقالِ افکار'' (TELEPATHY)

کے ذریعے پہنچی تھی اور حضرت عمرؓ کی روحانی کیفیت اس رات ساریہؓ کے نفس پر طاری ہوگئی تھی جس کے زیرِ اثر وہ امیر المومنین کا حکم اس طرح بجالا رہے تھے، جس طرح عملِ تنویم (HYPNOTISM) کا معمول اپنے عامل کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔

لیکن ہمیں اس مخمصہ میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ وحی کے سوا (جس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگیا) علمِ غائب کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے نہ حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھے میدانِ کارزار کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے، نہ ایسی ہدایت ان تک پہنچا سکتے تھے۔

اور اس کے وضعی ہونے کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جو (حضرت) عمرؓ ہزار ہا میل کے فاصلے پر میدان کارزار کو اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکتے تھے وہ اپنے اُس قاتل (فیروز ابولولو) کو کیوں نہ دیکھ سکے جو اُن کے بالمقابل اوٹ میں کھڑا تھا اور جس نے وہاں سے نکل کر، دندناتے ہوئے، خنجر کے وار سے انہیں شہید کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی قوتِ ایمانی سے محروم اور زورِ بازو سے مجبور ہو جاتی ہے تو وہ اس قسم کے افسانوں میں جھوٹا اطمینان تلاش کرنے لگ جاتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اِک زندہ کرامات

ان اعجوبہ پسند ذہنوں کو "یا ساریہؓ! الی الجبل" کی آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن حضرت عمرؓ کا "**لا غالب الاھو**" کا وہ تہلکہ انگیز نعرہ سنائی نہیں دیتا جو آج تک اقصائے عالم میں غلغلہ انداز ہے۔ انہیں کون بتائے کہ حضرت عمرؓ کی "کرامت" وہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت تھی جو دین کے تمکن اور حق کے غلبہ کے لئے قوتِ بازو سے حاصل کی گئی تھی۔ ان کے "معجزات" قرآن اور شمشیر کے پیدا کردہ تھے، درود اور وظائف کے نہیں۔

عروسِ نیل کی کہانی

اسی قسم کا ایک اور افسانہ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ــــ بلکہ وہ تو اس قدر لغو ہے کہ اسے درخورِ اعتنا قرار دینے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن چونکہ اس نے بھی تاریخ میں خاصی شہرت حاصل کر رکھی ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ "عروسِ نیل" کی کہانی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کے والی مقرر ہوئے تو سربرآوردہ قبطیوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا اور کہا کہ ہماری زندگی کا دارومدار دریائے نیل کے پانی پر ہے۔ اس میں از خود روانی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ہم کرتے یہ ہیں کہ سال میں ایک بار، ایک دوشیزہ کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ماں باپ کو

رضا مند کر کے اُسے بہترین لباس پہناتے اور قیمتی زیورات سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسے دریا میں ڈال دیتے ہیں اور وہ بہنے لگ جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا کہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس وحشت و بربریت کی رسم کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس پر قبطیوں نے کہا کہ پھر ہم ترکِ وطن پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ اس کے بغیر دریا میں روانی پیدا نہیں ہوگی اور ہم بھوکے مر جائیں گے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے یہ سارا ماجرا حضرت عمرؓ کو لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے انہیں خط لکھا اور اس کے ساتھ ایک پُرزہ منسلک کیا اور کہا کہ اس پُرزہ کو دریائے نیل میں ڈال دینا۔ انہوں نے اس پُرزے کو کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

اللہ کے بندے امیر المومنین عمرؓ کی طرف سے دریائے نیل کے نام۔

امابعد! اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو نہ بہہ لیکن اگر تجھ میں روانی پیدا کرنے والا خدائے واحد و قہار ہے تو ہم اس خدا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ تجھ میں روانی پیدا کر دے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے لوگوں کو اس پُرزے کے مضمون سے آگاہ کیا اور رسم سے ایک دن (یعنی عیدِ صلیب سے ایک دن) پہلے اُسے دریا میں ڈال دیا۔ جب وہ لوگ دوسری صبح اُٹھے تو دریا کا پاٹ سولہ ہاتھ ہو گیا تھا۔ اس سے اس قبیح رسم کا خاتمہ ہو گیا۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے اس سے گنڈے تعویذ کے جواز کی سند تو حاصل کر لی لیکن یہ نہ سوچا کہ اس سے اسلام' اسلام کے خدا' اور اس خدا کے عبد' امیر المومنین حضرت عمرؓ کے متعلق کس قسم کا توہّم پرستانہ تصور قائم ہوتا ہے۔ اگر حضرت عمرؓ کے پُرزہ سے دریائے نیل میں روانی آ سکتی تھی تو ان کے عہد میں' عرب میں خشک سالی کی وجہ سے جو عالمگیر قحط پڑا تھا اور جس سے بڑی تباہی آ گئی تھی' آپ نے بادلوں کی طرف کوئی پُرزہ کیوں نہ بھیج دیا کہ بارش ہو جاتی اور قحط کی بلا ٹل جاتی۔ یاد رکھئے! یہ سب افسانے خانقاہوں اور درگاہوں کے طلسم خانوں کی تخلیق ہیں۔

جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے' مغربی محققین نے صاف کہہ دیا ہے کہ مصر میں (رومن امپائر کے زمانے میں) اس قسم کی کوئی رسم ہی رائج نہیں تھی۔

(2)

رُومیوں کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس دَور میں، دو ہی سلطنتیں تھیں جن کی طرف سے مملکتِ اسلامیہ کو خطرہ تھا ـــــ ایران کی سلطنت اور بازنطینی (رُومیوں) کی سلطنت۔ رُومیوں کی طرف سے خطرہ خود رسول اللہؐ کے زمانے میں سامنے آ گیا تھا اور ان کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانۂ خلافت میں بھی جاری رہا۔ ایرانیوں کی طرف سے خطرہ کی ابتداء عہدِ صدیقی میں ہوئی۔

پس منظر

اسلامی جیوش ان دونوں سلطنتوں کے ساتھ مصروفِ معرکہ آرائی تھے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات ہوگئی۔ عہدِ فاروقی میں ان تصادمات کا سلسلہ آگے بڑھا لیکن چونکہ (ان میں سے) ایران کے خلاف معرکے زیادہ شدت اختیار کر گئے تھے اس لئے ہم نے اس داستان کو مسلسل بیان کرنا مناسب سمجھا تا آنکہ ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ایران مکمل طور پر اسلامی مملکت کے قبضہ میں آ گیا۔ اب، جبکہ ہم اُدھر سے فارغ ہو گئے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی توجہ کا رُخ رُومیوں کے خلاف معارک آرائی کی طرف موڑیں۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند الفاظ میں دہرا دیں کہ نبرد آزمائیوں کا یہ سلسلہ عہدِ صدیقی میں کس مقام تک پہنچا تھا۔

(1) رسول اللہؐ کے عہدِ مبارک میں، رومیوں کے خلاف پہلا معرکہ مؤتہ کے مقام پر ہوا تھا۔ وہاں مسلمانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا حُسنِ تدبّر اپنی افواج کو بحفاظت نکال لانے میں کامیاب ہوا تھا۔

(2) پھر حضورؐ نے خود لشکر کُشائی کی لیکن تبوک کے مقام پر جا کر معلوم ہوا کہ رومیوں کی طرف سے حملے کی جو خبریں پھیلی تھیں وہ غلط تھیں۔ اس لے یہ لشکر بلا تصادم واپس آ گیا۔

(3) اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں حضورؐ نے رومیوں کی روک تھام کے لئے ایک لشکرِ جرار حضرت اسامہ بن زیدؓ کی زیرِ سرکردگی مرتب فرمایا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔

(4) حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی لشکر کو روانہ کر دیا۔ وہاں کوئی خاص معرکہ تو نہیں ہوا البتہ مختلف مقامات پر جو جھڑپیں ہوئیں ان میں اسلامی لشکر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

(5) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پھر ایک عظیم لشکر رومیوں کے خلاف بھیجا اس نے یرموک کے مقام پر رومیوں کو شکست فاش دی۔

(6) اور آخرالامر دمشق بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات پا گئے۔

اب آیئے عہدِ فاروقی کی طرف! واضح رہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام کی طرف چار لشکر روانہ فرمائے تھے جن کے سپہ سالار حضرت عمرو بن عاصؓ، شرجیل بن حسنہؓ، خالد بن ولیدؓ اور ابوعبیدہ ابن الجراحؓ تھے اور طے یہ پایا تھا کہ ان لشکروں کی بہ ہیئتِ مجموعی کمان حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ میں ہوگی (واضح رہے کہ یہ ابوعبیدہؓ، اُن ابوعبیدہؓ ثقفی سے مختلف ہیں جو معرکۂ جسر میں شہید ہو گئے تھے۔ یہ ابوعبیدہؓ ابن الجراح مشہور صحابی ہیں)۔

حمص کی فتح ــــ 15ھ بمطابق 635ء

فتحِ دمشق کے بعد، فحل اور بیسان کے مقامات پر رومیوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، جن میں انہیں شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا ــــ اسی سال حمص کا معرکہ پیش آیا جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

حمص، شام کے اضلاع میں سب سے بڑا ضلع تھا اور بڑی شہرت کا مالک لیکن یہ بھی بڑی آسانی سے فتح ہو گیا۔ اس کے بعد چند ایک چھوٹے چھوٹے مقامات پر مقابلہ ہوا، اور ہر مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یوں، حماۃ، شیرز، لاذقیہ، سلمیہ، قنسرین، اور حلب بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ یہ کامیابیاں حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کے حُسنِ تدبّر اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی اس شمشیر خارہ شگاف کے تصدق حاصل ہوئیں جسے رسولؐ اللہ نے سیف اللہ کہہ کر پکارا تھا۔ ان کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے دل میں حضرت خالدؓ کی بڑی قدر و قیمت تھی ــــ اور ہونی بھی چاہئے تھی (یہ 15ھ مطابق 635ء کے واقعات ہیں)۔

انطاکیہ کا معرکہ ــــ 15ھ بمطابق 635ء

مسلمانوں کی فتوحات کا راز

ان فتوحات کے بعد انطاکیہ کی باری آئی، جو قیصر کا ایشیائی دارالسلطنت تھا اور جہاں تمام شکست خوردہ عیسائی بھاگ بھاگ کر جمع ہو گئے تھے۔ اس مقام پر ہرقل نے تمام بڑے بڑے مدبر اور دانشور عیسائی معززین کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ مسلمانوں کی اس قدر محیر العقول کامرانیوں اور عیسائیوں کی پے در پے شکستوں کی وجہ کیا ہے؟ ایک نہایت جہاندیدہ، پختہ کار، عمر رسیدہ، مدبر نے کہا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ:

> ان لوگوں کے اخلاق ہم سے بہت بلند ہیں۔ وہ دن کو روزے رکھ کر مصروفِ جہاد رہتے ہیں اور راتوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے خواہ وہ ان کا مفتوح و مغلوب ہی کیوں نہ ہو۔ آپس میں برادرانہ مساوات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، ہمارا حال یہ ہے کہ شرابیں پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں، قول و قرار کی پابندی نہیں کرتے۔ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش اور استقلال ہوتا ہے اور ہمارا جو کام بھی

ہو، ہمت اور عزم سے خالی ہوتا ہے۔

یہ وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف دشمن بھی کرتے تھے۔ مسلمانوں کی ان محیّر العقول کامیابیوں کا راز ان کی بلندیٔ اخلاق اور پاکیزگیٔ سیرت میں تھا۔ یہ سب نتیجہ تھا اقدارِ خداوندی کی پابندی کا۔

ہرقل، شام سے فرار ہو جانا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ چاروں طرف سے شکست خوردہ عیسائی پناہ لینے کے لئے اس کی طرف اُمنڈے چلے آ رہے ہیں تو اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے بڑے عظیم پیمانے پر تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن شاید اسے اس تصادم کا بھی انجام معلوم تھا اس لئے وہ خود انطاکیہ کے بجائے رہاؔ کے مقام پر بیٹھا رہا جو اس کے نزدیک یا تو انطاکیہ سے زیادہ محفوظ تھا اور یا وہاں سے بآسانی قسطنطنیہ کی طرف بھاگا جا سکتا تھا۔

جیوشِ اسلامیہ نے انطاکیہ کا محاصرہ کیا تو عیسائیوں نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور حضرت ابوعبیدہؓ نے انہیں معاہدۂ امن لکھ دیا۔

لیکن انہوں نے چند دنوں کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا ـــــ یہ حرکت صرف انطاکیہ تک محدود نہیں تھی؛ عیسائیوں نے اکثر و بیشتر مقامات پر ایسا ہی کیا تھا اور ان کی اس عادتِ مستمرہ کے پیشِ نظر مسلمانوں کو سوچنا پڑا تھا کہ ان فتنوں کا حتمی علاج کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عیسائیوں کے خلاف فیصلہ کُن جنگ کا تہیہ کیا۔ ادھر عیسائیوں نے بھی یہ سوچ لیا کہ اب ایسا وقت آ پہنچا ہے کہ یا تو عربوں کو شام کا علاقہ خالی کرنا پڑے گا اور یا ہم ہمیشہ کے لئے اسے خیر باد کہہ دیں گے؛ چنانچہ انہوں نے مختلف مقامات سے فوجوں کو جمع کیا۔ دوسری طرف حضرت ابوعبیدہؓ نے بھی اپنی مختلف مقامات میں بکھری ہوئی، فوجوں کو اس مرکز پر جمع ہو جانے کے احکام بھیج دیئے ـــــ یہی وہ ضرورت تھی جس کے پیشِ نظر اسلامی فوجوں کو حمص چھوڑنا پڑا تھا اور جزیہ کی جو رقم ان سے لی تھی اسے واپس کر دیا تھا (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)۔ حقیقت یہ ہے مسلمانوں نے جزیہ کی رقم صرف اہلِ حمص کو واپس نہیں کی تھی بلکہ جس جس مقام کو بھی اسلامی فوجوں نے چھوڑا تھا، جزیہ کی رقم واپس کر دی تھی۔

ہرقل کا فرار، شام کی مکمل فتح ـــــ 15ھ بمطابق 635ء

یہ فیصلہ کن جنگ، یرمُوک کے قریب ہوئی۔ جہاں عہدِ صدیقی میں بھی رومیوں کو شکست کھانی پڑی تھی اور یہاں پھر ایسی شکست کھائی کہ ہرقل نے شام کو آخری سلام کہہ کر، قسطنطنیہ میں جا کر پناہ لی۔ اب شام مکمل طور پر فتح ہو چکا تھا۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے شام کی طرف چار لشکر، چار مختلف سپہ سالاروں کی زیرِ سرکردگی بھیجے تھے۔ ان میں سے حضرت عمرو بن عاصؓ کے سپرد فلسطین کا علاقہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس دوران میں، اس علاقہ کے چند ایک

مقامات کو فتح بھی کر لیا تھا لیکن وہاں ہنوز کوئی فیصلہ کُن معرکہ پیش نہیں آیا تھا۔ فلسطین کا مرکزی مقام بیت المقدس تھا۔ بیت المقدس کی اہمیت قسطنطنیہ سے کم نہیں تھی، بلکہ ایک نقطۂ نگاہ سے اس سے بھی زیادہ تھی۔ قسطنطنیہ رومیوں (عیسائیوں) کا قومی یا دنیاوی مرکز تھا لیکن بیت المقدس ان کا مذہبی اور رُوحانی نشیمن، جس سے کروڑوں عیسائیوں کے قلوب وابستہ تھے۔ اس کی عظمت وعقیدت ان کے دل کی گہرائیوں میں اس حد تک پیوست تھی کہ وہ اس کی حفاظت کی خاطر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو اپنی انتہائی خوش بختی سمجھتے تھے

بیت المقدس

لیکن جذباتی عقیدت مندیاں بھی اسی وقت خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں جب قوم کی ہمتیں جوان اور عزم پُرشباب ہوں۔ شکست خوردہ، ہزیمت گزیدہ، دوں ہمت قوم کے لئے یہ بھی کوئی محکم سہارا نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو پے در پے کامیابیاں ہو رہی ہیں، تو وہ بجائے اس کے کہ بیت المقدس کی حفاظت کے لئے مر مٹنے پر آمادہ ہو جاتے، انہوں نے وہاں کے تبرکات کو قسطنطنیہ منتقل کر دیا لیکن اس کے باوجود، اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ ہرقل نے وہاں کثیر تعداد میں فوجیں جمع کر دیں جن کی قیادت روم کا سب سے بڑا سپہ سالار اطربون کر رہا تھا اور عیسائی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے وہاں کا اُسقفِ اعظم صفرینوس، معبد میں موجود تھا۔ فتحِ بیت المقدس کے متعلق ہمارے ہاں بہت سی روایات مذکور ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کیا تو اطربون وہاں سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا اور صفرینوس نے حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم بلامقابلہ اطاعت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ معاہدہ صلح پر، آپ کا امیر المومنین خود یہاں آ کر دستخط کرے۔ اس مقصد کے لئے حضرت عمرؓ مدینہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔

فتح بَیتُ المقدس ــــ 16ھ بمطابق 637ء

لیکن یہ روایات چنداں قابلِ اعتماد نہیں۔ عیسائی رومی، بیت المقدس جیسے مقام کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ روایات وہی قابلِ اعتماد ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اہلِ بیت المقدس نے بڑی شدت سے مقابلہ کیا اور جب محاصرہ طول کھینچ گیا اور کامیابی مشکل نظر آئی، تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے مدینہ سے کمک طلب کی۔ معاملہ کی اہمیت اور مقابلہ کی سنگینی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے یہی مناسب سمجھا کہ خود کمک لے کر بیت المقدس جائیں۔ چنانچہ وہ اس طرح تشریف لائے اور جابیہ کے مقام پر، جو صحرائے شام اور سرزمینِ اُردن کے اتصال پر واقع ہے، خیمہ زن ہو گئے۔ یہاں بیٹھ کر حضرت عمرؓ نے دیگر سپہ سالاروں کے مشورہ سے، جنگ کا نیا نقشہ مرتب کیا۔ جب اہلِ بیت المقدس کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ممکن نہیں۔ چنانچہ اطربون تو کچھ فوج ہمراہ لے کر چپکے سے مصر کی طرف کھسک گیا اور بوڑھے

پادری (صفرینوس) نے اسی میں راہِ نجات دیکھی کہ مسلمانوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا جائے۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ حضرت عمرؓ جابیہ میں فروکش ہیں' اس لئے اس نے (اپنی اہمیت اور عزتِ نفس کے خیال سے) یہ شرط لگا دی کہ امیر المومنین بہ نفسِ نفیس' معاہدہ کے لئے تشریف لائیں۔ حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس جس کی تفصیل روایات میں شرح و بسط سے مذکور ہے' جابیہ سے بیت المقدس کا سفر تھا۔

حضرت عمرؓ کا سفرِ بیت المقدس

آیئے' اس ''شاہانہ جلوس'' کی ایک جھلک ہم بھی دیکھ لیں کہ اس طرح کے فردوس بداماں مناظر کب کب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کتبِ تاریخ میں اس سفر کی مختلف تفاصیل مذکور ہیں۔ ان کا ملخص درج ذیل ہے:

بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا یہ سربراہ فاتحِ ایران و روم کی حیثیت سے عازمِ سفر ہوا تو بایں نمط ایک اونٹنی پر سوار تھا جس پر ایک اونی کمبل پڑا تھا۔ یہ کمبل بحالتِ قیام بستر کا کام بھی دیتا تھا۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں بے رکاب کجاوے میں ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہے تھے۔ خرجی کھال کی تھی' جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اسے ضرورت کے وقت تکیہ بنا لیا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر دو تھیلے لٹک رہے تھے' جن میں سے ایک میں سَتّو تھے اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کا مشکیزہ تھا۔ رفقاء کی جماعت ساتھ تھی۔ آپ ہر روز صبح اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھتے' اپنا زادِ راہ دسترخوان پر رکھ دیتے جسے سب مل کر کھا لیتے۔ راستے میں چلتے بھی جاتے اور اپنے ہمسفروں کو دین کی تعلیم بھی دیتے جاتے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک ایک اونٹ دو دو سواروں کے حصے میں آیا تھا اور آپ کا زمیل آپ کا غلام (ملازم) تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ ایک منزل آپ سوار ہوتے اور وہ غلام مہار پکڑتا اور دوسری منزل وہ (غلام) سوار ہوتا' اور آپ مہار پکڑتے۔ ایک جگہ راستے میں پانی آ گیا تو آپ اونٹنی سے اُترے' موزے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے' اونٹنی کو ساتھ لے کر پانی میں اُتر گئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے دیکھا تو کہا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جس کی اہلِ زمین کے نزدیک بڑی عظمت ہے۔ آپ نے یہ کیا اور وہ کیا ہے۔ آپ نے سنا تو فرمایا ''ابوعبیدہ! یہ بات تمہارے کہنے کی نہیں تھی۔ ہم سب سے زیادہ غریب' سب سے زیادہ حقیر اور سب سے زیادہ قلیل تھے اللہ نے ہمیں اسلام سے عزت دی۔ یہی ہمارے لئے وجہِ شرف ہونا چاہئے۔ اگر ہم نے اللہ کے سوا کسی اور سے عزت طلب کی تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا''۔

ہماری عزت اسلام کا صدقہ ہے

بیت المقدس سے کچھ فاصلہ پر تھے تو سواروں کا وہ دستہ آ پہنچا جسے حضرت ابوعبیدہؓ نے آپ کے استقبال کے لئے بھیجا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ آپ نمدے کا کُرتہ پہنے ہوئے تھے جس میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے اور ان میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ ایک نئے ملک میں' اجنبی قوم کے ہاں' فاتح کی حیثیت سے

جا رہے ہیں بہتر ہو گا کہ آپ اونٹنی کے بجائے اس تُرکی گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور وہ لباس پہن لیں جسے حضرت ابوعبیدہؓ نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔ آپ نے ان کا مشورہ قبول فرما لیا اور وہ لباسِ فاخرہ پہن کر تُرکی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ چار ہی قدم چلے ہوں گے تو گھوڑے سے اُتر گئے اور اپنے رفقاء سے کہا کہ "عزیزانِ من! تم میری اس لغزش سے درگزر کرو اللہ قیامت میں تمہاری لغزش سے درگزر کرے گا۔ جس نخوت اور تکبر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ یقیناً تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتے"۔ اس کے بعد وہ پوشاک اُتار کر پھر وہی پیوند لگے کپڑے پہن لئے۔

آگے گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت یزید بن سفیانؓ آپ کے استقبال کے لئے آئے۔ انہوں نے ریشمی کُرتے پہن رکھے تھے۔ آپ نے دیکھا تو سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ 'تم لوگ اتنی جلدی بدل گئے' تم نے دو ہی برس میں اس قسم کی تن آسانی اختیار کر لی۔ اگر تمہارا یہی طرزِ عمل رہا تو' خدا کی قسم' خدا تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تمہاری حکومت اسے دے دے گا کہ حریر و اطلس پہننے والی قومیں حکومت کی اہل نہیں رہتیں۔ انہوں نے معذرت چاہی اور عرض کیا کہ امیر المومنین! ہم نے یہ کُرتے' اِس قوم کی خاطر اوپر سے پہن رکھے ہیں۔ دیکھ لیجئے' ان کے نیچے وہی ہتھیار موجود ہیں۔ اس پر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

لیجئے! یہ "شاہانہ جلوس"' داخلِ بیت المقدس ہو گیا۔ اُس قوم کا سردار' جلوس کے استقبال کے لئے آیا تو آپ نے اُس سے فرمایا:

میرا کُرتہ سفر کی وجہ سے پھٹ گیا ہے۔ اسے دھو بھی دیجئے اور سی بھی لایئے اور اتنی مدت کے لئے مجھے کوئی اور کُرتہ دے دیجئے۔ اس نے وہ کُرتہ بھی دھو اور سی دیا اور ایک اور کُرتہ بھی تیار کر لیا اور کہا کہ اسے میری طرف سے قبول فرما لیجئے۔ آپ نے اپنا کُرتہ پہن لیا اور اس کا کُرتہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا کُرتہ اس سے زیادہ پسینہ جذب کرتا ہے۔

ساری عزت اسلام سے ہے

اس سردار (پادری) نے بھی یہ کہا تھا کہ آپ شہر میں داخل ہو رہے ہیں' ذرا اچھے کپڑے پہن لیجئے اور گھوڑے پر سوار ہو جایئے' اس سے رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت بڑھے گی۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام سے ہے' ان اضافی چیزوں سے نہیں۔ اس لئے ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔

سچ ہے' جب تک مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے وجۂ عزو شرف سمجھا' وہ آسمانِ عظمت و وقار کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو ان بلندیوں سے' ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح گرے اور فضائے زمانہ کی گردش میں پس کر راکھ ہو گئے۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بامِ بلندے

آپ نے بیت المقدس کے اُسقفِ اعظم، صفرینوس کو معاہدہ لکھ کر دیا ـــــ اس معاہدہ کا متن ہم پہلے درج کر چکے ہیں اس لئے اسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد، آپ گئی رات تک بحضور ربّ العزت سجدہ ہائے شکرانہ ادا کرتے رہے ـــــ یہ مقام تھا بھی اِنتہائے تشکّر و اِمتنان کا۔ دنیائے یہود و نصاریٰ کا دینی اور دنیاوی مرکز، سلطنتِ روما کا قلبِ حساس، اور حضرت عمرؓ کی مٹھی میں!

جاں نذر دینی بُھول گیا اضطراب میں

صبح ہوئی تو صفرینوس حاضر خدمت ہوا کہ آپ کو شہر کے آثار اور مقاماتِ مقدسّہ کی سیر کرائے۔ بیت المقدس میں زیارت گاہوں کی کیا کمی تھی! یہ شہر، ہزار ہا سال سے یہودی تہذیب وثقافت کا محور اور حکومت وسطوت کا مرکز رہا تھا۔ اس کے بعد، عیسائیوں کے قلب ونگاہ کا نقطۂ تقدیس و احترام بھی یہی شہر تھا لیکن چونکہ یہ شہر اب صدیوں سے عیسائیوں کے قبضے میں چلا آرہا تھا، جنہیں یہودیوں سے سخت عداوت اور نفرت تھی، اس لئے وہاں اِن کی (یہودیوں کی) زیارت گاہوں کے صرف کھنڈر اور نام باقی رہ گئے تھے۔ مثلاً صخرۂ یعقوب'' کی یہ حالت تھی کہ رومی وہاں کوڑا کرکٹ لا لا کر ڈالا کرتے تھے۔ آپ نے گندگی کا یہ ڈھیر دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں تم بھی کرو۔ یہ کہہ کر آپ جُھکے اور کوڑے کرکٹ کو اٹھا اٹھا کر دور پھینکنے لگے۔ آپ کے رفقاء نے بھی یہی کچھ کیا اور اس جگہ کو غلاظت سے پاک اور صاف کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے صخرہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا کہ عیسائی پھر ایسا کچھ نہ کرنے پائیں۔

آپ، صفرینوس کی معیت میں ''کلیسائے قیامت'' میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ بیشک وہیں نماز ادا کرلیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ

> اگر میں نے آج یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمانوں کے ہاں اس کی طرح پڑ جائے گی اور اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے گرجاؤں کو مسجدیں بنالیں۔ میں ایسی طرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

اسی طرح جب آپ کلیسائے قسطنطین کے دروازے پر تھے تو نماز کا وقت آ گیا اور عیسائیوں نے آپ کے نماز پڑھنے کے لئے بساط بچھائی، تو آپ نے پھر معذرت چاہی اور ہیکلِ سلیمانی کے کھنڈروں کے قریب ایک کھلی جگہ نماز پڑھی۔

اس مقام پر آپ ذرا آواز دیجئے اُن غیر مُسلم معترضین کو، جو کہا کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کو ڈھا کر مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہیں آواز دیجئے اور کہئے کہ ذرا پوچھئے بیت المقدس کے یہودیوں اور عیسائیوں سے کہ کیا اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہے؟ ایک سربراہِ مملکت، فاتح کی حیثیت سے، بیت المقدس داخل ہوتا ہے، نماز کے وقت خود عیسائی اسقف اور بطریق کہتے ہیں کہ آپ گرجا ہی میں نماز ادا کر لیجئے لیکن وہ یہ کہہ کر کہ مبادا بعد میں آنے والے، میرے اس عمل کو سند قرار دے کر، ان گرجوں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیں، وہاں نماز پڑھنے سے انکار کر دیتا ہے۔

آپ نے اتنا ہی نہیں کیا' بلکہ مزید احتیاط کے طور پر' بطریق کو ایک عہد نامہ لکھ دیا جس میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ گرجے ہمیشہ عیسائیوں کی تحویل میں رہیں گے اور مسلمان زائرین میں سے' ایک وقت میں صرف ایک' ان کے اندر جا سکے گا۔

کیا تاریخ' اس قسم کی مذہبی رواداری کی کوئی اور مثال بھی پیش کر سکتی ہے؟

یہاں ایک لطیف نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان زیارت گاہوں میں' کعب احبار بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے گرجا سے باہر آ کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو کعب سے پوچھا کہ نماز کہاں پڑھی جائے' انہوں نے کہا کہ آپ صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں سارا بیت المقدس آپ کے سامنے ہوگا۔ آپ نے ان سے کہا کہ ''تم میں ابھی تک یہودیت کا اثر باقی ہے جو یہ مشورہ دے رہے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ تم نے صخرہ کے قریب آ کر جوتی اتار دی تھی'' —— اور آپ نے کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی کہ وہی مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

مسلمانوں کا قبلہ

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عمرؓ نے ''صخرۂ یعقوب'' پر سے کوڑا کرکٹ اپنے ہاتھوں سے صاف کیا تھا کہ ایک ایسے مقام کی' جو یہودیوں کے نزدیک واجب الاحترام تھا' بے حرمتی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن نماز کے وقت اپنا رُخ بیت المقدس کی طرف نہیں کیا بلکہ کعبہ کی طرف کیا' کہ خدا نے اسی کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ تیرہ سال مکہ میں اور ابتدائی دو سال مدینہ میں' بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس کے بعد تحویلِ قبلہ کا حکم آیا تو آپؐ نے کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی' (قرآنِ کریم کی روشنی میں) صحیح نہیں۔ اسلام میں' کعبہ کو پہلے دن ہی سے مرکزِ ملّت (قبلہ) قرار دیا گیا تھا۔ (قبلہ کی اہمیت کے متعلق میری کتاب —— ''معراجِ انسانیت'' دیکھئے)۔

مذہب پرست نَو مسلم

دوسری بات یہ کہ مذہبی عقائد اس قدر گراں نشین اور اعماقِ قلب میں پیوست ہوتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے پر بھی وہ' خون میں حلول شدہ جراثیم کی طرح ساتھ ہی آ جاتے ہیں۔ انہیں الگ کرنے کے لئے مسلسل تعلیم و تربیت اور فکری جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسولؐ اللہ کے زمانے میں آپؐ کے گردو پیش قریشِ مکہ تھے نیز یہودی' نصرانی اور مجوسی۔ اوّل الذکر کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں تھے۔ ان کی اصنام پرستی اور دیگر رسومات کی حیثیت قومی شعار کی سی تھی؛ چنانچہ جب وہ اسلام لائے ہیں تو کوئی خاص عقائد سینوں میں مستور نہیں لائے۔ اسی لئے وہ دینِ خالص کے پیرو ہو گئے۔ لیکن یہودی' نصاریٰ' مجوس میں سے خال خال ہی کسی نے اسلام قبول کیا اور جنہوں نے اسلام قبول کیا وہ بھی اپنے قدیم معتقدات و نظریات کو ساتھ لے

کر آئے۔ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ بعد میں جتنی قومیں شاباش مسلمان ہو گئیں' ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی مناسب انتظام نہ ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نام کو تو مسلمان ہو گئیں لیکن ان کے عقائد و تصورات اسی قدیم مذہب کے رہے' اور پھر یہی معتقدات و نظریات عین اسلام بن گئے۔ ہمارا مروجہ اسلام انہی نَو مسلموں کا دَرآستیں پوشیدہ و تراشیدہ مذہب ہے۔ یہ موضوع بڑا تحقیق طلب اور گہرے مطالعہ کا محتاج ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک ''اسلام کی تاریخ'' لکھی ہی نہیں گئی —— ہماری تاریخ ''مسلمانوں کی تاریخ'' ہے اور ان دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے۔

اِسلام کی تاریخ

اِسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلام کیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے عطا فرمایا تھا' اور وہ رفتہ رفتہ' اس اسلام میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو صدیوں سے مسلمانوں میں متوارث چلا آ رہا ہے اور جو آج تمام مسلم ممالک میں رائج ہے۔ مجھے اس کی اہمیت کا خاص طور پر احساس ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ خود میری ''آپ بیتی'' ہے۔ مجھے اگر فرصت میسر آ گئی اور حالات مساعد رہے تو میرا ارادہ ہے کہ اسلام کی اس قسم کی تاریخ مرتب کر دوں۔ میں چونکہ ان تمام وادیوں سے ایک ''مسلمانِ نامسلمانے[1] نے'' کی طرح گزرا ہوں' اور اس کے بعد' ذاتی مطالعہ اور تحقیق کے بعد' قرآنِ کریم کی راہنمائی میں (یوں کہیئے کہ) از سرِ نو ''مسلمان'' ہوا ہوں' اس لئے اس قسم کی تاریخ کی تدوین میرے لئے چنداں دشوار بھی نہیں ہو گی لیکن اس کے لئے حالات کی مساعدت اور قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ مجھے ابھی لکھنا ہے' اس کی تکمیل شرط ہے۔

دکھاؤں گا تماشہ' دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دِل' اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا (غالب)

سرِدست' میں نے اتنا ہی کیا ہے کہ اس کتاب کے آخری باب میں ان راستوں کی نشاندہی کر دی ہے جن سے گزر کر' حقیقی اسلام' مروجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کعبؔ احبار کا اِسلام

ہاں تو' سلسلہ کلام کعبؔ الاحبار سے چلا تھا۔ یہ یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا کہ اور نبی اکرمؐ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا لیکن اسلام نہیں لایا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں اسلام کا اعلان اس وقت کروں گا جب میں دیکھ لوں گا کہ اس سے وہ تمام علامات ظہور میں آ گئی ہیں جو دینِ حقّہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں مذکور ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اس نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ بیت المقدس کے سفر میں ویسے ہی آپ کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہاں' قبۃ

1۔ چہ گوئمت ز مسلمانِ نامسلمانے جز ایں کہ پُورِ خلیل است و آذری داند (اقبالؒ)

الصخرہ کے سلسلہ میں جو کچھ اس نے کیا اور کہا اس سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ یہودیت کے اثرات ابھی تک تمہارے دل سے نہیں گئے۔ "گوسالہ کی محبت تمہارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے"۔ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ [2:93]۔

حضرت عمرؓ کا یہ قیاس وقتی نہیں تھا' یہودیت کے اثرات اس کے خون کے ذرّات تک میں حلول کر چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت[1] کے بعد جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا معاملہ طے ہوگیا تو اس نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب اسلام کے معاشی نظام نے اپنے مقام سے سرکنا شروع کر دیا تو حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ سے ملنے کے لئے آئے تو وہاں (اتفاق سے یا بالارادہ) کعب بھی بیٹھے تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ کی رُو سے' زائد از ضرورت مال کسی کے پاس رہ نہیں سکتا' قرآن نے اس کی سخت ممانعت کی ہے۔ اس پر کعب بیچ میں بول اُٹھے اور کہنے لگے یہ غلط ہے۔ جب مال میں سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر (باقی مال) حلال وطیّب ہوتا ہے۔ اس پر حضرت ابوذرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور اپنا ڈنڈا اٹھا کر کہا کہ "او یہودی! تو ہمیں اسلام سکھا رہا ہے؟"

اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ کعبؔ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اندازہ کس قدر صحیح تھا۔ جس نظام کو وہ پیش کر رہے تھے وہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہیں تھا' یہودیت کا نظامِ سرمایہ داری تھا۔ "اسلام کی تاریخ" مرتب کرتے وقت اسی قسم کے "احباروں اور رہبانوں" کی جستجو اور نشاندہی کرنی ضروری ہوگی۔

یہ نکات ضمناً سامنے آ گئے تھے۔ اب آگے چلئے۔

قُبۃ الصخرہ

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے' کلیسا کے بجائے' ہیکل کے کھنڈرات پر' صخرہؔ کے قریب نماز ادا فرمائی تھی۔ اس واقعہ کی یاد میں وہاں ایک سادہ سی مسجد تعمیر کر دی گئی۔ اس کے بعد' اموی خلیفہ عبدالملکؔ بن مروان نے (72ھ بمطابق 691ء) میں اس جگہ ایک قُبہ تعمیر کرادیا جو اُس دَور کے فنِ تعمیر کا نادر شاہکار ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید (813-33ء) نے' اس قُبہ کی مرمت کرائی تو اس پر عبدالملکؔ کے بجائے اپنا نام نقش کرا دیا لیکن (حسنِ اتفاق دیکھئے) کہ اس کے عمّال قُبہ کا سنِ تعمیر تبدیل کرنا بھول گئے چنانچہ وہ' وہی کا وہی (یعنی 72ھ) رہا اور آج تک ویسے ہی محفوظ ہے[2]۔

1۔ بعض قرائن اس کے غماز ہیں کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا یا کم از کم اسے اس کا علم تھا۔ تفصیل حضرت عمرؓ کی شہادت سے متعلق باب میں ملے گی۔

1۔ HISTORY OF THE ARABS. (P.K. HITTI)

مسجدِ اقصیٰ

عبدالملک بن مروان نے قبۃ الصخرہ کے قریب ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جسے مسجدِ اقصیٰ کہتے ہیں۔ بعد میں زلزلہ سے اس کے کچھ حصے مسمار ہو گئے تو عباسی خلیفہ منصور نے اسے (771ء میں) دوبارہ تعمیر کر دیا۔ صلیبی جنگوں میں بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا' تو قبۃ الصخرہ اور مسجدِ اقصیٰ بھی ان کی تحویل میں چلے گئے۔ انہیں' انہوں نے کلیسا بنالیا لیکن صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو (1187ء میں) دوبارہ فتح کر لیا اور ان مقاماتِ مقدسہ کو پھر سے ان کی پہلی حیثیت حاصل ہو گئی[1]۔

اب (یہ لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے کہ) بیت المقدس' یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور دنیا کے ساٹھ ستر کروڑ مسلمان سوائے آہیں بھرنے اور دعائیں مانگنے کے' کچھ نہیں کر سکے۔

بجھی عشق کی آگ' اندھیر ہے ‏ ‏ ‏ مسلماں نہیں' راکھ کا ڈھیر ہے

مسجدِ اقصیٰ اور شبِ معراج

مسجدِ اقصیٰ کا ذکر آ گیا تو ایک اور گوشہ کا سامنے لانا بھی ضروری سمجھا گیا۔ سورہ بنی اسرائیل کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ [17:1]

اس کا عام ترجمہ یوں کہا جاتا ہے:

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا' دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں' مسجدِ حرام سے مراد لیا جاتا ہے کعبہ اور مسجدِ اقصیٰ سے بیت المقدس کی مسجد اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ واقعہ شبِ معراج کا ہے' جس میں جبریلِ امین تشریف لائے اور حضورؐ کو براق پر سوار کرا کر پہلے بیت المقدس لے گئے اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کراتے ہوئے عرشِ معلّٰی تک۔ اور پھر اسی طریق اور اسی راستے سے مکہ کی طرف واپسی ہو گئی۔ ہمارے سامنے اس وقت تفسیر ابنِ کثیر ہے جو ہمارے ہاں بڑی مستند اور قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ ہم اس سفر کے ضروری حصوں کے متعلق اس تفسیر سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف مکہ سے بیت المقدس تک' کیونکہ اس وقت زیرِ نظر نکتہ مسجدِ اقصیٰ سے متعلق ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب حضورؐ' براق پر سوار'

بیت المقدس کی مسجد کے پاس اس دروازے پر پہنچے جسے بابِ محمدؐ کہا جاتا ہے تو وہاں ایک پتھر تھا جسے حضرت جبریل نے

اپنی انگلی لگائی تو اس میں سوراخ ہو گیا۔ وہیں آپ نے براق کو باندھا اور مسجد پر چڑھ گئے (؟)۔ وہاں تمام انبیاء سابقہ نے حضورؐ کی امامت میں نماز پڑھی۔

اور پھر آپؐ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔

تفسیری روایات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسولؐ اللہ کا عہدِ مبارک تو ایک طرف، حضرت عمرؓ کے زمانہ تک بھی بیت المقدس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ وہاں عبدالملک بن مروان نے (72ء میں) مسجد تعمیر کی جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ (اقصیٰ کے معنی ہیں —— بہت دُور —— یعنی وہ مسجد مکہ یا مدینہ حتیٰ کہ اُمیہ خاندان کے دارالسلطنت دمشق سے بھی بہت دُور، کافی فاصلہ پر واقع تھی۔ اسی جہت سے اسے مسجدِ اقصیٰ کہا گیا ہوگا)۔ لیکن ہماری کتبِ روایات میں اتنا ہی نہیں کہ بیت المقدس کی اس مسجد کا مجملاً ذکر کیا گیا ہو، اس کی تفاصیل تک دی گئی ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ جب (اسلام کے ابتدائی ایام میں) ابوسفیانؓ ہرقل کے پاس گیا، تو اس نے رسولؐ اللہ کے خلاف جو کچھ کہا اس میں یہ بھی تھا کہ

> بادشاہ سلامت سنیئے! میں ایک واقعہ بیان کروں جس سے آپ پر یہ بات کُھل جائے گی کہ محمدؐ (معاذ اللہ) بڑے جھوٹے آدمی ہیں۔ ایک دن وہ (محمدؐ) کہنے لگا کہ اس رات وہ مکہ سے چلا اور آپ کی اس مسجد میں، یعنی بیت المقدس کی مسجدِ قدس میں آیا اور پھر واپس صبح سے پہلے مکہ پہنچ گیا...... یہ بات سنتے ہی بیت المقدس کا لاٹ پادری جو شاہِ روم کی اس مجلس میں اس کے پاس بڑی عزت سے بیٹھا تھا، فوراً ہی بول اٹھا کہ یہ بالکل سچ ہے مجھے اس رات کا علم ہے، قیصر نے تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ادب سے پوچھا کہ جناب کو کیسے معلوم ہوا۔ اس نے کہا۔ سنیئے! میری عادت تھی اور یہ کام میں نے اپنے متعلق کر رکھا تھا کہ جب تک مسجد شریف کے تمام دروازے اپنے ہاتھ سے بند نہ کرلوں، سوتا نہ تھا۔ اُس رات، میں دروازے بند کرنے کو کھڑا ہوا۔ سب دروازے اچھی طرح بند کر دیئے لیکن ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا، میں نے ہر چند زور لگایا لیکن کواڑ اپنی جگہ سے سرکا بھی نہیں۔ میں نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو آواز دی، وہ آئے، ہم سب نے مل کر طاقت لگائی لیکن سب کے سب ناکام رہے۔ بس یہ معلوم ہو رہا تھا گویا ہم کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکانا چاہتے ہیں لیکن وہ جُسکا تک نہیں، ہلا بھی نہیں۔ میں نے بڑھئی بلوائے انہوں نے دیکھا بھالا، ترکیبیں کیں، کوششیں کیں لیکن وہ بھی ہار گئے اور کہنے لگے صبح پر رکھئے۔ چنانچہ وہ دروازہ اس شب یوں ہی رہا۔ دونوں کواڑ یوں ہی کھلے رہے۔ صبح ہی میں اس دروازے کے پاس گیا تو دیکھا کہ اس کے پاس کونے میں جو چٹان پتھر کی تھی، اس میں ایک سوراخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رات کو کسی نے کوئی جانور باندھا تھا۔ اس کا اثر اور نشان موجود تھے۔ میں سمجھ گیا اور میں نے اسی وقت اپنی جماعت سے کہا کہ آج کی رات ہماری یہ مسجد کسی نبی کے لئے کھلی رکھی گئی ہے اور اس نے یہاں ضرور نماز ادا کی ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیر، شروع پندرھواں پارہ)

یہ ہے سند اور شہادت بیت المقدس میں ''مسجدِ اقصیٰ'' کی موجودگی کی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

مسجدِ اقصیٰ سے مراد

سورۂ بنی اسرائیل میں جو کہا گیا ہے کہ

پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئی۔

تو (ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق) یہ حضورؐ کی شبِ ہجرت کا بیان ہے' جب آپ مکہ سے جانبِ مدینہ روانہ ہوئے تھے۔ مدینہ میں پہلے سے مسلمان موجود تھے جن کی دعوت پر حضورؐ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ صدرِ اوّل میں مسجد صرف نماز پڑھنے کے لئے مخصوص نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں کا جماعتی مرکز تھا' جہاں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق جملہ امور سرانجام پاتے تھے۔ مدینہ میں وہاں کے مسلمانوں کا اجتماعی مرکز موجود تھا اور اس کے بعد رسولؐ اللہ نے اُسے ایسا اجتماعی مرکز بنایا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد بھی مرکز مدینہ ہی رہا۔ یہ تھی وہ ''مسجدِ اقصیٰ'' (مدینہ کی بستی) جس کی طرف حضورؐ شبِ ہجرت تشریف لے گئے تھے اور مقصد اس انتقالِ مکانی (ہجرت) سے یہ تھا کہ وہاں اسلام ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر لے اور اس طرح ''خدا کی عظیم نشانیاں'' (انقلاب) ظہور میں آئیں۔ بیت المقدس (سوائے ان چند سالوں کے جب صلیبی جنگوں میں اس پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا) ہمیشہ مسلمانوں کے زیرِ تسلط رہا لیکن وہ نہ کبھی ان کا اجتماعی مرکز بنا اور نہ وہاں سے انقلابِ اسلامی کی کوئی خاص نشانیاں (آیاتِ خداوندی) نمودار ہوئیں۔ لہٰذا قرآن میں بیان کردہ ''مسجدِ اقصیٰ'' سے مراد عبدالملک بن مروان کی تعمیر کردہ مسجد نہیں بلکہ مدینہ کا اسلامی مرکز ہے۔ (باقی رہا حضورؐ کا آسمانوں پر تشریف لے جانا' سو اس کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں)۔

جشنِ فتح

حضرت عمرؓ بیت المقدس سے متعلق جملہ امور سے فارغ ہونے کے بعد' واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی ان کی ہم رکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے' عازمِ سفر ہو جانا چاہئے۔ لیکن ہمارے سامنے ایک ایسا دلکش اور جاذبِ قلب و نگاہ حسین منظر ہے جس سے قدم آگے نہیں اٹھ سکتے۔

فتح بیت المقدس ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس سے مجاہدین کے دل مسرتوں کے جھولے جھول رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ اس کی یاد میں جشن منانا چاہئے۔ یہ وہی جشن ہے جس کے لئے ہم یہاں رُک گئے ہیں۔

حضرت بلال حبشیؓ' رسولؐ اللہ کے مؤذن تھے لیکن رقیق القلب ایسے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انہوں نے پھر اذان

نہیں دی۔ وہ بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ ''بلال! آج کا دن ایسا یادگار ہے کہ ہمیں جشنِ مُسرت منانا چاہئے''۔ انہوں نے کہا کہ ضرور منانا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر یہ جشن یوں منایا جائے گا کہ نماز کے لئے اذان آپ دیں گے —— اور حضرت بلالؓ اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔

فتحِ بیت المقدس کا جشنِ مسرّت، فلسطین کی ارضِ مقدس، تاروں کی چھاؤں، نورِ سحر کی آئینہ پاشی، حضرت بلالؓ نے عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی آواز سے جو اذان دی تو شمعِ رسالت کے پروانوں کی نگاہوں کے سامنے وہ جنت بداماں منظر آ گیا جب وہ حضورؐ کی امامت میں صفیں باندھ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت بلالؓ کی آواز سینوں کو چیر کر دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر گئی۔ رفقائے رسولؐ تڑپ اُٹھے، روتے روتے اِن کی ہچکیاں بندھ گئیں، خود حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے۔ حضرت بلالؓ کی ہمنوائی میں ساری وادی اللہ اکبر کی آواز سے گونج اُٹھی اور جب انہوں نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ —— تو دشت و جبل پکار اُٹھے کہ

خودی کا سرِّ نہاں لا اِلٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ، فساں لا اِلٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند — بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہ الا اللہ

اور یوں صحرائے سینا نے صدیوں کے بعد اس فراموش کردہ حقیقت کی گواہی دی کہ

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اس کے بعد نماز پڑھی اور پھر اس کاروانِ شوق نے اپنا رختِ سفر باندھا۔ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ [13:29]۔

یہ قافلہ جانبِ بطحا روانہ ہوا لیکن ہمیں دجلہ و فرات کی گزر گاہوں کی طرف چلنا چاہئے کہ وہاں فتوحات کا مزید سلسلہ جاری ہے۔

حمص پر عیسائیوں کی یورش —— 17ھ بمطابق 637ء

عراق کے شمال میں، دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ کو الجزیرہ کہتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا چلا آ رہا ہے تو انہیں اپنے متعلق خدشہ لاحق ہوا۔ انہوں نے قیصر کو لکھا کہ اگر تم ہمت کرو تو ہم اور تم مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک کثیر فوج جمع کی اور اُسے حمص کی طرف بھیج دیا۔ ادھر سے جزیرہ والوں نے بھی حمص کا رُخ کیا۔ عساکرِ اسلامیہ نے ان کے مقابلہ کی تیاریاں کیں، اور اگرچہ حضرت ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ وہاں

موجود تھے' موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ خود دمشق تشریف لے آئے۔ حِمصؔ کے قریب سخت معرکہ برپا ہوا لیکن عیسائیوں کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد انہیں پھر کبھی پیش قدمی کا حوصلہ نہ ہوا۔

ادھر جزیرؔہ والوں کو بھی ایسی شکست ہوئی کہ چند دنوں میں اس سارے علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

جندی سابورؔ کی فتح

ہرمزانؔ کے' شوسترؔ (یا تشتر) کی فتح کے بعد' مسلمانوں نے جندیؔ سابور پر حملہ کیا جو شوسترؔ سے قریب ہی ہے۔ کئی دنوں کے محاصرہ کے بعد مسلمانوں نے دیکھا کہ اہلِ شہر نے خود ہی دروازے کھول دیئے ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں اطمینان سے مصروف ہیں —— دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ ہمیں مسلمانوں نے امان دے دی ہے اس لئے ہم محفوظ ہیں۔ امان نامہ دیکھا تو وہ ایک غلام کی طرف سے تھا جس نے از خود ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا۔

ایک غلام نے امان دے دی

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (سپہ سالار) کہتے تھے کہ ایک غلام کی امان حجت نہیں ہو سکتی۔ شہر والے کہتے تھے کہ ہم آزاد اور غلام کو نہیں جانتے' ہمیں ایک مسلمان نے امان دی ہے۔ بالآخر حضرت عمرؓ کی طرف رجوع کیا گیا تو آپ نے کہا کہ مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے' اس لئے اس نے جسے امان دی ہے وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ ہمارے ہاں غلام اور آزاد کی کوئی تفریق نہیں۔ لہٰذا' وہ امان بدستور قائم رہی۔

مُسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا!

فتحِ مصرؔ —— 20ھ بمطابق 641ء

مصرؔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' یہ رومیوں کے قبضہ میں تھا لیکن ایرانی اس پر یورشیں کرتے رہتے تھے۔ 616ء میں انہوں نے اسے فتح کر لیا اور نُو برس تک اس پر قابض رہے (قرآنِ کریم' سورۂ الروم (سورہ 30) میں ایرانیوں اور رومیوں کی اسی آویزش کا ذکر ہے)۔ اس کے بعد رومیوں نے اسے پھر فتح کر لیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں' مقوقس (قبطی عیسائی) رومیوں کی طرف سے مصرؔ کا حاکم تھا۔

جب حضرت عمرؓ فلسطین تشریف لے گئے ہیں تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے آپ سے مصرؔ فتح کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ لیکن

حضرت عمرؓ نے اس وقت اس تجویز کے متعلق خاموشی اختیار فرمائی (یہ 16ھ کی بات ہے)۔ اس کے بعد بھی حضرت عمرو بن عاصؓ اپنی تجویز کو برابر دہراتے رہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر اظہارِ رضامندی نہ فرمایا۔ اس کے بعد اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو دو ایسے حادثاتِ سماوی سے دوچار ہونا پڑا جنہوں نے ان کی تمام توجہات کا رُخ اپنی طرف کھینچ لیا ـــــ فلسطین کے شہر عمواس میں طاعون پھوٹی اور اس نے پھیلتے پھیلتے شام اور عراق تک کے علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی ہلاکت آفرینیاں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ اِدھر عرب میں ایسا قحط پڑا کہ سارا علاقہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا (تفصیل ان حوادث کی آئندہ چل کر سامنے آئے گی)۔ ان حوادث کی وجہ سے کسی نئے علاقہ کی طرف یورش کرنے کا خیال تک بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ جب مملکت کو ان بلاؤں سے نجات حاصل ہوئی، تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے پھر اپنی تجویز کو دہرایا۔ وہ اس کے حق میں جو دلائل دیتے تھے، ان کا ملخّص یہ تھا:

(1) رومی سپہ سالار، اطربونؔ، فلسطین سے فرار ہو کر مصر پہنچ گیا تھا اور وہاں اتنی جمعیت فراہم کر رہا تھا کہ اس سے ہر وقت خطرہ تھا کہ وہ شام یا فلسطین پر حملہ کر دے گا۔ اس کی روک تھام ضروری تھی اور اس کا مؤثر ترین طریق یہ تھا کہ مصرؔ کی طرف پیش قدمی کر دی جائے۔

(2) مصر میں قبطی کاشتکاروں اور محنت کشوں کی حالت اس سے بھی زبوں تر تھی جو عراق میں ایرانیوں کے محکوم سرحدی قبائل کی تھی۔ مصر بڑا زرخیز علاقہ تھا لیکن وہاں کی ساری پیداوار رومی سمیٹ کر لے جاتے تھے اور قبطی بیچارے نانِ شبینہ تک کے محتاج رہ جاتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے قیصرؔ کے نام اپنے مکتوبِ گرامی میں انہی کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر ان کے خلاف مظالم کی روک تھام نہ کی گئی تو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کا کہنا تھا کہ اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان مظلوموں کی مدد کر سکیں، اس لئے یہ اب ہمارا دینی فریضہ ہو چکا ہے۔

(3) مصرؔ، رومیوں اور ایرانیوں کی یورشوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی مقامی آبادی مسلسل پامال ہوتی رہتی تھی۔ وہاں ایک مستحکم، عادل، حکومت کا قیام، ان کی فلاح و بہبود کے لئے لاینفک تھا۔ اس کے بغیر وہ انسانی سطحِ زندگی تک آ نہیں سکتے تھے۔

(4) قبطی بھی عیسائی تھے اور ہرقلؔ بھی عیسائی لیکن ان کے فرقے مختلف تھے۔ جب ہرقلؔ نے ایرانیوں کو شکست دے کر مصر پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو اس نے اس حقیقت کا احساس کیا کہ رومی سلطنت کے اس قدر عظیم ہونے کے باوجود، اس کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے باہمدگر مصروفِ جنگ وقتال رہتے ہیں۔ اس نے اس کا علاج یہ سوچا کہ مختلف فرقوں کے مشترک عقائد پر مبنی ایک مذہب مرتب کیا جائے اور مختلف فرقوں سے کہا جائے کہ وہ اسے اختیار کریں۔ اس مقصد کے لئے اس نے مصر کے دارالسلطنت اسکندریہ کی مذہبی پیشوائیت کی سربراہی قیرسؔ نامی اسقف کے سپرد کی۔ وہ بڑا متشدد تھا اور سرکاری

مذہب کو بزور منوانا چاہتا تھا۔قبطیوں نے اس کی مخالفت کی تو اس نے ان پر اس قدر وحشیانہ مظالم توڑے جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔اس سے پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔دس برس تک قبطی اس کی وحشت اور بربریت کا شکار ہوتے رہے۔وہ اس کے مظالم کے خلاف چیختے چلاتے تھے لیکن کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا تھا۔حضرت عمرو بن عاصؓ کا کہنا تھا کہ ان کی امداد بھی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

بلبیس کا معرکہ ــــ 18ھ بمطابق 40-639ء

ان دلائل کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی تجویز پر اظہارِ رضامندی کر دیا۔پہلا معرکہ فرما کے مقام پر ہوا جو مصر کا ایک مشہور شہر تھا۔ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد رومیوں کو ذِلّت آمیز شکست ہوئی۔دوسرا معرکہ بلبیس کے مقام پر ہوا جہاں اطربون ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا۔مسلمانوں کو وہاں بھی فتح نصیب ہوئی اور اطربون میدانِ جنگ میں کام آ گیا۔اس کے بعد بابلیون کے قلعہ پر باہمی تصادم ہوا۔اس قلعہ میں خود مقوقس موجود تھا اور سپہ سالار جارج نامی ایک رومی تھا جس کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔(جیسا کہ سابقہ باب میں لکھا جا چکا ہے) اس معرکہ میں مقوقس نے ایک وفد حضرت عمرو بن عاصؓ کی خدمت میں بھیجا تھا۔وفد کی واپسی پر مقوقس نے ان کے تأثرات معلوم کرنے چاہے تو رئیسِ وفد نے کہا کہ

> ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد زندگی کے مقابلہ میں موت کو اور تکبر و سرکشی کے بجائے انکسار و اطاعت کو ترجیح دیتا ہے۔ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دنیا کی کوئی دلکشی اپنی طرف کھینچ سکتی ہو۔وہ زمین پر بیٹھتے ہیں گھٹنوں پر رکھ کر کھاتے ہیں۔ان کا امیر انہی میں کا ایک فرد ہے۔ان میں بڑے اور چھوٹے آقا اور غلام کی کوئی تمیز نہیں۔جب نماز کا وقت آتا ہے تو پیچھے کوئی نہیں رہتا۔سب وضو کرتے ہیں اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

مجاہدین کے یہ اوصاف سن کر مقوقس سوچ میں پڑ گیا۔اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ''قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ چاہیں تو پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ہمیں ان سے صلح کر لینی چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ذلیل وخوار ہونا پڑے گا''۔

بابلیون کی فتح ــــ 20ھ بمطابق 641ء

جب ہرقل تک مقوقس کے یہ خیالات پہنچے تو اس نے اسے بلا بھیجا اور جب اس نے وہاں بھی یہی کہا کہ ہمیں مسلمانوں سے صلح کر لینی چاہیے تو ہرقل نے اسے بڑا ذلیل کیا اور بزدلی اور غداری کے جرم میں اسے ملک بدر کر دیا ــــ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ مقوقس کا خیال صحیح تھا۔بابلیون کے قلعہ کا محاصرہ اگرچہ کافی طول کھینچ گیا لیکن بالآخر رومیوں کو اسے خالی کرنا

پڑا۔ یہ اپریل 641ء کا واقعہ ہے۔ ہرقل اس سے دو ایک ماہ قبل وفات پا چکا تھا۔

فتح اسکندریہ ـــ 20ھ بمطابق 641ء

ازاں بعد مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ کی مدت کے متعلق تاریخ میں مختلف روایات ہیں لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ محاصرہ اواخر جون 641ء میں شروع ہوا اور 18- نومبر 641ء کو اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یوں مصر فتح ہو گیا۔

اس زمانہ میں مصر بالعموم' اور اسکندریہ بالخصوص' کس شوکت وعظمت کے مظہر اور حسن وتجمل کے آئینہ دار تھے' تاریخ کے اوراق اس کے تذکرہ سے آج تک جگمگا رہے ہیں۔ جب حضرت عمرو بن عاصؓ نے معاویہ بن حدیج کو' فتحِ اسکندریہ کی نویدِ جانفزا دے کر امیر المومنین کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ کوئی خط نہیں دیں گے؟ حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا کہ میں خط میں کیا کچھ لکھ سکوں گا۔ تم خود عرب ہو' جو کچھ تم نے یہاں دیکھا ہے اسے زبانی بتا دینا۔ جب قاصد مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے بیتابانہ پوچھا کہ کیا خبر لائے ہو؟ جب اس نے کہا کہ اسکندریہ فتح ہو گیا ہے تو آپ اُسے ساتھ لے کر فوراً مسجد میں تشریف لے گئے۔ مؤذن سے اذان دینے کو کہا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے معاویہ سے کہا کہ تم جو پیغام لائے ہو' اُسے خود اپنی زبانی بیان کرو۔ معاویہ نے فتح کی خوشخبری کے بعد جب اسکندریہ کی تفصیلات سنائیں تو سامعین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہوں نے مدائن کا مالِ غنیمت بھی اسی مسجد میں دیکھا تھا لیکن جو کچھ اسکندریہ کے متعلق سنا اس سے وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔

امیر المومنین کا کھانا

اس کے بعد حضرت عمرؓ قاصد کو لے کر گھر پہنچے۔ کھانے کے لئے کہا تو ملازمہ نے سوکھی روٹی اور زیتون کا روغن لا کر دسترخوان پر رکھ دیا۔ معاویہ نے جھجک جھجک کر اسے کھایا۔

میں سو کیسے سکتا ہوں؟

دورانِ گفتگو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ جب تم دوپہر کے وقت یہاں پہنچے تھے تو میرے متعلق تمہارا کیا خیال تھا۔ اس نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ آپ قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا تم نے غلط سمجھا۔

اگر میں دن کو سوؤں تو رعیّت کا نقصان ہے اگر رات کو سوؤں تو میرا اپنا نقصان ہے۔ ان صورتوں میں' معاویہ! نیند کیسے آ سکتی ہے۔

سچ ہے' جب تک سربراہِ مملکت جاگے نہیں' رعایا چین کی نیند کیسے سو سکتی ہے؟ قرآنِ کریم نے اس اُمت کو طائفین کہہ کر پکارا ہے' یعنی راتوں کو پہرہ دینے والے۔ یہ پہرہ دیتے ہیں تا کہ نوعِ انسانی اطمینان کی نیند سو سکے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ قلعہ بابلیون کے اثنائے محاصرہ میں جس خیمہ میں قیام پذیر تھے' جب فتح بابلیون کے بعد وہاں سے کوچ کرنے لگے' تو دیکھا کہ خیمہ میں ایک کبوتر نے بچے دے رکھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ بچے بڑے ہو کر اُڑ نہ جائیں' خیمہ اکھیڑا نہ جائے۔ فتحِ اسکندریہ کے بعد انہوں نے سوچا کہ اگر اہلِ لشکر کے لئے کوئی اور جائے سکونت نہ ہوئی تو یہ لوگ اسکندریہ کے باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان میں خود رہائش پذیر ہو جائیں گے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر انہوں نے طے کیا کہ عسکریہ کے لئے ایک الگ شہر بسایا جائے۔ یہ شہر اس مقام پر بسایا گیا جہاں وہ خیمہ نصب تھا۔ یہی شہر فسطاط ہے جس نے تاریخ میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے فسطاط کی مسجد میں ایک منبر بنوایا جس پر کھڑے ہو کر وہ لوگوں سے خطاب کرتے تھے' حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے انہیں ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک منبر بنوایا ہے جس پر' مسلمانوں سے اونچے ہو کر بیٹھتے ہو۔ کیا یہ اعزاز تمہارے لئے کافی نہیں کہ تم مسلمانوں کے امیر ہو' لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تم اونچے بیٹھو اور دوسرے مسلمان تمہارے قدموں میں نیچے بیٹھے ہوں۔ منبر تُڑوا دو اور لوگوں کو کھڑے ہو کر مخاطب کرو۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے منبر تڑوا دیا۔

انہوں نے اس شہر میں' حضرت عمرؓ کے لئے بھی ایک مکان بنوایا اور اس کی اطلاع انہیں دی۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ

حجاز میں رہنے والے ایک آدمی کا مکان مصر میں کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مکان کو رفاہِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اسکندریہ کا کتب خانہ

فتحِ اسکندریہ کے ضمن میں' تاریخ نے ایک ایسا افسانہ وضع کیا جس کے سننے کے بعد ہر علم دوست' مہذب انسان کا خون کُھولنے لگے۔ کہا یہ گیا کہ اسکندریہ میں ایک عظیم کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم وفنون کی قریب سات لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ (کہا یہ جاتا ہے کہ) قبطیوں کا ایک پادری تھا — یوحنا نحوی — اسے اسقفوں کی ایک مجلس نے جرمِ ارتداد کی بنا پر معزول کر دیا تھا۔ فتحِ اسکندریہ کے بعد وہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ مذکورہ بالا کتب خانہ کی کتابیں اسے دے دی جائیں۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ "اگر ان کتابوں میں وہی کچھ ہے جو کتاب اللہ میں ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں اور اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو ہمارے کس کام کی' انہیں جلا دو"۔ اس فیصلہ کی تعمیل میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے اِن کتابوں کو شہر کے حماموں میں تقسیم کر دیا جہاں وہ چھ ماہ تک آگ روشن کرتی رہیں۔

یہ افسانہ ہماری کتبِ تاریخ میں' پہلی بار' تیرھویں صدی عیسوی میں سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد کے مؤرخین اسے بلاتحقیق اپنے ہاں درج کرتے چلے گئے اور مغربی معترضین نے اسے خوب خوب اُچھالا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس سے حضرت عمرؓ ایک ایسے ''وحشی انسان'' کی شکل میں سامنے آنے لگے جو علم وفن کا دشمن اور تہذیب وتمدن کا حریف ہو۔ جو ایسے سنگین جرم کا مرتکب ہو جسے انسانیت کی عدالت میں کبھی قابلِ عفو نہیں سمجھا جاسکتا۔

پانچ چھ سو سال تک یہ افسانہ فضائے عالم میں آتش بارر ہا' اور اس کے بعد خود مغرب ہی کے محققین مثل گبنؔ' ریناںؔ' گستاؤلی بان' بٹلر وغیرہ نے تحقیق کے بعد' اسے یکے از خرافات قرار دے دیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کتب خانہ 48ء میں اس وقت جل گیا تھا جب سیزرؔ نے مصر فتح کرکے جہازوں کو آگ لگائی تھی۔ اور یوحنا نحوی' جس سے اس افسانہ کا آغاز ہوتا ہے مسلمانوں کے اسکندریہ فتح کرنے سے قریب سو سال پہلے مر چکا تھا۔

اندریں حالات' ہمیں اس باب میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں' بجز اس کے کہ جو کچھ ہماری کتبِ تاریخ وروایات میں مذکور ہے' اُسے بلا تحقیق وتفتیش قبول کر لینا کس قدر مُضرت رَساں ہے۔ اس قسم کی افسانہ طرازیوں کے محرکات کیا تھے' اس کی وضاحت میں اس وقت کروں گا جب (اور اگر) میں نے ''اسلام کی تاریخ'' مرتب کی۔ سرِدست میں نے اس کا مختصر ساذکر اس کتاب کے آخری باب میں کر دیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

تخریب نہیں، تعمیر

عہدِ فاروقی کے آغاز میں' اسلامی مملکت ایک محدود سے رقبہ کو محیط تھی۔ لیکن اس کے آخر میں' اس کی وسعتیں دور دراز علاقوں تک پھیل چکی تھیں۔ دس سال کے قلیل عرصہ میں اس قدر فتوحات بجائے خویش ایک عظیم کارنامہ ہے لیکن یہ کارنامہ منفرد نہیں کہلا سکتا۔ تاریخ میں کئی ایسے فاتح ملیں گے' جن کی فتوحات کی وسعتیں اس سے بھی زیادہ تھیں۔ جس خصوصیت کے اعتبار سے یہ کارنامہ منفرد قرار پاتا ہے' وہ یہ ہے کہ ان فتوحات کے نتیجہ میں یہ علاقے تباہ وبرباد نہیں ہوئے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ آباد وشاداب ہوئے اور اس تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنے جس نے ساری دنیا میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی گواہی (اپنے ہی نہیں) بیگانے بھی دیتے ہیں۔ مشہور مستشرق گِب (H.A.R. GIBB) اپنی کتاب (MOHAMMADANISM) میں لکھتا ہے:

> ان فتوحات کی رفتار کی تیزی سے کہیں زیادہ حیرت انگیز وہ نظم وضبط تھا جو اِن میں ملحوظ رکھا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان جنگوں کے دوران تھوڑی بہت تخریب بھی ہوئی لیکن بہ ہیئتِ مجموعی اِن عربوں نے اپنے پیچھے کھنڈرات کے آثار چھوڑنے کے بجائے مفتوحہ قوموں اور ان کے تمدن کے امتزاج کے لئے نئی نئی شاہراہیں تعمیر کیں۔ وہ نظامِ نو جسے نبی اکرمؐ نے اپنے ورثا (خلفاء) کو ترکہ میں دیا تھا اس نے ان بدوی لشکروں کے سیلاب کو' قوانین وضوابط کے ساحلوں میں

محصور رکھ کر، جریدۂ عالم پر اپنی قدر و قیمت ثبت کر دی۔ ان فتوحات کی رُو سے، اسلام بیرونی دنیا میں، لُوٹ مار کی خاطر تباہیاں مچانے والے جھکڑ کی شکل میں متعارف نہیں ہوا بلکہ ایک ایسی اخلاقی قوت کی شکل میں متعارف ہوا جس کے احترام میں ان مفتوحہ اقوام کے قلوب جُھک گئے اور اس نے ایک ایسا نظریۂ حیات پیش کیا جس کی حریف نہ مشرقی روم کی عسیائیت ہو سکی اور نہ ہی ایران کی مجوسیت۔ (صفحہ 4)

اور (M.A. ENAN) اپنی کتاب (DECISIVE MOMENTS IN THE HISTORY OF ISLAM) میں رقمطراز ہے:

ان (عربوں) نے ظلم اور انصاف، حدود فراموشی اور اعتدال، سلب و نہب اور ضبطِ خویش، مذہبی جنون اور رواداری میں جو فرق ملحوظ رکھا وہ ان بنیادی عناصر میں سے ایک تھا جنہوں نے ان کی فتوحات کے لئے راستے کشادہ کر دیئے تھے۔ ان کا یہی وہ حُسنِ سلوک تھا جس نے مفتوحہ قوموں کے دل موہ لئے اور انہیں اس امر کا اطمینان اور یقین ہو گیا کہ ان نئے آقاؤں کے زیرِ نگیں ان کی حالت پہلے کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہو جائے گی۔ اس نے اس خوف کو زائل کر دیا جو ہر نئے فاتح کی طرف سے مفتوح اقوام کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ عربوں کی آمد، ان خدشات و خطرات کو اپنے جلو میں نہیں لائی تھی جو ہر غالب دشمن کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ (صفحہ 11)

اتنا ہی نہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی یہ فتوحات امن و سلامتی کی پیامبر تھیں، عربوں کے ساتھ ان روابط کے نتیجہ میں، ان مفتوحہ اقوام نے جو کچھ حاصل کیا، اس کی مدح و ستائش میں غیر مسلم مؤرخین رطب اللسان ہیں — (JOSEPH HELL) اپنی کتاب (THE ARAB CIVILISATION) میں لکھتا ہے:

ایرانی، بازنطینی اور مصر کے قبطی، ایک نا قابلِ علاج جمود کا شکار ہو چکے تھے اور اس قابل ہی نہ تھے کہ اپنی جدوجہد کے ذریعے وہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکتے۔ عربوں کے ساتھ رابطہ نے ان کے جمود کو توڑا اور انہیں ایک تازہ حیاتِ دانش و بینش کے لئے بیدار کر دیا۔ اسلامی تمدن کی تاریخ میں یہ ایک عظیم واقعہ ہے اور اس زمانے میں عربوں کے مشن کی اہمیت کا نا قابلِ تردید ثبوت۔ (انگریزی ترجمہ، پروفیسر خدا بخش۔ صفحہ 70)

یہی مؤرخ دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

عربوں نے اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ ان مفتوحہ علاقوں میں بھی نئی نئی درسگاہیں کھولیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال نہ عہدِ قدیم کی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ ہی ابتدائی عہد کی عیسائیت۔ (ایضاً صفحہ 52)

اہلِ زمین کی طرف سے ان مجاہدینِ اسلام کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور آنسوئے افلاک سے ان پر اس نویدِ جانفزا کے ساتھ تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے کہ

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا [33:43]

خدا اور اس کے فرشتے ان پر درود و سلام کی بارش کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ خدا کی رحمتیں ان کے شاملِ حال ہیں۔

یہ انہی کے حُسنِ عمل کا صدقہ ہے کہ ہم آج (نام ہی کے سہی) مسلمان کہلاتے ہیں اور ایسی ایسی وسیع و عریض مملکتوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کتنے زور کا تھا وہ تحرک جس سے ملتِ اسلامیہ کا ''ڈبہ انجن کے بغیر'' چودہ سو سال سے رواں دواں چلا آ رہا ہے۔[1]

حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی

''حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کر دیا تھا ـــــ''

(جیسا کہ اس عنوان کے آخر میں لکھا جائے گا) ہمارے نزدیک یہ واقعہ کچھ ایسا اہم نہیں تھا کہ اسے ہم ایک الگ عنوان کے تحت تفصیل سے لکھتے لیکن ہماری تاریخ نے اسے ایسی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ عہدِ فاروقیؓ کی تاریخ کسی کے سامنے آئے اور وہ فہرست میں اس واقعہ کو تلاش نہ کرے۔ چونکہ ہمیں اس کا اندازہ اور احساس ہے کہ ہمارے قارئین بھی ایسا ہی کریں گے، اس لئے ہم ان کے ذوقِ تجسّس کی تسکین کے لئے اسے تفصیل سے لکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارا انداز اور اسلوب ہے، ہم پہلے ان احوال و کوائف کو من و عن درج کر دیں گے جو اس سلسلہ میں ہماری کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں، اور اس کے بعد ان پر تبصرہ کریں گے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت عمرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور عہدِ جاہلیت ہی میں فنِ سپہ گری کے مشہور ماہر؛ چنانچہ قریش کے رسالہ کی افسری انہی کے سپرد تھی۔ جنگِ اُحد میں قریش کے اُکھڑے ہوئے قدم انہی کی عسکری تدبیر کی بنا پر سنبھلے تھے اور حدیبیہ کے موقعہ پر بھی، قریش کی طرف سے (مسلمانوں کے خلاف) جنگ کی تیاریاں انہی کی زیرِ نگرانی ہو رہی تھیں۔

سیف اللہ

تاریخ کا یہ واقعہ بھی عجائبات اور نوادرات میں شامل کئے جانے کے قابل ہے کہ جو سپہ سالار، حدیبیہ کے موقع پر، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، وہ صلح حدیبیہ کے بعد، مکہ سے مدینہ پہنچا اور بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا (حضرت عمرو بن عاصؓ بھی انہی کے ساتھ اسلام لائے تھے ـــــ ایک فاتح شام و عراق اور دوسرا فاتح مصر!)۔ اور وہی خالدؓ جو حدیبیہ کے موقع پر قریش کے سپہ سالار تھے، فتح مکہ کے دن، قریش کے خلاف، مسلمانوں کے ایک دستہ کے افسر تھے۔

1۔ گاڑیوں کی شنٹنگ کے وقت، بعض اوقات انجن اتنے زور سے دھکا لگا دیتا ہے کہ ڈبے انجن کے بغیر، کتنی دُور تک بھاگے چلے جاتے ہیں۔ ہماری ملت کی گاڑی جو اس وقت تک مصروفِ خرام ہے، وہ صدرِ اوّل کے تحرک ہی کا نتیجہ ہے۔

حضور نبی اکرمؐ نے اسی موقعہ پر انہیں سیف اللہ کے زندۂ جاوید لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ لقب جس سے قرطاسِ زمانہ پر ان کا دوام ثبت ہو گیا۔

جب نبی اکرمؐ نے (8ھ میں) زید بن حارثؓ کے زیرِ قیادت رومیوں کے خلاف سب سے پہلا لشکر روانہ فرمایا ہے تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) حضرت خالدؓ اس میں' اپنی رضامندی سے' بطور ماتحت شامل ہو گئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جب اسلامی لشکر کے تین علمبردار ـــــ حضرت زید بن حارثؓ حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ـــــ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو اہلِ لشکر کی رضامندی سے حضرت خالدؓ نے عَلَمِ قیادت اٹھایا اور اپنے حُسنِ تدبر سے لشکر کو محفوظ نکال کر واپس لے آئے۔ ان کی یہ تدبیر بڑی کامیاب قرار پائی۔

عہدِ صدیقیؓ میں ''مانعینِ زکوٰۃ'' کی سرکوبی کی مہم حضرت خالدؓ کے سپرد ہوئی جسے انہوں نے بڑی جرأت و بسالت سے سر کیا۔ جنگِ یمامہ کے تو نام ہی سے معرکہ نگاری کی وادیاں گونج اٹھتی ہیں۔ ان مہمات کو انہوں نے سَر کیا اور مقامِ حیرت ہے کہ یہی وہ مہمات ہیں جن سے اس آویزش کی ابتدا ہوئی جس نے آگے جا کر ان کی معزولی کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں پہلا واقعہ مالک بن نویرہ کے قتل کا ہے۔

مالک بن نویرہ کا قتل

نبی اکرمؐ نے بنی تمیم کی مختلف شاخوں کے لئے مختلف امیر مقرر فرمائے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا جو بنی یربوع کا سردار تھا۔ رسول اللہؐ کی وفات پر جن سرداروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ زکوٰۃ کی رقم مرکز میں نہ بھیجی جائے ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ حضرت خالدؓ نے سخت مقابلہ کے بعد اسے گرفتار کر لیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ہدایات کے مطابق اسے مدینہ بھیج دیتے تا کہ امیر المومنین خود اس کے متعلق فیصلہ کرتے لیکن حضرت خالدؓ نے ایسا نہ کیا بلکہ اسے وہیں قتل کر دیا۔ اس کی وجہ کیا تھی' اسے تاریخ کی ان تأسف انگیز روایات سے اخذ کیجئے جن میں کچھ معلوم نہیں کہ کس قدر حقیقت ہے اور کس قدر افسانہ۔ ان میں کہا گیا ہے کہ

> جب مالک بن نویرہ گرفتار ہونے کے بعد' خالدؓ سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی بیوی لیلیٰ اس کے ساتھ تھی۔ وہ حسن و جمال میں بےنظیر تھی۔ جب خالدؓ نے مالک سے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا تو لیلیٰ خالدؓ کے قدموں میں گر پڑی اور ان سے اپنے خاوند کے لئے طلبگارِ عفو ہوئی۔ اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ اس حال میں اس کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی جس نے خالدؓ کو مسحور کر دیا۔ خالدؓ کے لئے لیلیٰ کو اپنے قبضہ میں لے لینے کا طریق اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ مالک کا قتل کر دیا جائے؛ چنانچہ مالک نے اپنے قتل کے وقت کہا تھا کہ افسوس! میری بیوی میرے قتل کا موجب بن گئی۔

اور ابھی مالکؓ کی لاش سامنے تڑپ رہی تھی کہ خالدؓ نے لیلیٰ سے شادی کر لی ـــــ ایک مسلمان کی بیوی سے اس کے عِدّت گزارنے سے بھی پہلے شادی!!

مجاعہ کی بیٹی سے شادی

اسی طرح روایات میں ہے کہ جنگِ یمامہ میں مخالفین کے ایک سردار، مجاعہ نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ نے معاہدۂ صلح کی تکمیل کے ساتھ ہی مجاعہ سے کہا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دے۔ اس نے انکار کیا تو حضرت خالدؓ نے اس پر سختی کی تا آنکہ اسے مجبوراً اپنی بیٹی کی شادی حضرت خالدؓ سے کرنی پڑی۔

یہ دَورِ صدیقی کے واقعات ہیں۔ جب ان کی اطلاع مدینے پہنچی تو حضرت خالدؓ کی طلبی ہوئی ـــــ اس مقام پر تاریخ ایک اور شوشہ چھوڑتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی حضرت خالدؓ کے ساتھ پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ خالدؓ کو معزول کر دیا جائے اور اسے اس کے جرائم کی عبرتناک سزا دی جائے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ کی بات تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت ملک میں عام بغاوتیں ہو رہی ہیں جنہیں خالدؓ کے سوا کوئی اور فرو نہیں کر سکتا، اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے کچھ نہ کہا جائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ دین کے معاملہ میں مصلحت کا کیا کام! خالدؓ کے جرائم بڑے سنگین ہیں اسے ان کی سزا ملنی چاہئے لیکن حضرت ابوبکرؓ نہ مانے اور حضرت خالدؓ کو معمولی سی سرزنش سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا اور جونہی وہ برسرِ اقتدار آئے، (یعنی 13ھ میں) تو سب سے پہلا حکم، جو نافذ فرمایا وہ حضرت خالدؓ کی معزولی کا تھا۔

معزولی کا قصہ

لیکن تاریخ یہ بھول گئی کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں، شام اور عراق میں جو عظیم معرکہ آرائیاں ہوئیں اور مسلمانوں کو جس قدر شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں، وہ بیشتر سیف اللہ ہی کے تصدّق تھیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ (16ھ میں) بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو جو تین زعمائے ملت ان کے استقبال کے لئے آئے تھے، ان میں ایک حضرت خالد بن ولیدؓ بھی تھے۔ نیز تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ 17ھ میں، جب حضرت خالدؓ قنسرین کے امیر تھے، ان کی بہت سی بے اعتدالیوں کی خبریں بارگاہِ خلافت میں پہنچیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر اشعث بن قیس کو دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تھے اور ایک یہ کہ انہوں نے ایک حمام میں شراب ملے ہوئے پانی سے مالش کرائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے جواب طلبی کی تو انہوں نے کہا کہ ''ہم شراب کو اس قدر کمزور کر دیتے ہیں کہ وہ بالکل پانی ہو جاتی ہے''۔ حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے، اور انعام والے قصہ میں حضرت خالدؓ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو (جو اس علاقہ کے امیر تھے) لکھا کہ خالدؓ کو بلا کر اس کی مشکیں کسو، سر سے اس کی

ٹوپی اُتارو؛ اور اس سے پوچھو کہ اس نے اشعثؓ کو انعام اپنے پاس سے دیا ہے یا مالِ غنیمت میں سے۔ اگر مالِ غنیمت میں سے دیا ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر اپنے پاس سے دیا ہے تو یہ اَسراف ہے۔ ہر دو صورتوں میں خالدؓ کو معزول کر کے اس کے علاقہ کو اپنی ولائیت میں شامل کرلو'۔ یہ خط حضرت بلالؓ کے ہاتھ بھیجا گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے معاملہ حضرت بلالؓ پر چھوڑا کہ وہ جس طرح چاہیں خلیفہ کے حکم کی تعمیل کریں۔ انہوں نے لوگوں کو جمع کیا۔ حضرت خالدؓ کا عمامہ اتار کر؛ اس سے ان کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے اور ان کے سر سے ٹوپی اتار کر؛ پوچھا کہ انعام کس مد سے دیا تھا۔

حضرت خالدؓ نے اس تمام ذِلّت آمیز سلوک کو نہایت ضبط وتحمل سے برداشت کیا اور جواب میں کہا کہ انہوں نے انعام اپنے پاس سے دیا تھا۔ اس پر انہوں نے اور دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ معاملہ ختم ہو گیا لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ بلا لیا اور ان سے کہا کہ ''تم کہاں کے ایسے دولت مند تھے کہ اس قدر خطیر رقم انعام میں دے دی''۔ انہوں نے کہا کہ ان فتوحات میں ساٹھ ہزار درہم بطورِ مالِ غنیمت میرے حصہ میں آیا ہے آپ حساب کر لیجئے۔ جس قدر اس سے زائد ہو؛ وہ لے لیجئے۔ چنانچہ حساب کیا گیا تو اسی ہزار درہم نکلے۔ ان میں سے ساٹھ ہزار چھوڑ دیئے گئے اور باقی بیس ہزار بیت المال میں داخل کر دیئے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے انہیں معزول بھی کر دیا۔ یہ 17ھ کی بات ہے۔

تنزّلی اور معزولی

تاریخ اپنے اس تضاد کو اس طرح رفع کرتی ہے کہ 13ھ میں حضرت عمرؓ نے انہیں سپہ سالاری کے منصب سے تنزّلی کے بعد نائب سپہ سالار بنا دیا تھا اور 17ھ میں انہیں ان کے عہدہ ہی سے معزول کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ حمص کے قریب ایک جگہ جا کر مقیم ہو گئے اور اسی غم واندوہ میں؛ چار سال بعد؛ مدینہ میں وفات پا گئے؛ جہاں وہ اپنی والدہ کو ملنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت عمرؓ کو ان کی وفات کا سخت صدمہ اور رنج ہوا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت خالدؓ کی معزولی پر صحابہؓ میں بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن نہ تو حضرت خالدؓ نے کسی قسم کی اشتعال انگیز بات کی اور نہ ہی فوج میں؛ جس کے دلوں میں حضرت خالدؓ کا اس قدر احترام تھا؛ کوئی فتنہ برپا ہوا۔ ان کی معزولی کے حکم کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے ملک میں اعلان کر دیا کہ

> میں نے خالدؓ کو کسی ناراضگی یا خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ لوگ ان کے بے حد گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں ان پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ لوگوں کو بتا دیا جائے کہ فتح وظفر خدا کی نصرت سے ہوتی ہے یہ کسی شخصیت سے وابستہ نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کے مختلف گروہ

یہ ہے ملخص ان روایات کا جو اس باب میں ہماری کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں اور چونکہ اس واقعہ (یا قصہ) سے' صدرِ اوّل کی تین عظیم شخصیتیں متعلّق (یا مخالفین کے الفاظ میں' ملوث) ہیں۔ اس لئے ان کی بنا پر بحث وتمحیص کا بازار گرم چلا آ رہا ہے۔ ایک گروہ ایک ہی تیر سے ان تینوں شخصیتوں کو اپنے طعن کا ہدف بنا دیتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

(1) مالک کی بیوی لیلےٰ اور بنتِ مجاعہ کے ساتھ شادی کرنے سے (حضرت) خالد بن ولیدؓ نے ایسے کردار کا ثبوت دیا جو ایک مسلمان کے قطعاً شایانِ شان نہ تھا۔ اس سے حضرت خالدؓ ہدفِ طعن قرار پا گئے۔

(2) حضرت ابوبکرؓ نے مصلحت کی بنا پر' ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا حالانکہ دین اور عدل کے معاملہ میں مصلحت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس سے حضرت ابوبکرؓ موردِ الزام قرار پا گئے۔

(3) حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کے خلاف شروع سے حسد چلا آ رہا تھا اس لئے انہوں نے اس ذاتی عناد کی بنا پر پہلے حضرت ابوبکرؓ کو اُکسایا کہ وہ (حضرت) خالدؓ کے خلاف سخت کاروائی کریں اور جب وہ اس پر رضامند نہ ہوئے تو اشعث کے انعام کا بہانہ رکھ کر انہیں خود معزول کر دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ مطعون قرار پا گئے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ان ہر سہ حضرات کی بلندیٔ مرتبت کا قائل ہے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی مطعون قرار نہ دیں۔ وہ ان روایات کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تاویلات سے کوئی بات ٹھکانے کی بن نہیں پڑتی۔ ان تاویلات سے اگر ایک واجب الاحترام ہستی بَری الذِمہ قرار پاتی ہے تو دوسری موردِ الزام قرار پا جاتی ہے۔ یہ گروہ حضرت خالدؓ کے متعلق کہتا ہے کہ وہ حساب کتاب کے معاملہ میں احتیاط نہیں برتتے تھے اور حضرت عمرؓ اس باب میں بڑے متشدّد واقعہ ہوئے تھے۔ انہوں نے انہیں اس پر کئی بار تنبیہ بھی کی لیکن وہ اس پر بھی محتاط نہ ہوئے تو حضرت عمرؓ کو مجبوراً ایسا سخت قدم اٹھانا پڑا۔

مومنین کی خصوصیت

یہ کشمکش اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے' جب ہم تاریخی روایات کی صحت وسقم کا معیار' اپنے رجحانات' یا ان کتابوں کے مؤلّفین کے متعلق اپنی آراء کو قرار دے لیں۔ اگر ان کے پرکھنے کا معیار' قرآنِ کریم کی شہادت قرار دے لیا جائے تو پھر اس قسم کی کوئی کشمکش پیدا نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ [53:32]

یہ لوگ بڑے بڑے جرائم (کبیرہ گناہوں) اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ اُن سے یونہی چھوٹی موٹی سی لغزشیں سرزد ہو سکتی ہیں۔

یعنی وہ ایسی تمام حرکات سے مُجتنب رہتے ہیں، جن سے ایک مومن کی سیرت داغدار ہو جائے۔ لیکن وہ معصوم بھی نہیں ہوتے کہ بہ تقاضائے بشریت ان سے چھوٹی موٹی لغزشیں بھی سرزد نہ ہوں۔ یہ عام مومنین کے متعلق ہے اور صحابہ کبارؓ (مہاجرین و انصار) کے متعلق یہ قرآنی شہادت ہمارے سامنے ہے کہ وہ ''مومنِ حقّا'' تھے ـــــ یعنی پکے اور سچے مومن (تفصیل کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے)۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ ہوں یا حضرت عمرؓ یا حضرت خالدؓ ان سے معمولی لغزشیں تو سرزد ہو سکتی ہیں لیکن تاریخ میں اگر کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے جو ایک پکے اور سچے مومن کے شایانِ شان نہیں ـــــ یعنی وہ کبائر الاثم والفواحش کے ذیل میں آتی ہے ـــــ تو ہم بلا تأمل کہہ دیں گے کہ وہ روایت صحیح نہیں۔ اس معیار کے مطابق اگر واقعہ زیرِ نظر کو پرکھا جائے تو اس سے کوئی کشمکش پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم میں، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ) کے متعلق بالتصریح مذکور ہے کہ وہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [48:29] تھے، یعنی مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت، لیکن آپس میں نہایت محبت اور ہمدردی سے رہنے والے۔ قرآن کی اس شہادت کی بنا پر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کے خلاف یہ اقدام ذاتی حسد، عداوت یا جذبہ انتقام کی بنا پر کیا ہو۔ اس کی وجہ مصالحِ مملکت اور مفادِ امت کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

یہ امورِ مملکت سے متعلق عام معاملہ تھا

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک اس واقعہ کو وہ اہمیت حاصل ہی نہیں جو اسے خواہ مخواہ دے دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ ایک عظیم مملکت کے سربراہ اور کثیر افواجِ اسلامیہ کے ''ہائی کمان'' تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ احکامِ خداوندی کے شدت سے پابند اور دین کے استحکام اور فروغ کے معاملات میں بڑے متشدّد تھے۔ وہ خود بھی اسی معیار کی زندگی گزارتے تھے اور اپنے عمّال سے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنے کی توقع رکھتے تھے۔ بنابریں، وہ ان کی حرکات و سکنات کی جزئیات تک پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جہاں کسی کو دیکھتے کہ اس سے کوئی ذرا سی لغزش سرزد ہوئی ہے، اسے سخت تنبیہ کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کچھ کم بلند مرتبہ کی حامل شخصیت نہ تھے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے ایک منبر بنوا لیا تو آپ نے انہیں سخت سرزنش کی اور منبر تڑوا ڈالا۔ ایک دفعہ انہیں اپنے خط میں لکھا کہ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو، عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو، تکیہ نہ لگایا کرو''۔ مصر کے ایک حاکم عیاض بن غنم کے متعلق شکایت پہنچی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ان کے عہدے سے معزول کیا، مدینے بلا لیا۔ اور ان سے کہا کہ

> اپنی قمیض اتار کر کمبل کا جبہ پہنو، بکریوں کا گلہ لے کر جنگل کی طرف جاؤ، وہاں بکریاں چراؤ اور ہر راہگذر کو پانی پلاؤ۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راعی کے فرائض کیا ہیں اور رعیت کے حقوق کیا۔

جب انہوں نے سنا کہ خود ان کے (حضرت عمرؓ کے) اپنے بیٹے کو سزا دیتے وقت، حضرت عمرو بن عاصؓ نے کچھ رعایت برتی

ہے تو بیٹے کو مدینہ بلایا اور اُسے از سرِ نو سزا دی۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی) یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے عمّال کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ یاد رکھو! جو باتیں عام لوگوں کے سلسلہ میں لمّم کہلاتی ہیں (یعنی معمولی لغزشیں) تمہارے سلسلہ میں کبائر الاثم بن جاتی ہیں کیونکہ تمہاری رفتار' گفتار' کردار کا اثر تمہاری اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں ایسے امور میں خاص طور پر محتاط رہنا چاہئے۔

ہوسکتا ہے کہ حضرت خالدؓ سے کچھ اسی قسم کی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں اور حضرت عمرؓ نے انہیں ان پر سرزنش کی ہو۔ جہاں تک ان کی تنزّلی یا معزولی کا تعلق ہے' حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں' بے شمار عمّالِ مملکت کو متعین کیا' انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا' بعض کو معطل کیا' بعض کو معزول کردیا۔ انصرامِ امورِ مملکت کے ضمن میں ایسا ہوتا رہتا ہے اور حضرت عمرؓ کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اگر انہوں نے اپنے ایک امیر یا سپہ سالار (حضرت خالدؓ) کو معطل یا معزول کردیا تو کون سی قیامت آگئی؟ فاتحِ ایران حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا مرتبہ جس قدر بلند تھا' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا لیکن جب ان کے خلاف کچھ شکایات موصول ہوئیں تو انہیں معزول کردیا۔ اس قسم کے اور متعدد واقعات تاریخ میں مذکور ہیں۔ بنابریں' حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کے واقعہ میں کون سی منفرد استثنائی صورت ہے جسے خصوصیت کے ساتھ بحث کا موضوع بنایا جائے۔

اور اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم اس قسم کی بحثوں میں پڑیں ہی کیوں' جن میں اشخاص کے محاکمہ کی ضرورت لاحق ہوجائے۔ ہمارے لئے قرآنِ کریم نے ایسی راہنمائی دی ہے جس کی روشنی میں ہمیں ضرورت ہی نہیں رہتی کہ ہم اپنے اسلاف کے متعلق اس قسم کے محاکموں میں اُلجھ جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ جہاں تک اسلاف کا تعلق ہے

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ [2:141]

> یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں کیا اس کا بدلہ انہیں ملے گا جو کچھ تم کروگے' اس کا بدلہ تمہیں ملے گا۔ اور ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

ہمارا خدا تو یہ کہتا ہے کہ ہم تم سے ان کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے' اور ہم ہیں کہ ہزار برس سے ان حضرات کے ''کفر و ایمان'' یا حسنات و سیئات کا فیصلہ کرنے میں دماغ سوزیاں اور قلم کاریاں کررہے ہیں اور باہمی سر پھٹول سے تباہ ہورہے ہیں۔ اقبالؒ نے کس قدر درد و غم میں ڈوب کر کہا تھا کہ:

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

ہمارے نزدیک یہ تمام حضرات وہ تھے جن کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ..... ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ [9:100]

اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اور یہ ان کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی تھی۔

اور یہی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساتواں باب

آئینِ جہانداری

(نظم ونسقِ مملکت)

رسم و راہ و دِین و آئینش زِحق
زِشت و خوب و تلخ و شیرینش زِحق

عہدِ رسالتمآبؐ میں' اسلامی مملکت' جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی اور اس کا کُل رقبہ قریب دس لاکھ مربع میل تھا۔ عہدِ فاروقی میں' عرب کے علاوہ' ایران' عراق' فلسطین' شام' مصر' جزیرہ' خوزستان' آرمینیا' آذربائیجان' خراسان' کرمان' مکران (جس میں کچھ حصہ بلوچستان کا بھی شامل تھا) اس مملکت میں شامل ہو گئے اور اس کا رقبہ قریب ساڑھے بائیس لاکھ (22,51,030) مربع میل تک پھیل گیا۔

بالکل نئی بات

عرب' جنگجو قوم تھی اس لئے ان لڑائیوں میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے' وہ ایک حد تک قابلِ فہم تھے لیکن مملکت وحکومت کے تو وہ تصور تک سے ناآشنا تھے۔ ان کی ساری تاریخ میں' نہ کسی غیر قوم نے ان پر حکومت کی' نہ ہی ان کی اپنی کوئی حکومت تھی۔ وہ قدیم قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ قبیلہ کے اندر متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ سردارانِ قبیلہ کرتے تھے۔ اور قبائل کے اندر اکثر سلسلۂ جنگ وجدال جاری رہتا تھا۔ اگر کبھی مصالحت کی نوبت آتی تو وہ بھی قبائل کے سربراہوں کی باہمی مفاہمت سے طے پاجاتی۔ ذرا سوچئے کہ اس قسم کی قوم کے قبضے میں (یوں کہئے گویا شباشب) ایسی وسیع وعریض مملکت آجائے جس میں گوناگوں نسلوں' مختلف مذاہب' متنوع تہاذیب وتمدن' اور الگ الگ روایات کی حامل قومیں آباد ہوں تو اس (قوم) کے لئے اس کا نظم ونسق کس قدر مشکل ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نظر آتا ہے کہ جنابِ فاروق اعظمؓ فی الحقیقت ایک نابغہ (GENIUS) تھے۔ انہوں نے جس حُسنِ تدبّر سے امورِ مملکت کو سنبھالا' سنوارا' اور اُسے مثالی بنایا' اپنے تو ایک طرف' غیر بھی اس پر نذرانۂ تحسین وآفرین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اس مقام پر' بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ اس قسم کی مثالی

مملکت کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

اِسلامی نظامِ مملکت

اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے‘ یہ ایک مستقل موضوع ہے جسے ہم الگ (باب نمبر 9 میں) بیان کریں گے۔ اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے‘ دنیا کے تمام مسلمان ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں (یعنی مسلمانوں کی مختلف اقوام نہیں ہوتیں‘ وہ سب ایک قوم ہوتے ہیں)۔ اس اُمت کی ایک مملکت ہوتی ہے (یعنی مسلمانوں کی الگ الگ قومیں اور ان کی الگ الگ مملکتیں نہیں ہوتیں)‘ اس مملکت کا ایک سربراہ ہوتا ہے جسے اُمت کے مشورہ سے منتخب کیا جاتا ہے۔ وہ سربراہ‘ امورِ مملکت‘ اُمت کے مشورہ سے سرانجام دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [42:38] ”ان کے معاملات باہمی مشاورت سے سرانجام پائیں گے“۔ قرآنِ کریم نے مشاورت کا اصولی حکم دیا ہے۔ مشاورت کی مشینری کا تعیّن خود نہیں کیا‘ اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑا ہے کہ اپنے حالات اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جس قسم کی مشینری مناسب سمجھیں‘ وضع و اختیار کرلیں۔

صلوٰۃِ جامعہ

زیرِ نظر اسلامی مملکت کا مرکزی مقام مدینہ تھا اور حضرت عمر فاروقؓ اس کے سربراہ (امیر المومنین)۔ ان کی ایک مجلسِ مشاورت تھی جو اعیانِ مدینہ (انصار و مہاجرین) کے منتخب افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں حضرت علیؓ‘ حضرت عثمانؓ‘ عبدالرحمٰن بن عوفؓ‘ زید بن ثابتؓ‘ معاذ بن جبلؓ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ جب اس کی میٹنگ بلانی ہوتی تو ایک منادا اعلان کرتا — **اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃ** — صلوٰۃ کے لئے جمع ہو جاؤ — (یہاں سے ”صلوٰۃ“ کا مفہوم و منطوق واضح ہو جاتا ہے)۔ جب ارکانِ مجلس جمع ہو جاتے تو پہلے‘ امیر المومنین کے زیرِ اِمامت‘ دو رکعت نماز پڑھی جاتی جس سے اس امر کا اعتراف و اظہار و اعلان مقصود تھا کہ ہم قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے (یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنے) کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ خطبہ دیتے (یعنی ارکانِ مجلس سے خطاب کرتے) جس میں بحث طلب معاملہ پیش کیا جاتا۔ امورِ زیرِ نظر کے سلسلہ میں (عام طور پر) زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہ پڑتی کیونکہ ہر معاملہ کا فیصلہ‘ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوتا تھا‘ لہٰذا سوال سارا جزئیات کے تعیّن یا اِنتظامی مشینری کے متعلق سوچ بچار تک محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔

جب کوئی زیادہ اہم معاملہ زیرِ غور ہوتا تو انصار و مہاجرینِ مدینہ کا عام اجلاس منعقد ہوتا۔ اور اگر مسئلہ ایسا ہوتا جس سے صوبے بنیادی طور پر متعلق ہوتے‘ تو وہاں کے منتخب افراد کو بھی دعوتِ شرکت دی جاتی۔

اس کے علاوہ‘ ایک مخصوص و مختصر مجلس بھی تھی جسے آج کی اصطلاح میں کابینہ کہا جائے گا‘ روزمرہ کے معاملات اس کے

مشورہ سے طے پاتے تھے۔

مسجد کی حیثیت

یہ تمام اجتماعات مسجدِ نبویؐ میں منعقد ہوتے تھے۔ اسلام میں جس مقام پر اُمت کے معاملات طے پائیں' اُسے مسجد کہہ کر پکارا جاتا ہے ـــــ یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہونے کا مقام۔ صدرِ اوّل میں مسجد ہی حکومت کا سیکرٹریٹ' وہی ایوانِ مملکت' پارلیمان کی نشست گاہ' عدالت اور مرکزِ معاشرہ (COMMUNITY CENTRE) ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک حدیث کی رُو سے حضورؐ نے حبشیوں کا ناچ بھی صحنِ مسجد ہی میں دیکھا تھا۔

صوبے اور اضلاع

2۔ حضرت عمرؓ نے پوری مملکت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر صوبے کا گورنر الگ الگ تھا جسے والّی کہا جاتا تھا۔ (صوبہ اس زمانے میں ولایت کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے وہاں کے حاکم کو والّی کہا جاتا تھا) پھر' ہر صوبہ میں متعدد اضلاع تھے جن کے نظم و نسق کے لئے مختلف شعبوں کے انچارج' مختلف عمّالِ حکومت ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صوبوں میں کمشنریاں بھی تھیں۔ مثلاً مصر کو دو حصوں (کمشنریوں) میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں (28) اضلاع تھے اور دوسرے میں (15)۔ حضرت عمروؓ ابنِ عاص مصر کے والی تھے۔

حج سے مقصود

یوں تو ان صوبوں کے والیان کا مرکز میں اکثر آنا جانا رہتا تھا لیکن حج کے اجتماع میں سب کی شرکت لازمی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی دعوتِ عام دی جاتی تھی' جنہیں ان میں سے کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو۔ ان شکایات کے فیصلے بھی حج کے موقع پر ہوتے تھے اور مملکت کے بین الصوبائی معاملات پر بحث و تمحیص بھی اسی اجتماع میں۔ وہ جو جبلِ رحمت سے امام کے عام خطاب (خطبہ) کے بعد' منیٰ میں تین دن کا قیام ہوتا ہے' وہ اسی زندگی بخش نظام کی بے روح یادگار ہے۔ وہاں ان مشترکہ معاملات پر' جن کا ذکر امام نے اپنے خطبہ میں کیا تھا' بحث و تمحیص بھی ہوتی تھی اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی۔ انہی ضیافتوں نے اب ''قربانی'' کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

اور یہ کچھ' اجتماعاتِ صلوٰۃ و حج تک ہی محدود نہیں' اسلامی نظامِ زندگی کے تمام ارکان کی یہی حالت ہو چکی ہے۔ جب دینؔ' مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اُس حیات بخش نظام کے مختلف اجزاء کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں لیکن ان کا مقصود و مطلوب باقی نہیں رہتا۔ انہیں ایک جسدِ زندہ کی ممی شدہ لاشیں کہیئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

کامیابی کا راز

بہر حال یہ تھا دورِ فاروقی کی اسلامی مملکت کا تنظیمی نقشہ۔ یہ چیز یقیناً وجۂ حیرت بن جاتی ہے کہ اُس زمانے میں، جب نظامِ رسل ورسائل کا اس قدر فقدان اور وسائلِ مواصلات کی اتنی قلت تھی، اتنے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی مملکت کا انتظام، اور وہ بھی اس حسن وخوبی سے کہ کسی جگہ کسی قسم کا کوئی خلفشار یا اِنتشار پیدا نہ ہو، کس طرح ممکن تھا؟ اس کی بنیادی وجہ تو ہم آگے چل کر بتائیں گے، جہاں یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مملکت کی انتظامی مشینری بے شک اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کی کامیابی کا دار و مدار ان ''ہاتھوں'' پر ہوتا ہے جو اس مشینری کو چلاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے حُسنِ تدبر کی کرشمہ زائی اس وقت سامنے آتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان ''ہاتھوں'' کا انتخاب کس طرح کرتے تھے اور پھر انہیں قاعدے اور قانون کے مطابق مصروفِ حرکت وعمل کس طرح رکھتے تھے۔

پرچہ نویس

جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے، مرکزی حکومت کے ''پرچہ نویس'' مملکت کے طول وعرض میں اس طرح پھیلائے ہوئے تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا اور نہ ہی امیر المومنین کے علم سے باہر۔ وہ ''پرچہ نویس'' قابلِ اعتماد اس قدر تھے کہ اُن کی کوئی رپورٹ کبھی غلط یا جانبدارانہ ثابت نہیں ہوئی۔

شعبۂ محاصل (REVENUE DEPARTMENT)

جسمِ انسانی کی مشینری میں جو مقام نظامِ ہضم کا ہے، مملکت کی مشینری میں وہی اہمیت شعبۂ محاصل کو حاصل ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قدر وسیع وعریض مملکت کے محاصلی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے اور عمدگی سے چلانے کے لئے کس قدر دقّتِ نظر اور انتظامی صلاحیت درکار ہو گی۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ مملکت کی آمدنی میں ایک پائی بھی ناجائز طریق سے نہ آنے پائے اور ایک پائی بھی بے جا خرچ نہ ہو۔ حضرت عمرؓ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا تھا کہ آپ اپنے تجربہ کی بِناء پر بتایئے کہ ''خلافت'' کسے کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ میں تو اتنا ہی سمجھ سکا ہوں کہ ''خلافت'' سے مراد یہ ہے کہ خدا کے سامنے حساب دیتے وقت یہ بتایا جا سکے کہ

کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا

اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہے تو یہ خلافت ہے، ورنہ ملوکیت۔

اراضیات کا انتظام

آپ سوچئے کہ اس پابندی کے ساتھ، شعبۂ محاصل و مخارج کس قدر اہمیت در آغوش ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں انڈسٹری (صنعت) ہنوز معاشی نظام کے طور پر وجود میں نہیں آئی تھی، معاشی نظام زرعی تھا (تفصیل ان امور کی ''نظامِ معاشی'' سے متعلق باب میں ملے گی)۔ حضرت عمرؓ نے مملکت کی اراضیات کی پیمائش کرائی۔ پیداوار کے لحاظ سے ان کے درجات مقرر کئے۔ ان درجات کے مطابق لگان کی شرحیں مقرر کیں۔ لگان کا حساب کرنے کے لئے نہایت آسان اصول مقرر کئے اور اس کی وصولی کے لئے ایسے اربابِ دیانت و امانت کہ پوری مملکت میں کسی ایک شخص کو ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ زمین کی اصلاح کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے۔ تمام ممالکِ مفتوحہ میں آبپاشی کے لئے نہریں کُھدوائیں، بند بنوائے، تالاب تیار کرائے، پانی کی تقسیم کے لئے دہانے یا ''موگے'' بنائے۔ یہ تمام امور ایک خاص شعبہ کے سپرد تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ زمین سے جس قدر آمدنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی اس کے بعد کبھی نہیں ہوئی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، معاشی نظام کا تفصیلی تذکرہ ایک الگ باب میں کیا جائے گا۔

نظامِ آب رسانی

نہروں کی ضرورت آبپاشی کے لئے ہی نہیں تھی۔ ان ممالک میں پینے کے پانی کی بھی بڑی قلت تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے بھی نہریں کُھدوائی گئیں۔ بصرہ میں پانی کی قلت دُور کرنے کے لئے دَجلہ سے نو میل لمبی نہر کاٹ کر شہر تک پہنچائی گئی جس سے گھر گھر پانی کی افراط ہو گئی۔ اسی طرح دجلؔہ سے ایک اور نہر کاٹی گئی تھی جو اس کے مہتمم کے نام کی نسبت سے ''نہر معقل'' کہلائی۔ سب سے بڑی نہر خود امیر المومنینؓ کی طرف منسوب تھی، اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ تھی بھی ایسی جس کا انتساب، خود امیر المومنین کی طرف ہونا چاہئے تھا۔ اُس زمانے میں دریائے نیل کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے دہانے کے قریب جا کر اس قابل نہیں رہتا تھا کہ اس سے جہاز بحیرۂ قلزم میں داخل ہو سکیں۔ جب 18ھ میں عرب میں قحط پڑا ہے تو حضرت عمرؓ نے تمام مملکت کے صوبوں کو لکھا تھا کہ جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ غلہ مدینہ بھیجیں۔ غلّہ بافراط شام اور مصر سے آ سکتا تھا لیکن ان مقامات سے خشکی کا راستہ اس قدر طویل تھا کہ قافلہ کو مدینہ پہنچتے پہنچتے بہت دیر لگ جاتی تھی۔

نیل اور بحیرۂ قلزم

حضرت عمرؓ نے سوچا کہ اس مستقل دِقت کا رفع کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے فسطاؔط سے ایک نہر کاٹ کر بحیرۂ قلزم سے ملا دی گئی۔ یہ نہر قریب سَتر میل لمبی تھی، اور ایسی کہ اس سے جہاز بآسانی بحیرۂ قلزم تک پہنچ سکتے تھے۔ اس سے مکّہ اور

مدینہ کی بندرگاہ جدّہ اور مصر گویا ایک ہو گئے۔

نہر سویز کا تصور

اُس زمانے میں نہر سویز نہیں تھی اس لئے بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم ایک دوسرے سے الگ تھے۔ اُن کے درمیان قریب ستر میل لمبا خشکی کا قطعہ تھا۔ حضرت عمروؓ بن عاص نے تجویز کیا کہ اس خشکی کے قطعہ میں سے نہر نکال کر اِن دونوں سمندروں کو ملا دیا جائے۔ تجویز تو معقول تھی لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس سے ایک سیاسی خطرہ ہے اور وہ یہ کہ اس طرح یونانی، جہازوں کے ذریعے آکر حاجیوں کو لوٹ لیا کریں گے، اس لئے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ نہر کھد جاتی تو ''سویز'' کا سہرا بھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے سر ہوتا۔ بایں ہمہ، اس تجویز اور اس کے امکان کے خیال کی اوّلیت کا سہرا تو پھر بھی انہی کے سر ہے۔

نئے شہر

نہروں کے علاوہ مملکت میں مناسب مقامات پر بڑے بڑے شہر بسائے۔ ان میں بصرہ اور کوفہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان شہروں کے محلِ وقوع کا تعیّن خود کیا۔ ان کے نقشے خود مرتب کرائے جن میں شاہراہوں اور گلیوں کی الگ الگ نشان دہی کی گئی۔ مکانات اِبتداءً گھاس پھونس کے تھے لیکن آگ سے نقصان پہنچنے پر انہیں پختہ کر دیا گیا۔ حکم یہ تھا کہ کوئی شخص تین کمروں سے زائد پر مشتمل مکان نہ بنائے۔ ان شہروں کی وسعت اور آبادی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کوفہ کی جامع مسجد اس قدر وسیع تھی کہ اس میں چالیس ہزار نمازی آ سکتے تھے۔ اور اس کے باوجود آئندہ ضرورت کے لئے اس کے اردگرد کافی زمین کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔

سڑکیں

ساری مملکت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور ضروری مقامات پر بڑے مضبوط پُل تعمیر کر دیئے گئے۔ ان شاہراہوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حفاظت کے لئے چوکیاں اور مسافروں کے لئے سرائیں تعمیر کرادی گئیں۔

مساجد

جدید عمارات میں، مساجد کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اُس زمانے میں مسجد، صرف نماز پڑھنے کا مقام نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا مرکز تھی۔ اس سے مساجد کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق عہدِ فاروقی میں قریب چار ہزار جدید مساجد تعمیر ہوئی تھیں۔

بیت المال

ان کے علاوہ، مرکزی مقامات میں بیت المال کی عمارات نہایت مستحکم طریق پر بنوائی گئیں۔ حفاظت کی غرض سے انہیں مساجد کی عمارت کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا تھا۔ (ضمناً) جب سے اسلام، دین سے مذہب میں تبدیل ہوا ہے زکوٰۃ کی طرح بیت المال کے ساتھ بھی ''مذہبی تقدس'' کا تصور چسپاں ہو گیا ہے، حالانکہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی آمدنی کو کہتے تھے (جس سے نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچایا جانا مقصود تھا) اور بیت المال حکومت کے خزانہ کو۔ دین و سیاست کی اسی ثنویّت (الگ الگ ہونے) کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ کے نزدیک، حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ ـــــ اور سرکاری خزانہ اور بیت المال کو ایک قرار دینا ''کفر'' نہیں تو ''بے دینی'' ضرور ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ آئے دن مطالبہ ہوتا رہتا ہے کہ حکومت، زکوٰۃ کی وصولی کے لئے الگ محکمہ کھولے اور ''بیت المال'' قائم کرے! اسلامی حکومت میں، ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

عہدِ رسالتمآبؐ میں مسجدِ نبوی اُس زمانے کی ضروریات کے لئے کافی تھی لیکن عہدِ فاروقی میں مدینہ کی روز افزوں آبادی کے لئے وہ کافی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ 17 ھ میں حضرت عمرؓ نے مسجد کے گرد و پیش کے مکانات خرید کر، اسے وسیع کر دیا۔ اسی طرح حرمِ کعبہ کی بھی ضروری توسیع کرائی۔

عسکری نظام

اسلام میں ہر مومن، مجاہد (سپاہی) ہوتا ہے اس لئے حکومت کو الگ فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہر مسلمان، عام حالات میں اپنا اپنا کاروبار کرتا اور جنگ کی صورت میں، ان میں سے جتنے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی، وہ فوج کی شکل میں میدانِ کارزار کی طرف چلے جاتے۔ صورتِ حال تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی یہی تھی لیکن آپ نے اس میں ایک نظم اور باقاعدگی پیدا کی جس سے (یوں سمجھئے کہ) ''فوجی محکمہ'' کا وجود عمل میں آ گیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آپ نے رجسٹر مرتب کئے جن میں فوجی خدمت کے قابل تمام افراد کے نام اور کوائف درج تھے۔ چونکہ جنگوں کا سلسلہ متواتر جاری تھا، اس لئے آپ نے ان افراد کو دو حصوں میں تقسیم کیا ـــــ ایک وہ جو مہمات میں مسلسل مصروف رہتے تھے (انہیں آج کی اصطلاح میں ریگولر آرمی کہئے) اور دوسرے وہ جنہیں ہنگامی ضرورت کے وقت بلایا جاتا تھا (انہیں ریزروِسٹس کہہ لیجئے)۔ مختلف مقامات پر چھاؤنیاں بنوائیں۔ ان چھاؤنیوں میں جدید طرز کی بارکیں تعمیر کرائیں۔ اُس زمانے میں، جنگ کا بنیادی دارومدار گھوڑوں پر ہوتا تھا اس لئے آپ نے گھوڑوں کی افزائش، پرورش اور نگہ پرداخت کے لئے خصوصی انتظامات کئے۔ ان کے لئے چراگاہیں مختص کی گئیں، اصطبل بنوائے گئے۔ مرکزی مقامات پر ایک ایک اصطبل میں چار چار ہزار گھوڑے، سامانِ حرب و ضرب سے لیس، ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان گھوڑوں کو جو داغ دیا جاتا تھا اس میں جَیْشُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ کے الفاظ مُرتسم ہوتے تھے۔

رسد، سامانِ رسل و رسائل اور ذرائعِ مواصلات کے لئے الگ الگ محکمے قائم کئے۔ موسم کے لحاظ سے فوجوں کی ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ سپاہیوں کے لئے رخصت پر جانے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ فوج کے ''پرچہ نویس'' الگ تھے۔

یہ تمام انتظامات اس شخص نے کئے تھے جسے اپنی دس سالہ مدتِ خلافت میں، ایک دن بھی ایسا میسّر نہیں آیا تھا جس میں کہیں نہ کہیں جنگ نہ ہو رہی ہو، اور ان جنگوں کا بھی یہ نقشہ تھا کہ ایک طرف فوجیں سرحدِ چین پر تھیں تو دوسری طرف مصر کے میدانوں میں۔ اور ٹکراؤ تھا ایران اور روم کی ان سلطنتوں کے ساتھ جن کی ہیبت سے تاریخ کے اوراق آج بھی کپکپاتے ہیں۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اس تمام دوران میں، اندرونِ ملک بغاوت تو ایک طرف، کسی قسم کا کوئی خلفشار تک نمودار نہیں ہوا۔ آج داخلی فسادات اور بغاوتوں کو دبانے کے لئے حکومت کے پاس فوج (STANDING ARMY) ہوتی ہے لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکومت کی اپنی الگ کوئی فوج نہیں تھی۔ ساری قوم ہی فوج تھی جو ملک میں بکھری ہوئی تھی۔ ان حالات میں، ملک میں کسی قسم کا فساد رُونما نہ ہونا، حسنِ نظم و نسق کی ایسی شہادت ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی۔

کیا ایسے منتظم کے فطین اور نابغہ ہونے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟

سپاہی، مبلغِ اسلام

لیکن یہ سپاہی ''حزب اللہ'' کے جانباز، زمینوں کو فتح کرنے والے ہی نہیں تھے، انسانی قلوب کو مسخر کرنے والے بھی تھے۔ یہ اشاعتِ اسلام کا مؤثر ترین ذریعہ تھے، ان کی وجہ سے اسلام بڑی تیزی سے پھیلا — لیکن ان کی تلوار سے نہیں، ان کی سیرت و کردار سے، ان کے حسنِ اخلاق سے، ان کی پاکیزگیٔ قلب و نگارہ سے، ان کی دیانت و امانت سے، ان کی خوش معاملگی سے۔ آپ نے ''فتوحات'' کے باب میں دیکھا نہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں کا جو وفد بھی ان کے پاس آیا، اس نے واپس جا کر یہی رپورٹ دی کہ یہ لوگ جس حُسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کے حامل ہیں، اس کے پیشِ نظر دنیا کی کوئی قوم بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہمیں اُن سے صلح کر لینی چاہئے۔ پاکیزگیٔ کردار کے علاوہ حضرت عمرؓ جس فوجی افسر کا انتخاب کرتے، یہ دیکھ لیتے کہ اسے دین کا علم اور تفقہ حاصل ہے؛ چنانچہ آپ نے دیکھا ہے کہ ان فوجیوں کے جو وفد ایرانی اور رومی درباروں میں پہنچے، انہوں نے وہاں اسلام کی خصوصیات اور اس کی انقلاب آفریں تعلیم کے اصول و مبانی کس حُسنِ بلاغت سے پیش کئے تھے۔

قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت

اُس زمانے میں، اشاعتِ اسلام کا عملی مفہوم قرآنِ کریم کی تعلیم و تعلّم، درس و تدریس اور نشر و اشاعت تھا۔ حضرت عمرؓ

کو قرآنِ مجید کے ساتھ کس قدر والہانہ شیفتگی تھی' اسے ہم حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه کے باب (چہارم) میں دیکھ چکے ہیں۔ اپنے عہدِ خلافت میں انہوں نے قرآنِ کریم کی تعلیم کا عام انتظام کیا۔ مفتوحہ علاقوں میں ہر جگہ قرآنی درس کے حلقے قائم کئے۔ مدینہ منورہ میں جن صحابہؓ کو قرآنی مفاہیم پر زیادہ عبور تھا' انہیں مفتوحہ علاقوں میں بھیجا جاتا تاکہ وہ وہاں کی آبادی کو قرآنی تعلیم سے آشنا کرائیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعراب (بدو) اسلام کی سیاسی سیادت قبول کر چکے تھے لیکن اسلامی تعلیم سے آشنا نہیں تھے۔ ان کے لئے قرآن کی تعلیم جبری قرار دی گئی۔ مکاتب میں' قرآن کی تعلیم کے علاوہ' کتابت بھی سکھائی جاتی تھی تاکہ ملک میں (کم از کم) نوشت وخواند عام ہو جائے۔ اُس زمانے میں چونکہ تعلیم عام نہیں تھی اس لئے حفاظتِ قرآنِ مجید کا بہترین طریقہ حفظِ قرآن تھا۔ بنابریں' عہدِ فاروقی میں بھی حفّاظ کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ عام حفاظ کے علاوہ' وہ سورتیں جن میں بیشتر قرآنی احکام ہیں' ان کا حفظ کرنا ہر ایک کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ حفّاظ کے علاوہ قرآنِ کریم کے مصدّقہ نسخے ساری مملکت میں عام کئے گئے۔ امام ابنِ حزم کے بیان کے مطابق' عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآنِ کریم کے کم وبیش ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں تک فقہِ قرآنی کا تعلق ہے' اس کی تعلیم امیرالمومنین اپنے خطبات میں خود دیتے تھے اور اس کے بعد انہیں تحریری طور پر مملکت کے مختلف مرکزی مقامات میں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں کے فقہاء معاملات کے فیصلوں میں ان سے مدد لیتے اور راہنمائی حاصل کرتے تھے۔

ہر شخص مجاز نہیں تھا

واضح رہے کہ اُس زمانے میں ہر شخص مسائل کی تعلیم دینے کا مجاز نہیں تھا۔ یہ سب حکومت کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ اُس زمانے میں مسلمانوں میں فرقے پیدا ہوئے تھے' نہ ان میں باہمی سرپھٹول ہوتی تھی۔ تفرقات وفسادات تو مذہبی پیشوائیت کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

سنِ ہجری کا تعیّن

متفرق تدابیر میں حضرت عمرؓ کا سب سے نمایاں کارنامہ سنِ ہجری کی تعیین وترویج ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ آپ کے سامنے ایک اہم دستاویز آئی جس پر صرف ''شعبان'' لکھا ہوا تھا' سن کوئی نہیں تھا۔ اس سے یہ متعین کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی کہ اس دستاویز کا تعلق کس سال سے ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے سن متعین کرنے کی تجویز پیش کی۔ باہمی مشاورت سے طے پایا کہ ہمیں اپنے سن کا آغاز نبی اکرمؐ کی ہجرت سے کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ دین کی تاریخ میں عظیم انقلابی واقعہ ہے۔ ہجرت' ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی لیکن چونکہ عرب نیا سال محرم سے شروع کیا کرتے تھے اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ تاریخِ ہجرت کو دو ماہ پیچھے ہٹا کر' سنِ ہجری کا آغاز اُسی سال کے محرم سے کیا جائے۔ یہی سنِ ہجری آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔ عرب میں مروجہ دستور کے مطابق حساب قمری مہینوں کا رکھا گیا۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے حساب قمری بھی رکھا جا سکتا ہے

اور شمسی بھی۔ سورۂ انعام میں ہے وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا [6:96 نیز 10:5; 17:12] سورج اور چاند دونوں حساب کے لئے بنائے گئے ہیں۔

سیکریٹریٹ کا کاروبار

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے حضرت عمرؓ نے سیکریٹریٹ قائم کیا تو ہر شعبہ کے لئے الگ الگ دفاتر اور ہر دفتر میں مختلف امور سے متعلق الگ الگ رجسٹر تیار کروائے۔ مملکت کا تمام کاروبار تحریری ہوتا تھا اور اہم واقعات و حوادث اور اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ دوسری مملکتوں کے ساتھ جس قدر معاہدات کئے جاتے تھے اور مفتوحہ علاقوں کے ذِمّیوں کو جس قدر ضمانتیں دی جاتی تھیں' ان سے متعلق دستاویزات امیر المومنین کی اپنی حفاظت میں رہتی تھیں۔ یہ تھا امورِ مملکت سے متعلق طریقِ کار۔

یہ ریکارڈ کہاں چلا گیا

اس مقام پر ایک نہایت اہم بات سامنے آتی ہے۔ اسلامی مملکت' رسولؐ اللہ کے زمانے میں قائم ہوئی۔ عہدِ صدیقیؓ میں اس میں وسعت ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اس کی وسعتیں قریب ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر پھیل گئیں۔ اس تمام اَثناء میں بلکہ خلافتِ عثمانی میں بھی مدینہ' اس مملکت کا دار الخلافہ رہا۔ عہدِ فاروقیؓ میں کاروبارِ مملکت کے متعلق دفاتر بھی قائم ہو گئے' ان میں فائلیں بھی کھل گئیں۔ دستاویزات محفوظ رکھی گئیں' خط و کتابت کا ریکارڈ رکھا گیا' اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب کئے گئے لیکن کیا یہ چیز انتہائی حیرت کا موجب نہیں کہ اُس دَور کا ایک پرزۂ کاغذ بھی کہیں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں' ہر بلائے ارضی و سماوی سے محفوظ رہا' نہ اس میں کوئی سیلاب آیا نہ زلزلہ' نہ کوئی ایسی بڑی آگ لگی جس سے شہر تباہ ہو گیا ہو نہ کسی قوم نے اس پر یورش کی کہ اس نے وہ سارا ریکاڈ ضائع کر دیا ہو۔ اس تمام عرصہ میں یہ بلدِ طیّب مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور اس کا تقدس و احترام ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں۔ اس کے بعد' کیا یہ بات کسی کی سمجھ میں بھی آ سکتی ہے کہ اس تمام ریکارڈ کو بالآخر ہوا کیا۔ وہ گیا کہاں! اُسے کون لے گیا۔ کس نے اُسے تلف کر دیا اور تلف بھی اس طرح کیا کہ اس کا نام و نشان تک کہیں باقی نہ رہا! مؤرخین نے اپنی کتابوں میں جو اُس زمانے کی بعض دستاویزات کو نقل کیا ہے تو انہوں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے انہیں کہاں دیکھا تھا' پھر انہیں کیا ہوا' وہ کہاں چلی گئیں۔ ہماری تاریخ میں اس اوریجنل (ORIGINAL) ریکارڈ کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی اُن کی نقول کے متعلق کسی نے یہ بتایا ہے کہ ان کے مصدقہ ہونے کی سند کیا ہے؟ ہر روایت زبانی ہے اور درج ہے ان کتابوں میں جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ کے دو تین سو سال بعد مدون ہوئیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر دو ایک مکتوباتِ گرامی کے عکس شائع ہوتے رہتے ہیں' جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے وہ کسریٰ (یا مقوقس) کو بھیجے تھے۔ ان مکتوبات کا احترام اپنی جگہ پر' لیکن جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہنمائی کرتی

ہیں' ان کے متعلق بھی کسی نے وثوق سے نہیں بتایا کہ ان کی اصل (ORIGINAL) کہاں ہے اور ان کے حصول کا ذریعہ کیا؟ جہاں تک جعلی دستاویزات وضع ہونے کا تعلق ہے' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔

اُس دور کی جعلی دستاویزات

امام ابن فروحون کی کتاب الدیباج المذّھب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہودیوں نے ایک بار مسلمانوں کے رئیس کے سامنے رسول اللہؐ کی طرف سے ایک عہد نامہ پیش کیا جس میں تحریر تھا کہ خیبر کے یہودیوں سے جزیہ نہ لیا جائے۔ اس کی بنیاد پر ان کا مطالبہ تھا کہ ان سے جزیہ ساقط کیا جائے۔ لوگ اس معاہدہ سے حیرت زدہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں امام ابوبکر خطیب بغدادی موجود تھے۔ ان کے سامنے اس معاہدہ کو پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ جعلی ہے۔ اس لئے کہ اس پر تاریخ 7ھ درج ہے اور اس پر گواہوں میں امیر معاویہؓ کا نام ہے جو 8ھ میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور واقعۂ خیبر میں شریک نہیں تھے۔ علاوہ ازیں' اُس پر سعد بن معاذ رئیسِ انصار کے بھی دستخط ہیں جو فتح خیبر سے پہلے واقعہ بنی قریظہ میں وفات پا چکے تھے۔

لہٰذا' یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے اس قسم کی جعلی دستاویزات وضع کرنا کچھ بعید نہیں۔ علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے الفاظ میں ''جو قوم اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر سکتی ہے اس کے لئے اس قسم کے پروانے بنا لینے کچھ بھی مشکل نہیں[1]''۔

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ صدرِ اوّل میں مسلمانوں کی اتنی وسیع و عریض مملکت قائم رہی لیکن (دیگر مقامات تو ایک طرف) خود اس کے دارالخلافہ (مدینہ) میں بھی اس کے ریکارڈ میں سے کاغذ کا پرزہ تک نہیں ملتا۔ کیا اس سے لامحالہ ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ کوئی بڑی سازش تھی جس کی رُو سے اُس دورِ ہمایوں کے ریکارڈ کی ایک چٹ تک بھی باقی نہ رہنے دی گئی تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ صحیح اسلامی مملکت کا نقشہ اور اندازِ حکومت کس قسم کا ہوتا ہے — نہ یہ معلوم ہو سکے اور اس لئے نہ ہی کوئی دورِ ملوکیت کے کسی اقدام کے خلاف یہ کہہ کر اعتراض کر سکے کہ یہ اُس حکومت کے انداز کے خلاف ہے جو رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں قائم تھی۔

اُف! کس قدر مہیب تھی یہ سازش؟

ہمارے اوریجنل مآخذ کی تو کیفیت یہ' اور تاریخ کا یہ عالم کہ اس میں وہ گفتگو بھی لفظاً لفظاً درج ہوتی ہے جو میدانِ جنگ میں ان دو سپاہیوں کے درمیان ہوئی تھی جب وہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور جن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا تھا۔

محفوظ صرف قرآنِ مجید ہے

اور یہ ہے وہ تاریخ جس کی بنیادوں پر ہمارا ''مروجہ اسلام'' منضبط ہوا ہے۔ یاد رکھئے! ہمارے پاس محفوظ صرف خدا کی

1۔ نوادراتِ علامہ اسلم جیراجپوری۔ صفحہ 28' ایڈیشن دوم (1989ء) مطبوعہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور۔

کتاب (قرآنِ مجید) ہے جس کا ایک ایک لفظ بلاشک وشبہ وہی ہے جسے خدا نے اپنے آخری رسولؐ پر وحی کیا اور جسے رسولؐ اللہ نے اُمت کو دیا[1]۔ یہی ہمارا اوریجنل ریکارڈ ہے اور یہی دین میں سند اور حجت۔ فقہ ہو یا حدیث' تاریخ ہو یا تفسیر' جو کچھ ان میں' قرآنِ مجید کے مطابق ہے اسے صحیح باور کیا جا سکتا ہے' جو اس کے خلاف ہے وہ بلا تامل مسترد کر دینے کے قابل۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰہِ تو اس سے یہی مقصود تھا۔

نظامِ عدل

اگر یہ پوچھا جائے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے حکومت کی ضرورت کیوں ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حکومت کی ضرورت عدل کے لئے ہے۔ یہی اس کی وجہِ جواز ہے' یہی اس کے قیام کی اساس و بنیاد۔ جس مملکت میں عدل نہیں وہ انسانوں کی دنیا نہیں' درندوں کا مسکن ہے جہاں ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' نہجِ زندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک عام حکومت میں عدل کو یہ اہمیت حاصل ہے تو اسلامی حکومت میں' جو خدا کے نام پر' خدا کے قوانین و احکام کے نفاذ کے لئے قائم کی گئی ہو' عدل کا جو مقام ہوگا' وہ واضح ہے۔

قرآنِ کریم میں عدل کی تاکید

چنانچہ قرآنِ کریم میں عدل و انصاف کے لئے بڑے تاکیدی احکام آئے ہیں۔ ایک مختصر لیکن جامع آیت میں کہا گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ [16:90] اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے (احسان کا صحیح مفہوم' معاشی نظام سے متعلق باب میں بتایا جائے گا)۔ دوسری جگہ ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ [7:29] ''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میرے ربّ نے انصاف کا حکم دیا ہے''۔ سورۂ شوریٰ میں ہے وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ [42:15] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم میں عدل کروں''۔ عدل کا مقام کون سا ہوتا ہے' اس کے متعلق فرمایا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ [4:58 نیز 5:42] ''خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کے مطابق فیصلہ کرو''۔ واضح رہے کہ حُکْمٌ کے معنی فیصلہ کرنا ہیں اور یہیں سے ''حکومت'' کا لفظ بنا ہے۔ لہٰذا' قرآنی نقطۂ نگاہ سے' حکومت سے مراد ہے وہ ادارہ جو عدل کے مطابق فیصلے کرے۔

ظاہر ہے کہ متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے' عدالت کے علاوہ' مدعی' مدعا علیہ' اور گواہ بھی ضروری ہوں گے۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے جو جامع احکام دیئے ہیں' اُن سے نظامِ عدل کا پورا پورا نقشہ ذہن کے سامنے آ جاتا ہے۔ فرمایا:

> اے جماعتِ مومنین! تم قیامِ عدل کے ذمہ دار بن کر رہو۔ کسی معاملہ میں شہادت دینی ہو تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر آؤ' نہ مدعا علیہ کی طرف سے' تم ''خدا کی طرف سے'' گواہی دینے کے لئے آؤ۔ بات سچی کہو خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف

1۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' آخری باب۔

ہی کیوں نہ جائے' تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف' یا تمہارے رشتے داروں کے خلاف۔ یہ مت دیکھو کہ فریقین میں کون غریب ہے اور کون امیر۔ تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کر آئے ہو۔ تم ان کی پوزیشن کا خیال مت کرو۔ خدا کا قانون خود دیکھ لے گا کہ فیصلہ کس کے حق میں جانا چاہئے۔ بڑے محتاط رہو کہ کہیں تمہارے جذبات' حق گوئی کے راستے میں حائل نہ ہو جائیں۔ جب بات کرو' صاف صاف کرو' واضح' دوٹوک بات کرو۔ نہ توڑ مروڑ کر بات کرو اور نہ ہی سچی گواہی دینے سے اِعراض برتو۔ یاد رکھو! تم جو کچھ بھی کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے (4:135)۔

یہ تو پھر بھی اپنوں کی بات تھی۔ قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی [5:8]

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر ایک سے عدل کرو' ہر حال میں عدل کرو۔ عدل' تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

عدل سے مراد

لیکن عدل کے معاملہ میں ایک بنیادی نقطہ سمجھنے کے قابل ہے۔ دنیا کے عام معیار کے مطابق' عدل سے مراد ہے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا۔ یعنی اگر کسی معاملہ کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق ہو' تو اسے مبنی بَرعدل کہا جائے گا۔ اگر فیصلہ قانون کے خلاف ہو تو اُسے بے انصافی یا دھاندلی سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے ہی کو عدل کہا جانا چاہئے لیکن قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اگر خود وہ قانون ہی ظلم پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ' مبنی بر عدل کس طرح کہلا سکے گا؟ لہٰذا' قوانین بھی عدل پر مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے متعلق تو اس امر کی ضمانت کبھی نہیں دی جاسکتی کہ ان میں' شعوری یا غیر شعوری طور پر' واضعینِ قوانین کے جذبات کی آمیزش شامل نہیں ہوئی۔ انسان مشین نہیں کہ اس میں جو کچھ ڈالا جائے وہ اپنے رجحانات کی آمیزش کے بغیر اسے اسی طرح آگے گزار دے۔ وہ اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا ہے۔ جو بات اس دل میں سے ہو کر گزرے گی اس میں' اس کی رنگینی کے شائبہ کی آمیزش کا امکان ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ جذبات سے بلند و بالا صرف خدا کی ذات ہے' اور اسی کی طرف سے دیئے گئے قوانین کے متعلق ہی حتم و یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان میں قانون وضع کرنے والے کے جذبات کی آمیزش نہیں۔ اس نے وحی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی [53:3-4] یہ (قرآن) وحیٔ خداوندی ہے۔ اس میں صاحبِ وحی کے اپنے خیالات و جذبات کی آمیزش قطعاً نہیں۔

قرآنی معیارِ عدل

لہٰذا' قرآنِ کریم کی رُو سے عدل مراد ہوگا وہ فیصلہ جو وحی پر مبنی قوانین و اقدار کے مطابق کیا جائے' اس طرح فیصلے کرنے

والوں کے متعلق کہا کہ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ [7:181] ''یہ وہ لوگ ہیں جو الحق (وحیٔ خداوندی) کے مطابق عدل کرتے ہیں''۔ حضرت عمرؓ نے قرآنِ کریم کی عام نشر و اشاعت کے لئے جو اس قدر اہتمام کیا تھا تو اس سے بنیادی مقصد یہی تھا کہ معاملات کے فیصلے اس کی راہنمائی میں کئے جائیں۔

قانونی عدل

عدل کی ضرورت زندگی کے ہر گوشے میں پڑتی ہے لیکن اس وقت ہم اس کے صرف اس گوشے سے بحث کریں گے جس کا تعلق ''قانونی عدل'' سے ہے۔ اسی کو عام طور پر عدالتی فیصلے کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے مملکت کے گوشے گوشے میں عدالتیں قائم کیں جن میں مقرر کردہ ججوں کو (جنہیں قاضی ــــ یعنی فیصلہ کرنے والے کہا جاتا تھا) وہ وقتاً فوقتاً ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ہدایات صرف اس بناء پر نہیں بھیجی جاتی تھیں کہ مملکت کی آخری اتھارٹی، امیر المومنین تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ امیر المومنین (حضرت عمرؓ) فقۂ قرآنی کے جیّد عالم تھے اور اس باب میں ان کی نگاہ اس قدر وسیع اور عمیق تھی کہ کوئی اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت عمرؓ کا علم

حضرت ابنِ مسعودؓ (جو خود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے) کا قول ہے کہ ''اگر عمرؓ کا علم ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور تمام عرب قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں، تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا جھکتا رہے گا''۔ عہدِ جاہلیت میں ان کے ذوقِ علم و شوقِ تجسّس کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد، انہوں نے انتہائی شغف و اِنہماک سے، ذاتِ رسالتمآبؐ سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ عہدِ صدیقیؓ میں انہیں مدینہ کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ خود اپنے دورِ خلافت کے اِبتدائی ایام میں بھی قضاء کے فرائض وہ خود ہی سرانجام دیتے تھے۔ بنابریں، امورِ قضا کے متعلق ان کی ہدایات ان کے وسیع علم، عمیق نگاہ، اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان میں کچھ ہدایات جو تاریخ میں محفوظ ہیں، ان مکتوبات میں مندرج ہیں جو انہوں نے نامور قضاۃ اور امراء کی طرف بھیجے تھے۔ ان میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نام مکتوبات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں مندرج ہدایات کا ملخص درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی ہدایات

(1) قضا، فریضۂ خداوندی اور سنتِ رسول اللہؐ ہے، اس سے اس ذمہ داری کی اہمیت واضح ہے۔

(2) جب آپ کے سامنے کوئی مقدمہ آئے اور آپ اس کے ہر پہلو پر غور و تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں تو اس کے فیصلے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ فیصلہ تحریری ہونا چاہئے۔ زبانی فیصلہ بے سند ہوتا ہے، اور فیصلہ وہی فیصلہ کہلا سکتا ہے جسے

نافذ کر دیا جائے۔

(3) دورانِ سماعت' فریقین کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو۔ کسی فریق سے بات کرنے' یا عدالت میں بٹھانے یا کسی اور نہج سے' کسی قسم کا امتیاز نہ برتو تا کہ اس سے باوقار فریق کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ آپ اس کی وجاہت سے متاثر ہو گئے ہیں اور کمزور فریق' انصاف کی طرف سے مایوس ہو جائے۔

(4) بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوگا اور مدعا علیہ اگر شہادت نہ پیش کر سکے تو اس سے حلف لے لینا چاہئے۔

(5) فریقین میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے مگر ایسی مصالحت نہیں جس میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کا درجہ دے دیا جائے۔

(6) اگر آپ نے آج ایک فیصلہ کیا ہے اور کل کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو اس فیصلہ سے رجوع کر لینا آپ کے منصب کے منافی نہیں۔

(7) جب کسی معاملہ میں نصِ صریح نہ ملے تو اس کے نظائر و امثال کی جستجو کرو اور ان پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کرو کہ کون سی بات حق سے زیادہ قرب ہے۔ اس پر اعتماد کرو۔

(8) مدعی یا مدعا علیہ میں سے جو بھی ثبوت یا گواہ پیش کرنے کے لئے مہلت مانگے' اسے مہلت دے دو۔

(9) گواہی کے لئے ہر مسلمان ثقہ ہے بجز اُن کے جنہیں کسی جرم کی پاداش میں ساقط الاعتبار قرار دے دیا گیا ہو۔

(10) فیصلہ ظاہری بیانات اور شہادات پر ہوگا۔ پوشیدہ امور اور نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے۔

(11) تمہارے دل میں اہلِ مقدمہ کی طرف سے کبھی خفگی' اکتاہٹ یا چڑ چڑا پن پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیشہ تحمل اور بُردباری سے کام لینا چاہئے۔

(12) شبہ کی صورت میں' سزا دینے کے مقابلہ میں سزا نہ دینا بہتر ہے۔

(13) غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرو۔ اسے ملتوی کر دو۔

(14) یاد رکھو! قاتل' مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔

(15) لوگوں کے فیصلے کرتے وقت' ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو۔

دیگر ہدایات

اس قسم کی ہدایات آپ اکثر نافذ کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ' آپ نے بعض معاملات میں جو فیصلے خود صادر فرمائے' یا کسی اور ضمن میں کوئی اور حکم نافذ کیا' ان سے بھی قانونی عدل کے سلسلہ میں راہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً

(1) آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک دفعہ لکھا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی عجمی (غیر عرب) کو امان دے یا کسی

قسم کا اشارہ کرے' یا ایسی زبان میں اس سے بات کرے جسے وہ سمجھتا نہ ہو' اور وہ اسے اپنے لئے امان سمجھ لے' تو اسے امان ہی تصور کرو۔ اگر تم اس قسم کے الجھاؤ سے بچنا چاہتے ہو تو ایسا انتظام کرو کہ دوسرے سے بات اس انداز سے کی جائے جس سے صاف صاف مطلب اس کی سمجھ میں آ جائے۔

اس سے قانونی عدل کے لئے ایک اہم اصول مستنبط ہوتا ہے۔

(2)۔ (ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ) ایک دفعہ ایک بدّو آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے حالتِ احرام میں ایک ہرن مار دیا ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف' آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ فرمایئے! اس باب میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک بکری فدیہ میں دے دے۔ آپ نے بدّو سے یہی کہہ دیا۔ اس پر اس بدّو نے کہا کہ آپ کس قسم کے امیر المومنین ہیں کہ آپ کو اتنے آسان سے مسئلہ کا جواب بھی خود معلوم نہیں تھا' دوسرے سے پوچھنا پڑا۔ آپ نے فرمایا کہ بات یہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کا حکم ہے کہ ایسے معاملات میں' دو صاحبِ عدل فیصلہ کریں۔ اس لئے مجھے' اپنے ساتھ ایک اور کی رائے لینے کی ضرورت تھی۔

اس سے واضح ہے کہ قانون کی رُو سے' کسی بڑی سے بڑی شخصیت' حتیٰ کہ سربراہِ مملکت' کی بھی رائے' ایک ہی تصور اور شمار کی جائے گی۔

وہ قابلِ اعتماد ہے جو معاملات میں کھرا ہے

(3) ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اسے سے پوچھا کہ

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟

اس نے کہا: نہیں۔

پھر پوچھا: کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟

اس نے کہا: نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کہ:

کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں' تو آپ نے فرمایا کہ:

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے' سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔

غور کیجئے کہ کسی کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کے لئے آپ نے کیا معیار قرار دیا ہے!

معقول عذر قابلِ قبول

(4) ایک شخص کو دیکھا کہ حرم کا درخت کاٹ کر اپنے اونٹ کو کھلا کر رہا ہے۔ یہ جرم تھا۔ آپ نے اسے گرفتار کر لیا اور پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں دُور کا مسافر ہوں۔ توشہ اور نفقہ میرے پاس نہیں۔ اونٹ میرا بہت لاغر اور بھوکا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں نے اسے کچھ کھلایا نہیں تو یہ یہیں ڈھیر ہو کر رہ جائے گا اور میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس لئے جو کچھ میرے سامنے آیا' میں نے اسے کھلا دیا۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس کا عذر معقول ہے' اسے آٹے سے لدا ہوا ایک فربہ اونٹ دے دو۔

مجبور کو سزا نہیں

(5) زنا بالجبر کے مقدمہ میں آپ نے یہ کہہ کر عورت کو سزا نہیں دی کہ مجبور اپنے کسی فعل کے لئے قابلِ مؤاخذہ قرار نہیں پا سکتا۔

بھوکوں کی چوری

(6) اسی سلسلہ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چُرا کر' ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطبؓ ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطبؓ کو بلا کر کہا کہ چاہئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں' تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس سے ایک عظیم معاشی اصول مستنبط ہوتا ہے جس کی وضاحت' معاشی نظام' سے متعلق باب میں کی جائے گی۔

(7) ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قضاۃ کو ہدایت کی تھی کہ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت فریقین میں سے کسی کی پوزیشن کا قطعاً خیال نہ کیا جائے۔ فیصلہ' عدل کے تقاضے کے مطابق کیا جائے۔ اس ضمن میں خود حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ ایسا ہے جو انسانیت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

جبلّہ بن ایہم کا واقعہ

''فتوحات'' سے متعلق باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کی شمالی سرحدوں پر قدیم عربی قبائل آباد تھے' جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ان قبائل کے سردار' ہرقل کی طرف سے اپنے اپنے علاقہ کے حاکم تھے۔ وہ وہاں کے بادشاہ ہی متصور ہوتے تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک قبیلہ کا سردار' جبلہ بن ایہم' مع اپنے قبیلہ کے پانچ سو افراد کے مسلمان ہوگیا اور مدینہ آ گیا۔ وہاں اُسے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ رکھا گیا۔ حج کے موقعہ پر وہ حضرت عمرؓ کی معیت میں مکہ آیا۔ وہ طواف کر رہا تھا کہ اس کے تہبند کا پلو ایک بدّو کے پاؤں تلے آ گیا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر اس بدّو کی ناک پر ایک مکہ دے مارا۔ بدو نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور جبلہ نے اس کا اقرار کیا۔ اس پر آپ نے اُس سے کہا کہ تم اس بدّو کو منا کر مصالحت کر لو' ورنہ تمہیں اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں بادشاہ ہوں اور وہ معمولی بدو ہے۔ میں اس سے کیسے معافی مانگ سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''بادشاہ اور معمولی بدو میں فرق' تمہارے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے۔ اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔ یہاں سب برابر ہوتے ہیں''۔ اس نے کہا کہ ''امیر المومنین! میں تو سمجھا تھا کہ اسلام لانے کے بعد' مجھے جاہلیت کے مقابلہ میں زیادہ عزت دی جائے گی لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے''۔ آپ نے فرمایا کہ ''اسلام میں عزت کا معیار تقویٰ ہے اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ تم یا تو اس بدو کو راضی کر لو' ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جاؤ''۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دی جائے۔ اُسے مہلت دے دی گئی۔

مدینہ میں اس واقعہ کا خاصا چرچا ہوگیا۔ حضرت عمرؓ کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے آپ سے کہا کہ اس معاملہ میں اس قدر متشدد نہ ہوں۔ ذرا نرمی برتیں۔ آپ نے انہیں جواب دیا کہ اگر کسی شخص کی وجاہت کے اثر سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے تو پھر خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی ملوکیّت میں فرق کیا ہوا! چنانچہ آپ ذرا نہ جھکے۔ اور جبلہ دوسری صبح' اپنے ساتھیوں سمیت' پھر ہرقل کے پاس چلا گیا اور عیسائی ہوگیا۔

اس طرح اسلام لانے والے' اسی طرح واپس چلے جایا کرتے ہیں! اس سے اسلام کا رُخِ روشن اور زیادہ تابناک ہو جاتا ہے۔

جبلہ کے متعلق' علامہ ابنِ عبدربّہ نے اپنی (محاضرات کی مشہور) کتاب' عقد الفریدؔ' میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جبلّہ کے ہرقل کے پاس جانے کے کچھ عرصہ بعد' حضرت عمرؓ کا ایک قاصد' دعوتِ اسلام لے کر ہرقل کے دربار میں گیا۔ اس نے کہا کہ تم آئے ہو تو جبلہ سے بھی ملتے جاؤ۔ وہ جبلہ کے پاس گیا تو وہاں بڑے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھے۔ جبلہ نے پہلے عامتہ المسلمین کی خیریت دریافت کی اور پھر حضرت عمرؓ کی بابت دریافت کیا۔ ان کی خیریت کی خبر سے اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمودار ہوئے۔ اس دوران میں قاصد' اس کے سنہری تخت سے اُٹھ کر دوسری

جگہ جا بیٹھا۔ جبلہ نے کہا کہ میں نے تمہاری عزت افزائی کی اور سونے کے تخت پر بٹھایا اور تم اُس سے دُور ہٹ گئے۔ قاصد نے کہا کہ ہمیں رسولؐ اللہ نے سونے کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ اس پر جبلہ نے حضورؐ پر درود و سلام بھیجا۔ قاصد کا بیان ہے کہ جب میں نے اسے حضورؐ پر سلام بھیجتے سنا' تو میرے دل میں اس کے دوبارہ اسلام لانے کی حرص پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تم دوبارہ اسلام کیوں نہیں لے آتے؟ اس نے کہا کہ کیا میں اپنی ان حرکات کے بعد' دوبارہ حریمِ اسلام میں داخل ہوسکتا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر تم اس کی ضمانت دیتے ہو کہ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھے دے دیں گے اور اپنے بعد مجھے مسلمانوں کا حکمران بنا دیں گے تو میں دوبارہ اسلام لے آؤں گا۔ قاصد نے کہا کہ حضرت عمرؓ کی بیٹی سے تمہارے نکاح تک کی تو میں ضمانت دے سکتا ہوں لیکن خلافت کے بارے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہاں سے واپسی پر قاصد نے حضرت عمرؓ سے جبلؔہ کے اسلام لانے کی شرائط کا ذکر کیا اور کہا کہ میں نے اسے آپ کی بیٹی سے نکاح کی تو ضمانت دی تھی لیکن خلافت کی ضمانت نہیں دی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی بھی ضمانت دے دی ہوتی۔ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آتا تو پھر خدا کے احکام کے مطابق فیصلہ ہو جاتا۔

اس واقعہ سے (جس حد تک یہ صحیح نظر آتا ہے)' دو ایک نہایت بصیرت افروز نتائج سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ' کہ یہ حضرات لوگوں کو اسلامی دائرہ میں لانے کے لئے کس شدت سے آرزومند رہتے تھے۔ جبلؔہ بڑا ذی اثر سردار تھا اور (قاصد اور حضرت عمرؓ کو) معلوم تھا کہ وہ اسلام لے آیا تو اس کا سارا قبیلہ پھر سے حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائے گا۔ اس کے لئے امیر المومنین اسے اپنی بیٹی کا رشتہ تک دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کا ایک دوسرے پر اعتماد کس قدر تھا کہ ایک ایلچی' حضرت عمرؓ کی طرف سے ان کی بیٹی کے رشتہ کی ضمانت دے دیتا ہے اور حضرت عمرؓ یہ نہیں کہتے کہ تمہیں اس کا کیا حق حاصل تھا۔

تیسرے یہ کہ' یہ جو ہمارے ہاں "بطور مسلمہ" کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے' تو یہ عقیدہ بعد کا وضع کردہ ہے۔ اگر اُس دَور میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو جبلہ قاصؔد سے فوراً کہتا کہ تمہارے ہاں تو مرتد کو قتل کر دیا جاتا ہے تم مجھے اسلام کی دعوت ہی نہیں بلکہ ایسی ضمانتیں کیسے دے سکتے ہو؟

جہاں تک خلافت کی ضمانت کا تعلق ہے' نظر آتا ہے کہ وقائع نگار نے اس باب میں زیادہ باریک بینی سے کام نہیں لیا۔ قاصد یا حضرت عمرؓ نے یہ کہا ہوگا کہ اسلام لے آنے کے بعد جبلؔہ (باقی مسلمانوں کی طرح) خلافت کا امیدوار قرار پا سکتا ہے' وہ اُسے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے کہ اسے (حضرت عمرؓ کے بعد) خلیفہ بنا دیا جائے گا۔ اس قسم کی ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جو فرمایا تھا کہ جب وہ مسلمان ہو جائے گا تو خلافت کا فیصلہ احکامِ خداوندی کے مطابق ہوگا تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے جبلہ کو خلیفہ بنا دینے کی بات نہیں کی ہوگی۔ اسے صرف خلافت کے لئے امیدوار بننے کے

حق کی ضمانت کا کہا ہو گا۔

یہ ضمنی واقعہ تھا۔ اس کے بعد ہم پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی عدلِ فاروقیؓ کی طرف۔

اپنے بیٹے کا معاملہ

(8) قانون کے سلسلہ میں یہ تصلّب وتشدد' غیروں کے معاملہ میں ہی نہیں تھا' خود اپنوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ ہوتا تھا۔ ان کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن مصر میں تھے۔ وہاں انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ نبیذ پی لی جس سے انہیں نشہ ہو گیا۔ یہ جرم مستوجب سزا تھا۔ یہ دونوں حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ انہیں سزا دی جائے۔ حضرت عاصؓ نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیا۔ عبدالرحمٰن نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے ہمیں سزا نہ دی تو میں اس کی شکایت امیر المومنین سے کروں گا۔ اس پر حضرت عمرو بن عاصؓ مجبور ہو گئے لیکن انہوں نے اتنی رعایت برتی کہ عبدالرحمٰن کو پبلک میں کوڑے لگانے اور سر مونڈ کر تشہیر کرنے کے بجائے' اپنے مکان کے اندر سزا دے دی اور حضرت عمرؓ کو اس بارے میں کوئی اطلاع نہ دی۔ چند دنوں کے بعد' حضرت عمرو بن عاصؓ کو امیر المومنین کی طرف سے حسبِ ذیل مراسلہ موصول ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اللہ کے بندے' عمر کی جانب سے ''عاصی ابن العاصی'' کے نام۔

> ابن العاص! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر کے اندر کوڑے لگوائے اور اس نے وہیں اپنا سر مونڈا حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے تھا جو دوسرے مجرموں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے کہا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے' اس لئے اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا چاہئے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق لینے میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
>
> جس وقت تمہیں یہ خط ملے' عبدالرحمٰن کو ایک اونی چغہ پہناؤ اور پالان (ننگی پیٹھ کے اونٹ) پر سوار کر کے مدینہ روانہ کر دو تا کہ وہ اپنی بدکرداری کا مزہ چکھے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب عبدالرحمٰن مدینے پہنچے تو ننگی پیٹھ کے اونٹ پر سواری کی وجہ سے ان سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اسے باقاعدہ سزا دی جائے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! مجرم کو سزا مل چکی ہے۔ اب اسے اُسی جرم کی پاداش میں دوبارہ سزا کس طرح دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے اَن سنی کر دیا۔ بیٹا چلایا کہ ''میں بیمار ہوں۔ آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں''! اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے انہیں دوبارہ سزا دی اور قید کر دیا۔ وہ حالتِ قید میں بیمار ہوئے اور وہیں وفات پا گئے۔

اس میں (نظر بظاہر) سختی دکھائی دیتی ہے لیکن اگر سر براہِ مملکت اپنی اولاد کے ساتھ اس قسم کی سختی کی ایک نظیر قائم کر دے تو

مملکت سے جرائم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مجھے اپنا دوست نہ بنائیے

ہم آگے چل کر (کسی اور باب میں) بیان کریں گے کہ اُس دور میں، سربراہِ مملکت کا رشتہ دار ہونا، اسے کس طرح (DISADVANTAGEOUS) پوزیشن میں رکھتا تھا۔ رشتہ دار ہونا تو ایک طرف، اس کے دوست بھی دوسروں کے مقابلہ میں خسارے میں رہتے تھے۔ ابنِ طباطبا نے اپنی کتاب ''آداب السلطانیہ'' میں ایک شخص کا ایک فقرہ نقل کیا ہے جس سے عدلِ فاروقیؓ، آفتابِ جہانتاب کی طرح وجہِ درخشندگیٔ عالم بن جاتا ہے۔ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ

ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے معاف فرمائیے! مجھے اپنا دوست نہ بنائیے۔ دُور دُور ہی رہنے دیجئے۔

یہ ہیں سیرتِ فاروقیؓ کے وہ مقامات جہاں پہنچ کر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا معاملہ

(9) اب آگے چلئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کیا۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ (مصر کے گورنر) حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کے ساتھ کیا بیتی۔ ان کے بیٹے (محمد) نے ایک قبطی کو کسی بات پر تازیانوں سے پیٹا۔ وہ تازیانے مارتا جاتا تھا اور اسے کہتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اس نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں کو بلا بھیجا۔ اعترافِ جرم پر آپ نے اس قبطی سے کہا کہ جس طرح اس نے تمہیں تازیانوں سے پیٹا تھا، اسی طرح تم اس کے تازیانے لگاؤ۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ ''مار —— بڑوں کی اولاد کو اور مار''۔ جب وہ اُسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاصؓ) کے بھی مارو کہ اگر اس نے اس کی صحیح تربیت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا، سخت غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمرو بن عاصؓ کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریمِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کی تابندہ دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

''ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا'' —— یہ ہے قرآنِ کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے

کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ [17:70] ہم نے ہر انسان کو' اس کے انسان ہونے کی جہت سے' واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اپنے خلاف فیصلہ

(10) اور خود اپنے خلاف۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کر لو۔ اس نے کہا کہ میں شُریح کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔ انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ امیر المومنین! یا گھوڑا خریدیئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اُسے واپس کیجئے۔ آپ اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے اور شُریح سے کہا کہ آپ منصبِ قضاۃ کے لئے نہایت موزوں ہیں۔

یہی ہیں کوفہ کے مشہور قاضی شُریح' جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمالِ حُسن وخوبی سرانجام دیا۔

حضرت عمرؓ عدالت میں

(11) اس سے بھی آگے بڑھئے۔ آپ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے حضرت زید بن ثابتؓ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے ان سے کہا کہ زیدؓ! تم سے انصاف کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتداء ہی میں' فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے!! یہ کہہ کر مدعی کے قریب بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ فریقِ مخالف (ابی بن کعب) نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ان (مدعی) سے کہا کہ امیر المومنین سے قسم نہیں لینی چاہئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ زیدؓ! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ عدالت میں

(12) لیکن اس قسم کی غلطی تو ایک دفعہ خود ان (حضرت عمرؓ) سے بھی سرزد ہو گئی تھی۔ ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف' آپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ نسبتاً متمیز جگہ پر بیٹھ گئے تو آپ نے کہا کہ ''ابوالحسن! اُٹھو اور اپنے مدعی کے مقابل جا کر بیٹھ جاؤ''۔ حضرت علیؓ اٹھے اور مدعی کے قریب جا کر بیٹھ گئے لیکن آپ کے چہرے پر برافروختگی کے آثار تھے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد' حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ فریقِ مخالف کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گزرا تھا؟

حضرت علیؓ بھی تو بالآخر دست پروردگانِ رسالتؐ میں سے تھے۔ سنئے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ ''عمرؓ!

مجھے یہ قطعاً ناگوار نہیں گزرا۔ ناگوار یہ گزرا کہ تم نے میرا نام لینے کی بجائے مجھے میری کنیّت (ابوالحسن) سے پکارا اور فریقِ مقابل کو اس کے نام سے۔ اس سے تم نے جو عدمِ مساوات کا ثبوت دیا مجھے وہ ناگوار گزرا تھا۔

(واضح رہے کہ عربوں کے ہاں کسی کو نام کے بجائے کنیّت سے پکارنا' اس کی تعظیم پر دلالت کرتا تھا)۔

یہ تھا عدل کا معیار اُس دَور میں!

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ زیرِ نظر عنوان کو ہم ''قانونی عدل'' تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اِس خود عائد کردہ پابندی کے پیشِ نظر ہم اس باب کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عدل کے دوسرے گوشوں میں کس قسم کی مثالیں قائم کیں' ان کا تذکرہ الگ باب میں کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے شخصیت ایسی جامع ہے کہ اس کی سیرت کو جس زاویئے سے بھی دیکھئے' نگہِ شوق بے ساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ

زِ فرق تا بقدم ہر کُجا کہ می نِگرم!
کرشمہ دامنِ دل می کَشد کہ جا اِینجا ست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آٹھواں باب

حوادثِ آفاقی

(طاعون اور قحط) ـــــ سنہ 17-18ھ

جامِ جہاں نُما مجو، دستِ جہاں کُشا طلب!

جیوشِ اسلامیہ کو فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ علاقوں پر علاقے مملکتِ خداوندی کے جزو بنتے چلے جا رہے تھے۔ سلطنتوں کی سلطنتیں بارگاہِ خلافت میں باجگزاری کے لئے حاضر ہو رہی تھیں۔ دولت و ثروت ابرِ نیساں کی طرح برس رہی تھی۔ فراست و تدبرِ فاروقیؓ نے ساری مملکت کو شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت بنا دیا تھا کہ اتنے میں مملکت کو دو ایسے ہولناک حوادثِ سماوی نے گھیر لیا جن کا سدِ باب کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ تھا شام کے علاقہ کا طاعون اور عرب کا قحط!

حوادثِ آفاقی اور اِنسان

ہم نے کہا ہے کہ یہ وہ حوادثِ سماوی تھے جن کا انسداد کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ قرآنِ کریم میں قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں کہا گیا ہے کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا [2:31] خدا نے انسان میں، تمام اشیائے فطرت کے متعلق علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ نیز کئی ایک مقامات میں کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ [45:13] کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے کہ انسان انہیں اپنے کام میں لائے۔ ان ارشاداتِ خداوندی سے واضح ہے کہ حوادثِ ارضی و سماوی (طبیعی کائنات) میں سے کوئی حادثہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کا سدِ باب انسان کے بس کی بات نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان حوادث کا سدِّ باب تو قوانینِ فطرت کے علم کی رُو سے ہو سکے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم ہو گا، اسی قدر وہ ان حوادث پر قابو پا لینے کے قابل ہو سکے گا۔ آج سے چودہ سو سال تو ایک طرف، پچاس سال پہلے بھی حالت یہ تھی کہ ہیضہ، طاعون، انفلوئنزا (جیسے وبائی امراض) جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے تھے، لاکھوں جانیں ضائع کر کے رکھ دیتے تھے اور انسان بے چارہ،

بے کس و بے بس' کھڑا ان کا منہ تکتا رہ جاتا' اوران کے انسداد کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اب ایسی ادویات ایجاد ہوگئی ہیں جن سے بطورِ حفظِ ماتقدم ان کا سدّ باب کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت قحط کی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک خشک سالی کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور ذرائع مواصلات کی کمی کی وجہ سے' غلّہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن اب ایک طرف ذرائعِ آبپاشی کی متنوع صورتیں پیدا ہوجانے' اور دوسری طرف سامانِ رسل و رسائل کے عام اور تیز رفتار ہوجانے سے' قحط پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید ریسرچ جاری ہے۔ سنا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا میں مصنوعی بارشیں بھی برسانے لگ گئے ہیں۔ جب انسان نے قوانینِ فطرت کا پورا پورا علم حاصل کرلیا اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخّر کرلیا تو حوادثِ ارضی و سماوی پر قابو پالینا کچھ بھی مشکل نہیں رہے گا۔ (مشکل تو اپنے آپ پر قابو پانا ہے' خارجی حوادث پر نہیں۔ ملائکہ (فطرت کی قوتیں) تو سب کی سب' آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی تھیں' بغاوت اس کے اپنے سرکش جذبات نے کی تھی جسے قرآنی اصطلاح میں شیطان یا ابلیس کہا جاتا ہے)۔ آج سے چودہ سو سال پہلے' ان خارجی حوادث پر کماحقہٗ قابو پانا تو مشکل تھا لیکن جو سعادت مند انسان' اقدارِ خداوندی کی اطاعت سے' اپنے آپ پر قابو پانے کے اہل ہوگئے تھے ان کی دلگدازیاں اور حُسنِ تدبّر کی کرشمہ سازیاں' ان حوادث کی تباہ کاریوں کی کافی حد تک تلافی کر دیتی تھیں۔ اس وقت ہمارے سامنے' آفاقی حوادث کی تباہ کاریوں اور ان کے مقابلہ کے لئے ''دستِ جہاں کُشا'' کی سعی و کاوش کی عبرت آموز و بصیرت افروز داستان کا ایک باب ہے۔

عمواس کا طاعون

17ھ کے اواخر کی بات ہے کہ فلسطین کے شہر عمواس میں طاعون پُھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام سے عراق تک سارے علاقہ میں سیلاب کی طرح پھیل گیا۔ یہ وہ علاقے تھے جن میں اُس وقت مملکتِ اسلامیہ کی فوجیں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سب اس طوفان کی لپیٹ میں آگئیں۔ یہ وبا مہینوں تک پھیلی رہی اور (ایک اندازہ کے مطابق) قریب پچیس ہزار مسلمان اس کی نذر ہوگئے۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ مثل حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ' معاذ بن جبلؓ' یزید بن ابی سفیانؓ' عقبہ بن سہیلؓ وغیرہ شامل تھے۔

ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف

حضرت عمرؓ شام کا نظم و نسق بچشمِ خویش دیکھنے کی غرض سے' اس سے پہلے مدینہ سے روانہ ہوچکے تھے۔ جب آپ تبوک کے قریب پہنچے تو طاعون کی تباہ کاریوں کی خبر ملی۔ وہاں صحابہؓ سے مشورہ کیا گیا کہ آگے جانا چاہئے یا نہ' اور طے یہ پایا کہ آپ کو' اپنے ساتھیوں سمیت واپس تشریف لے جانا چاہئے۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس کے خلاف حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا تھا کہ ''کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں''۔ اور آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ ''ہاں! میں خدا کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی

طرف جا رہا ہوں''۔ (تفصیل اس نکتہ کی ''حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ'' سے متعلق چوتھے باب میں گزر چکی ہے)۔ اور یہی وہ ''مرگِ مفاجات'' تھی جس سے بچانے کے لئے آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا تھا کہ آپ ایک ضروری مشورہ کے لئے مدینہ آ یئے۔ اور انہوں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اس بَلا سے محفوظ رہنے کے لئے بُلا رہے ہیں لیکن میں اپنے لشکر کا سپہ سالار ہوں اپنے سپاہیوں کو خطرہ میں چھوڑ کر' اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے نکل جانا باعثِ ننگ سمجھتا ہوں۔ اس لئے آپ مجھے تعمیلِ ارشاد سے معذور رکھئے۔ آپ وہاں سے نہ نکلے اور اپنے رفقاء کی معیت میں وہیں' جان' جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ [9:100]۔

فاروقِ اعظمؓ اس سیلاب کو تو نہ روک سکے لیکن اس کی آوردہ تباہیوں کی تلافی کے لئے بڑی تگ و تاز کی۔ یہ غنیمت ہوا کہ اس دوران میں یزدگرد یا ہرقل نے' ان علاقوں کی بازیابی کے لئے حملہ نہ کر دیا' ورنہ مشکل اندر مشکل پیدا ہو جاتی۔ (انہوں نے غالباً طاعون کے ڈر سے ایسا نہ کیا)۔ وبا ختم ہو گئی تو آپ ان تباہیوں کا جائزہ لینے' اور ان کے ازالہ کے لئے مناسب انتظام کرنے کی غرض سے خود شام کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ کے اس سفر کا حال' فتوحات سے متعلق باب میں ہماری نظروں سے گزر چکا ہے۔

عرب میں قحط

اُدھر شام و عراق میں یہ طوفانِ بَلا اُمنڈا ہوا تھا اور اِدھر پورے کے پورے عرب کو نہایت شدید اور مہیب قحط نے گھیر لیا۔ خشک سالی ایسی آتش فشاں تھی کہ اس نے زندگی کی ہر نمود کو راکھ بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ بعد میں اسے یاد ہی ''عام الرمادہ'' ـــــ سالِ خاکستر ـــــ کے نام سے کیا جاتا تھا۔

غلّہ کے قافلے

جیسا کہ اس قسم کے حالات میں ہوتا ہے' اردگرد کی ساری صحرائی آبادیاں' ہجوم کر کے مدینہ آ گئیں۔ مدینہ اگرچہ مملکت کا مرکزی مقام بھی تھا اور (اب) خوشحال بھی' لیکن وہاں اتنا غلہ ریزرو میں تو نہیں رکھا تھا کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کے لئے کافی ہو جائے۔ یہ ایک ایسا لاینحل مسئلہ اور ناگہانی آفت تھی جس سے بڑی سے بڑی مستحکم اور وسیع مملکت کے مدبرین بھی حواس باختہ ہو جاتے۔ لیکن حضرت عمرؓ نہ تو اس قدر پریشان ہوئے کہ آپ کے اوسان خطا ہو جاتے' اور نہ ہی یہ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کہ یہ ''خدا کی طرف سے آئی ہوئی بلا ہے' بندے اس کا علاج کیا کر سکتے ہیں''! انہوں نے ''ایک تقدیرِ الٰہی سے دوسری تقدیرِ الٰہی'' کی طرف رُخ موڑا اور کامل دلجمعی سے اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے شام' فلسطین اور عراق کے گورنروں کے نام ''خطرہ کا الارم'' (S.O.S.) بھیجا اور کہا کہ ''کیا تم اسے گوارا کرو گے کہ

ہم ہلاک ہو جائیں اور تم زندہ رہو'۔ اس امداد طلبی پر انہوں نے دل کی اُس کشادگی سے لبیک کہا جس کی ان سے توقع تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب میں کہا کہ اطمینان رکھیئے' میں غلہ کا ایسا قافلہ بھیج رہا ہوں جس کا اگلا سرا آپ کے پاس ہو گا اور پچھلا سرا میرے پاس۔ حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح چار ہزار اونٹوں کا قافلہ لے کر خود عازمِ مدینہ ہو گئے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے شام سے تین ہزار اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک ہزار اونٹوں کے قافلے روانہ کئے۔ علاوہ بریں' حضرت عمرو بن عاصؓ نے پانچ ہزار کمبل اور حضرت معاویہؓ نے تین ہزار چُغے بھیجے۔ انہوں نے امداد بھیجنے میں تو ذرا سا تساہل نہ برتا لیکن اونٹوں نے تو اپنی رفتار سے چلنا تھا ___ وہ انہیں ہوائی جہاز یا ریل نہیں بنا سکتے تھے۔ مدینہ کے باہر ہزار ہا کی تعداد میں بھوکے مرد' عورتیں' بچے' پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

بہ لبم رسیدہ جانم' تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم' بچہ کار خواہی آمد

حُسنِ تدابیر

حضرت عمرؓ اس "صبر طلبیٔ عشق اور بیتابیٔ تمنا" کی کشمکش سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے رسد کی آمد تک مقامی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ کیا کہ مدینے میں جس قدر کھاتے پیتے گھرانے تھے' ان کے افرادِ خاندان کی تعداد کے برابر باہر سے آنے والے افراد ان کے ساتھ ملا دیئے اور کہہ دیا کہ جتنا کھانا روز پکتا تھا وہ کھانا اس دُگنی تعداد میں تقسیم کر لیا جائے۔ ان کا ارشاد تھا کہ نصف خوراک سے انسان مرتا نہیں۔

مشترکہ دسترخوان

لیکن جب آنے والوں کا ہجوم زیادہ ہو گیا تو آپ نے اس انتظام کو بدل دیا اور حکم دے دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں انفرادی طور پر کچھ نہیں پکے گا۔ غذا کا سامان یکجا کر لیا جائے اور جو کچھ پکے' اہلِ مدینہ اور باہر سے آنے والے' ایک مشترکہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھا لیں۔ اس انتظام کی ابتداء انہوں نے خود اپنے ہاں سے کی۔ چنانچہ آپ بھی اسی مشترکہ دسترخوان پر بیٹھ کر' ماحضر تناول فرما لیتے تھے۔ اس دسترخوان کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس پر کھانے والوں کی تعداد قریب دس ہزار تھی اور جن مریضوں' معذوروں' بوڑھوں' بچوں' عورتوں کو ان کی اقامت گاہوں پر کھانا پہنچایا جاتا تھا' ان کی تعداد قریب پچاس ہزار۔

اس اشتراکِ طعام کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دن آپ' ایک بدّو کے ساتھ مل کر' ایک ہی طشت میں کھانا کھا رہے تھے۔ طشت میں' گھی میں چُوری کی ہوئی روٹی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بدّو "ندیدوں" کی طرح طشت میں اُس طرف ہاتھ مار رہا ہے جس طرف گھی زیادہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے گھی کبھی نے کھایا۔ اس نے کہا کہ جب سے قحط پڑا ہے

نہ خود اس نے گھی یا تیل کھایا ہے' نہ کسی اور کو کھاتے دیکھا ہے۔ یہ سن کر آپ نے قسم کھائی کہ جب تک قحط رہے گا وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ صرف زیتون کے تیل کے ساتھ سوکھی روٹی کھائیں گے ـــــ مسلسل پریشانی' پیہم مشقت' دن رات کی تگ و تاز ـــــ اور اس پر اس تبدیلیٔ غذا کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا (حالانکہ وہ سرخ و سپید تھے)۔ پیٹ میں قراقر رہنے لگا۔ دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس تبدیلیٔ غذا کو برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے آپ اپنے معمول کی غذا کی طرف پلٹ آیئے۔ اس کے جواب میں آپ نے وہ فقرہ کہا کہ جسے اگر دنیا کے سربراہانِ مملکت اپنی زندگی کا اصول بنالیں تو یہ جہنم آج مبدّل بہ فردوس ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ

مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گزرے جو اُن پر گزرتی ہے۔

اور قحط کا سارا زمانہ اسی سوکھی روٹی اور روغنِ زیتون پر گزار دیا! معمول یہ تھا کہ صبح اُٹھتے ہی' پہلے مطبخ کی طرف جاتے جہاں مشترکہ دسترخوان کے لئے پروگرام کے مطابق کچھ پکتا تھا۔ پھر قحط زدگان کی قیام گاہوں کی طرف جاتے تا کہ دیکھ لیں کہ انہیں کوئی خاص تکلیف تو نہیں۔ جو کھانا انہیں بھیجا جاتا اس کی نگرانی بھی خود کرتے اور اکثر اوقات' کھانا پہنچانے والوں کے ساتھ مل کر' اور خود کھانا اٹھا کر ان تک پہنچاتے۔ صبح سے رات تک یہ معمول رہتا' اور (حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ) رات کو سجدے میں پڑے روتے' گڑگڑاتے اور خدا سے فریاد کرتے کہ ''ربّ العالمین! اگر یہ مصیبت میری کسی کوتاہی کی وجہ سے ہے تو مجھے معاف کر دے''۔ جن لوگوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے کہ اگر کچھ وقت اور تک قحط دُور نہ ہوتا تو ہمیں خدشہ تھا کہ عمرؓ مسلمانوں کے غم میں اپنی جان گھلا دیتے۔ غم تمام مسلمانوں کا تھا' ساری اُمت کا تھا۔ اس میں اپنے اور بیگانے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔

عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے!

ایک دن آپ نے دیکھا کہ آپ کا پوتا ککڑی (یا تربوز) کھا رہا ہے۔ (حضرت) عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور ڈانٹ کر کہا کہ ''محمدؐ کی اُمّت بھوکی مر رہی ہے اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟'' بیٹے نے کہا کہ ابا جان! خفا نہ ہو جیئے۔ عمرؓ کے پوتے کو ''پھل'' کسی خصوصی امتیاز کی بنا پر نہیں ملا۔ صبح کے ناشتے میں بچوں کو جو کھجوریں ملی تھیں' اس نے ایک بدولڑکے سے' ان کے عوض یہ ککڑی (یا تربوز) خرید لیا تھا۔

یہ عمرؓ کی پوتی تھی

ایک دن گلی میں دیکھا کہ ایک بچی جا رہی ہے ـــــ زرد رُو' نحیف و نزار ـــــ اسے دیکھ کر آپ کو بڑا صدمہ ہوا۔ پوچھا یہ کس کی بچی ہے۔ بیٹا ساتھ تھا' کہا کہ ''یہ امیر المومنین کی پوتی ہے''! فرمایا کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہے؟ کہا کہ اس قحط میں

جو کچھ ملتا ہے بدوں کے بچے تو اس کے عادی ہیں لیکن ہمارے بچے اس کے عادی نہیں اس لئے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ حالت کچھ بھی ہو اس عالمگیر مصیبت میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔

بعض فاقہ زدہ لوگ اس حالت میں مدینہ پہنچتے کہ ان میں خود کچھ پکا کر کھانے کی سکت بھی نہ ہوتی۔ ایسی حالت میں آپ ان کے لئے خود کھانا تیار کر دیتے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ چمڑے کے دو تھیلے اور روغنِ زیتون کا کنستر اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں لے کر چند قحط زدہ لوگوں کے پاس پہنچے اور خود کھانا تیار کر کے انہیں کھلایا۔

انہی کیمپوں میں ایک دفعہ دیکھا کہ ایک عورت عصید (ایک قسم کا کھانا) پکا رہی ہے لیکن اُسے پکانا نہیں آتا۔ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور خود کفگیر چلا کر بتایا کہ عصید ایسے پکایا کرتے ہیں۔

بالآخر بارش ہوگئی

خشک سالی کئی مہینوں تک رہی۔ اس کے بعد رحمتِ ایزدی کے سحابِ کرم نے گُہر باری کی۔ بارش ہوئی اور ایسی کہ اس نے جَل تھَل ایک کر دیا۔ لوگ شاداں و فرحاں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ یہ آفت اس قدر عالمگیر، مہیب اور تباہ کُن تھی لیکن حضرت عمرؓ کی دلگدازی، جگر سوزی اور حُسنِ تدبر نے اس کا اس طرح مقابلہ کیا کہ اس سے کم از کم نقصان ہوا اور لوگوں کی مصیبتوں کی تلخیاں، ہمدردی کی شیرینیوں میں تبدیل ہو گئیں۔

دنیا میں حوادث تو رُونما ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن خوش بخت ہیں وہ آفت رسیدگان جنہیں اس قسم کا سربراہ میسر آ جائے جو اِن تیرِ حوادث کو اپنے سینے پر لے اور اس کی پناہ میں سر چھپانے والوں کے کانوں تک ان کی سنسناہٹ بھی نہ پہنچنے دے۔

خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع
تخیّلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

حضرت عباسؓ کا وسیلہ

وبا اور قحط کی خاردار وادیوں سے نکل کر اب ہمیں اپنا سفر پھر اُسی نہج و انداز سے شروع کر دینا چاہئے لیکن اُس پُرخار راستے کا ایک کانٹا ایسا ہے جس کا اسی مقام پر نکال دینا ضروری ہے۔

تاریخ میں ہے کہ جب قحط کی شدّت اور طوالت بڑھ گئی تو حضرت عمرؓ نے نمازِ اِستسقاء ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور والیانِ ریاست کو لکھا کہ وہ بھی فلاں دن اور فلاں وقت اپنے اپنے ہاں یہ نماز ادا کریں اور خدا سے دُعا مانگیں کہ وہ بارش برسائے۔ آپ خود معہ صحابہ کبارؓ نماز کے لئے میدان میں جمع ہوئے۔ نماز کے بعد اس خشوع و خضوع سے بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑائے کہ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تَر ہو گئی لیکن اس پر بھی بارش کا ایک قطرہ نہ برسا۔ اس پر آپ نے حضرت عباسؓ بن

عبدالمطلب کا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا کہ "یا اللہ! ہم تیرے رسولؐ کے چچا کو تیرے حضور وسیلہ بنا کر دُعا کرتے ہیں کہ تو ہماری حالت پر رحم فرما"۔ یہ کہنا تھا کہ بارش برسنے لگ گئی اور خوب زور سے برسی۔ اس سے قحط رفع ہو گیا۔

وضعی روایات

کسی اور کے متعلق یہ کہا جاتا تو اسے باور بھی کیا جا سکتا تھا لیکن جو عمرؓ شخصیت پرستی کے اس قدر خلاف تھا کہ اس نے اس درخت تک کو کٹوا دیا تھا جس کے نیچے حضورؐ نے بیعتِ رضوان لی تھی اور جسے بعد میں لوگوں نے مقدس تصور کر لیا تھا' اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے رسولؐ اللہ کے چچا کو وسیلہ قرار دے کر خدا سے بارانِ رحمت کی دعا کی تھی' بعید از قیاس ہے۔ ہماری روایات' عباسیوں کے عہدِ حکومت میں جمع اور مرتب ہوئی تھیں اور انہی کے زمانے میں وضعی حدیثوں کی بھرمار ہوئی تھی۔ ان کے عہدِ حکومت میں' ان کے (عباسی خلفاء کے) ابوالآباء (حضرت عباسؓ) کی مبالغہ آمیز عظمت وعقیدت کی روایات کا وضع ہو جانا فطری امر تھا (ملوکیت میں ایسا ہی ہوتا ہے)۔ چنانچہ یہ حدیث بھی ہمارے ہاں موجود ہے کہ

> ایک مرتبہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے رسولؐ اللہ سے شکایت کی کہ قریش جب آپس میں ملتے ہیں تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں لیکن ہم سے اس ہنسی خوشی کے ساتھ نہیں ملتے۔ یہ سن کر آپ بہت رنجیدہ ہوئے اور فرمانے لگے۔
> خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' کسی کے دل میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا' جب تک وہ خدا کے لئے اور اس کے رسولؐ کی وجہ سے تم سے محبت نہ رکھے۔ (مسندِ احمد)

سو جب اس قسم کی حدیثیں وضع ہو گئیں جن کی رُو سے' ایمان کو حضرت عباسؓ کے ساتھ محبت سے مشروط کر دیا گیا' تو ایسی روایات کے وضع کرنے میں کونسا تامل ہو سکتا تھا جن میں اجابتِ دعا کے لئے حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنانے کا ذکر ہو۔

دعاؤں کے متعلق حضرت عمرؓ کا مؤقف کیا تھا' اس کے متعلق بارھواں باب دیکھئے

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ طبقاتِ ابن سعد کی ایک روایت سامنے آئی جس سے اس واقعہ پر ایک نئے زاویہ سے روشنی پڑتی ہے۔ عرب' ستاروں سے راستوں کا تعیّن بھی کیا کرتے تھے اور موسموں کے تغیرات کا اندازہ بھی۔ روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر بارش کے لئے دُعا مانگی اور پھر نیچے اُتر آئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے نمازِ استسقاء کیوں نہیں ادا کی۔ فرمایا کہ میں نے آسمان کے ان ستاروں سے جو بارش کی نوید دیتے ہیں' بارش کی بابت پوچھا ہے' پھر آپ نے حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ (فلاں) ستاروں کے طلوع ہونے کو کتنے روز باقی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ قریب آٹھ دن۔ آپ نے کہا کہ امید ہے اللہ جلد خیر کر دے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بات اتنی تھی (اور یہ حضرت عمرؓ کے مزاج اور قرآنی راہنمائی کے مطابق ہے)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نواں باب

سیاسی نظام

از کلید دیں در دنیا کشاد

قرآن کے سیاسی نظام (یا بالفاظِ دیگر، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ) کا اصل الاصول، عُروۃ الوُثقیٰ، یا اساسِ محکم سورۂ آلِ عمران کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا نے اُسے ضابطۂ قوانین کا حامل، یا منصبِ حکومت پر سرفراز یا مقامِ نبوت پر فائز بھی کیوں نہ کر دیا ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے حقائق و غوامض پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی و مقاصد کی حقیقت تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ''۔ (3:78)

انسانی آزادی کا منشور

یہ انسانی آزادی کا وہ عظیم انقلابی منشور ہے جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ انسانی فکر نے بھی غلامی اور محکومی کے استبداد سے تنگ آ کر، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر سوچیں۔ پہلے اس نے شخصی حکومت (ملوکیت) کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر مذہبی پیشوائیت (تھیا کریسی) کی دسیسہ کاریوں کے دامِ ہمرنگِ زمین کو توڑا۔ اس کے بعد اس نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ انسانی فکر ابھی تک اسی مقام تک پہنچ سکی ہے لیکن وہ اس سے بھی مطمئن نہیں اس لئے کہ انسانوں کی محکومی سے نجات، جمہوری نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک شخص (ملوکیت) کی محکومی کے بجائے، انسانوں کے ایک گروہ (اکثریت) کی محکومی اختیار کرنی پڑتی ہے[1]۔ یہ گروہ، دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت ''ذاتی حکم'' کی رُو سے نہیں کراتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی رُو سے کراتا ہے — لیکن محکومی، کسی کے ذاتی فیصلہ کی ہو، یا اس کے فیصلہ کو قانون کا نام دے دینے کی، بات ایک ہی ہے۔ اس سے انسان، دوسرے انسانوں کی محکومی کی زنجیروں سے رَستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ، وہ طریق ہے جسے

1۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''اِسلام کیا ہے''۔

مندرجہ بالا قرآنی منشورِ آزادی کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانون سازی کا حق بھی کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی کو خدا کا ''حقِّ حکومت'' کہا گیا ہے۔ سورۂ یوسفؑ میں ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ [12:40] یاد رکھو! حقِّ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیّت اختیار نہ کی جائے۔ یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ خدا کا یہ حقِّ حکومت اس طرح خالصتاً اسی کے لئے مختص ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا [18:26] وہ اپنے دائرہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

کتاب اللہ کی حکومت

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت (محکومیّت) کس طرح اختیار کی جائے۔ اس کا جواب اس نے خود ہی یہ کہہ کر دے دیا کہ اس کی اطاعت، اس کے عطا کردہ ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کی جائے۔ سورۃ الانعام میں ہے اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا [6:114] (اے رسول! ان سے کہیں) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم قرار دے لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ [5:44] جو اس کے مطابق فیصلے (حکومت) نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جائے گا۔

دین اور مذہب میں فرق

لیکن کتاب تو ساکت و صامت حروف و نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ یہاں سے مذہب اور دین کا بنیادی فرق ہمارے سامنے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا (اور دنیا کے تمام اہلِ مذاہب اسی خیال کے حامل ہیں) کہ یہ اطاعت انفرادی طور پر کی جائے گی۔ یعنی ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہے۔ اسے ''مذہب'' کہتے ہیں جس میں ''خدا کی اطاعت'' سے مراد اس کی پرستش ہوتی ہے، محکومیت نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ حیات کی تاکید کرتا ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا [3:103] تم اس ضابطۂ خداوندی کو اجتماعی طور پر تھامے رکھو'۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمہارے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی

1۔ مذہب اور دین کے اس فرق کے لئے میرے مجموعۂ مضامین ـــــ بہارِ نو ـــــ میں ''قیامتِ موجود'' کا عنوان دیکھئے یا میری انگریزی زبان کی کتاب ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION۔

الارض ہوگا (یعنی تمہاری اپنی حاکمیّت وحکومت)۔اسی سے تمہارے دیؔن (اجتماعی نظامِ زندگی) کو تمکّن حاصل ہوگا اور اسی سے تم اس قابل ہوسکو گے کہ خالصۃً خدا کی محکومیّت اختیار کرسکو (24:55)۔اس نظام (کی مرکزی اتھارٹی) کی اطاعت' خدا کی اطاعت کہلائے گی۔ان امور کی تفصیل تیسرے اور ساتویں باب میں گزر چکی ہے لیکن اس مقام پر اس کا دہرانا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر عہدِ فاروقی کا سیاسی نظام (جو اس کتاب کا عمودی موضوع ہے) اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔(اس تکرار کے لئے میں قارئین کے حُسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں)۔

اسلام اپنی آزاد مملکت چاہتا ہے

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام ایک زندہ نظام (یعنی دین) کی حیثیت صرف اپنی آزاد مملکت میں اختیار کرسکتا ہے۔غیروں کی حکومت میں' یا خود مسلمانوں کی ایسی حکومت میں جس کی بنیاد کتابِ خداوندی پر نہ ہو' اسلام ایک رسمی مذہب بن کر رہ جاتا ہے' دین کی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔اس قسم کی حکومتوں کے تابع' مسلمان' اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔تقسیمِ ہند سے پہلے' تحریکِ پاکستان کے دوران' ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں بیشک حکومت' اکثریت (یعنی ہندوؤں) کی ہوگی لیکن وہ جب ہمیں ''مذہبی آزادی'' کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کو آزادی' صرف اپنی آزاد مملکت میں میسر آسکتی ہے۔جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت نہ ہو' قرآن کے احکام' قانونی شکل میں نافذ ہی نہیں کئے جاسکتے۔اور (ظاہر ہے کہ) جو احکام قانونی شکل میں نافذ نہ کئے جاسکیں' ان کی حیثیت محض ''وعظ'' کی رہ جاتی ہے۔''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے قرآنی فریضہ سے مقصود ہی یہ ہے کہ احکامِ قرآنی کو قانوناً نافذ کیا جائے۔اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے مطابق یَزَعُ اللّٰہُ بِالسُّلْطَانِ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ تنہا قرآن سے اتنی اصلاح نہیں ہوسکتی جتنی اصلاح (قرآنی) حکومت کے ذریعے ہوسکتی ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ

مومناں را تیغ با قرآں بس است! (اقبالؒ)

سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے اس حکومت کو قائم کیا اور وہی اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔اس لئے خدا نے' حضورؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دیا جب فرمایا کہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ [4:80] ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی''۔قرآنِ کریم نے اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (خدا اور رسول کی اطاعت) کا جو حکم بار بار

دیا ہے اس سے مراد اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا[1]۔ چونکہ اطاعت درحقیقت، خدا کی یعنی خدا کی کتاب کی، مقصود تھی اس لئے رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ [5:48] آپ ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں۔

اصول و جزئیات کی پوزیشن

(2) لیکن قرآنِ کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں چند ایک احکام تو بالتصریح دیئے گئے ہیں لیکن باقی تمام ہدایات بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس نے ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا۔ ایسی کتاب کو جس نے تمام بنی نوعِ انسان کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا، ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا کہ اس کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں لیکن ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام، ہر زمانے کے تقاضوں اور امت کے احوال و ظروف کے مطابق مرتب ہوتے اور بدلتے رہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ جن احکام کو ہم نے صرف اصولی طور پر دیا ہے اور ان کی جزئیات خود مرتب کر کے نہیں دیں، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو ایسا کرنا چاہئے تھا لیکن یہ (معاذ اللہ) اس سے سہواً رہ گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ [5:101] ''اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو اُن کا نباہنا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ سو تم بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر مزید پابندیاں عائد کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ [5:102] اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرما دی کہ **ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا۔ وحرم حرمات فلا تنتھکوھا۔ وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔** اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو، کچھ حدود متعین کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کرید مت کرو۔

زبانِ وحی جن امور کے متعلق خاموش ہے، ان میں ان احکام کی جزئیات بھی شامل ہیں جنہیں صرف اصولی طور پر بیان کیا

1۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ''اسلام میں قانون سازی کا اصول'' —— شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور۔

گیا ہے اور کتاب اللہ میں بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ باقی رہے وہ احکام جنہیں متعیّن طور پر بیان کر دیا گیا ہے' ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآنِ کریم نے نہ تو ان احوال وظروف کا تعیّن کیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہیں۔ (مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی قانونی تعریف (DEFINITION) خود متعیّن نہیں کی۔ یا (مثلاً) اس نے اضطراری حالت میں بعض حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیّتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔

بنا بریں' قرآنِ کریم نے ان احکام کی جزئیات کا تعین جنہیں اُس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے اور جن احکام کو بالتصریح بیان کیا ہے' ان کی شرائط و احوال کی تبیین' نظامِ حکومتِ اسلامی پر چھوڑ دی ہے۔ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا لیکن ان کی تفاصیل و جزئیات' جنہیں حکومتِ قرآنی متعین کرے گی' حالات کے تقاضے کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ اس طرح ثبات وتغیر کے حسین امتزاج سے کتاب اللہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ زندگی بنتی چلی جائے گی۔

ان تفاصیل و جزئیات کا تعین سب سے پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ' حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ قرآنِ کریم میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [3:159] ''امورِ مملکت میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرو''۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک وحیٔ خداوندی کا تعلق ہے' اس میں کسی کے مشورہ کا تو ایک طرف' خود صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا بھی کوئی دخل نہیں تھا (53:3-4)۔ لہٰذا' مشورہ کا حکم' ان احکامِ خداوندی کی جزئیات و تفاصیل کے متعلق تھا جنہیں خدا نے اصولی طور پر دیا تھا یا جن کی شرائط و قیود بیان نہیں کی تھیں۔

رسولؐ اللہ کی متعیّن کردہ جزئیات

ان جزئیات وشرائط کو حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور قومِ مخاطب کے احوال وظروف کے مطابق صحابہؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات وشرائط کے متعلق یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ اگر انہیں بھی غیر متبدل رکھنا مطلوب ہوتا' تو انہیں وحی کے ذریعے' قرآن کے اندر محفوظ کر دیا جاتا' یا' جس طرح حضورؐ نے قرآنِ کریم مرتب اور محفوظ شکل میں اُمت کو دیا تھا' اسی طرح اپنے فیصلوں کا مستند اور مصدقہ مجموعہ' محفوظ طور پر اُمت کو دے جاتے لیکن نہ خدا نے' قرآنِ کریم میں ان تفاصیل کا ذکر کیا اور نہ ہی رسولؐ اللہ نے انہیں محفوظ طور پر اُمت کو دیا (احادیث کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل باب چہارم میں بتایا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی)۔ اس سے واضح ہے کہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا' نہ مقصودِ رسالت۔ حضورؐ نے ان کے برعکس' ایک ایسا اصول بیان فرمایا جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ امت کے لئے' اپنے زمانے کے اسلامی نظام کے فیصلوں کا اتباع ہی مقصودِ خدا

ورسولؐ تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین (مشکٰوۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے صاحبِ رشد وہدایت جانشینوں کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس حقیقت کی تبیین ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ [3:144]

محمدؐ بجز ایں نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر دین کا نظام آپؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

بات بالکل واضح ہے کہ دین کا نظام' حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اسے آپؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام میں جس طرح حضورؐ کی زندگی میں' مرکزِ نظام کی اطاعت ''خدا اور رسولؐ کی اطاعت'' تھی۔ یہی شکل حضورؐ کے جانشینوں کے زمانے میں بھی رہے گی۔ اسی نظام کو قرآنِ کریم نے ''سبیل المومنین'' کہہ کر پکارا ہے یعنی جماعتِ مومنین کا راستہ (4:115)۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا' لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) خلافتِ راشدہ اوّلین چار خلفاءؓ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ ''تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے'' اس کا اب عملی مفہوم' حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ (چار خلفاء) کی سنت (طریق) لیا جاتا ہے لیکن یہ نہ تو حکمِ خداوندی تھا' نہ ارشادِ نبویؐ کہ خلافتِ راشدہ' چار خلفاء تک محدود رہے گی۔ دین کے نظام کا تو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا مطلوب تھا۔ یہ اتفاق تھا (اور اُمت بلکہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی) کہ وہ نظام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا' لیکن اگر وہ قائم رہتا (اور جب تک قائم رہتا) تو اس کی اطاعت ''خلافتِ راشدہ'' کی اطاعت قرار پاتی۔ یعنی اُمت کے لئے اطاعت' اپنے زمانے کے نظامِ اسلامی کی لازم ہوتی' نہ کہ کسی سابقہ زمانے کے نظام کی۔ اور اس کی وجہ حضورؐ نے خود ہی یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ

الناس اشبه بزمانهم من اسلافهم (جاحظ البیان والتبیین)

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر امام ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا (یعنی ہم دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپؐ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ بغدادی' جلد 13' صفحہ 290)

زمانے کے تقاضوں کے مطابق فیصلے

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ' پیش آمدہ معاملات کے فیصلے' قرآن کے اصولی احکام کی روشنی میں صحابہؓ کے مشورہ سے کیا

کرتے تھے۔ اگر میں (یعنی امام اعظم) اُس زمانے میں ہوتا تو آپؐ اکثر معاملات میں میری رائے قبول فرما لیتے اور اس طرح میری رائے شریعت کا حکم قرار پا جاتی۔ امامِ اعظمؒ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادیؒ نے لکھا ہے کہ

> ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چُرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی مدد کو پہنچئے ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔
>
> (بغدادی، جلد 13، صفحہ 290)

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ کا وہ فیصلہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں اس لئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے۔ اسی اصول کے مطابق "تعلیل الاحکام" میں آیۂ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ [21:107] کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ

> زمانے کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر صرف منصوص ہی کا اعتبار کیا جائے تو لوگ سخت مصیبت میں پھنس جائیں۔ یہ بات رحمت کے منافی ہوگی۔ (تعلیل الاحکام صفحہ 288)

یعنی حضورؐ کے رحمت للعالمین (تمام زمانوں کے لئے رحمت) ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں۔ امام ابن قیمؒ نے اُسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

> شریعت اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دیؔن ہوگا۔ اسے دیؔن کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطریق الحکمیہ)

یعنی دین کے اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن اصولوں پر عمل اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اس اصول کے متعلق اپنے خطبات (تشکیلِ جدید) میں بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے۔ وہ پہلے شاہ ولیؒ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

> پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود

بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ

غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظمؒ نے، جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیثوں پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد انہوں (علامہ اقبالؒ) نے لکھا ہے کہ:

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں —— وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے —— تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد و مُتصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ سوال کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت سی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے —— وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریّت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰهِ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

دَورِ فاروقیؓ میں اس اصول پر عمل

اب ہم اُس دَور کی کچھ مثالیں سامنے لاتے ہیں (یعنی دَورِ فاروقیؓ کی) جس میں، یہ ''روحِ عمرؓ''، عملی پیکروں میں کارفرما

تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا —— یعنی یہی دو تین برس —— لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اس لئے حالات میں کافی تبدیلی آ رہی تھی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر آپ نے (حضرت عمرؓ نے) فرمایا تھا کہ

بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

چنانچہ ان کا طریقِ کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا معاملہ سامنے آتا آپ سابقہ ادوار کی حکومتوں (یعنی عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ) کو دیکھتے۔ اگر وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ملتا جو اس معاملہ کے تقاضوں کو پورا کر دیتا تو اسے من و عن نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے اور عندالضرورت اپنا جدید فیصلہ نافذ کر دیتے اور بعض اوقات (حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر) خود اپنے سابقہ فیصلہ میں بھی تبدیلی کر دیتے' یعنی وحی کے متعیّن کردہ احکام و اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہتے لیکن ان کے عملی نفاذ کی شکلوں اور جزئیات میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ ثبات و تغیر کا یہی حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک عالمگیر اور ابدی نظامِ حیات بن سکتا ہے اور عہدِ فاروقیؓ اس کی درخشندہ مثال پیش کرتا ہے۔

(1) نظامِ مشاورت

کسی سابقہ حکم کا من و عن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا' لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا پیشِ نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا' بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے' بالخصوص جب ان احکام و جزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کرنی ہو۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر' قرآنِ کریم نے رسولؐ اللہ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو (3:158) اور حضورؐ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے (42:38)۔ یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلام

یورپ نے' ملوکیت اور تھیاکریسی سے تنگ آ کر' جمہوریت (ڈیماکریسی) کا نظام وضع کیا اور اس کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دنیا اُسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی' مسلم اقوام نے بھی اُسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طُرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابقِ اسلام قرار دے دیا۔ چنانچہ آج اس نظریہ کو مسلّمہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ''جمہوریت عین اسلام'' ہے' بلکہ یہ کہ جمہوریت کی طرح ہی اسلام نے ڈالی تھی۔ یہ تصور غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدارِ مطلق (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہے۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون

مرتب کر سکتے ہیں۔ انہی کا فیصلہ حرفِ آخر ہے۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف' پوری نوعِ انسان کو بھی حاصل نہیں۔ اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہے اور اسلامی نظام (یعنی اُمت کے نمائندگان) کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ مغربی اندازِ جمہوریت اور اسلام کے نظامِ مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اسلامی نظام کو آپ ''کنٹرولڈ ڈیما کریسی'' کہہ سکتے ہیں یعنی وہ جمہوریت جس پر قرآن کا کنٹرول ہو۔

مشاورت کی مشینری

قرآنِ کریم نے اُمت کے لئے مشاورت کو ضروری تو قرار دیا لیکن اپنے مخصوص انداز کے مطابق' مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریق کار خود متعین کرے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں زندگی بڑی سادہ سی تھی اس لئے مشاورت کی مشینری بھی کچھ ایسی وسیع و عریض نہیں تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا تھا' اسے ساتویں باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے۔ آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں۔ مختصراً' امیر المومنین کی مجلسِ مشاورت' اعیانِ مدینہ تک محدود تھی اور اہم معاملات میں صوبوں کے نمائندوں کو بھی بلا لیا جاتا تھا۔

نوجوان اور عورتوں سے مشورہ

مجلسِ مشاورت میں حضرت علیؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ' حضرت معاذ بن جبلؓ' حضرت ابی بن کعبؓ' حضرت زید بن ثابتؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ یہ سب معمر اور پختہ کار تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی[1]۔ عام انتظامی امور اور بندوبست کے سلسلہ میں آپ ذِمّی رعایا کو بھی شریکِ مشاورت کر لیتے تھے کیونکہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا[2]۔ آپ دیگر مملکتوں کے آئین و قوانین کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ اُس زمانے میں' غیر مسلم' بلا روک ٹوک مکہ معظّمہ آتے جاتے تھے (کتاب الخراج' امام ابو یوسف' بحوالہ شبلی نعمانی)۔ دیگر ممالک کے احوال و کوائف اور قوانین و ضوابط کے متعلق ان کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔

---

1. ابن الجوزی' بحوالہ طنطاوی (مطبوعہ بیروت صفحہ 174)
2. یاد رکھئے! غیر مسلموں سے مشورہ لیا جا سکتا ہے' انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو' اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔

اکثریت کے فیصلے

مغربی اندازِ جمہوریت میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہِ مملکت' پارلیمان کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے یا اُسے ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں آئین سازی کے سلسلہ میں' اس موضوع پر بڑی بحث وتمحیص ہوتی رہی اور (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اسے اسلامی معیار کے مطابق پرکھنے کے مدعیٰ' اپنے اپنے نقطہ نگاہ کی تائید اور مخالفین کی تردید میں صدرِ اوّل سے اسناد پیش کرنے لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے' ہم اس اصول کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ انداز ہی صحیح نہیں کہ جو معاملہ پیش آئے اس کے فیصلہ کے لئے صدرِ اوّل کے طریق کو بطورِ سند پیش کر دیا جائے۔ اوّل تو اُس دَور کی تاریخ میں مخالف' موافق' ہر قسم کے شواہد اور اقوال مل جاتے ہیں (اور مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آنے والے اختلافات کا بنیادی سبب یہی ہے)' دوسرے' قرآنی نظام کی رُو سے' کسی سابقہ دَور کا کوئی فیصلہ' آنے والے دَور کے لئے قولِ فیصل نہیں قرار پا سکتا۔ اُن کا فیصلہ اُن کے زمانے کے احوال وظروف کے مطابق تھا۔ ہمارا فیصلہ' ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ سابقہ ادوار کے فیصلوں سے بطورِ نظائر تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' انہیں سند اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنا بریں' اس قسم کی بحثیں' بجز اس کے کہ ان سے اختلافات بڑھیں' کوئی مفیدِ مطلب نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

اس سوال کے متعلق کہ سربراہِ مملکت' اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہے یا اُسے ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے' صدرِ اوّل کی تاریخ میں دونوں قسم کے شواہد مل جاتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی جن میں امیر المومنین نے اکثریت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیا ہو ــــ حتیٰ کہ طبقات ابنِ سعد میں' عمالِ حکومت کے نام حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ ''جس معاملہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو' اس میں صحابہؓ کی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے'' اور حضرت صدیقِ اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ایسے فیصلے بھی جو اکثریت کی رائے کے خلاف تھے۔ (مثلاً) رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد' مانعینِ زکوٰۃ کا جو پہلا معاملہ زیرِ غور آیا تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور صحابہؓ کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی (ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے' عمل اپنے فیصلے کے مطابق کیا۔ اور اس فیصلہ کی اطاعت' مخالف وموافق سب نے بدلّ وجان کی (یہی اُس دَور کی خوبی تھی)۔ اس ضمن میں دو اہم امور پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر معاملہ کے متعلق اصولی ہدایت قرآنِ کریم میں موجود ہوتی تھی اور فیصلہ طلب معاملہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ امیر المومنین اگر اکثریت کی رائے کو مسترد کرتا تھا تو وہ ایسا دھاندلی سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فیصلے کے حق میں دلائل وبراہین پیش کرتا اور اختلاف رکھنے والے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا کھلے بندوں کرتا اور اس کے لئے قرآنی سند پیش کرتا۔ (مثلاً) جب عراق کی زمینوں کا سوال سامنے آیا ہے (جس کی تفصیل معاشی نظام میں پیش کی جائے گی) تو صحابہؓ کی اکثریت نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر کئی دنوں

تک بحث ہوتی رہی اور بحث میں ہر شخص پوری جرأت اور بے باکی سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتا رہا (اسی کو روحِ جمہوریت کہتے ہیں)۔ اس پر بھی معاملہ جب کسی فیصلہ کُن مرحلہ تک نہ پہنچ سکا تو حضرت عمرؓ نے مزید غور و فکر کے لئے مہلت چاہی۔ اس مہلت کے وقفہ کے بعد، جب انہوں نے اس مسئلہ کو مجلسِ مشاورت کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو انہوں نے اس سلسلہ میں جو افتتاحی تقریر فرمائی، وہ غور طلب ہے۔

سند کتاب اللہ کی ہوتی تھی

آپ نے فرمایا:

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور بعض نے موافقت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دوران میں غور و فکر کے بعد مجھے قرآنِ کریم سے ایسی راہنمائی مل گئی ہے جس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بآسانی ہوسکتا ہے اور وہ یہ آیات ہیں۔ اس پر مخالفین نے کہا کہ اب ہمارا سینہ بھی کشادہ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ تھا اختلافی امور میں انداز اپنی رائے کے پیش کرنے کا۔ اور اسی بنا پر حضرت ابنِ مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ

جب عمرؓ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ بات ہمارے لئے آسان ہو جاتی تھی۔

وحی اور اپنی رائے میں فرق

اس کے باوجود، آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ یہ "اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تم نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اسے اُمت کے لئے سنت نہ بناؤ"۔ اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہہ رہا تھا اور آپ درد کی شدت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ جس پر میں نے دادا کے حصہ کے متعلق کچھ لکھا تھا"۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام آپ کی طرف سے

ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ' وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جب تک وہ ہڈی نہ آگئی اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا ــــ احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ خدا کی وحی اور اپنی رائے میں فرق کرنے والوں کے دَور میں قانون سازی کا طریق کار کیا تھا ــــ یہ گوشہ گہری توجہ اور غور وفکر کا متقاضی ہے کہ اس میں ثبات وتغیر کا وہ امتزاج جو دین کی ابدیّت کا ضامن ہے' بڑے حسین انداز میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

2- قانون سازی کا طریق

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن
ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چُھوٹے (اقبال)

اسلامی مملکت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ قرآنی احکام وضوابط کی تنفیذ' اور اس کے اصول واقدار کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر دَور کی حکومت:

(1) اپنے سے پہلے دَور کی حکومت کے فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے۔

(2) لیکن اگر زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق' ان میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان میں مناسب ترمیم وتنسیخ اور حک واضافہ کر دیتی ہے اور

(3) اگر کسی معاملہ کے متعلق پہلے سے کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو وہ نیا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ لیکن

(4) سابقہ فیصلوں میں تغیر وتبدّل ہو یا کسی نئے فیصلہ کا صدور' اس کا کوئی اقدام قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کرسکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کی طرح:

پَرد دَر وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

قرآن کے مطابق احکام

یہ ''شاخِ آشیانہ'' خدا کی کتاب عظیم تھی جسے اس نے حبل اللہ (اللہ کی محکم رسی) اور عروۃ الوثقیٰ (ناقابلِ شکست سہارا) کہہ کر پکارا ہے۔ اس ''سہارے'' کو حضرت عمرؓ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے جابیہ کے خطبہ میں فرمایا:

مجھے اللہ نے جو حکومت عطا کی ہے اس کی اصلاح صرف تین چیزوں سے ہوسکتی ہے۔ امانت کی ادائیگی' (مجرمین اور مخالفین کی) قوت کے ساتھ گرفت اور کتابِ خداوندی کے مطابق حکم دینا۔

اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا:

حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا [4:20] اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو'۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بول اُٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے' عمرؓ غلطی پر تھا۔

(ضمناً) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ بات اصولِ مساوات کی اہمیت اور قرآن کے مطابق کہنے کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی ہوگی' ورنہ قرآن کے اس حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اوّل تو اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ تم جس قدر مہر مقرر یا ادا کر چکے ہو' اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے جس بات کو مطلق (بلاقیود و شرائط) چھوڑا ہے' اسلامی نظام' مصالحِ امت کے پیشِ نظر اُسے مقیّد کر سکتا ــــ یعنی اس پر شرائط عائد کر سکتا ہے۔ بہر حال' یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خلافتِ فاروقیؓ میں بھی اصلاً و اساساً اطاعت احکامِ خداوندی ہی کی تھی۔ باقی رہیں ان احکام کی جزئیات اور ان کے تعین کا طریق کار' سو اس باب میں حضرت عمرؓ نے اصولاً ان فیصلوں کو برقرار رکھا جو ان سے پہلی حکومتوں (عہدِ رسالتمآبؐ اور دَورِ صدیقیؓ) نے صادر کئے تھے' لیکن تغیرِ حالات کے ماتحت جن فیصلوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی' ان میں تبدیلی بھی کر دی۔ کتبِ روایات میں ان اختلافی فیصلوں کی تفاصیل موجود ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

اختلافی فیصلے

(1) سب سے پہلی مثال تو وہ ہے جو آج تک اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ حضرات میں ما بہ النّزاع چلی آ رہی ہے۔ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص بیک وقت تین دفعہ طلاق کہہ دے' تو رسول اللہؐ اور حضرت صدیقؓ کے زمانے تک اُسے ایک طلاق ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں دو سال تک یہی قانون رہا لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس باب میں بڑے غیر محتاط ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی (یعنی یہ ایسی طلاق متصور ہوگی جس کے بعد یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکیں گے)۔

(ضمناً، ہماری بصیرت کے مطابق، قرآنِ کریم کی رُو سے ''تین طلاقوں'' کا مفہوم اور قاعدہ کچھ اور ہے۔اس کی وضاحت میری کتاب ''قرآنی قوانین واقدار'' میں ملے گی۔اس روایت کو جس مقصد کے لئے درج کیا گیا ہے، وہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا)۔

(2) رسولؐ اللہ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کر لیتا تو جائیدادِ منقولہ اور غیر منقولہ اس کے پاس رہتی لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی جائیدادِ غیر منقولہ اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کی کفاف کے لئے حکومت کی طرف سے (باقی مسلمانوں کی طرح) وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

(3) رسولؐ اللہ کے زمانے میں شراب خور کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اُسے بڑھا کر اَسّی کوڑے کر دیا۔

(4) حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں چوری کی سزا موقوف کر دی۔نیز ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جن غلاموں نے بھوک سے مجبور ہو کر ایک شخص کی اونٹنی ذبح کر کے کھالی تھی، آپ نے انہیں سزا نہیں دی تھی بلکہ ان کے مالک پر تاوان عائد کر دیا تھا۔ (واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں چوری کی سزا بغیر کسی شرط کے مقرر کی گئی ہے۔آپ نے اسے مشروط بہ حالات کر دیا) نیز آپ نے جنگ کے دوران سزا دینے سے بھی منع کر دیا۔

(5) قرآنِ کریم نے صدقات میں موئفۃ القلوب کا حصہ رکھا تھا۔یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچے، ان کے نقصان کی تلافی کے لئے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔یہ حکم عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں جاری رہا لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں اس لئے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔

(6) ارکانِ حج میں رَمَل بھی ایک رکن ہے۔یعنی طواف کے وقت، پہلے تین چکر ذرا تیز چل کر لگائے جاتے ہیں۔اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ رسولؐ اللہ جب مکّہ سے مدینہ تشریف لائے تو مخالفین نے مشہور کر دیا کہ وہاں جا کر مسلمان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔اس پر حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ طواف میں ذرا اکڑ کر تیز چلا کریں تا کہ مخالفین دیکھ لیں کہ ہم یہاں آ کر کمزور نہیں ہو گئے۔اس سے یہ رَوش حج کا ایک رکن (ضروری معمول) بن گئی۔لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کہا کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔نہ وہ حالات رہے، نہ وہ مصلحت، نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا طنز۔اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہئے۔

(7) قرآنِ کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے، یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن

جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔

(8) حضرت عمرؓ نے اُمِ ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اسے اولاد ہوگئی ہو) کی بیع ممنوع قرار دے دی حالانکہ رسولؐ اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔ (واضح رہے کہ یہ حکم ان لونڈیوں کے متعلق تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ ''غلام اور لونڈیوں'' کے متعلق تفصیلی بحث چھٹے باب میں آ چکی ہے)۔

(9) اس سلسلہ کی سب سے اہم مثالیں دو (اور) ہیں۔ ایک' عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ اس اہم واقعہ کی تفصیل تو ہم ''معاشی نظام'' سے متعلق باب میں بیان کریں گے اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی ضمناً لکھا جا چکا ہے) رسولؐ اللہ اور خلافتِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتحِ عراق کے وقت' مالِ غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدہ کے مطابق' مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری اُمت اور آنے والی نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لئے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد' فیصلہ حضرت عمرؓ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ قانون سے بڑا اہم اختلاف تھا۔

دوسری مثال' افرادِ اُمت کے وظائف کے تعیّن کا معیار تھا۔ رسولؐ اللہ اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں اس کا معیار' ہر فرد یا خاندان کی معاشی ضرورت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس قانون کو بدل دیا اور اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دے دیا۔ یہ اختلاف بھی بہت اہم تھا جس کی تفصیل ''معاشی نظام'' میں پیش کی جائے گی۔ وہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کی اجتہادی غلطی تھی جس کا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہوگیا' لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کا ازالہ کرتے' ان کی شہادت ہوگئی۔

اوّلیاتِ حضرت عمرؓ

یہ ان امور کی چند ایک مثالیں ہیں جن میں' حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ ان کے علاوہ' جو نئے امور سامنے آئے ان کے متعلق آپ نے (پہلی بار) اپنے فیصلے صادر فرمائے۔ انہیں حضرت عمرؓ کی ''اوّلیات'' کہا جاتا ہے اور ان کی فہرست طُول طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی وسعت اس قدر بڑھ گئی تھی اور نئے نئے امور نہایت تیزی سے سامنے آ رہے تھے' تو مملکت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے تصفیہ کے لئے ضروری احکام نافذ اور قواعد و ضوابط منضبط کرے۔ ان میں سے چند ایک (تمثیلاً) درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(1) خزانہ قائم کیا۔ (2) سنِ ہجری رائج کیا۔ (3) دفاتر قائم کئے اور رجسٹر مرتب کرائے۔ (4) مردم شماری کرائی۔ (5) شہر آباد کرائے' نہریں کھدوائیں۔ (6) عشورہ (یعنی محصول چنگی) کی اِبتداء کی۔ (7) دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔ (8) نمازِ تراویح جماعت سے قائم کی۔ (9) نمازِ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا۔ (10) مساجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔ وغیرہ ذالک۔

حاصلِ بحث

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی نظام میں:

(1) قانون کا سرچشمہ' قرآنِ کریم ہے۔ اس کے احکام' اصول اور اقدار سب غیر متبدل ہیں' ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

(2) جن امور کو قرآن نے جائز قرار دیا ہے' اگر اسلامی نظام چاہے تو (بہ تقاضائے حالات) انہیں ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام انہیں اَبداً حرام قرار نہیں دے سکتا۔ مصالحِ اُمت کے مطابق ان پر وقتی پابندی عائد کر سکتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی حرام کو حلال قرار دے سکتا ہے۔

(3) جن احکام کو قرآن نے مطلق (بلا شرائط و قیود) بیان کیا ہے' اسلامی نظام ان پر عند الضّرورت' قیود اور شرائط عائد کر سکتا ہے اور بعض احکام کو وقتی طور پر ساقط العمل بھی قرار دے سکتا ہے۔

(4) سابقہ اَدوار کے فیصلوں میں' خواہ وہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں' ردّ و بدل کر سکتا ہے اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

(5) نئے پیش آمدہ معاملات کے متعلق نئے احکام بھی صادر کر سکتا ہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ احکام و قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل' یا حکّ و اضافہ' صرف اسلامی نظامِ حکومت کر سکتا ہے۔ کسی فرد یا کسی جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں حضورؐ کا ارشادِ گرامی واضح ہے کہ

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے یا اسے جسے امیر اس مقصد کے لئے مقرر کرے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا تھا کہ

یہ کام اس کے لئے رہنے دینا چاہئے جو اس کے نفع و ضرر کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

پاکستان میں

یہ تھا اسلامی نظام میں قانون سازی کا اصول۔ لیکن جب (بعد میں) مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی‘ تو پھر یہ تمام اصول بدل گئے۔ اُس وقت‘ نہ اسلامی نظامِ حکومت باقی رہا نہ اس کا مرکز۔ دین اور سیاست میں ثنویّت پیدا ہوگئی۔ امورِ سیاست‘ حکومت نے اپنی تحویل میں لے لئے‘ اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ ''مذہبی امور'' سے مراد تھی عقائد کی بحث اور پرسنل لاز (شخصی قوانین)۔ بالفاظِ دیگر‘ اُس وقت‘ اسلام (دین کے بجائے) مذہب بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کی حکومت سیکولر ہوگئی ـــــ مملکت کے معاملات میں فرمانرواؤں نے اپنی مَن مانی کی اور مذہبی امور میں علماء اور فقہاء نے اپنا حکم چلایا۔ اُمت کے مرکز (اسلامی نظام) کے خاتمے کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُمت میں فرقے پیدا ہو جاتے ـــــ فرقے‘ جن کے وجود کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے (30:31)۔ چنانچہ فرقے پیدا ہوئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتوے دینے شروع کر دیئے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کا نبیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پھر سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا احیاء کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال قانون سازی کا تھا۔ جب یہ بحث چھڑی تو اسلامی نظام کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا‘ اس لئے ہر فرقہ نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

(1) ایک فرقہ نے کہا کہ جو کچھ کتبِ احادیث میں درج ہے‘ اسلامی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے کسی حکم کو معطل یا منسوخ کر دینا تو درکنار‘ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی کر سکے۔ ایسا کرنا انکارِ سنت ہوگا۔ نیز اسلامی حکومت کو اس کا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا حکم نافذ کر سکے۔ یہ بدعت ہوگی‘ جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں۔

(2) دوسرے فرقہ نے کہا کہ جو کچھ ہمارے آئمہ فقہ نے فیصلہ کر دیا ہے‘ اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ من و عن ان فیصلوں کو نافذ کرے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اُسے حق حاصل نہیں۔

جدید امور کے متعلق ان میں سے بعض لوگ اتنی اجازت دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت‘ فقہاء کے فیصلوں کی روشنی میں نئے احکام نافذ کر سکتی ہے لیکن دوسرے حضرات اس کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کا دروازہ یکسر بند ہے۔

(3) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے‘ اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حدیث‘ قرآنی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے[1]۔ اور اہلِ فقہ کا عقیدہ کہ اگر قرآن کی کوئی آیت‘ ان کے ائمہ کے کسی فیصلہ کے خلاف ہو‘ تو اوّل تو اس آیت کی ایسی تاویل کرنی چاہیئے جو ائمہ کے فیصلہ کے مطابق ہو اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھنا چاہیئے۔

(تاریخِ فقہ اسلامی‘ علامہ خضری صفحہ 421)

1۔ مثلاً قرآن کی آیت متعلقہ وصیت کو ایک حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ''فتنۂ انکارِ حدیث'' از علامہ محمد ایوب مرحوم‘ صفحہ 85)

ان امور پر تفصیلی بحث آخری باب میں ہوگی

اِس وقت ہمارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے اور تعجب ہے کہ اہلِ حدیث حضرات ہوں یا اہلِ فقہ‘ حضرت عمرؓ کو مومنِ حقّا اور خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں‘ اور ان کے عہدِ خلافت کو اسلامی حکومت کا بہترین آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

ان حضرات کا جو مسلک اوپر بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق انہیں اصرار ہے کہ وہ عین اسلام ہے‘ ظاہر ہے کہ اس کی رُو سے قانون سازی کے سلسلہ میں کوئی حکومت بھی‘ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ لیکن چونکہ (اس پچیس سال میں) کسی حکومت میں اس کی جرأت نہیں تھی کہ وہ عہدِ فاروقیؓ کی نظیر پیش کرکے‘ قانون سازی کے لئے صحیح اسلامی طریق اختیار کرے اور اس طرح علماء حضرات سے جھگڑا مول لے‘ اس لئے انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ آئین میں تو یہ الفاظ درج کردیئے جائیں کہ ”پاکستان میں کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا“، لیکن عملاً وہی کچھ ہونے دیا جائے جو ہو رہا ہے۔ لہٰذا‘ ہم آج بھی اُسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں انگریز کے عہدِ حکومت میں تھے۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے اقدامات کا تذکرہ کرنے کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے)۔

مَیں نے جرأت کی اور کہا کہ قانون سازی کے لئے ہمارے سامنے عہدِ فاروقیؓ بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں ان اصولوں کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کرلینا چاہیئے۔ علماء حضرات نے اُسے ”انکارِ سنت“ قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر کردیا اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے — اسلامی ضابطۂ قوانین نہ بننا تھا‘ نہ بنا‘ نہ بن سکے گا۔ اس کا اعتراف خود ان حضرات نے بھی کرلیا ہے کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو[1]۔ یہ اعتراف بھی ہے‘ اور اس پر اصرار بھی کہ ضابطۂ قوانین ”کتاب وسنت“ کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ یاللعجب!

یاد رکھئے! وہی اسلامی حکومت‘ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرسکے گی جو خلافتِ فاروقی کو اپنے لئے اُسوہ (نمونہ) قرار دے کہ وہ عہد‘ عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

لیکن ایسا وہی کرسکے گا جو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرے‘ علماء حضرات کے کفر کے فتوؤں سے نہ ڈرے۔ اس مقام پر ہم ایک بار پھر اقبالؒ کے الفاظ دہرا دینا چاہتے ہیں کہ:

ایسا وہی حکومت کرسکے گی جو رُوحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے۔

معلوم نہیں اس کی سعادت کس ملک کے حصے میں آئے گی۔

1۔ ”اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہوجائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہوسکے گی...... ”کتاب وسنت“ کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں‘ شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(ابوالاعلیٰ مودودی صاحب‘ بحوالہ ایشیاء 23 اگست 1970ء)

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب، اور کدھر سے
مسکیں ولکم ماندہ دریں کشمکش اندر (اقبال)

3- قانون سازی ہی نہیں ___ سیرت سازی بھی

آنچہ حق می خواہد آں سازد تُرا

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قانون خواہ کیسا ہی مکمل، جامع، اور اسقام سے منزّہ کیوں نہ ہو، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کرسکتا جب تک اس قانون کو نافذ کرنے والوں کی سیرت صحیح سانچوں میں نہ ڈھلی ہو۔ بنابریں، وہ قانونی سازی کے ساتھ ساتھ، ان انسانوں کی سیرت وکردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے جنہوں نے ان قوانین کو عملاً نافذ کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے رفقاء کا گروہ بھی ان مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا، جن کے مومنِ حقّا ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی تھی (8:74) لیکن مومنین کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ (بڑے بڑے عیوب وجرائم) سے مُجتنب رہتے ہیں البتہ معمولی لغزشوں (لمم) کا ان سے امکان ہوسکتا ہے (53:32)۔ اس قسم کی معمولی لغزشیں، عام لوگوں کی صورت میں کوئی خاص مضر اثر پیدا نہیں کرتیں (کیونکہ ان کے اعمال وافعال کا اثر متعدی نہیں ہوتا) لیکن جن اربابِ نظم ونسق کے ہاتھ میں لاکھوں (کروڑوں) انسانوں کا حال اور مستقبل ہو، اور ان کی قیادت کی اہم ذمہ داری جن کے کندھوں پر، ان کے لئے اس قسم کی عام لغزشوں سے بچنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ جو حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رُفقاء کی ہر نقل وحرکت پر نگاہ رکھتے تھے ___ سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمّالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر اَبد در کنار درخشندہ وتابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانین حکومت کے مبنی بَرحق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

عمّالِ حکومت کے انتخاب کا معیار

قرآنِ کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے، عمّال کے انتخاب میں، قرآنی علم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) مکّہ کے گورنر، نافعؓ بن عمر بن عبدالحارث آپ سے ملے تو آپ نے پوچھا کہ تم نے اہلِ وادی پر کسے حاکم مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبدالرحمٰنؓ بن ابزی کو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (سابقہ) غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا کہ اُسے کس خصوصیت کی بنا پر حاکم مقرر کیا ہے، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس کی قرآن پر گہری نگاہ ہے اور فرائضِ دین کا علم حاصل ہے۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

(2) اس واقعہ کو پھر سے سامنے لایئے جس میں ایک شخص نے کہا تھا کہ فلاں آدمی بڑا قابلِ اعتماد ہے تو آپ نے پوچھا تھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ یا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ اور جب اس نے اِن سوالات کا جواب نفی میں دیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ پھر تمہیں اس شخص کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم نے اُسے مسجد میں اٹھتے بیٹھتے (نماز پڑھتے) دیکھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بڑا قابلِ اعتماد ہے۔

حُسنِ معاملات

یہی معیار آپ عمّالِ حکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں اختیار فرماتے تھے۔ وہ کسی کے نماز روزے کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصبِ متعلقہ کے لئے اس کی صلاحیت اور حسنِ معاملت کو دیکھتے تھے۔ اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے ہوتا' اسے منتخب کرتے تھے' اور اس باب میں کسی کی رُو رعائت نہیں کرتے تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کر دوں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو''۔

بلند اصول

(3) انتخاب کے لئے' آپ کے اصولوں میں سے ایک اصول ملاحظہ فرمایئے اور پھر آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ آپ جس شخص کو منتخب کرتے تھے وہ کس سیرت و کردار کا حامل ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ:

> جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے اور جب اُسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

کہیئے! اس معیار کو دیکھ کر آپ کی نگہِ بصیرت وجد میں آ گئی ہے یا نہیں!

(4) آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

> خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔

ثقاہت اور قوت

یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے اور ایک شخص نہایت دیانتدار اور قابلِ اعتماد ہے لیکن ہے کمزور' تو وہ بھی مضرت رساں ہے۔ لہٰذا' انتخاب کا اصول تھا' ثقاہت اور قوت۔

شفقت اور محبت

(5) لیکن ''قوت'' سے مراد سنگدلی اور شقاوتِ قلبی نہیں تھی' عدل کے لئے جرأت و بسالت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ ایک

شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا' آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ نے اُسے پیار کیا۔ اس (منتخب شدہ شخص) نے کہا کہ امیر المومنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ آپ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور؟ اگر خدا نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اُس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آ سکتا' وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا۔

طلبگار کو نہیں

(6) کسی صوبے کی گورنری کے لئے ایک شخص آپ کے ذہن میں تھا لیکن اس نے ایک دن آ کر آپ سے کہا کہ مجھے گورنر تعینات کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے ہی گورنر بنانے والا تھا' لیکن اب نہیں بناؤں گا کیونکہ جو شخص خود کسی عہدہ کا خواہشمند ہو' اُسے اس عہدہ پر فائز نہیں کرنا چاہئے۔

شاعر نہ ہو

(7) آپ نے نعمان بن عدیؓ کو ایک صوبہ کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے کچھ ایسے اشعار آپ کے سامنے آئے جس میں اس نے شاہد و شراب کی وجد آور کیفیات بیان کی تھیں۔ آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! بخدا میں نے آج تک کبھی شراب کو چکھا تک نہیں۔ یہ تو محض شاعری ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ تو شاعر تو بہت اچھا ہے لیکن گورنری کے قابل نہیں اس لئے تجھے معزول کیا جاتا ہے۔ (حضرت عمرؓ کے اپنے قبیلے کے آدمی تھے)۔

اشخاص پرستی کے خلاف

(8) صحابہؓ میں سے جو لوگ زیادہ صاحبِ اثر تھے آپ انہیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ مدینہ سے باہر نہیں جانے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ آپ ہم لوگوں کو باہر کیوں نہیں جانے دیتے۔ آپ نے فرمایا کہ "اس سوال کا جواب نہ دینا جواب دینے سے بہتر ہے"۔

اور وجہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات باہر جاتے تو نومسلموں میں شخصیت پرستی شروع ہو جاتی۔

اپنے بیٹے کو گورنر نہیں بنایا

(9) اہلِ کوفہ کی طرف سے آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اگر وہاں کسی نرم مزاج آدمی کو گورنر بنا کر بھیجا جاتا تو وہ اُسے خاطر میں نہ لاتے۔ اگر وہ سخت مزاج ہوتا تو اس کی شکایتیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تنگ آ کر کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو نہایت قوی بھی ہو اور امین بھی تو میں اُسے وہاں کا گورنر مقرر کروں۔ ایک شخص پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں

آپ کو ایسا آدمی بتاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ عبداللہ ابنِ عمرؓ (یعنی خود آپ کے صاحبزادہ)۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ خدا تجھے غارت کرے! (اس سے زیادہ اور کیا کہوں!)

تبادلے

اس قدر احتیاط کے بعد، آپ عمّالِ حکومت کا تقرر کرتے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شخص کے تقرر کے بعد آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ آپ ان میں سے ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھتے (اس کی تفصیل چند سطور آگے چل کر ملے گی) اور کسی کے متعلق کوئی شکایت سنتے تو اسے وہاں سے تبدیل کر دیتے اور شکایت کے درست ثابت ہونے پر اُسے معزول کر دیتے۔ آپ کا مقولہ تھا کہ

> اگر کوئی حاکم کسی جگہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور میں اُسے، اس کا علم ہو جانے کے بعد بھی، وہاں سے تبدیل نہیں کرتا تو یہ سمجھئے کہ وہ ظلم و زیادتی گویا خود میں نے کی ہے۔

فرمایا:

> کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو گورنر تعینات کر دوں جو میرے خیال میں تم سب سے بہتر ہو۔ پھر اُسے انصاف کرنے کی تاکید بھی کر دوں، تو کیا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا!

لوگوں نے کہا کہ ہاں!

آپ نے فرمایا:

> نہیں! جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام بھی کر رہا ہے یا نہیں، میں اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

4-ہدایات

عمّال کی تعیناتی کے وقت اور اس کے بعد بھی، وقتاً فوقتاً آپ جو ہدایات دیتے اور نافذ کرتے رہتے تھے، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں کس سیرت و کردار کا حامل، اور امورِ مملکت کو کن خطوط پر سرانجام پاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً)

(1) آپ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے:

> یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا بلکہ رعایا کا راہنما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں۔ کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ مچل جائے۔ لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(2) آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا:

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تا کہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور صاحبِ منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(3) جب کسی حاکم کے متعلق سنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحبِ احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اُسے برخاست کر دیتے۔

(4) حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کے نام ایک خط میں لکھا:

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(5) ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ (1) تُرکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے)۔ (2) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (3) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (4) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (5) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کُھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمعِ عام میں پڑھ کر بھی سنا دیا جاتا۔

(6) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمّال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے جب وہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(7) ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمانؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں''۔ اسی بِنا پر وہ عمّالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

عصبیّتِ جاہلیہ کے خلاف

(8) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں قبیلہ ضبّہ نے اپنے

امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے' آلِ ضبّہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیّت' جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا' پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب گروہ دو ہی ہوں گے —— ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم —— اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے گا۔

(9) حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک خط میں لکھا —— اور غور سے سنئے کہ کیا لکھا —— لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہوتو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(10) آپ نے سپہ سالاروں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جنگ کے دوران کسی کو سزا نہ دو' مبادا وہ دشمن کے ساتھ جا ملے۔

(11) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو (جب وہ بصرہ کے گورنر تھے) لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عوام کے ہجوم کو ایک ساتھ بلا لیتے ہو۔ مساوات بیشک اپنی جگہ ہے لیکن اہلِ علم و دیانت کی قدر افزائی بھی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن دان اور صاحبِ دیانت لوگوں کو پہلے بلا لیا کرو۔ (ایسا کرنا علاوہ ان حضرات کی قدر افزائی کے' دوسروں کے دل میں قرآن دانی اور دیانت کا شوق پیدا کرے گا)۔

نرمی بلا ضُعف —— سختی بلا جبر

(12) ایک قول سنئے اور جُھوم جایئے۔ فرمایا:

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو' لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور جس میں سختی ہو' لیکن اِستبداد کی بنا پر نہیں —— بلا ضعف نرمی اور بلا جبر قوت —— یہ ہے اصل الاصول۔

(13) حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہ! ایسا بن کر رہنا کہ پُر امن تجھ سے بے خوف رہیں اور بدمعاش خوف زدہ۔

وجد آفریں قول

(14) ایک اور وجد آفریں قول —— فرماتے ہیں:

جو شَر پیدا کر کے غالب آیا' وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی' وہ کامیاب نہیں' ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور

تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا۔اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

غلام کی طرح مخلص اور امین

ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت اَحنف بن قیسؓ بھی تھے۔سخت گرمی کا دن تھا۔دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی عبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔وفد کو دیکھا تو فرمایا:

اَحنف! کپڑے اتار کر آجا اور میری مدد کر۔یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں' بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا ـــــ امیر المومنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور اَحنف سے بڑا غلام کون ہوگا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔کہا:

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

عام تاکید یہ تھی کہ

کُھردرے بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ کرو۔اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔سخت بنو۔جھوٹا موٹا کھاؤ۔گاڑھا گزی پہنو۔پرانے کپڑے استعمال کرو۔سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو۔ہمیں تکلّف سے منع کیا گیا ہے اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔دین میں تفقہ حاصل کرو۔کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو جس میں تکبر دیکھو' سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

محاسبۂ خویش

اور آخر میں وہ ہدایت' جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔فرمایا:

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے کیونکہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔اپنے آپ کو ''عرضِ اکبر'' (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔

آیئے ـــــ ہم دیکھیں کہ یہ محاسبہ کس طرح ہوا کرتا تھا۔اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

5-اِحتساب

مقبوضات کی فہرست

احتساب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ہر عامل کی تقرری کے وقت اس کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی التزام یہ تھا کہ ہر عامل کو اتنا دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے متعلقین کی ضروریات باطمینان پوری ہوتی رہیں۔ (تفصیل اس کی معاشی نظام میں ملے گی)۔

(2) اس فہرست کی چیکنگ میں بڑی شدّت برتی جاتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر مقرر کیا تو وہ واپسی پر دس ہزار دینار ساتھ لائے۔ آپ نے فوراً مؤاخذہ کیا کہ وہ مال کہاں سے آیا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے گھوڑیاں پال رکھی تھیں' اُن سے آمدنی ہوئی۔ عذر معقول تھا' قبول کر لیا گیا۔ (حضرت ابو ہریرہؓ کو ان کے عہدہ پر واپس بھیجنے لگے تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ ذمہ داری بڑی سخت ہے اگر اِس میں نادانستہ بھی کوئی بات خلافِ عدل ہو گئی تو آپ کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکوں گا۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں)۔

(3) آپ نے احکام جاری کر رکھے تھے کہ کوئی گورنر مدینہ آئے تو دن کے وقت آئے اور لوگوں کے سامنے شہر میں داخل ہو۔ رات کے وقت نہ آئے۔

راعی کی ذمہ داری

(4) یہ احتساب مال تک محدود نہیں تھا۔ عمّال کے رہن سہن' طرزِ بود و ماند' تمدن و معاشرت' اخلاقِ عامہ' غرضیکہ ان کی ہر نقل و حرکت پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ مصر کے گورنر (حضرت) عیاض بن غنمؓ کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے۔ ان کے خلاف شکایت یہ تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے دربان مقرر کر رکھا ہے۔ شکایت کے صحیح ثابت ہونے پر آپ نے ان سے کہا کہ یہ لو' اُون کا جبّہ پہنو' ایک عصا لو اور بیت المال کی تین سو بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریا) کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔

حِمص کے گورنر' (حضرت) عبداللہ بن قرطؓ کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالا خانہ بنوا لیا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالا خانہ کو تو آپ (حضرت عمرؓ) نے آگ لگوا دی اور گورنر کو ایک جبہ پہنوا کر' ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کی بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو۔ اس سے' دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے گی۔

(5) فاتحِ مصر' حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے جس نے ایک قبطی کو بلاوجہ پیٹ دیا تھا۔ آپ نے

اس قبطی کے ہاتھوں اسے کوڑے لگوائے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ خود (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی ایک آدھ تازیانہ لگا دیا جائے جس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔

مدافعت کا موقعہ دیا جاتا

(6) شکایت سننے پر یونہی اندھا دھند مؤاخذہ نہیں کر لیا جاتا تھا۔ شکایت کی پوری پوری چھان بین کی جاتی اور جس کے خلاف شکایت ہوتی اُسے اپنی مدافعت کا موقعہ دیا جاتا۔ لوگوں نے حمص کے گورنر (حضرت) سعیدؓ بن عامر کے خلاف چار شکایتیں کیں۔ (1) وہ دن چڑھے تک گھر سے نہیں نکلتے۔ (2) رات کے وقت کسی کی پکار نہیں سنتے۔ (3) مہینہ میں ایک دن بالکل ہی باہر نہیں آتے۔ اور (4) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے سعیدؓ سے پوچھا کہ پہلی شکایت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے' انہوں نے کہا۔ بخدا مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس بات کو عام کروں لیکن آپ پوچھتے ہیں تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی کے پاس کوئی خادمہ نہیں' میں نے اس کا کچھ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ صبح اُٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں۔ اس کے خمیر ہونے تک انتظار کرتا ہوں۔ پھر روٹی پکاتا ہوں ازاں بعد وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ وہ رات کے وقت باہر نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں یہ راز بھی سَر بستہ ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن اب اِسے بھی کھولنا پڑا۔ میں نے دن رعایا کے لئے اور رات کو اللہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

تیسری شکایت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک دن باہر نہیں نکلتا۔ سو میرے پاس خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے۔ نہ ہی کپڑوں کا کوئی فالتو جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک دن کپڑے دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے تک انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔

اب رہا چوتھا الزام' کہ مجھ پر کبھی کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے تو یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اس میں مجھے عمرِ رفتہ کو آواز دینی پڑے گی۔ مکہ میں مشرکین نے حضرت خبیبؓ انصاری کو گرفتار کر لیا اور ان کی بوٹیاں اڑا کر انہیں کھجور کے تنے کے ساتھ لٹکا دیا اور پوچھا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمدؐ ہوتا۔

انہوں نے جواب دیا کہ ملعونو! تم یہ کیا کہتے ہو۔ میں تو اسے بھی پسند نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے رہوں اور حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چُبھ جائے۔ اس پر قریش نے انہیں سخت اذیت دے کر صلیب دی۔

جب کبھی مجھے وہ دن یاد آ جاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں کہ خدا میرا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ میں نے اپنے سامنے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا اور خبیبؓ کی کوئی مدد نہ کی۔ میں اُن دنوں مُشرک تھا' خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بایں ہمہ' میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک مظلوم کی مدد کرنی چاہئے تھی۔ جب اپنے اس گناہ کا احساس غالب آ جاتا ہے تو مجھ پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

سرِ عام سزا

یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اور اس کے باوجود' سربراہِ مملکت ان کی رفتار' گفتار اور کردار پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شکایتوں کی تحقیق و تفتیش سرِ عام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی اور الزام صحیح ثابت ہونے پر' سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ اس طریقِ کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس سے عمّالِ حکومت بددل ہو جائیں گے اور رعایا کی ان کے خلاف جرأتیں بڑھ جائیں گی۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پر بددل ہوتا ہے' وہ منصبِ حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ قرآنِ کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ سزا پبلک میں دی جائے اور اس باب میں ذرا سی بھی نرمی نہ برتی جائے (24:2)۔

ہمارا ہر عمل عوام کے لئے سند بن جاتا ہے

آپ عمّالِ حکومت کے بارے میں اس قدر سختی کیوں برتتے تھے' اس کی وجہ بھی آپ نے بیان فرما دی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے کہا کہ طلحہؓ! طواف میں رنگدار کپڑا' چہ معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا ''طلحہؓ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام ہیں جن کی اقتداء عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالتِ طواف رنگدار کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا یہ معصوم سا عمل لوگوں کے لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا' ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہئے''۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ ان ذمہ دار حضرات کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مؤاخذہ کرتے تھے۔

خود اپنا محاسبہ

لیکن دوسروں کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنے سے پہلے' امیر المومنین خود اپنا محاسبہ کرتے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مؤاخذہ کے لئے پیش کرتے تھے۔

یمنی چادریں

واقعہ مشہور ہے کہ یمنی چادریں آئیں تو آپ نے سب کو ایک ایک چادر دے دی۔ ایک دن آپ منبر پر تشریف لائے اور حسبِ معمول مجمع سے کہا کہ ـــــ **اسمعوا و اطیعوا** ''سنو جو کچھ میں کہتا ہوں اور پھر اس کی اطاعت کرو''۔
مجمع میں سے آواز آئی ـــــ ''ہم نہ تمہاری سنیں گے' نہ اطاعت کریں گے'' ـــــ کہنے والے حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔

سربراہِ مملکت منبر سے نیچے اُتر آئے اور کہا کہ ابوعبداللہ! کیا بات ہے؟

کہا۔ عمر! تم نے دنیاداری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہو؟

فرمایا: عبداللہ بن عمرؓ کہاں ہے!

حاضر ہوں! امیر المومنین!

فرمایا' بتاؤ! ان میں سے ایک چادر کس کی ہے —— عرض کیا میری ہے' امیر المومنین۔

آپ نے حضرت سلمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا' ابوعبداللہ! تم نے جلدی کی جو بات پوچھے بغیر احتجاج کر دیا۔ میں نے اپنے میلے کپڑے دھوئے تھے۔ باہر آنے کے لئے ایک چادر کافی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے (اپنے بیٹے) عبداللہ سے چادر مانگ لی تھی۔

(حضرت) سلمانؓ نے کہا' ہاں! اب کہئے' یا امیر المومنین!! ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ آپ خود اپنا یہ قول کیسے بھول سکتے تھے کہ

رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے۔

ایک درہم

(2) حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کُوڑے میں سے ایک درہم (اُس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پر پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا بلاوا آ گیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیب! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امتِ محمدؐ یہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

عمر! خدا سے ڈر

(3) ایک شخص نے آپ سے بھرے مجمع میں کہا کہ عمرؓ! خدا سے ڈر۔ وہ بار بار اس جملہ کو دہرائے چلا گیا تو مجمع میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ اب بس بھی کرو' تم بہت کہہ چکے۔ حضرت عمرؓ نے اسے روکا اور کہا نہیں! اسے کہنے دو۔ اگر لوگ ایسی بات نہ کہیں تو سمجھ لو کہ ان میں خیر کا ذرّہ تک نہیں رہا اور اگر ہم اسے نہ سنیں تو سمجھ لو کہ ہم میں خیر کی رمق تک نہیں رہی۔

خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو......

(4) ایک دن آپ نے برسرِ منبر کہا کہ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص کھڑا ہو گیا۔

تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ ہم تمہارا سر اُڑا دیں گے۔ آپ نے اسے آزمانے کے لئے کہا کہ کیا تو میری شان میں یہ بات کہتا ہے۔ اس نے نہایت سکون سے کہا کہ ہاں! تمہاری شان میں۔ آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ! قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر عمر بھی کج رَو ہو جائے تو وہ اس کا سر اُڑا دیں۔

(5) اور یہ "سر اُڑا دینے کی بات" تو خود آپ ہی نے انہیں بتائی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک ٹھیک چلے تو لوگوں کو چاہئے کہ اس کی اطاعت کریں لیکن اگر وہ غلط راستہ اختیار کرلے تو اسے قتل کر دینا چاہئے۔

حضرت طلحہؓ پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا آپ نے یہ کیوں نہ کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو اسے معزول کر دینا چاہئے۔ آپ نے فرمایا ــــ "نہیں! قتل کر دینا بعد میں آنے والوں کے لئے زیادہ عبرتناک ہوگا"۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی دانست میں سمجھے کہ خلیفہ غلطی کر رہا ہے تو وہ اٹھ کر اس کا سر اُڑا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جرائم کی سزا موت ہے اگر وہ خلیفہ سے بھی سرزد ہوں تو اسے بھی وہی سزا دینی چاہئے۔ اس باب میں سربراہِ مملکت اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرنا چاہئے۔

اہل وعیال کا اِحتساب

لیکن حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ سربراہِ مملکت کا احتساب اس کی ذات تک محدود نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں اس کے اہل وعیال بھی برابر کے شریک ہونے چاہئیں۔ قرآنِ کریم نے جو بعض بیوی بچوں کو انسان کا دشمن (64:14) اور مال اور اولاد کو فتنہ (64:15) کہا ہے تو یہ خطرناک گھاٹی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ

> جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے' ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دُگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہے حدود سے تجاوز کرے' جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دُگنی سزا" کا فیصلہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی' اُسے دُگنی سزا ملے گی (33:30)۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم' مملکتِ اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔

ذمہ دار کو نیند کہاں!

یہ تھا مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس جس کے پیشِ نظر آپ نے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) مصر کے قاصد (حضرت) معاویہ بن خدیجؓ سے کہا تھا کہ تم نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے امیر المومنین اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے؟ معاویہ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف اُسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آ سکتی۔

ذمہ داریوں کا احساس

اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس پر نگاہ رکھتے ہوئے حضرت عباسؓ نے اس شخص کے سوال پر کہ حضرت عمرؓ کیسے تھے، جواب میں کہا تھا کہ

وہ اس خوف زدہ پرندے کے مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں، مَیں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ وہ راستہ میں ایک احاطہ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے پسِ دیوار کان لگا کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے۔

خطاب کا بیٹا عمر اور امیر المومنین! اللہ اکبر! خطاب کے چھوکرے۔ اللہ سے ڈرتا رہ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

ایک دن آپ نے اعلان کیا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ"۔ لوگوں نے حسبِ معمول سمجھا کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے جس کے لئے اجتماعی اعلان ہوا ہے۔ وہ جمع ہوئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے لوگو! میں اپنی مخزومی خالاؤں کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا پانی بھرا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے مٹھی بھر چھوہارے دے دیا کرتی تھیں۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اُتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! ہم سمجھے نہیں کہ اس اجتماع اور اعلان کا مطلب کیا تھا۔ فرمایا، آج میں تنہا بیٹھا تھا کہ دل نے کہا تُو امیر المومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان کوئی قوت نہیں۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس پر میں کانپ اٹھا اور کہا کہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے نفس کو بتا دوں کہ وہ ہے کیا؟ اس اجتماع اور خطاب سے یہی مقصد تھا۔

القوی الامین

ایک دن حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے اونٹوں کا جائزہ لینے کے لئے گئے۔ حضرت عمرؓ اونٹوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے احوال و کوائف بولتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ سُن سُن کر حضرت عثمانؓ کو اِملا کرواتے جاتے تھے اور وہ انہیں، ایک درخت کے نیچے بیٹھے، لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے تھے۔ دھوپ سخت تھی لیکن وہ کام میں ایسے منہمک

تھے کہ انہیں اس کی شدت کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے قرآنِ مجید میں حضرت شعیبؑ کی بیٹی کا یہ قول پڑھا ہوگا جس نے کہا تھا کہ یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ [28:26] ''ابا جان! اسے (حضرت موسیٰؑ کو) ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہترین خدمت گزار وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی''۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ ہے قوی الامین۔

اَلْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ـــــ ان دو لفظوں میں حضرت عمرؓ کی ساری شخصیت سمٹ کر آ جاتی ہے۔

جیسا سربراہ ویسے عمّال

اور اُس دَور کے عمّالِ حکومت جو اس قدر امین تھے تو اس کا راز بھی اسی میں تھا کہ سربراہِ مملکت خود امین تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مالِ غنیمت مدینہ بھیجا تو زرّ و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ امیر المومنین! یہ مال و متاع اس قدر وجہِ تعجب اور باعثِ مُسرت نہیں جس قدر یہ امر کہ جب ہم نے یہ شہر فتح کئے ہیں تو یہ تمام زرّ و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور کوئی باہر کا دیکھنے والا بھی نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سارے کا سارا مال لا کر مرکز میں ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو پِیر گئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ فرمایا کہ

ابنِ خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔

یہ تھا سارا راز اُس دَور کی حکومت کی درخشندگی اور تابندگی کا ـــــ اُس دَور میں سربراہِ مملکت کا فریضہ، مملکت کے انتظام کی درستگی ہی نہیں تھا، اس کا فریضہ حکومت کے اعضاء و جوارح کی سیرت و کردار کی درستگی بھی تھا ـــــ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کا اوّلین فریضہ، ارکانِ حکومت کی سیرت و کردار کی درستگی تھا۔ انتظام کی درستگی، ان کی سیرت کی درستگی کا فطری نتیجہ تھا۔

سَمِيْعٌ وَّ بَصِيْرٌ

اور اس حُسنِ عمل اور درستگی، نظم و نسق کا راز یہ تھا کہ سربراہِ مملکت تمام رعایا کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ ایک شخص نے آپ کے ایک پڑوسی سے دریافت کیا کہ امیر المومنین تک پہنچنے کی کیا سبیل ہے۔ اس نے کہا کہ نہ تو ان کے گھر پر کوئی پھاٹک ہے، نہ وہ پسِ پردہ بیٹھتے ہیں۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں پھر جو چاہتا ہے ان سے آ کر باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

ہر ایک کی رسائی

یہ تو رہا رعایا کا امیر المومنین تک پہنچنا۔ لیکن امیر المومنین خود رعایا تک پہنچتا تھا۔ وہ بازاروں میں پھرتے، رعایا کے

معاملات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرتے، ضروری امور کا فیصلہ وہیں برسرِ موقعہ کر دیتے۔ زیادہ اہم معاملات مجلسِ مشاورت میں پیش کر دیتے۔ دن کے وقت فرصت کم ملتی، تو راتوں کو گشت کرتے اور بغیر کسی کو علم ہوئے، رعایا کے حالات براہِ راست معلوم کرتے۔

بچہ رو رہا تھا

کتبِ تاریخ میں اس گشت کے بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات مذکور ہیں۔ (مثلاً) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اُترا۔ اس کی خبر گیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگاتے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اُدھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزرے تو بچے کو روتے پایا۔ سخت غصہ کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بے رحم ماں ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ روتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو سخت رقّت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! نہ معلوم تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اسی دن منادی کرادی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

خالی ہانڈی چڑھا رکھی تھی

(2) آپ کے خادم اسلمؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کے وقت گشت کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقتِ حال معلوم کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے، بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اسلمؓ سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلمؓ نے کہا کہ مجھے دیجئے میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلمؓ! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے، اس لئے یہ بوجھ مجھے خود اٹھانے دو۔ یہ چیزیں لاکر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا، بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیر المومنین ہونے کے قابل تم تھے نہ کہ عمرؓ۔

فی الحقیقت امیر المومنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

بدو کی بیوی

(3) اسی طرح ایک رات گشت میں ایک بدو کے پاس، اس کے خیمے سے باہر بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعتہً

خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میری بیوی دردِزہ میں مبتلا ہے اور اس وقت کوئی عورت پاس نہیں۔ آپ خاموشی سے اُٹھے۔ گھر آئے' اپنی زوجہ محترمہ اُمِّ کلثومؓ (جو حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھیں) کو ساتھ لیا اور بدو کی اجازت سے انہیں خیمہ کے اندر بھیج دیا اور خود باہر بدو سے باتیں کرنے لگے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے کہ اندر سے اُمِّ کلثومؓ کی آواز آئی۔ ''امیر المومنین! اپنے دوست کو بچے کی مبارکباد دیجئے''۔

امیر المومنین!!! ــــ یہ سن کر بدو کی جو حالت ہوئی ہوگی' وہ ظاہر ہے۔ آپ نے اُسے مبارک باد دی اور فرمایا کہ کل میرے پاس آنا تاکہ اس بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

دُودھ میں پانی نہ ملانے والی لڑکی

(4) اور اسی گشت کی ایک شبِ تاریک میں آپ کو وہ گوہرِ تابدار مل گیا جس نے کاشانۂ فاروقی کو بقعۂ نُور بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دودھ میں پانی ملانے سے منع کرتے تھے۔ ایک رات گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا ــــ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے شدّت سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا ــــ اُٹھ اور دودھ میں پانی ڈال' اس جگہ کونسا امیر المومنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا ــــ اماں! امیر المومنین نہیں دیکھ رہا تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے' جس کا حکم امیر المومنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اُسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں ــــ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔

اسی لڑکی کی اولاد سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے تھے جنہوں نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی ــــ اسی نسبت سے آپ (حضرت عمرؓ) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نانا کہلاتے ہیں۔

(5) ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ اس سے کہا کہ میاں! دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ دوبارہ ادھر سے گزرے تو وہ پھر بھی بائیں ہاتھ ہی سے کھانا کھا رہا تھا۔ ذرا سختی سے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ میرا دایاں ہاتھ کام آ چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی جہاد میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ افسوس ہے۔ تمہیں وضو کون کراتا ہوگا۔ سر کون دھوتا ہوگا۔ کپڑے کون پہناتا ہوگا۔ پھر ایک ملازم مقرر کر دیا کہ اس کے ضروری کام کر دیا کرے۔

یہ تھا رعایا کے افراد پر سربراہ کی نگاہ کا عالم!

ہمارا حاکم اور ہماری حالت سے بے خبر!

(6) اس عورت کے واقعہ میں جو خالی ہانڈی چولھے پر چڑھائے، بھوکے بچوں کو بہلا رہی تھی، ہم نے ایک اہم کڑی دانستہ چھوڑ دی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ بچوں کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ تم نے امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی ہے! اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا تھا اُس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اُس دَور میں عام عورتیں تک، حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر رہے، اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اُسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

شام کے ویرانے کی بُڑھیا

آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا — ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ اس نے کہا کہ سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے، اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا، عمرؓ کا کام تھا — آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دُور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اُسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتایا۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا کیونکہ دُور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمّال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ جاؤں گا! اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کر کے لوگوں کے حالات براہِ راست معلوم کروں گا۔

لیکن، عمر نے ایفانہ کی اور اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔

ظاہر ہے کہ جب ان کی اپنی یہ حالت تھی تو اپنے عمال کو کس قدر سخت تاکید نہیں کرتے ہوں گے کہ وہ لوگوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (حضرت) عیاض بن غنمؓ کو اس ''جرم'' کی پاداش میں کہ انہوں نے اپنے دروازے پر دربان بٹھا دیا تھا' کیسی عبرت آموز سزا دی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مکان کے سامنے بازار تھا' جس سے ہر وقت شعور وشغب کی آواز آتی رہتی تھی۔ آپ نے اس طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے محمد بن مسلمہؓ (انسپکٹر امورِ عامہ) کو بلا کر کوفہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر' سعدؓ کے دروازے کو آگ لگا دے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو خط حضرت سعدؓ کو لکھا تھا اس میں کہا تھا کہ

جس محل کے دروازے عوام پر بند ہو جائیں' وہ قصرِ سعدؔ نہیں' قصرِ فساد ہے' اس کا منہدم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

آپ نے گورنروں کے نام تاکیدی احکام نافذ کر رکھے تھے کہ

وہ پردوں کے پیچھے چھپ کر نہ بیٹھیں۔ عوام کے سامنے بیٹھیں۔ اپنا حق وصول کریں۔ ان کے حقوق کی ادائیگی کریں۔

حج کی تقریب پر شکایات

یہ تو سال بھر کا معمول تھا اور سال کے بعد حج کا اجتماع ہوتا تھا جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے تھے۔ اس میں آپ تمام صوبوں کے گورنروں کو بلاتے۔ دوسری طرف ملک میں عام اعلان کیا جاتا کہ جسے کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو وہ اس اجتماع میں آ جائے۔ وہاں شکایات سنی جاتیں، پیشی ہوتی اور جس کے خلاف شکایت صحیح ثابت ہوتی اُسے لاکھوں کے اجتماع میں سزا دی جاتی یا سرزنش کی جاتی۔

یہ تھا امیر المومنین' حضرت عمر فاروقؓ کا رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا طریق اور معمول۔ سچ ہے' جو خدائے سمیع وبصیر وخبیر کے نام پر لوگوں سے اطاعت لے' اسے خود ایسا ہی (بحدِّ بشریّت) سمیع وبصیر وخبیر ہونا چاہئے۔ یہی صحرائے شام کی اس بڑھیا نے کہا تھا کہ

اگر عمرؓ کے پاس رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں تو اُسے چاہئے کہ حکومت چھوڑ دے۔

ان مقامات پر رہ رہ کر میرے جی میں آتا ہے کہ میں فاروقِ اعظمؓ کی اس بات کو بھی نوکِ قلم پر لے آؤں جس کے تصور سے رہگذرِ خیال روشِ صد بہار ہو جاتا ہے لیکن کوئی جذبہ ہے جو غیر شعوری طور پر یہ کہہ کر میرا ہاتھ روک لیتا ہے کہ

اپنے سینے میں اِسے اور ذرا تھام ابھی

اس لئے میں اسے، اِس جادۂ جنت نگاہ کی کسی اگلی منزل[1] پر اٹھا رکھتا ہوں۔ ویسے بھی، انتظار کی لذت بڑی دلفریب ہوتی ہے۔ غالبؔ تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ جسے تمنا کہا جاتا ہے وہ انتظار ہی کی سحر آفرینی کا دوسرا نام ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا　　افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

اور اقبالؒ اس ''افسونِ انتظار'' کے ختم کرنے کے حق ہی میں نہیں، جب وہ کہتا ہے کہ

طپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد　　خوشا کسے کہ بہ دُنبالِ محمل است ہنوز

اب آیئے اس سفرِ شوق کی اگلی منزل کی طرف۔

1۔ اس کے لئے دیکھئے بارہواں باب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دسواں باب

معاشرتی زِندگی

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہدِ فاروقیؓ کا سیاسی نظام کس قدر محکم بنیادوں پر استوار تھا اور وہاں کا ضابطہء قوانین کس طرح ان کی اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا کفیل' لیکن زندگی سیاسی دوائر کے اندر ہی تو محصور نہیں ہوتی۔ وہ ترتیب پاتی ہے ان چھوٹے چھوٹے (بظاہر) نہایت معمولی روابط سے جو صبح سے شام تک' قدم قدم پر' ایک فرد کو دیگر افرادِ معاشرہ سے منوط کرتے' اور باہمی تعلقات کے رشتے میں پروتے ہیں۔ یہ رشتے اور یہ تعلقات' قانون کی زنجیروں سے نہیں جکڑے جا سکتے۔ ذرا تصور میں لایئے اس معمولی سے واقعہ کو کہ ایک شخص کو آپ سلام کرتے ہیں اور وہ نہایت بے رُخی سے اس کا جواب دیتا ہے۔ فرمایئے کہ وہ کون سی عدالت ہے جس میں جا کر آپ' اس کے اس طرزِ عمل کے خلاف دعویٰ دائر کریں گے اور وہ کون سا قانون ہے جس کی رُو سے وہ عدالت اُسے مجبور کر سکے گی کہ وہ آپ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آیا کرے۔ ان روابط کی استواریاں قانون کی زنجیروں سے نہیں بلکہ جذبات کے نہایت نرم و نازک ریشمی دھاگوں سے پیوست ہوتی ہیں۔ یہی وہ روابط ہیں جن کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ

یک نگہ یک خندۂ دُزدیدہ یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دِگر

بلکہ غالبؔ کی نازک مزاجی تو ''نگہ'' اور ''نگاہ'' میں بھی فرق کرتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

بہت دنوں کے تغافل نے تیرے کی پیدا
وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

سوچئے کہ وہ کون سی میزانِ عدل ہے جو نگہؔ اور نگاہؔ کے اس فرق کا وزن کر کے بتا سکے گی؟ سچ ہے

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

یا' اس سے نیچے اتر کر یہ سوچئے کہ دنیا کا وہ کون سا قانون ہے جس کی رُو سے آپ کسی کو (حکماً) یہ کہہ سکیں کہ میاں! صاف ستھرے رہا کرو۔

قانون سے نہیں غمخواری سے

اب سوچئے کہ آپ قانوناً ایسا کر بھی نہیں سکتے اور معاشرہ کو علیٰ حالہٖ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ اس کے لئے آپ کو اور طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ یہ کام سرزنش اور فہمائش سے نہیں ہو سکے گا؛ افہام و تفہیم اور غمخواری و دلسوزی سے ہو سکے گا۔ اور دوسروں سے کچھ کہنے سے پہلے خود نمونہ بننے سے۔ اس بطلِ جلیل کو' جو قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث تھا' ان امور کا بھی خیال رہتا تھا اور وہ معاشرہ کی اصلاح کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

غلیظ صورت خاوند

(مثلاً)

(1) ایک عورت اپنے خاوند کو آپ کے پاس لائی۔ وہ بڑا میلا کچیلا' پراگندہ مُو اور ژولیدہ حال تھا۔ اس نے آپ سے کہا کہ ''نہ میں اس شوہر کے قابل ہوں' نہ یہ میرے قابل۔ مجھے اس سے آزادی (طلاق) دلا دیجئے''۔[1] آپ نے پہلی نظر میں محسوس کرلیا کہ وہ عورت کس بات سے کراہت کر رہی ہے۔ اُسے تو آپ نے گھر بھیج دیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ اُس شخص کو حمام کراؤ۔ اُس کے ناخن ترشواؤ' بال کٹواؤ' صاف ستھرے کپڑے پہناؤ' اور پھر میرے پاس لے آؤ۔ وہ جب اس نئی ہیئت (''آدم جون'') میں آیا تو آپ نے اس کی بیوی کو بلا بھیجا۔ اس نے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا پھر آپ کی طرف نگاہ اٹھائی اور ایک خفیف سی ہنسی اس کی آنکھوں میں پیر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ' بسو رسو اور اس کے شوہر سے کہا کہ یاد رکھو! اگر تم نے پھر ایسی صورت بنائی تو تمہیں عمرؓ کا درّہ سیدھا کر دے گا۔

بدصورتی

(2) اکثر کہا کرتے تھے کہ

قبیح صورت اور کمینہ خصلت (زمیم) مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کیا کرو۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اپنی بیوی کے سلسلہ میں پسند کرتے ہو' وہی کچھ عورتیں' اپنے خاوندوں کے سلسلہ میں پسند کرتی ہیں۔

بالغ اولاد

(3) لوگوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ

جب تمہاری اولاد بالغ ہو جائے تو ان کا نکاح کر دیا کرو۔ خواہ مخواہ ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر نہ لا دو۔

1۔ آپ نے دیکھا کہ اُس دور میں گھر بیٹھے طلاق' طلاق' طلاق کہہ کر قصہ ختم نہیں کر دیتے تھے۔ میاں اور بیوی دونوں کو حقِ طلاق حاصل ہوتا لیکن اس کے لئے حکومت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔

حسب نسب کا بت

(4) عربوں کے ہاں' نکاح کے رشتہ کے لئے سب سے پہلے حسب نسب دیکھا جاتا تھا۔ وہ اس باب میں بڑے متشدد واقعہ ہوئے تھے۔ لیکن اسلام نسلی امتیاز کے بت کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ

مرد کا حسب' اس کا دین ہے' نسب اس کی عقل اور مردانگی اس کا حُسنِ خلق ہے۔

تصورات کی دنیا میں نہ رہو

(5) ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا۔ آپ نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ وہ میرے معیارِ محبت پر پوری نہیں اترتی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے بھائی' میاں بیوی کے تعلقات میں تصوراتی (IDEAL) معیار تلاش نہیں کیا کرتے۔ یہ عملی زندگی ہوتی ہے' اس میں رعایت اور رواداری (GIVE AND TAKE) کا مسلک اختیار کرنا چاہئے۔

بدترین اور بہترین بیوی

(6) ایک دفعہ میاں بیوی کے تعلقات کے سلسلہ میں باتیں کرتے ہوئے فرمایا کہ

کفر بدترین شئے ہے اِس کے بعد' ایک تیز زبان اور بد خلق بیوی سے بدتر شئے کوئی نہیں۔ اسی طرح ایمان بہترین شئے ہے اِس کے بعد ایک خوش خلق محبت کرنے والی بیوی سے بہتر کوئی شئے نہیں۔

بدظنی کا موقعہ نہ دو

(7) ایک دفعہ بازار سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص' شارعِ عام پر ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ غصہ آ گیا۔ گئے اور اسے ایک بید رسید کر دیا۔ اس نے کہا' امیر المومنین! یہ میری بیوی ہے۔ فرمایا' تیری بیوی ہے تو سرِ بازار اس سے باتیں کیوں کر رہا ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کو غیبت کرنے پر مجبور کرتا ہے؟

اس نے کہا۔ امیر المومنین! ہم نو وارد ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ باہم مشورہ کر رہے ہیں کہ ہم کہاں ٹھہریں! یہ بات بہرحال اسی جگہ کھڑے ہو کر کی جاسکتی تھی۔

دُرّہ اللہ کا ہے

یہ سن کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں دیا کہ "اے بندۂ خدا! اپنا بدلہ لے لے"۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ

امیر المومنین! یہ بید (دُرّہ) آپ کا ہے۔ آپ ہی اپنے ہاتھ میں رکھئے۔

اس کے جواب میں فرمایا کہ

سنو میرے بھائی! یہ دُرّہ نہ میرا ہے نہ تمہارا' یہ اللہ کا درّہ ہے' اسے اللہ کی راہ میں اٹھنا چاہئے۔

اس نے کہا کہ

یہ درست ہے کہ یہ دُرّہ اللہ کا ہے لیکن اللہ نے اسے آپ ہی کو دیا ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔

اللہ اکبر! کیسا تھا وہ معاشرہ جس میں عام لوگ بھی اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔

تبرّجِ جاہلیہ

(8) ایک عورت کو دیکھا کہ بناؤ سنگھار کئے' تبرجِ جاہلیہ کا انداز لئے' بازار میں پھر رہی ہے۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اسے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس باب میں اس کی اجازت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ بناؤ سنگھار کی ممانعت نہیں لیکن اس کا اظہار اپنے باپ بھائی وغیرہ (محرموں) تک محدود رہنا چاہئے۔ تبرجِ جاہلیہ کی اجازت قرآن نہیں دیتا۔

ڈاڑھی سلیقہ سے رکھو

(9) دوسری طرف آپ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس نے بے ہنگم طریق سے اپنی ڈاڑھی بڑھا رکھی ہے۔ آپ نے اس کی ڈاڑھی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ اس بدہیئتی کے کیا معنی؟ پھر آپ نے قینچی منگائی اور اس کی وضع قطع درست کی۔ اس کے بعد فرمایا:

بعض لوگ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں گویا وہ درندوں میں سے ایک درندہ ہے۔[1]

اس سلسلہ میں اس قسم کے ارشاداتِ نبویؐ بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

جب اللہ نے تمہیں خوشحال کیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی اس نعمت اور سرفرازی کا اظہار تمہاری وضع قطع اور رہن سہن سے ہو۔　(نسائی)

اسی ارشادِ گرامی کی وضاحت میں دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے کہ جو نعمت اس نے اپنے کسی بندے کو عطا کی ہے' اس کے نشانات وعلامات اس بندے میں دیکھے۔　(ترمذی)

زاہدِ مرتاض

(10) ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک زاہدِ مرتاض کو دیکھا جس نے دنیا کی ہر نعمت کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا۔ اسے

---

1. عینی؛ بحوالہ ''اسلامی معاشیات'' از مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) صفحہ 24۔

ایک ہنٹر رسید کیا اور فرمایا:

خدا تجھے غارت کرے ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے۔

سخت کوش رہو

(11) اچھے کھانے اور اچھے پہننے کی تاکید کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد تھا کہ

سخت کوش بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو عجمیوں کے لباس سے بچاؤ۔ زیب و زینت کے لباس عورتوں کے لئے رہنے دو۔ اپنی ہیئت عورتوں جیسی کبھی نہ بناؤ۔

کم مال اور کثرتِ عیاّل

(12) آپ سے دریافت کیا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت کون سی ہے!

فرمایا: کم مال اور کثرتِ عیال سب سے بڑی مصیبت ہے۔

جوانی میں احتیاط

(13) آپ جوانوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ

جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تا کہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجۂ ندامت نہ ہو۔

بچوں کی تربیت

(14) آپ نے اہلِ شام کو لکھا:

اپنے بچوں کو کتابت، تیرا کی، تیراندازی اور شہ سواری سکھاؤ۔ انہیں حکم دو کہ وہ گھوڑوں پر کود کر چڑھا کریں۔ نیز انہیں مشہور امثال اور اچھے اشعار یاد کراؤ۔

شعر سے دلچسپی

خود اپنے بیٹے، عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ ''بیٹا! اچھے اچھے شعر یاد کیا کرو تا کہ تمہارے ادب میں اضافہ ہو جسے اچھے شعر یاد نہ ہوں وہ کبھی ادیب نہیں بن سکتا''۔

عربوں کی شاعری کے متعلق فرمایا:

اہلِ عرب کا بہترین فن اشعار ہیں کہ انسان اپنی ضروریات میں ان سے کام لیتا ہے۔ یہ سخی کو مائل بہ کرم کر دیتا ہے حتیٰ کہ بخیل کا دل بھی نرم کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ فرمایا:

شعر ایک ایسی قوم کا فن تھا جس کے پاس اس سے بہتر کوئی فن نہیں تھا۔ جب اسلام آیا تو اہلِ عرب جہاد میں مصروف ہو گئے اور شعر اور اس کی روایات سے غافل ہو گئے۔ بعد ازاں جب اسلام پھیل گیا فتوحات کی کثرت ہو گئی اور اہلِ عرب شہروں میں اطمینان سے بیٹھ گئے' تو پھر روایتِ شعر کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ان کے پاس نہ کوئی مدوّن دیوان تھا' نہ کوئی لکھی ہوئی کتاب۔ بہت سے عرب طبعی موت یا تلوار کی نذر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے پایا اسے یاد کر لیا' اگرچہ بہت سا شعری سرمایہ ضائع ہو گیا اور بہت کم محفوظ رہا۔

یہ تو بالتحقیق نہیں کہا جا سکتا کہ آپ خود بھی شعر کہتے تھے یا نہیں لیکن تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو اس قدر شعر یاد تھے کہ جو اہم بات بھی آپ کے سامنے آتی' اس کے متعلق آپ حسبِ حال شعر سنا دیا کرتے۔ اور شعر کا ذوق اتنا بلند اور مذاق ایسا سلیم تھا کہ بڑے بڑے شعراء کا کلام آپ کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش کیا جاتا اور آپ اس سلسلہ میں ایسے لطیف نکات بیان فرماتے کہ اہلِ مجلس عَش عَش کر اٹھتے' کتبِ محاصرات و ادب' آپ سے متعلق اس قسم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پڑھتے وقت آپ کے دل میں دو خیالات ضرور اُبھر رہے ہوں گے۔ ایک یہ کہ قرآنِ کریم نے شعراء کی مذمّت کی ہے اور دوسرے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ باب میں ہمارے سامنے آ چکا ہے) حضرت عمرؓ نے نعمان بن عدی کے شعر سنے تو انہیں یہ کہہ کر گورنری کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا کہ تم شاعر تو اچھے ہو' لیکن گورنری کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان حالات کے پیشِ نظر آپ کے ذوقِ شعری کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

قرآن اور شاعری

پہلے اعتراض کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآنِ کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اگر ایک بات نثر میں بیان کر دی جائے تو وہ قرآن کے نزدیک مستحسن' یا کم از کم قابلِ قبول ہو گی' اور اگر اسی بات کو موزوں الفاظ (یعنی اشعار) میں بیان کر دیا جائے' تو وہ اس کی رُو سے مذموم و مردود قرار پا جائے گی۔ یہ صحیح نہیں۔ قرآن اسلوبِ بیان سے بحث نہیں کرتا' مقصودِ بیان سے بحث کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک شاعری ایک ذہنیت یا نفسیاتی کیفیت کا نام ہے' جو اُس ذہنیت کے خلاف ہے جسے قرآن پیدا کرنا یا ابھارنا چاہتا ہے۔ قرآنِ کریم زندگی کا ایک متعیّن مقصد بتاتا ہے اور انسان کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھتا ہے۔ وہ اس نصب العین کو بدلائل و براہین پیش کرتا اور پھر اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو کاروانِ انسانیت کو سیدھا اس منزل تک لے جائے۔ اس کے برعکس' شاعری انسانی جذبات سے کھیلتی ہے۔ اس کے سامنے نہ زندگی کا کوئی متعیّن مقصد ہوتا ہے' نہ انسانی تگ و تاز کا کوئی واضح نصبُ العین۔ اس کی کشتی جذباتی طوفان کی

موجوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے کہ ـــــ جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا ـــــ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان آیاتِ جلیلہ میں نہایت حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جن میں شعراء کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ شاعروں کے پیچھے لگنے والے وہ فریب خوردہ لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کی رَو میں بہے چلے جاتے ہیں اور کبھی حقائق کا سامنا نہیں کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو ٹڈی دَل کی طرح بے شمار لیکن نتیجہ کے اعتبار سے دیکھو تو تخریب ہی تخریب۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ باقی رہے خود شاعر، تو ان کی حالت اس اونٹ کی سی ہوتی ہے جو جھوٹی پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کی وجہ سے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا رہے اور اس کی پیاس کہیں بجھنے نہ پائے ـــــ ساری عمر جذبات کی رو میں بہے چلے جانے والا اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی اپنی زندگی اس کے مطابق نہیں ہوتی جو وہ کہتے ہیں ـــــ ان کے قال اور حال ـــــ قول اور عمل میں تطابق نہیں ہوتا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ [26:224-227] ان کے برعکس، وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعیّن نصب العین پر یقین رکھتے اور زندگی کے صلاحیّت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ جب کوئی ان پر ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ (شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ) اس سے زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں (اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں، جس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں کہ جو اُن کے جی میں آئے کرتے رہیں، انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو) اُس نظام میں ایسے لوگوں کو صاف نظر آتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش سے لَوٹا کر کس مقام پر لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانہ کون سا ہو گا''۔ یہ وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ شاعری ایک داعیٔ انقلاب (رسول) کے شایانِ شان نہیں (36:69)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ (دیگر اقوامِ عالم مثلاً اہلِ یونان وغیرہ کی طرح) عربوں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی ''الہام'' ہوتا ہے۔ ہاتف یا سروش ان کی طرف غیب سے پیغامات لاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس تصور اور عقیدہ کی شدّت کے ساتھ تردید کی۔ اس نے کہا کہ انسانی علم کا ذریعہ اس کی اپنی قوتِ فکر ہے جو مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے جِلا پاتی ہے۔ اس میں ''غیب'' کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کلیہ میں اِستثناء صرف وحی کی ہوتی ہے جو مخصوص ہے نبوت کے ساتھ۔ نبی کے علاوہ اور کسی کو کوئی علم، غیب سے نہیں ملتا۔ کشف، الہام وغیرہ کے سب دعاوی باطل ہیں۔ بنابریں، قرآنِ کریم نے، کاہنوں، نجومیوں، شاعروں (یعنی غیب سے علم حاصل کرنے کے مدعیوں) کو للکار کر کہا کہ تمہارا دعویٰ باطل ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے لغات القرآن، عنوان ش۔ ع۔ ر۔ نیز اِسی کتاب کا آخری باب)۔

شعر اور نبی اکرمؐ

یہ ہے شاعری کی وہ ذہنیت اور اِدّعائیت جس کی قرآن نے تردید کی ہے۔ ورنہ جہاں تک موزوں اندازِ بیان کا تعلق ہے' اس کی مذمّت کسی نے نہیں کی۔ حضرت حسانؓ بن ثابتؓ خود رسول اللہ کے حضور شعر پڑھا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات حضورؐ خود اُن سے شعر خوانی کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ حضورؐ کا ذوقِ شعر و ادب بڑا بلند تھا۔ فرق یہ تھا کہ جہاں کوئی شاعر (یا شعر) انسان کو غلط راستے کی طرف لے جاتا' اُسے ٹوک اور روک دیا جاتا تھا۔ امراءالقیسؔ عرب کا نامور شاعر تھا۔ اس کے متعلق حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ **اشعر الشعراء وقائدھم الی النّار** وہ شاعروں کا سرتاج بھی ہے اور ان کے جہنم کی طرف جانے والے قافلہ کا سالار بھی۔ ایک دفعہ مشہور شاعر عنترہؔ کا یہ شعر حضورؐ کے سامنے پڑھا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی و اظلہ حتیٰ انال بہ کریم الماکل

(میں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ میں اکلِ حلال کے قابل ہوسکوں)

تو حضورؐ اسے سن کر بہت محظوظ ہوئے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ "کسی معروف عرب کی ملاقات کا شوق میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ جس نے یہ شعر کہا ہے اسے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"۔

شعر و شاعری کے متعلق یہی انداز حضرت عمرؓ کا تھا۔ وہ شعر کو بدِل پسند کرتے تھے لیکن اسی شعر کو جو حقائق کا آئینہ دار ہو اور زندگی اور حرارت کا پیغام بَر۔ ایسے شعر کے کیا کہنے! اقبالؒ کے الفاظ میں:

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اب رہا دوسرا سوال کہ جب آپ خود شعر پسند کرتے تھے تو نعمانؓ بن عدی کو ان کے شعر کہنے کی بنا پر گورنری کے عہدے سے معزول کیوں کر دیا تھا؟ بات واضح ہے۔ شاعر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اس کی ملاقات "ہاتف" سے ہو جائے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ وہ جذبات نگاری اور نکاتِ آفرینی میں اس قدر جذب اور محو ہوتا ہے کہ دنیائے ممکنات کا اُسے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — افکار میں سَرمَست نہ خوابیدہ نہ بیدار — آپ سوچئے کہ ایسا شخص گورنری جیسے اہم منصب کی ذمہ داریوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟ آپ اپنے ہاں کے نامور شعراء کے حالاتِ زندگی پڑھئے۔ اگر ان کا کہیں سے وظیفہ نہیں بندھ گیا تو ان کی اور ان کی (حرماں نصیب) بیوی بچوں کی ساری عمر فاقے کاٹتے گزر جاتی ہے۔ سو جو لوگ اپنی معاش تک کا انتظام نہیں کر سکتے وہ ایک ملک کا نظام کیسے سنبھال سکتے ہیں! حضرت عمرؓ شاعری نہیں کرتے تھے' شعر سمجھتے اور اس سے کیف اندوز ہوتے تھے۔

موسیقی کا ذوق

شعر ہی نہیں، آپ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ عربوں کی موسیقی زیادہ تر حُدی خوانی اور رجز نوائی تک محدود تھی۔ اس سے آپ کیف اندوز بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی ترنم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت عمرؓ کے مکان پر آیا تو میں نے سنا کہ اندر حضرت عمرؓ حدی خوانوں کی طرح گا رہے ہیں۔ میں اندر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا، تم نے اسے سنا تھا۔ جب میں نے کہا ہاں، تو فرمایا کہ جب ہم تنہا ہوتے ہیں تو جیسے عام لوگ گاتے ہیں ہم بھی گاتے ہیں۔

تنہائی ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں بھی۔ ایک دفعہ آپ کسی قافلے کے ساتھ جا رہے تھے تو ایک شعر اس ترنم کے ساتھ پڑھا کہ لوگ سننے کے لئے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے یہ دیکھا تو جھٹ سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے۔ پھر ویسے ہی شعر گایا تو لوگ جمع ہو گئے اور جب آپ نے پھر قرآن پڑھنا شروع کر دیا تو وہ منتشر ہو گئے۔ ہنس کر فرمایا کہ ان شیطانوں کی ذریّت کو دیکھو، گانا گاتا ہوں تو لپک کر آ جاتے ہیں اور قرآن پڑھتا ہوں تو بھاگ جاتے ہیں۔

ایک قافلہ کے ساتھ، جس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی تھے، چرواہوں کی ایک ٹولی آ ملی۔ شام ہوئی تو چرواہوں نے ربَاح فہری سے، جو مشہور گانے والا تھا، حدی خوانی کی فرمائش کی۔ رباح نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ قافلے کے ساتھ حضرت عمرؓ بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم شروع کرو اگر حضرت عمرؓ نے روک دیا تو بند کر دینا۔ اس نے شروع کیا تو حضرت عمرؓ نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ سن کر خوش ہوئے۔ جب صبح ہوئی، تو رباح سے کہا کہ اب بس کرو، ذکرِ الٰہی کا وقت آ گیا ہے۔ دوسری شب چرواہوں نے رباح سے ایک اور گانے کی فرمائش کی جو حدی خوانوں ہی کے انداز کا تھا۔ اس سے بھی حضرت عمرؓ اسی طرح کیف اندوز ہوتے رہے۔ تیسری شب انہوں نے کچھ بازاری قسم کے گانے کی فرمائش کی تو اسے سن کر آپ نے رباح سے کہا کہ یہ نہیں بھائی، اس سے دلوں میں انقباض اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

ان واقعات سے 'موسیقی کے جواز و عدم جواز' اور سرودِ حلال و حرام' کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے کھینچے ہوئے یہی خطوطِ امتیاز تھے جن کی روشنی میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ ''سرودِ حلال'' وہ ہے کہ — جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود —

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

اس کے برعکس

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

حسین مجسمے

یہ ہم چھٹے باب (فتحِ مدائن کے سلسلہ) میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مدائن کی فتح کے بعد، اسلامی لشکر کسریٰ کے قصرِ ابیض میں داخل ہوا تو اس میں، یہاں وہاں مجسموں کے حسین وجمیل شاہکار نصب تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے انہیں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا اور بارگہِ خلافت نے ان کے اس فیصلے کی تصویب فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ، انسانی زندگی کے نرم ونازک غیر مرئی گوشوں کے محسوس مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام جیسے مبنی برحقیقت، انسانیت ساز دین میں، جس کا مقصد انسانی ذات کی صلاحیتوں اور ذوق کی برومندی ہے، ان کی ممانعت کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ انسان کی تحسینِ جمالیات کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور انہیں نشوونما دینے کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں تو ''حلال'' ہیں اور اگر اس کے خلاف جاتے ہیں تو ''حرام'' ہیں۔ اس امتیازی خط کے لئے بھی ہمیں پھر حکیم الامتؒ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہُنر کیا

اسلام کے صدرِ اوّل کا ''ہنر'' ضربِ کلیمی کا مظہر تھا اور اسی لئے حضرت عمرؓ مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی قدر افزائی فرمایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ علمِ نجوم سیکھنے کی بھی تاکید کیا کرتے تھے تاکہ ستاروں سے صحیح سمت معلوم کی جا سکے (علمِ نجوم سے مراد علم الافلاک ہے نہ کہ ''نجومیوں'' کی طرح ستاروں سے قسمت معلوم کرنا)۔

شگفتہ مزاجی

(15) انہی واقعات سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے متعلق جو تصور عام طور پر ذہنوں میں راسخ ہوتا ہے کہ وہ بڑے درشت مزاج اور ''عبوساً قمطریرا'' (حارو یابس) قسم کے انسان تھے، جن کے ہاتھ میں ہر وقت دُرّہ، (معاذ اللہ) منہ میں جھاگ، آنکھوں میں شعلے اور ماتھے پر شکن رہتے تھے، وہ ان کی غلط تصویر ہے۔ وہ نہایت لطیف حسیات کے حامل تھے، بلند ترین ذوقِ جمالیات کے پیکر۔ ان کے مزاج میں شگفتگی بھی تھی جو کبھی کبھی ہلکے سے کیف آور مزاح کے رنگ میں چھلک بھی پڑتی ہے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک بدو کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا مانگی کہ یا اللہ! میری شادی کسی بڑی خوبصورت حُور سے کردے۔ آپ نے فرمایا کہ ''اِسے دیکھو! مہر کتنا کم باندھتا ہے اور بیوی کیسی بلند پایہ مانگتا ہے''۔

جس شخص کی طبیعت میں ایسی ملیح ظرافت ہو، وہ خشک مزاج کیسے ہوسکتا ہے! مومن خشک مزاج ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو عجم کے حسنِ طبیعت، عرب کے سوزِ دروں کا دلآویز امتزاج ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ذوقِ لطیف کو فرائضِ زندگی پر غالب نہیں آنے دیتا۔

وہ اسے، زندگی کی گاڑی میں "موبل آئل" کی طرح استعمال کرتا ہے پیٹرول کی ٹینکی اس سے نہیں بھر لیتا۔

رقیق القلب بھی

(16) مزاج کی شگفتگی ہی نہیں، قلب کی رِقّت بھی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ "قلب کی رِقّت" کا عنوان دیکھ کر آپ ضرور متعجب ہوئے ہوں گے کہ — حضرت عمرؓ اور رقیق القلب! جی ہاں، حضرت عمرؓ اور رقیق القلب بھی۔ اقبالؒ کے اس تصور کا مردِ مومن —

تَنے پیدا کُن از مُشتِ غبارے تَنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ اُو دلِ درد آشنائے چو جوئے درکنارِ کوہسارے

ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ جب آپ ایک شخص کی گورنری کی تعیناتی کی دستاویز لکھا رہے تھے تو کس طرح ایک بچہ آ کر آپ کی گود میں بیٹھ گیا تھا اور آپ اس سے پیار کرنے لگ گئے تھے۔ پھر اس (منتخب) گورنر نے کیا کہا تھا اور آپ نے اُسے کس بنا پر اُس منصب کا نا اہل قرار دے دیا تھا — اس بنا پر کہ اس کے دل میں رحم کے جذبات نہیں۔

(2) ہم بابِ اوّل میں یہ بھی دیکھ چکے ہیں (حضرت) عمرؓ (زمانہ جاہلیہ میں) مسلمانوں کو کس قدر اذیتیں دیا کرتے تھے۔ جب اِن کی اِن اذیتوں سے تنگ آ کر اُمّ عبداللہ بن ختمہ نے مکہ چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا تو حضرت عمرؓ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اُمّ عبداللہ! کیا سچ مچ جا رہی ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں! جا رہی ہوں۔ تم رہو اس دیس میں، ہم سے رہا نہ جائے۔ یہ سن کر عمرؓ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ منہ سے بس اتنا کہہ سکے کہ — "جاؤ، خدا حافظ" — زبان سے یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

عمرؓ کی اس کیفیت کو دیکھ کر اُمِّ عبداللہ نے کہا تھا کہ مجھے امید ہے عمرؓ اسلام لے آئے گا۔ کیسی ژرف بیں نگاہیں تھیں اُس دَور کی خواتین کی!!

حریمِ کعبہ میں

اُسی باب میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب عمر ابنِ خطاب نے رات کے سناٹے میں "غلافِ کعبہ کے پیچھے چھپ کر، نبی اکرمؐ کو قرآن پڑھتے سنا، تو آپ (عمرؓ) کے قلب پر کس طرح رِقّت طاری ہوئی اور آنکھوں سے کس طرح آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرنے لگے — یہی وہ رِقّت تھی جو عمرؓ کو کشاں کشاں بابِ نبویؐ تک لے گئی اور یہ کہتے ہوئے لوٹی کہ

ابدی بادِ بہارِ تو کہ در انجمنت کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

(3) سنان بن سلمہ کا بیان ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے، کھجوروں کے درختوں کے نیچے گری پڑی کھجوریں چُنا کرتے تھے۔ ایک دن عمرؓ بن خطاب ادھر آ نکلے تو سب بچے ان کے ڈر کے مارے بھاگ گئے لیکن مجھ سے بھاگا نہ گیا۔ جب وہ

میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ امیر المومنین! یہ کھجوریں ہم نے درختوں کے نیچے سے چُنی ہیں۔ آپ نے کہا کہ مجھے دکھاؤ۔ کھجوریں دیکھنے کے بعد کہا کہ ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ۔

میں نے کہا کہ امیر المومنین! میں اکیلا کیسے جاؤں، باقی لڑکے میری کھجوریں چھین لیں گے۔ آپ نے یہ بات سنی تو مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔

(4) انسان تو ایک طرف، وہ تو حیوانات کی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مسیبؒ بن دارم نے کہا کہ میں نے ایک دن حضرت عمرؓ کو دیکھا آپ ایک اونٹ والے کو ڈانٹ رہے تھے کہ اس نے اپنے اونٹ پر اتنا بوجھ کیوں لاد دیا ہے جسے وہ بہ مشقت اٹھا سکتا ہے۔

(5) اور قرآنِ کریم کی آیات سن کر تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگ جاتے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی تو تین صفوں کے پیچھے سے آپ کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

(6) اور آپ کے خادم اسلمؓ کی یہ روایت تو ہماری نظروں سے گزر چکی ہے کہ جب کسی نے پوچھا کہ حضرت عمرؓ کو سخت غصہ آتا ہے تو تم کیا کرتے ہو تو اس نے کہا تھا کہ ہم اس وقت قرآنِ کریم کی کوئی مناسب آیت پڑھ دیتے ہیں، آپ کا غصہ فوراً فرو ہو جاتا ہے۔

عدل و رحم کے تقاضے

اب ایک اور نازک مقام سامنے آتا ہے۔ ایک سربراہِ مملکت (یا ایسے کسی اور ذمہ دار شخص) کے لئے نہایت مشکل ہوتا ہے کہ وہ عدل و انصاف کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم کے جذبات کو بھی نبھائے۔ ایسے مقامات سے، جن میں عدل کا تقاضا کچھ اور ہو اور رحم کا تقاضا کچھ اور، صحیح و سلامت گزر جانا، بڑے ہی صاحبِ عزم و ہمت کا کام ہوتا ہے۔ ان متضاد جذبات کے تصادم، اور تصادم میں اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز نہ ہونے دینے کی بے نظیر مثالیں اسوۂ نبی اکرمؐ میں جھلمل جھلمل کرتی سامنے آتیں اور وجہِ تابانیٔ فکر و بصیرت بنتی ہیں ـــــ ایک اور واقعہ سنئے اور کلیجہ تھام کر رہ جایئے۔

یہودی کی لڑکی کا واقعہ

آپؐ نے ایک قتل کے مجرم، یہودی کو، موت کی سزا کا حکم سنایا۔ مجرم پابجولاں سامنے کھڑا تھا اور جلّاد تلوار ہاتھ میں لئے حضورؐ کے اشارہ کا منتظر کہ اتنے میں اس یہودی کی چھوٹی سی بچی، روتی چیختی دوڑے دوڑے آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں سے لپٹ کر نالۂ جگر پاش کے ساتھ چِلّائی کہ میرے بابا کو قتل نہ کیجئے۔ مجھے یتیمی کے داغ سے بچایئے۔

بچی کی گریہ وزاری سے حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپ نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اردگرد کھڑے لوگوں نے خیال کیا کہ اب آپ اس مجرم کو چھوڑ دیں گے لیکن حضورؐ نے انگلی کے اشارے سے جلاد کو حکم دے دیا کہ

مجرم کا سر قلم کر دیا جائے۔

بعدازاں صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ کی آنکھوں کے آنسوؤں کے بعد، انگلی کا وہ اشارہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا اس کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟ فرمایا کہ اُس وقت:

محمد ابنِ عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی اور محمدؐ رسول اللہ کی انگلی اشارہ کر رہی تھی۔

تضادِ جذبات کے ایسے ''پل صراط'' سے یوں صحیح و سلامت گزر جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں!

درجنوں از خود نرفتن، کارِ ہر دیوانہ نیست

عمر فاروقؓ نے نگہِ رسالتمآبؐ سے اسی قسم کی تربیت حاصل کی تھی۔

کافرہ بیویوں کو طلاق

تضادِ جذبات میں سب سے زیادہ کٹھن منزل وہ ہوتی ہے جہاں فرائضِ منصبی اور بال بچوں کی محبت میں تصادم واقعہ ہو۔ فاروقِ اعظمؓ اس منزل سے کس طرح قلندرانہ گزر گئے، اس کی کچھ مثالیں پہلے سامنے آچکی ہیں۔ مزید اب ملاحظہ فرمائیے۔

(17) جو لوگ آغازِ اسلام میں مسلمان ہوئے تھے ان کی شادیاں ان کے اپنے قبیلوں اور خاندانوں میں ہو چکی تھیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ خاوند مسلمان ہو گیا اور بیوی نے اسلام قبول نہ کیا۔ یا بیوی مسلمان ہو گئی اور خاوند مشرک رہا۔ بعدازاں، قرآنِ کریم میں حکم آ گیا کہ کافرہ بیویوں کا عقد فسخ کر دیا جائے (60:10)۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی دونوں (غیر مسلم) بیویوں کو طلاق دے دی۔

امورِ مملکت میں دخل دینے والی بیوی

یہ تو خیر احکامِ خداوندی کی تعمیل میں تھا۔ جب آپ نے خلافت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا تو آپ کی ایک بیوی تھی جس سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اس نے (غالباً اس لئے کہ وہ زیادہ منظورِ نظر تھی) امورِ مملکت میں دخل دینا شروع کر دیا۔ آپ نے اسے منع فرمایا کہ وہ اس دائرے میں قدم نہ رکھے لیکن وہ باز نہ آئی۔ ایک دفعہ آپ کسی گورنر پر ناراض ہو رہے تھے کہ اس (بیوی) نے پھر مداخلت کی اور آپ نے اسے طلاق دے دی۔

شاید یہ بات معمولی سی نظر آئے لیکن ذرا تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنی مملکتیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ فرمانرواؤں کی بیگمات امورِ مملکت میں دخیل ہوتی تھیں اور ان کے خاوند وفورِ محبت کی وجہ سے بے بس ہو جاتے تھے۔ ایسے مقام پر محبت کو فرائضِ منصبی کی قربان گاہ پر ذبح کر دینا ـــــ کارِ ہر دیوانہ نیست ـــــ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

بیوی کو تحفہ

(18) اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (گورنر) نے آپ کی بیوی (حضرت) عاتکہ کو ایک سجادہ بطور تحفہ دیا جو گز بھر لمبا اور چند بالشت چوڑا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا تو حضرت ابو موسیٰؓ کو بلا کر سخت ڈانٹا۔ سجادہ ان کے سر پر دے مارا اور کہا کہ خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔

ملکہ روم کا ہدیہ

(19) ایک دفعہ شاہِ روم کا قاصد آیا تو ملکہ کی طرف سے ''فرماں روائے مملکتِ اسلامیہ کی بیگم'' کے لئے ہدیۂ سلام لایا۔ آپ کی بیوی نے ایک دینار قرض لیا' عطر خریدا اور اُسے شیشیوں میں بند کر کے ملکہ روم کو بھیج دیا۔ اس نے تحفہ موصول ہونے پر' انہی شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس بھیج دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے سارے جواہرات فروخت کر کے' ایک دینار بیوی کو دے دیا اور باقی رقم بیت المال میں داخل کر دی اور بیوی کو آئندہ محتاط رہنے کی تلقین کی۔

خوشبو لگی رہ گئی

(20) بیت المال میں خوشبو آتی تو آپ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے کہ وہ اسے فروخت کر کے رقم بیت المال میں جمع کرا دے۔ ایک دفعہ بیوی نے خوشبو بیچی تو جو انگلیوں سے لگی رہ گئی اسے اپنے دوپٹے پر مل لیا۔ خوشبو نے بہرحال غمازی کر دینی تھی اس نے کر دی' تو آپ نے بیوی سے کہا کہ تمہیں خوشبو بیچنے کے لئے دی گئی تھی' نہ اس لئے کہ تُو مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے۔ یہ کہہ کر اس کے دوپٹے کو دھو ڈالا۔ اس پر بھی خوشبو نہ گئی تو اسے مٹی سے ملا۔ پھر سونگھا اور جب تک خوشبو اُتر نہیں گئی' ایسا ہی کرتے رہے۔

مُشک کا وزن

(21) ایک دفعہ بحرین سے کچھ مُشک آئی تو آپ نے کہا کہ کوئی عورت صحیح وزن کرنے والی مل جائے تو اس سے وزن کرا لیا جائے۔ آپ کی بیوی (عاتکہ) نے کہا کہ میں خوب تولنا جانتی ہوں۔ لایئے میں وزن کئے دیتی ہوں۔

آپ نے کہا کہ نہیں' تُو نہیں۔ بیوی نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ تو مشک تولے گی پھر جو ہاتھوں سے لگی رہ جائے گی اُسے سر اور گردن پر (یوں یوں) مَل لے گی اور اس طرح مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے گی۔ میں یہ طَرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

بچہ اور انگوٹھی

(22) ایک دفعہ آپ کے سامنے (جلولا سے آئے ہوئے مالِ غنیمت کے) زیورات کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہ اتنے میں آپ کا ایک بچہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک انگوٹھی دے دیجئے۔ آپ نے اُسے پیار کیا اور کہا کہ ''اپنی ماں کے پاس جا' وہ تجھے ستو پلا دے گی'' —— اور اُسے کچھ نہ دیا۔

(23) اور آپ' امیر المومنین کی اس پوتی کا حال تو پڑھ ہی چکے ہیں جو فاقوں کے مارے نحیف و زار ہو رہی تھی اور بیٹے کے کہنے پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو کچھ اَور بچوں کو کھانے کو ملتا ہے وہی اُسے ملے گا' امیر المومنین کی پوتی ہونے کی جہت سے اس کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں روا رکھا جا سکتا۔

اور آپ' امیر المومنین کے اس پوتے کا حال بھی پڑھ چکے ہیں جو قحط کے زمانے میں ککڑی (یا تربوز) کھا رہا تھا اور اسے دیکھ کر آپ نے بیٹے کو ڈانٹا تھا کہ اُمّت کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں اور امیر المومنین کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اور بیٹے نے یہ معذرت پیش کی تھی کہ اسے صبح کے ناشتے میں جو کھجوریں ملی تھیں اس نے اس کے عوض ایک بدو بچے سے ککڑی (یا تربوز) لے لیا تھا۔ اسے الگ پھل نہیں دیا گیا۔

بیٹے کے اونٹ

(24) آپ کے بیٹے' حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہ موٹے ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے آیا۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت عمرؓ کا گزر اُدھر سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا کہ ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں' میں بھی اٹھاؤں۔

یہ سن کر آپ کو سخت غصہ آیا۔ کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ کہو کہ امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو' راس المال رکھ لو اور سارا منافع بیت المال میں جمع کرا دو۔

بیت المال کا روپیہ اور بیٹے

(25) حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ جہاد سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کے لئے بھیجنا ہے' وہ لیتے جاؤ۔ میں وہ روپیہ تمہیں بطورِ قرض دیئے دیتا ہوں۔ تم اس سے کچھ عراقی مال خرید لو مدینے جا کر مال بیچ دینا۔ اصل بیت المال میں جمع کرا

دینا اور منافع خود رکھ لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہوگئی۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دے دیا تھا۔ اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟ انہوں نے کہا کہ سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک اس لئے کیا کہ تم امیر المومنین کے بیٹے تھے۔ جاؤ! مال اور نفع دونوں بیت المال میں داخل کرو۔

مجلسِ مشاورت کے بعض رفقاء نے مداخلت کی تو بصد مشکل آپ اس پر راضی ہوئے کہ نصف منافع انہیں دے دیا جائے۔

(26) اور آپ کے تیسرے بیٹے (عبدالرحمٰن) کا واقعہ تو ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اسے کس طرح مصر سے بلا کر سزا دی تھی اور وہ قید کی حالت میں ہی وفات پا گئے تھے۔

حضرت حفصہؓ کی دوہری حیثیت

(27) (ام المومنین حضرت) حفصہؓ چاہیتی بیٹی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس کچھ مال آیا تو وہ آئیں اور کہا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دیجئے۔ فرمایا کہ تمہیں کیسے دے دوں! انہوں نے کہا کہ قرآنِ کریم میں اقرباء کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم آیا ہے اور میں آپ کے اقرباء میں سے ہوں۔

یہ سن کر آپ مسکرائے اور کہا کہ بیٹی! باپ کو دھوکا دیتی ہو! وہ حکم ذاتی مال کے لئے ہے اور یہ مال میرا ذاتی نہیں مسلمانوں کا ہے۔ اس لئے اس پر قرآن کے اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا —— جاؤ! بھاگ جاؤ۔

(28) آپ کا معمول تھا کہ کوئی پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیزیں آتیں تو انہیں حصہ رسدی امہاتؓ المومنین (یعنی نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات) کو تحفتہً بھیجتے۔ حضرت حفصہؓ ام المومنین بھی تھیں، لیکن اس کے ساتھ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپ امہات الامہؓ کے حصے لگاتے وقت، حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ آپ (حضرت حفصہؓ) کے حصہ میں ہو!

(29) ہم آگے چل کر (معاشیات سے متعلق باب میں) دیکھیں گے کہ آپ نے لوگوں کے وظائف مقرر کرتے وقت، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو چار ہزار سالانہ دیئے تو آپ کے بیٹے (حضرت) عبداللہؓ نے کہا کہ آپ نے مجھے تین ہزار دیئے اور اسامہؓ کو چار ہزار؛ حالانکہ جو فضیلت میرے باپ کو حاصل ہے، ان کے باپ کو نہیں، اور نہ وہ میرے برابر ہیں۔

آپ نے فرمایا: ''میں نے اسے اس لئے زیادہ دیا ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کو تجھ سے، اور اس کا باپ تیرے باپ سے، زیادہ محبوب تھا''۔

اس مقام پر آپ کو یقیناً اس شخص کی بات یاد آ گئی ہوگی جسے؛ جب حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تو اس نے کہا تھا کہ مجھے ایسے لگتا ہے کہ اِس وقت مجھے حکومت کی طرف سے جو رعائتیں مل رہی ہیں؛ ان میں سے کوئی رعایت چھین لی جائے گی۔

سربراہِ مملکت سے جسے؛ جس قدر زیادہ تعلق؛ اسے اتنی ہی کم مراعات! کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت رہے گی کہ وہ دور اس قدر انسانیت ساز اور جنت بداماں کیوں تھا!

(30) امیر المومنین؛ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے؛ سرکاری خزانہ سے جو کچھ لیتے تھے؛ اس کا ذکر ''معاشی نظام'' کے باب میں آئے گا۔ اس وقت اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ امیر المومنین کے ہاں؛ عام مسلمانوں کے معیار کے مطابق راشن جاتا تھا؛ اور خود امیر المومنین؛ کپڑوں کا ایک جوڑا موسم سرما میں اور ایک جوڑا موسمِ گرما میں لیتے تھے۔ اسی لئے کپڑوں پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ جب اُن کا اپنا یہ حال تھا تو جو حالت ان کے اہلِ خانہ کی ہوسکتی ہے؛ ظاہر ہے۔

بیوی کا دوپٹہ

حضرت ساریہؓ کا قاصد آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ امیر المومنین کا دستر خوان بچھا؛ کھانا آیا تو وہ خشک روٹی؛ روغنِ زیتون اور پسے ہوئے نمک پر مشتمل تھا۔ آپ نے بیوی (اُمِ کلثومؓ) کو آواز دی کہ کیا تم کھانے کے لئے نہیں آؤ گی؟ اس نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اجنبی مَردوں کے سامنے آؤں تو مجھے کوئی کام کا دوپٹہ لے دیجئے۔ یہ دوپٹہ اوڑھ کر کیسے باہر آؤں؟ آپ نے جواب دیا کہ کیا تمہارے لئے یہ شرف کافی نہیں کہ تم علیؓ کی بیٹی اور عمرؓ کی بیوی ہو! وہ تنگ کر بولیں —— بے اعتنائی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے!

حضرت عمرؓ نے قاصد کی طرف دیکھ کر کہا۔ آؤ کھانا کھالو۔ اُمِ کلثوم ناراض نہ ہوتیں تو شاید اس سے اچھا کھانا مل جاتا!

بیت المال کا شہد

(31) لیکن اچھا کھانا مل کہاں سے جاتا؟ اس کے لئے تو کابینہ کی منظوری کی ضرورت تھی۔ ایک دفعہ آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ علاج کے لئے شہد تجویز کیا گیا۔ شہد؛ بیت المال میں تو موجود تھا لیکن امیر المومنین کے ہاں راشن میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے خود شہد نہیں لیا۔ کابینہ کی میٹنگ بلائی اور اس کی منظوری کے بعد شہد لیا۔

پرانے کپڑوں کی حفاظت

(32) جو سربراہِ مملکت خود پیوند لگے کپڑے پہنے اور بیوی سے کہے کہ اسی پرانے دوپٹے سے گزارہ کرؤ؛ وہی رعایا کو سادگی

سکھا سکتا ہے! ایک انصاریہ حاضرِ خدمت ہوئی اور کہا کہ امیر المومنین! مجھے نیا لباس دلوا دیجئے۔ آپ نے کہا کہ ابھی کپڑوں کی تقسیم کا وقت نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ بخدا! میرے پاس تو اب ستر ڈھانپنے کے لئے بھی کچھ نہیں رہا۔

یہ سن کر آپ بیت المال گئے اور ایک سفید چادر لا کر اُسے دے دی اور کہا کہ اسے اوڑھ لو لیکن پرانے کپڑوں کی حفاظت کرو۔ ہانڈی روٹی کے وقت انہیں پہن لیا۔ باہر نکلتے وقت نئے کپڑے پہن لئے۔ یاد رکھو! جو پرانے کپڑوں کی حفاظت نہیں کرتا' اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں رہتے۔

مسلسل گوشت نہ خریدا کرو

(33) اور جس فرماں روا کے کھانے میں روغنِ زیتون اور پسا ہوا نمک آتا ہے' وہی رعایا کے خورد و نوش پر کڑی نگاہ رکھ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں مدینے میں گوشت کی کمی واقعہ ہوگئی تھی۔ آپ مذبح میں تشریف لے جاتے اور جس شخص کو دیکھتے کہ دو دن متواتر گوشت لینے کے لئے آتا ہے' اسے بلاتے اور کہتے کہ تم مسلسل گوشت لے جاتے ہو' تمہیں خیال نہیں آتا کہ اس سے تم اپنے کسی بھائی کو گوشت سے محروم کر دیتے ہو۔ ناغہ کر کے گوشت لے جایا کرو۔

تقرّبِ خداوندی کا معیار

(34) طرزِ بود و ماند کی طرف سے ہٹ کر پھر آجایئے حُسنِ اخلاق کی طرف۔ آپ اپنے رفقاء کو تاکید کرتے رہتے کہ ''ہمیشہ یہ دیکھو کہ مخلوقِ خدا تمہارے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس اصول کو یاد رکھو کہ خدا کے ہاں تمہارا وہی مرتبہ ہوگا جو تمہارا مرتبہ مخلوق کی نگاہوں میں ہے''۔

دیکھا آپ نے' خدا کے مُقرّب بننے کے معیار؟

غصے کی حالت میں

(35) کہا کرتے — کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اُسے غصے کی حالت میں نہ آزمالو۔

اِصلاحِ خویش

(36) کہا کرتے — انسان کی بھی عجیب حالت ہے' اس کے گدھے' بیل یا اونٹ میں کوئی نقص یا عیب ہو تو اس کی اصلاح کی فکر فوراً کرتا ہے لیکن اپنے عیوب و نقائص کی اصلاح کی فکر کبھی نہیں کرتا — یعنی یہ اپنے آپ کو اپنے جانوروں

جتنی بھی اہمیت نہیں دیتا۔ یاللعجب !

مدحِ خویش

(37) ایک شخص آپ کی تعریف کرنے لگا تو آپ نے فرمایا:
کیا تو مجھے اور اپنے آپ، دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے؟

احترامِ آدمیّت

(38) دوسری طرف، احترامِ آدمیت کا اس قدر احساس، کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو منافق کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذِلّت اور کیا ہوسکتی ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کرلو ورنہ میں سزا دے دوں گا۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ حِمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے کسی ذِمّی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے — **اخزک اللہ** — خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تأسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل ہی نہیں۔

(39) اور آپ کا یہ مقولہ بھی ہماری نظروں سے گزر چکا ہے کہ اگر کسی شخص میں غرور دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔

ظاہر بھی اچھا ہونا چاہئے

(40) لیکن اس سے ہوسکتا تھا کہ لوگ اپنے عمدہ اخلاق اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار ہی نہ کریں کہ مبادا اسے خودنمائی اور کبرِ نفس پر محمول کرلیا جائے۔ فاروقِ اعظمؓ کی نگہِ حقیقت شناس سے کبرِ نفس اور اظہارِ حسنِ اخلاق کا نہایت نازک فرق پوشیدہ نہیں تھا — وہ معیوب تھا اور یہ مستحسن بھی اور ضروری بھی۔ اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص (کسرِ نفسی کی بناء پر ہی سہی) کسی معیوب بات کا اظہار کرے اور باز پُرس پر کہے کہ میرا باطن اچھا ہے، تو ہم اس کے باطن کی تصدیق نہیں کریں گے، ظاہر پر فیصلہ دے دیں گے۔ باطن اچھا ہے تو اس کا اظہار بھی اچھائی سے کرنا چاہئے۔

واعظ کو ڈانٹ

(41) اس کے ساتھ ہی آپ پیشہ ور واعظوں کی اچھی طرح خبر لیا کرتے، فرمایا کرتے کہ اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ

ہوتے ہیں۔

اپنے اہل وعیال میں بچے کی طرح رہے

(42) اور آخر میں ہم آپ کو پھر ''درونِ خانہ'' لئے چلتے ہیں کہ جس کے گھر کی زندگی اچھی نہیں، وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے کہ جب نگۂ بصیرت ان چار لفظوں پر غور کرتی ہے تو پہروں ورطۂ حیرت میں گم رہتی اور بار بار کہتی ہے کہ بارِ الٰہا! تو نے اس مردِ دانا کو کیسی حقیقت رس نگاہ عطا فرمائی تھی؟ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

> انسان کو چاہئے کہ اپنے اہل وعیال میں بچے کی طرح رہے۔ لیکن جب ان کی کوئی ضرورت اس کے سامنے آئے تو مرد بن جائے۔ (تاریخ عمر ابن الجوزی)

کہئے! آپ پر بھی مجھ ایسی کیفیت طاری ہوئی ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گیارہواں باب

معاشی نظام

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

دنیا کی تمام ناکامیوں میں، سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطّبع حیوان ہے اور سب سے زیادہ عقلمند بھی۔ اس کی وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن جب اس نظریہ پر عمل کا وقت آتا ہے تو حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں، سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ کسی عہدِ قدیم کے سیاستدان یا مفکر کے نہیں جو اس نتیجہ پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اسے ان نظامہائے حکومت کا علم نہیں تھا (نہ ہی اس وقت ان کا علم ہو سکتا تھا) جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع کیا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک نامور ماہرِ سیاست مسٹر مینکن (H.J. MENCKEN) کے ہیں جنہیں اس نے اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں، عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے[1]۔

مینکن نے ایک مثالی حکومت کے متعلق کہا ہے کہ:

وہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

1۔ افسوس کہ اس کے سامنے، اسلام کے صدرِ اوّل کا نظامِ حکومت نہیں تھا، ورنہ وہ اپنے کلیہ کی ایک استثناء ضرور دیکھ لیتا۔

مثالی حکومت

آیئے ہم دیکھیں کہ عہدِ فاروقیؓ' مسٹر میکنٹن کے اس معیار کے مطابق' مثالی حکومت کا دور قرار پا سکتا ہے یا نہیں۔اس سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مغربی ذہنیت کی رُو سے' چونکہ انسانی زندگی عبارت ہوتی ہے فقط انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے' اس لئے اس کی ضروریات بھی محدود ہوتی ہیں طبیعی ضروریات (یعنی انسانی جسم کی نشو ونما) تک۔لیکن قرآنی نقطہء نگاہ سے' انسان کی زندگی محض اس کی طبیعی زندگی نہیں۔اس کے طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شئے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔انسانی ذات' نہ فطرت کے عملِ تخلیق کے طبیعی ارتقاء کا نتیجہ ہوتی ہے' نہ ان طبیعی قوانین کے تابع' جن کے مطابق اس کے جسم کی مشینری مصروفِ حرکت وعمل رہتی ہے۔انسانی ذات میں خالقِ کائنات نے ایسی صلاحیتیں مضمر رکھی ہیں کہ ان کی مناسب نشو ونما ہو جائے تو انسان کی اس دنیا کی (انفرادی اور اجتماعی) زندگی بھی شادابیوں اور کامرانیوں کے جُھولے جُھولتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں کے مدارج طے کرتی۔یہ آخری الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔جب انسان کے جسم کی مشینری (طبیعی قوانین کے تابع) حرکت کرنے سے رُک جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے اور مغرب کے مادی نقطہء نگاہ سے' موت سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔لیکن قرآنی نقطہء نگاہ سے' اگر انسان کی ذات کی مناسب نشو ونما ہو جائے تو' جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔یہ آگے چلتی ہے اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے نئے پروگرام کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔اِس طرح ایک نشو ونما یافتہ ذات کی اس دنیا کی یہ زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی حسین۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً [2:201] سے یہی مراد ہے۔

جسم اور ذات کی نشو ونما

لیکن زندگی کی موجودہ سطح پر' انسانی ذات کے ارادے اور فیصلے انسان کی طبیعی زندگی کے ذریعے رُوبہ عمل آتے ہیں۔اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے طبیعی جسم کی بھی صحیح نشو ونما ہوتی جائے۔مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انسانی ذات ایک سوار ہے' اور اس کا جسم' اس کا مَرکَب (گھوڑا) جس پر سوار ہو کر وہ زندگی کا سفر طے کر کے (موجودہ سطحِ زندگی کی) آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ایک سوار کے نزدیک' اس کا گھوڑا مقصود بالذات نہیں ہوتا' اس کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔لیکن چونکہ وہ اس ذریعے کے بغیر' اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا اس لئے اس کے گھوڑے کا تنومند و توانا ہونا اور رہنا ضروری ہوتا ہے۔یہ حیثیت ہے قرآنی نقطہء نگاہ سے انسان کی طبیعی زندگی کی۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنی نقطہء نگاہ سے' انسانی زندگی کی ضروریات کو مندرجہ ذیل تین شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(1) انسانی جسم کی پرورش کے لئے سامان و ذرائع۔ان میں خوراک' لباس' مکان' علاج اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی

آسائش کے دیگر اسباب شامل ہوں گے۔

(2) عقل وفکر کی صلاحیتوں کی نشوونما جسے اصولی طور پر تعلیم سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور

(3) انسانی ذات کی نشوونما۔

اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ

انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی مملکت ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں افرادِ معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ اسے قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح میں ''اقامتِ صلوٰۃ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ نظامِ صلوٰۃ اپنی کلی حیثیت سے زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے اور صلوٰۃ (نماز) کے اجتماعات اس نظامِ صلوٰۃ' کا ایک گوشہ ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ اجمالی طور پر یوں سمجھئے کہ گذشتہ ابواب میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نظامِ صلوٰۃ ہی کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اسی نظام کی رُو سے ہوتی ہے۔ باقی دوشقوں (یعنی شق نمبر 1' نمبر 2 کے لئے) مادی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے قرآنِ کریم نے ''ایتائے زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا ہے —— یعنی سامانِ نشوونما بہم پہنچانا —— اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دونوں کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے (22:41)۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں ایتائے زکوٰۃ کو 'معاشی نظام'' سے تعبیر کیا جائے گا۔ (تفصیل اس اجمال کی ذرا آگے جا کر سامنے آئے گی) اُس وقت ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی مملکت اس فریضہ کو کس طرح ادا کرتی ہے اور عہدِ فاروقیؓ میں اس کا عملی مظاہرہ کس طرح ہوا؟

معاشی نظام اور انسانی ذات

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ معاشی نظام کا تعلق طبیعی سامان و ذرائع سے ہے لیکن کوئی معاشی نظام کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس کی بنیاد انسانی ذات کے تصور پر استوار نہ ہو۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی نظر آئے گی لیکن ہے یہ حقیقت۔ تفصیل اس حقیقت کی تو طول طویل ہے (اور میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں) لیکن اجمالاً اسے دو فقروں میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ آج کل جس معاشی نظام کو بہترین قرار دیا جاتا ہے اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع (زمین' کارخانے وغیرہ) حکومت کے قبضہ میں ہونے چاہئیں۔ ایسا کرنا مشکل نہیں۔ حکومت ایک قانون پاس کر کے تمام ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں لے سکتی ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ حکومتوں نے ایسا کیا بھی لیکن پھر بھی وہ نظام کامیاب ثابت نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ تو قانون کی رُو سے کیا جا سکتا ہے' کہ ذرائع پیداوار' انفرادی ملکیت سے چھین کر حکومت کی اجتماعی ملکیت میں لے لئے جائیں۔ لیکن یہ چیز کسی قانون کی رُو سے ممکن نہیں کہ ایک محنت کش' دن بھر جان مار کر محنت کرے' اور اس کے بعد' اپنی محنت کے ماحصل میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر' باقی

سب کا سب' دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ وہ بطیبِ خاطر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس سے اس کی محنت کا ماحصل زبردستی چھینا جائے تو وہ محنت کرنا چھوڑ دے گا۔ یہ ہے وہ چٹان جس سے ٹکرا کر سوشلسٹ نظاموں کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے اور اس مشکل کا حل ان کے پاس کوئی نہیں۔

اس کا حل' انسانی ذات اور حیاتِ آخرت پر ایمان کی رُو سے مل سکتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش اور نشو ونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے صَرف میں لاتا ہے یعنی جسے وہ اپنے لئے ''لیتا ہے''، لیکن قرآن کی رُو سے انسانی ذات کی نشو ونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے' جسے انسان دوسروں کے لئے ''دیتا ہے''۔ اس ایمان کی رُو سے' ایک فرد جان مار کر محنت کرتا ہے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے کم سے کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر' باقی سب' دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے سکے اور اس طرح اس کی ذات کی نشو ونما زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

یہ ہے وہ اساسِ محکم جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے (یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ کو بیشتر اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں)۔ اس نظام میں جملہ ذرائع پیداوار' مملکت (کی ملکیت میں نہیں اس) کی تحویل میں رہتے ہیں تاکہ ان سے وہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکے اور افرادِ معاشرہ میں سے ہر ایک زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کی نشو ونما کر سکے۔

اس اصولی تمہید کے بعد' پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے طریقِ کار کیا تجویز کرتا ہے اور اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اس طریقِ کار پر عہدِ فاروقیؓ میں عمل کس طرح کیا گیا۔

معاشی مسئلہ کی پیچیدگی

معاشی مسئلہ کی پیچیدگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے' اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک صبح کسی عظیم الشّان کوٹھی کے ایک مزیّن کمرے میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور اسی وقت اُس کوٹھی کے سرونٹس کوارٹر (نوکر گھر) میں' اس کوٹھی کے ملازم کے ہاں بھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو کوٹھی میں پیدا ہونے والے بچے کی کوئی ہنرمندی یا اعلیٰ صلاحیت تھی جس کی وجہ سے وہ اس امیر گھرانے میں پیدا ہو گیا اور نہ ہی نوکر گھر میں جنم لینے والے بچے نے کوئی جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اسے وہاں پھینک دیا گیا۔ لیکن یہ امتیاز دونوں کی زندگی میں آخری دم تک ساتھ رہتا ہے۔ امیر کا بیٹا اپنے باپ کی دولت کے بل بوتے پر دنیا کی ہر آسائش سے متمتع اور ہر مقامِ عزت وتکریم پر فائز رہتا ہے اور غریب کے بیٹے کی ساری عمر محنت اور مشقت میں کٹ جاتی ہے۔

نہ اسے دنیا کی آسائشیں نصیب ہوتی ہیں نہ اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان وذرائع اور نہ ہی ان کی نمود کے مواقع۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کی اولاد کی پرورش، تعلیم اور نشوونما کی ذمہ داری انفرادی قرار دی جاتی ہے یعنی جس کی اولاد ؛وہی اس کے رزق کا ذمہ دار۔

دوسری مثال یہ لیجئے کہ ایک مزدور دن بھر جان مار کر محنت کرتا ہے لیکن اسے جو اُجرت ملتی ہے اس میں اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ نہیں پلتا۔ ان کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ لیکن معاشرہ میں اس سے کسی کو سروکار نہیں ہوتا کہ اس محنت کش کی ضروریات، اس کی محنت کے معاوضہ سے پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر وہ بیمار پڑ جائے، کسی حادثہ کی وجہ سے معذور ہو جائے، اسے کام نہ ملے یا وہ فوت ہو جائے تو ان مصائب کو بھی اِس خاندان کو خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کسی کی ذمہ داری نہیں ہوتی کہ ان کی ضروریات پوری کرے۔

یہ ہیں رزق کے سلسلہ میں وہ پیچیدگیاں جن کا حل، انسانوں کے وضع کردہ معاشی نظاموں میں سے کوئی نظام نہیں کر سکا۔ اس کا حل قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا افراد کی ذمہ داری نہیں، یہ نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ افراد کے ذمے، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اُس کام کا سرانجام دینا ہے جو ان کے سپرد کیا جائے۔ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا مملکت کا کام ہے — صرف انہی افراد کی نہیں بلکہ مملکت کے دائرے کے اندر، ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری قرآنی حکومت کے سر پر ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا [11:6] زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ''ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے''۔ لیکن خدا ایسا نہیں کرتا کہ ہر شخص تک رزق خود پہنچائے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ رزق کے وہ سرچشمے جو خدا نے سامانِ زیست کے طور پر تمہیں عطا کئے ہیں، کھلے رکھو تاکہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا تو جو لوگ اس بنیادی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان لوگوں سے جو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ یہ تم کیا کہتے ہو کہ ہم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کریں، اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں خود رزق عطا کر دیتا۔ یہ بات کہ ان لوگوں پر رزق کی تنگی ہے، خود اس امر کا ثبوت ہے کہ خدا چاہتا ہی نہیں کہ انہیں فراخیٔ رزق نصیب ہو۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ ہم کون ہیں جو اس تقسیم کو بدل دیں؟ ان کے اس جواب کی تردید میں خدا نے کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ [36:47] تمہارا یہ عقیدہ، یہ ذہنیت، یہ طرزِ عمل ایسی گمراہی پر مبنی ہے جس کے ابطال کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

یہاں سے سوال یہ پیدا ہوا کہ جب خدا' ہر شخص کو رزق خود نہیں پہنچاتا' تو پھر تقسیمِ رزق کا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب کے لئے آپ تیسرے اور نویں باب کو ایک بار پھر سامنے لایئے جن میں بتا گیا ہے کہ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس حکومت کی اطاعت ہے جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیتی ہے۔ اسی انداز سے' ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوتی ہے جو دنیا میں خدا کے نام پر حکومت قائم کرتا ہے۔ وہ نظام' خدا کی طرف سے (ON HIS BEHALF) یہ اعلان کرتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ [6:151] ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار۔

اس سے واضح ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں وہ ذمہ داریاں' جنہیں خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھا ہے' اس حکومت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔

(2) لیکن ظاہر ہے کہ مملکت اپنا یہ عظیم فریضہ اسی صورت میں پورا کر سکتی ہے جب ذرائعِ پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے' مملکت کی تحویل میں رہیں تا کہ وہ ایسا انتظام کر سکے جس سے ہر فرد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ رزق کا بنیادی ذریعہ ارض (زمین) ہے اور زمین کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ ''اللہ کی ملکیت ہے''۔ کوئی انسان اس کا مالک نہیں ہو سکتا (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

مومنین کا معاہدہ

(3) لیکن مملکت کا نظام خلاء میں قائم نہیں ہوتا' یہ انسانوں کا قائم کردہ نظام ہوتا ہے۔ جن انسانوں (اُمتِ مسلمہ) کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوگا اُس کی ذمہ داری' تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا ہوگا اور جس کے لئے رزق کے سرچشمے ان کی تحویل میں ہوں گے' وہ اپنے اللہ (یعنی حکومتِ خداوندی) سے ایک معاہدہ کریں گے جس کی شقیں یہ ہوں گی۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [9:111]

اس معاہدہ کی رُو سے ہر مومن' اپنی جان اور اپنا مال (اپنی کمائی) ''خدا کے ہاتھ'' بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض ''خدا'' اسے جنت کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اِس دنیا میں جنت کی یہ زندگی' نظامِ خداوندی کی وساطت سے ملتی ہے۔ آخرت میں یہ براہِ راست خدا کی طرف سے ملے گی۔ اُس دنیا کی جنت کی بنیادی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا [2:35] اس میں' جہاں بھی کسی کو بھوک لگے اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ اس میں اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ○ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى [20:118-119] نہ کسی کو بھوک کی وجہ سے کسی قسم کی پریشانی ہوگی' نہ لباس کی طرف سے' نہ کسی کو پیاس ستائے گی نہ موسم کی گرمی (سردی) باعثِ تکلیف ہوگی۔

جنتِ ارضی

اس میں ہر فرد کو ضروریاتِ زندگی (روٹی' کپڑا' مکان وغیرہ) نہایت اطمینان سے مل جائے گا ـــــ اسے بھی اور اس کی

اولادکوبھی ـــــ جہاں تک اپنی محنت کی کمائی کونظامِ مملکت کے سپرد کردینے کا تعلق ہےاس کا عملی طریق (اصولی طور پر) سورۂ بقرہ کی اس آیۂ جلیلہ میں بیان کردیا جس میں کہا کہ

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ	اے رسولؐ! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں؟
قُلِ الْعَفْوَ [2:219]	ان سے کہہ دیں کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے' وہ سب کا سب۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ [59:9] وہ خود تنگی تُرشی میں گزارہ کرلیں گے اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں گے۔ اور جن ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیں گے ان سے کہہ دیں گے کہ نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا [76:9] ہم تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ معاوضہ یا صلہّ تو ایک طرف' ہم اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں' اس لئے کہ ہم نے یہ مال ''بیچ دیا ہوا ہے''۔ یہ ہمارا ہے ہی نہیں۔

یہ ہیں قرآن کے اس معاشی نظام کے اساسی خط و خال' جسے قائم کرنے کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے! لیکن ظاہر ہے کہ نظام اپنی انتہائی اور مکمل شکل میں شباشب رائج نہیں کیا جاسکتا۔ اسے بتدریج عمل میں لایا اور اس کا آغاز' قومِ مخاطب کے حالات کے مطابق مناسب کڑی سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں جو احکام دیئے ہیں ان میں بھی اس تدریجی پروگرام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان تدریجی مراحل کو تفصیل سے بیان کردیا جائے تاکہ قرآن کا معاشی نظام اور اس کی تشکیل کا عملی پروگرام نکھر کر سامنے آجائے۔

منزلِ اوّل

اِنفرادی زندگی

جب قرآنِ کریم نازل ہوا تو اس کی رُو سے اس نظام کی آواز اُس معاشرہ میں بلند کی گئی جو نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اُس میں ایک طرف، ایسے متموّل افراد تھے جو اپنی دولت کے نشہ میں بدمست تھے اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال جو نانِ شبینہ تک سے محروم تھے۔ اس معاشرہ میں سب سے پہلے متموّل لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں۔

اِنفرادی اپیل

ان سے کہا گیا کہ اگر تم نے اِن مسکینوں اور محتاجوں کے رزق کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جائے گا (69:34; 76:8-10)۔ اُخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا، اس کی تفصیل میں گئے بغیر انہیں یہ بتایا گیا کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلا جس میں بیشتر انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم رہتے ہیں، تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ اُس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتائے گا کہ یہ اس لئے ہوا کہ تمہارے ہاں عزت وتکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی۔ تم میں جو نہارہ جاتا تھا تم اُسے عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتا تھا، تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے (89:17-20)۔

صدقات

ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعیٔ اِنقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے (انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا تھا) ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پر لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں، یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی اُمید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا (76:8-9)۔ یہ ایک سخت گھاٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا (90:11-16)۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعوائے ایمان کی تکذیب کرے گا (107:1-3)۔ تمہارے دعویٔ ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا کچھ دیتے ہو (اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں)۔ اس کی ابتدا تم اپنے اعزّہ واقارب سے کرو اور پھر، اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے، اپنے اور بیگانے کی تمیز سے بلند ہو کر، ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو (2:215; 30:38)۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو، اس کے سر پر احسان کی مَن بھر کی سِل رکھ دو کہ وہ بے چارہ ساری عمر اس کے

بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اُسے لوگوں کو دکھا دکھا کر' اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقلِ فریب کار تم سے کہے گی کہ ہم دوسروں پر خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ اُن لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لئے لوگوں میں اس کا چرچا کریں' تو ہم اپنی دولت دوسروں پر خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ اُسے ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوقِ انسانیت محفوظ ہو جائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے (2:261-276) ; (14:31)۔

مال و دولت میں اِصلاح

قرآنِ کریم نے اس پہلی اسٹیج پر' جہاں ایک طرف' ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پر ترغیب و تحریص دی' اس کے ساتھ ہی دوسری طرف مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ باطل طور پر مت کھاؤ (2:188) ;(4:29)۔ اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں (9:34)۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کرو (4:6 ;6:153 ;17:34)۔ اگر عورت بھی کچھ کمائے تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ طور پر اس کا مالک نہ بن جائے۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی' مرد اپنی کمائی کا (4:32)۔ لین دین کے معاملات کے متعلق تاکید کی کہ انہیں ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو (2:282)۔ مقروض اگر تنگدست ہو تو اُسے قرض کی ادائیگی کے لئے مہلت دو اور اگر اس میں ادائیگی قرضہ کی استطاعت نہ ہو تو اُسے قرض معاف کر دو (2:280)۔ اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو (2:180 ;5-106)۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوتی' تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کر دو جو قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں (4:7 ;4:11-12) اور جن کی رُو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و مستاجر (مزدور) کے تعلقات میں حُسنِ معاملہ کے سلسلہ میں بار بار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو۔ خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری' قاعدے اور معاہدہ کے مطابق ادا کرو۔ (6:153 ;7:85 ;11:84 ;17:35 ;83:1-3)

زرعی اِصلاح

عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی اس لئے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی اصلاح کی طرف مبذول کرائی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں

کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو' اور زمین کی پیداوار میں سے بھی (2:267)۔ اسے ''خدا کا حق'' کہہ کر پکارا گیا (6:142)۔(ایسا کیوں کہا گیا' اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی) ـــــ جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہوجائے گا جو تمہارے موجودہ مقاماتِ عزت وتکریم کو اُلٹ کر رکھ دے گا' اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے ''خدا کا حق'' محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانۂ گندم جل کر راکھ ہوجائے گا (33-17-68) ;(44-18:32) اور تمہارے بال بچے تک تباہ ہوکر رہ جائیں گے (2:266)۔

منزلِ دوم

اجتماعیّت کی طرف اقدام

منزلِ اوّل میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں' وہ لوگ جو اس دعوتِ انقلاب کی صداقت کے قائل ہوگئے' اس داعیٔ انقلابؐ کے گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہئے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہوگیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔

صدقات کا اجتماعی نظم ونسق

منزلِ اوّل میں افراد سے کہا گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کی اپنے اپنے طور پر مدد کریں (اسے ''صدقات'' سے تعبیر کیا گیا تھا)۔ اب کہا کہ نہیں' صدقات (اپنے عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو ـــــ بلکہ اس مرکزِ نظام (یعنی نبی اکرمؐ) سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کریں (9:103) اور اس روپے کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لئے اُن مدات پر صَرف کریں جن کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت (9:60) میں آیا[1] ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اہلِ حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ ''قرض اللہ کو دیا کرو'' (73:20; 57:18)۔ یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی خود نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لئے اپیل کریں تو جو کچھ کسی سے بن پڑے' انہیں دے دیا کرو۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صَرف کریں گے اور تھوڑے عرصہ کے بعد' جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہوجائے گا اور یہ نظام نو پوری طرح متشکل' تو جو کچھ تم اب ''اللہ کو'' بطور قرض دو گے' اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی (8:60)۔ لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا تو پھر تم تباہ ہوجاؤ گے اس لئے تم اپنے ہاتھوں

1۔ یہ صدقات کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں (غلطی سے) ''زکوٰۃ'' کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

اپنی تباہی مول نہ لو(2:195)۔یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہوگی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی(74:38)۔انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو' وقت پر تمہارے کام آئے گا(2:268) لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رُونما ہوتا ہے اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ایسا سمجھنے والے (کہ ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچالے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے' تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں (4:37; 5:36; 92:8-9)۔یادرکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہوگی بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی چلے جائے گی(92:18)۔تمہاری طبیعی نشوونما بھی اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی جو درحقیقت منتہٰی و مقصود ہے موجودہ سطحِ زندگی کی تمام تگ وتاز و جدوجہد کا۔انسانی ذات کی نشوونما کو اصطلاح میں ''قُربِ خداوندی'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حدِ بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔یہ ''تقربّ الی اللہ'' مال و دولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا' اسے ''خدا کو دے دینے'' سے ہوتا ہے(34:37)۔

مال و دولت کے نظام میں اِصلاح

اس میں شبہ نہیں کہ زن و فرزند کی طرح' مال و دولت میں بھی کشش و جاذبیت ہے(3:13)۔لیکن اگر زن و فرزند یا مال و دولت کی جاذبیت' اجتماعی مفادِ انسانیت پر غالب آجائے تو یہی زن و فرزند اور مال و دولت فتنہ بن جاتے ہیں(64:15)۔اس لئے تم انفرادی مفاد پرستی کے فریب میں نہ آؤ۔اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی(64:16-17)۔انفرادی دولت جمع کر کے' یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہو گئے ہو' تم خود کفیل (SELF-SUFFICIENT) ہو گئے۔قطعاً نہیں۔جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہو جاتا ہے(92:10; 96:7)۔

سائل و محروم کا حق

منزلِ اوّل میں' ضرورت مندوں کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی' جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے۔تم انہیں بطور امداد کچھ دو لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورت مندوں کا حق ہے۔یعنی وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر' بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں(51:19; 70:24-25)۔اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کرو گے' تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی' حق کی ہوگئی ہے۔خیرات لینے والا ذلّت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبۂ احسان اُبھرتا ہے۔لیکن جو چیز بطورِ حق وصول کی جائے' اس سے نہ لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) پیدا ہوتا ہے' نہ دینے والے کے دل میں جذبۂ برتری

(SUPERIORITY COMPLEX)۔

مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں' مالِ غنیمت بہت بڑا ذریعۂ آمدنی تھا' اوران کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں' جو کچھ کوئی دشمن کا لُوٹ لے' وہ اسی کا ہوجاتا تھا۔قرآنِ کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مالِ غنیمت' انفرادی ملکیت نہیں ہوگا۔اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا۔مرکز اس میں سے ایک حصہ اجتماعی ضروریات کے لئے الگ کرکے' باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا (8:41)۔اس ایک تبدیلی سے' نہ صرف یہ کہ اس ذریعۂ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہوگئی بلکہ جنگ کا جذبۂ محرّکہ بھی بدل گیا۔پہلے جنگ کا جذبۂ محرکہ لُوٹ کا مال حاصل کرنا تھا — جو جتنا حاصل کرسکے' لے جائے — اب جذبۂ' حقوقِ انسانیت کی حفاظت قرار پاگیا۔اسے قرآن کی اصطلاح میں ''قتال فی سبیل اللہ'' کہا جاتا ہے یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے کیا جائے' اُسے قرآن کی رُو سے ''فی سبیل اللہ'' (یعنی اللہ کی راہ میں) کہا جاتا ہے۔

دولت کا اِکتناز

دولت اُسی صورت میں اپنا مقصد پورا کرسکتی ہے جب یہ گردش میں رہے — خود لفظ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں — لیکن انفرادی ہوسِ زرپرستی' اسے گردش میں رکھنے کے بجائے' جمع کرکے روک لیتی ہے۔اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام اُلٹ جاتا ہے۔قرآنِ کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز — یعنی اسے جمع کرکے روک رکھنا — سنگین ترین جرم ہے۔اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے' دونوں' بُری طرح جُھلستے اور جلتے ہیں (9:34-35)۔یہ شعلے' ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں (104:2-7)۔یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ان کا سب کچھ تباہ کردیتی ہے (70:15-18)۔

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں' اس کی بھی وضاحت کردی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔اسے پورے کے پورے معاشرہ کے رگ وپے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے' جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے (59:7)۔

رِبوٰ قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات وتاکیدات کے بعد' اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔روپیہ' ضروریاتِ زندگی کی خرید وفروخت کا ذریعہ ہے' اس سے از خود کچھ پیدا نہیں

ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہوگا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی رہے کہ وہ جتنی دیر جی چاہے پڑا رہے' اس میں کوئی اضافہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھ چھوڑنا حماقت ہوگا ـــ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی ضرورت مند کو سُود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آئے گا یعنی اب آپ کا روپیہ' اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ محنت سے نہیں بلکہ روپے سے از خود پیدا ہوا' اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں رِبوٰ کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے رِبوٰ کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم ـــ ایسا جرم' جسے اُس نے' اسلامی نظام کے مدِمقابل ایک باغی نظام قرار دیا اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ سمجھیں (2:275-279)۔ دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ رِبوٰ سے تمہاری انفرادی دولت میں بیشک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظامِ معیشت کے نتائج وعواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجامِ کار' اس سے اجتماعی دولت میں بے حد کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ' دوسروں کی محنت کا غاصب بن کر' قوتِ عمل سے محروم اور سعاداتِ انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی اور آخر الامر بھڑک اُٹھتی ہے (3:129-130)۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی رِبوٰ ہے' اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم' دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ اس سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا' وہ بھی رِبوٰ ہے (30:39)۔ اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (SLEEPING PARTNERHSIP) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى [53:39] معاوضہ صرف محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ رِبوٰ ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

رِبوٰ کو حرام قرار دے کر' قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔

زمین کے متعلق اگلا قدم

اب آگے بڑھیئے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کے منطق کی حاجت۔ خدا نے اپنے آپ کو اَلْحَیُّ کہنے کے ساتھ ہی اَلْقَیُّوْمُ بھی کہا ہے یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے زندگی عطا کی تو زندگی کے قائم رہنے کے لئے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی' اُسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیامِ

زندگی کے لئے روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو انسان کے پیدا کرنے سے پہلے، مہیا کر دیا۔ روشنی، حرارت، ہوا، اور پانی تو عام طور پر سطحِ ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ انسان، انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے (15:21)۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ [15:20] ''ہم نے اس میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھا ہے اور ان کے لئے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو''۔ آپ غور کیجئے کہ ''معیشت'' کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ (20:54)۔ دوسری جگہ اس نے اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ کہا ہے (80:32; 79:33)۔

جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، ارض اور دیگر ذرائعِ حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رُو سے کوئی شخص، ان ذرائعِ حیات (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے مشترکہ اور یکساں وجہِ قیامِ زندگی ہوں۔ آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے یہ قطعۂ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جایئے اور اُس شخص تک پہنچ جایئے جس نے پہلی مرتبہ اس قطعۂ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو، اس پر، اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائعِ حیات میں سے کسی پر، کسی کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اُس نوعِ انسان کے خلاف جرمِ عظیم ہے، جس کی زندگی کے قیام کا اُسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانۂ قدیم سے رواجاً قانوناً جائز چلی آ رہی تھی اس لئے قرآنِ کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لئے بڑے محکم دلائل دیئے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب آسمانوں کے اوپر خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی الوہیّت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح اِلٰہ السّمآء ہے اُسی طرح اِلٰہ الارض بھی ہے وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ [43:84]۔ دوسری جگہ ہے وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ [6:3] اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا، کُھلا ہوا شرک ہے (21:21)۔ سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم دو اِلٰہ اختیار نہ کرو۔ اِلٰہ صرف ایک ہے اور وہ اِلٰہ وہ ہے وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [16:51-52] سمٰوٰت اور ارض میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ اس لئے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر، انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ (2:22)۔ اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور تمام ذی حیات کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے (29:60-61)۔

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسول! اب آپ ان سے پوچھیں کہ ـــــ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کسی کی ملکیّت ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے لے کر دو۔ اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ [23:84-85] ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی مِلک ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لئے حلال و طیّب ہوگی' ورنہ تم شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو (11:168)۔

معاوضہ محنت کا

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے' روشنی' حرارت' ہوا' پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں ازخود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے جس میں محنت صَرف ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دلنشین انداز میں واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف اپنی محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو باقی ''خدا کا حصہ'' ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو)۔ اُسی قاعدے کے مطابق' زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو اور حقِ مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات 63 تا 74 میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنئے۔ فرمایا:

> (اس مقصد کے لئے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ بیج سے فصل کون اُگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا:

> پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد' اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آ جائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے ـــــ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے' ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف' ہماری محنت اور بیج بھی بیکار میں گئے۔

اس کے بعد ہے:

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو؟ یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے۔

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اس کے آگے ہے:

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا —— رگِ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا —— تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ:

رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو' بہر حال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا' اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے مالک نہیں ہو سکتے۔ یہ تمام ذرائعِ پیداوار از خود موجود رہتے ہیں —— یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں' نہ خریدے ہوئے۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں' محنت تمہاری ہے اور ذرائعِ پیداوار ہمارے۔ لہٰذا' تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور ''ہمارا حصہ ہمیں دے دو''۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو یہ سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (67:21; 67:30; 80:24-32) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

رقبوں کی تحدید

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں' اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا۔ اور جو لوگ ''بے حدّ و نہایت'' زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس اُسی قدر رقبہ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کافی ہو۔ اس

طرح اس نے زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کردی۔ سورۃ الرّعد میں ہے کہ داعی انقلاب' حضور نبی اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لئے میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے' کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے جواب میں کہا کہ آپ اس کی فکر میں نہ رہیں کہ اس کی تکمیل آپ کی موجودگی میں ہوگی یا آپ کی وفات کے بعد۔ آپ اس پیغام کو عام کرتے جائیں۔ یہ مکمل ہو کر رہے گا' خواہ آپ کی زندگی میں اور خواہ اس کے بعد۔ آپ دیکھتے نہیں کہ:

> ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہوگی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں (13:41)۔

سورۃ الانبیآء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاعِ حیات حاصل کرنے کے لئے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے (21:44)۔

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتداء کر دی۔

تیسری منزل

تکمیلِ کار

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ اب اسلامی مملکت وجود میں آ گئی ہے اور خدا نے ربوبیتِ عالمینی (یعنی تمام افراد کو سامانِ نشو ونما دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر پر لے لی ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود کی وجہِ جواز تھی۔ سورۃ الحج میں ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ [22:41] یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجہِ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں' کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں ''زکوٰۃ دینا'' یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری ''زکوٰۃ دینا'' ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مالدار' ایک خاص شرح کے مطابق' اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا

ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کر کے اُسے متعیّن مصارف کے مطابق خرچ کرتی ہے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رُو سے' حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ''زکوٰۃ دینا'' ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعینہ رقم ہے جسے مالدار (صاحبِ نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے' قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا' نہ ہی اس میں ''زکوٰۃ کے مصارف'' کا کوئی ذکر ہے (جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں نہ کہ زکوٰۃ کے۔ دیکھئے (9:60))۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں ''نشو ونما'' لہٰذا' ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوں گے سامانِ نشو ونما عطا کرنا۔ اس سے بات صاف ہوگئی۔ قرانِ کریم نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیتِ عالمینی اور رزاقیت کی وہ ذمہ داری' جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا' پوری کرے۔

خدا سے معاہدہ

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے' یہ مملکت ان لوگوں (مومنین) کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے جو اپنے خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ یہ معاہدہ کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ [9:111] یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا' اپنا مال اور اپنی جان' خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اُسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے (48:10)۔ اس طرح ایک عبدِ مومن کا جان و مال' انفرادی ملکیت کے بجائے اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اُسے اِس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت' جس کا وعدہ خدا نے بے شمار مقامات پر کر رکھا ہے۔ لہٰذا' اسلامی نظام میں' مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی' وہ ''خدا کا مال'' ہو جاتا ہے (24:33)۔

اختلافِ صلاحیت

قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں ـــــ مختلف بھی اور کم وبیش بھی۔ ہم اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتے کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے' اس باب میں قرآنی نقطۂ نگاہ کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں (24:32) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا ''اکتسابِ رزق کے سلسلہ میں مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہئے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اِشتراک سے کمائی میں

اتنا اضافہ ہوا ہے۔ لوگ یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے؟ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزد و معاوضہ ملی تھی (16:53; 16:17)۔

قارونیت

اس نے کہا ہے کہ قارونؔ (جسے قرآن نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) بھی اسی فریب میں مبتلا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ [28:78] میرا مال و دولت، میری اپنی ہنر مندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے (39:49)۔ دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کا احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا (102:8) تو (ہر چند اسے اس قسم کی باز پرس پر یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کے لئے) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیر خیرات کے طور پر ''خدا واسطے'' دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اُس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی جس طرح اِس دُنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب (41:50)۔

قُلِ الْعَفْوَ

یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد، قرآنِ کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر طے ہو گیا اور جسے ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں۔ یعنی يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ [2:219] ان سے کہہ دیں کہ اس میں تمہارا حق صرف اس قدر ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آ جائے کہ دوسرے کی ضرورت تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو (59:9)۔

مندرجہ بالا آیت (2:219) میں جو کہا گیا ہے کہ زائد از ضرورت (عفو) مال دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیا جائے تو یہ ایک اصولی ہدایت تھی۔ دوسرے مقام پر خود حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال خود وصول کر کے اسے مناسب مقامات پر حسبِ ضرورت صرف کرے خُذِ الْعَفْوَ [7:199]۔ اسی حقیقت کو سورۃ انفال میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ [8:1] اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے زائد از ضرورت مال کے متعلق

دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دیں کہ اسے ''خدا اور رسول'' (مرکزی حکومتِ اسلامی) کی تحویل میں رہنا چاہئے۔

(ضمناً) ہمارے ہاں عام طور پر انفال کا ترجمہ ''مالِ غنیمت'' کیا جاتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں۔ اوّل تو' مالِ غنیمت کے لئے قرآنِ کریم نے (غنم۔ مغآنم) الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ دوسرے' مالِ غنیمت کے متعلق کہا ہے کہ اس میں سے پانچواں حصہ' اللہ اور رسولؐ (مرکزی حکومت) کے لئے ہوگا اور باقی (4:5) مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا (8:41)۔ لہٰذا انفال ''مالِ غنیمت'' نہیں۔ انفال ''جمع ہے نَـفْـلٌ کی جس کے معنی زائد کے ہیں (جیسے نماز میں فرضوں کے علاوہ نوافل پڑھے جاتے ہیں)۔ مفہوم کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً:

(1) ہمارے ہاں انکم ٹیکس حکومت کے واجبات میں سے ہوتا ہے' یعنی وہ ٹیکس جس کا ادا کرنا فرض ہے۔ اگر کوئی شخص' انکم ٹیکس کے علاوہ' ضروری امور کے لئے حکومت کو کچھ بطورِ عطیہ دیتا ہے تو یہ انفال میں داخل ہوگا یعنی واجبات سے زائد۔ اسی کو صدقہ (جمع صدقات) بھی کہا جاتا ہے۔

(2) انتظامی نقطۂ نگاہ سے' مرکزی حکومت' مقامی حکومتوں کو اجازت دے دے کہ وہ اس قسم کی آمدنی خود وصول کر کے اس میں سے اپنے اخراجات پورے کر لیا کریں۔ اگر ایسا ہو کہ کسی جگہ' اخراجات پورے کر لینے کے بعد' کچھ روپیہ بچ جائے تو یہ انفال (زائد از ضرورت) ہوگا۔ اسے مرکز کی طرف منتقل کر دینا چاہئے۔

(3) اور تیسری شکل العفو کی ہے' یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد' جو کچھ افراد کے پاس بچ جائے' فرمایا کہ یہ زائد از ضرورت' دولت حکومت کی تحویل میں جائے گی۔

اب ظاہر ہے کہ جب زائد از ضرورت مال کسی کے پاس نہیں رہے گا' تو نہ دولت جمع کرنے کا سوال پیدا ہوگا' نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا۔ ویسے بھی' جب ہر شخص (اور اس کی اولاد) کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے اوپر لے لے' تو دولت جمع کس لئے کی جائے گی۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت تاکیدی اور تنبیہی احکام آئے ہیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)۔

زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے (55:10)۔ اس لئے ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ یہ ذریعۂ رزق' تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ [41:10]۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے عطیہ ہے وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا [17:20]۔ اور جو

چیز تمام انسانوں کو بطورِ عطیہ ملی ہو‘ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر پھاٹک لگا کر ’’میری اور تیری‘‘ کی حد بندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ رزق کے ان چشموں کو‘ جنہیں آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تا کہ ہر ضرورت مند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے‘ اپنے لئے روک لیتے ہیں‘ وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے‘ جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے‘ نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ایسے نمازیوں کے لئے انجام کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے۔ وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ اور رزق کے آبِ رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیبِ دین نہیں تو اور کیا ہے؟ [107:1-7]

ارض اللہ

زمین کی اس پوزیشن کو قرآنِ کریم نے‘ قومِ ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔ اس نے کہا کہ قومِ ثمود کی معیشت کا مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گردونواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبرِ انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سردارانِ قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے آپ سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِىْٓ اَرْضِ اللّٰهِ [7:73] یہ زمین خدا کی ہے — نہ تمہاری ہے نہ میری — اور یہ مویشی بھی اُسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیئے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے چریں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حد بندیاں قائم کر دو کہ اُس کی مخلوق اُس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جا سکے (7:73; 11:64)[1]۔ انہوں نے کہا کہ اس کا عملی طریق کیا ہونا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ یہ بڑی آسان بات ہے۔ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ [26:155; 91:13]

1۔ سرزمینِ مدین میں اسی قسم کا واقعہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آیا تھا جہاں صاحبِ اقتدار سرداروں کے چرواہے‘ کمزور و ناتواں لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے (28:23)۔

تم جانوروں کی باریاں مقرر کردو۔ ہر جانور‘ بلا تخصیص اس کے کہ وہ کس کا جانور ہے‘ اپنی اپنی باری پر پانی پی لے۔’’ باریاں مقرر کرنے‘‘ کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں‘ اس سے فائدہ اٹھانے میں ہر ایک کا اشتراک ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ارض اللہ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کوئی ذہنی تصور یا نظری عقیدہ نہیں۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا‘ اور عملاً اُسے زید‘ بکر کی ملکیت میں دے دینا‘ قرآن کی رُو سے شرک ہے‘ کفر ہے‘ تکذیبِ دین ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

مزدور اور مالک کے تعلقات

ضمناً‘ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت چونکہ ابھی صنعتی نظام وجود میں نہیں آیا تھا‘ اس لئے اس نے ارض کے متعلق ہی احکامات وضاحت سے دیئے ہیں لیکن ان احکام کی روشنی میں صنعتی تنظیمات کے متعلق بھی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہ سکتی۔ وہ بھی مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔

اس مقام پر اتنا معلوم کرلینا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ اگرچہ وہ دَور صنعتی نہیں تھا‘ بایں ہمہ‘ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی میں بعض ایسی ہدایات ملتی ہیں کہ جن سے آجر و مستاجر (مالک اور مزدور) کے تعلقات پر نہایت عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

مزدور کو اس کی محنت کے ماحصل میں سے بھی حصہ دو کیونکہ ’’خدا کے عامل‘‘ کو محروم و نامراد نہیں رہنا چاہیئے۔ (مسند احمد)

مزدوروں کا اندازِ زیست کیا ہونا چاہیئے۔ اس کا اندازہ بخاریؒ کی ایک روایت سے لگایا جاسکتا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

> وہ (مزدور) تمہارے بھائی ہیں جنہیں خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے‘ پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے کسی بھائی کو کیا ہے‘ اُسے چاہیئے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے‘ جو خود پہنے‘ وہی اس کو بھی پہنائے۔ اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو‘ اُسے اس کے سپرد نہ کرے۔ اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو پھر اس کی سرانجام دہی میں اس کی مدد کرے۔

ان ارشاداتِ گرامی سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ مزدور کو اُجرت ہی نہیں ملنی چاہیئے بلکہ منافع میں بھی اس کا حصہ ہونا چاہیئے اور اجرت مقرر کرنے کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے وہ ویسا ہی کھا پہن سکے‘ جیسا کارخانے کا مالک کھاتا‘ پہنتا ہے۔

اِستبداد نہیں

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پیداوار کے تمام وسائل افراد کے بجائے‘ مملکت کی تحویل میں چلے جائیں

اور کسی کے پاس ضرورت سے زائد روپیہ بھی نہ رہے' وہ بھی مملکت کی ملکیت قرار پا جائے تو اُس سے مملکت ایسی مستبد اور جابر بن جائے گی کہ وہ جب جی چاہے افراد کا گلا گھونٹ دے۔ اس سے بدتر مستبد نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

بیشک عام مملکتوں میں ایسا ہی ہو گا لیکن (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اسلامی مملکت اسی لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ افراد کی نہ صرف طبیعی پرورش کا انتظام کرے بلکہ ان کی ذات (انفرادیت) کی نشوونما کے لئے بھی اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ اس مملکت کی تحویل میں جو کچھ جاتا ہے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ مملکت اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں قاصر رہتی ہے تو اُسے کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ ذرائع پیداوار یا افراد کی فاضلہ دولت کو اپنے قبضے میں لے لے۔ ان چیزوں کو اپنے قبضے میں لے لینا تو ایک طرف' اس کا حقِ حکومت ہی باقی نہیں رہتا۔ اسلامی مملکت تو وجود ہی میں اس لئے آتی ہے کہ وہ ''اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ'' کا فریضہ ادا کرے۔ اس لئے یہ مملکت ذریعہ ہوتی ہے افراد کی نشوونما کا' نہ کہ ان کا گلا گھونٹنے کا۔ جن افراد کے ہاتھوں میں اس مملکت کا نظم و نسق ہوتا ہے' ان کی سیرت و کردار کی جھلک اس کتاب میں نظر آجاتی ہے۔ کیا ان کے متعلق تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذرائع رزق کو اپنی تحویل میں لے کر افرادِ انسانیہ کی آزادی سلب کریں گے؟

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

''ایتائے زکوٰۃ'' کی بات پھر سامنے آ گئی تو ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ زکوٰۃ کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے' اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے متعلق ہمارا مروجہ تصور (اور فقہی احکام) قرآنی تصور سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک قرآنی تصور نہایت وضاحت سے سامنے نہ آئے' مروجہ تصور کا غیر قرآنی ہونا سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے' قرآنِ کریم میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اتنا مال سال بھر تک جمع رہے تو اس میں سے اتنی رقم بطورِ زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ زکوٰۃ کا یہ قرآنی مفہوم ہے ہی نہیں۔ لفظ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما' بالیدگی' بڑھنا' پھولنا پھلنا۔ قرآنِ کریم میں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''اقامتِ صلوٰۃ'' اور ''ایتائے زکوٰۃ'' قرآنی نظام کے دو بنیادی ستون ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے — یعنی وہ سامان جس سے افرادِ معاشرہ کی طبیعی نشوونما بھی ہو جائے اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں یعنی سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینا) اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ سورۂ حج میں ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ [22:41] یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب ان کی حکومت قائم ہو گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ دوسری جگہ ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ [23:4] یعنی یہ لوگ زکوٰۃ (افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنے کے لئے) مصروفِ کار رہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ''ایتائے زکوٰۃ'' (زکوٰۃ دینا) ہے یعنی نوعِ انسان

(یا بطورِ آغاز کار، افرادِ معاشرہ) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت، ایتائے زکوٰۃ (سامانِ نشوونما مہیا کرنے) کا فریضہ اپنی آمدنی ہی سے ادا کرے گی۔ بالفاظِ دیگر، حکومت کی آمدنی (REVENUE OF THE STATE) ذریعہ ہوگی اس مقصد کے پورا کرنے کا۔ اس اعتبار سے، حکومت کی جملہ آمدنی کو، اصطلاحی طور پر زکوٰۃ کہا جا سکے گا یعنی ذریعہ کو خود مقصد کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس میں بھی ایک دقیق اور لطیف نکتہ پنہاں ہے۔ یعنی جب حکومت کی آمدنی کو زکوٰۃ کہا جائے گا تو اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس آمدنی کی غرض و غایت کیا ہے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں جن قبائل نے بغاوت اختیار کی تھی ان کا جرم یہ تھا کہ وہ حکومت کو ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ مرکزی حکومت کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کا مطالبہ کرنے پر، سرکشی پر اُتر آئے تھے۔ یہ یقیناً حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ یہ تھا زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں، مال و دولت جمع کر کے، سال کے بعد اس میں سے کچھ رقم بطورِ خیرات دے دینے کا تصور قطعاً نہیں تھا۔

ایک وضعی روایت

صدرِ اوّل کے بعد جب مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، تو قرآن کے معاشی نظام کی جگہ (جو نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا) پھر سے نظامِ سرمایہ داری قائم ہو گیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں مال و دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، اس کے راستے میں حائل ہوتی تھیں۔ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے وضعی روایات کا سہارا تراشا گیا اور (حیرت اندر حیرت کہ) اس کے لئے سب سے اہم کردار ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کو چُنا گیا — یعنی اُس عمرؓ کو جس کی زندگی سرمایہ داری کے خلاف مجسمہ انقلاب تھی)۔ آپ سورۂ توبہ کی ان آیات (9:34-35) کو پہلے دیکھ چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مال و دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے سرمایہ داروں کو داغ دیا جائے گا۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ذیل کی روایت (مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ میں) درج ہے۔

> (حضرت) ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ [9:34-35] تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ، خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے...... (حضرت) ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر (حضرت) عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے حکم کو (عملاً) منسوخ قرار دینے اور نظامِ سرمایہ داری کو پھر سے رائج کرنے کے لئے ہمارے

دورِ ملوکیت میں کیا کیا حیلے وضع اور اختیار کئے گئے تھے! آپ سوچئے کہ خدا کی طرف سے ایک واضح حکم نازل ہوتا ہے اور وہ صحابہ کبارؓ پر (معاذ اللہ) گراں گزرتا ہے! حضرت عمرؓ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے (اس مشکل کے حل کی تلاش میں) رسولؐ اللہ کے پاس جاتے ہیں اور حضورؐ فرما دیتے ہیں کہ تم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے ۔ جتنا جی چاہے مال و دولت جمع کرو۔ بس اس میں سے سال کے بعد اڑھائی روپے سینکڑہ کے حساب سے خدا کی راہ میں دے دیا کرو۔ باقی سارا مال حلال وطیّب ہو جائے گا اور حضرت عمرؓ اس حل کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں! (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ)

یہ ہے زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی شکل کے آغاز کی داستان! قرآنِ کریم کی آیات آپ کے سامنے آ چکی ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے، زائد از ضرورت روپیہ کسی کے پاس رہتا ہی نہیں۔ وہ سب حکومت کی تحویل میں آ جاتا ہے۔ یوں، جماعتِ مومنین، اپنے اس معاہدہ کو عملاً پورا کرتی ہے جو اس نے اپنے اللہ سے استوار کیا تھا اور جس کی رُو سے ''انہوں نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا'' اور اس کے عوض، انہیں جنت کی زندگی عطا ہو گئی تھی۔

حضورؐ کی اپنی زندگی

یہ ہیں قرآنِ کریم کے احکام و اصول معاشی نظام کے متعلق۔ حضور نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے اسلامی مملکت قائم فرمائی اور اس میں اس معاشی نظام کی بھی بنیاد رکھی۔ اس کے لئے حضورؐ کو چونکہ بہت کم وقت ملا، اس لئے عہدِ رسالت مآبؐ میں یہ فی الجملہ اپنی ابتدائی منزل میں ہی رہا۔ لیکن یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ عام مسلمانوں پر تو اس نظام کی منزلِ اوّل سے متعلق احکام کا اطلاق ہوتا تھا لیکن خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ اس کے اُس انتہائی دور کی آئینہ دار تھی جس میں زائد از ضرورت کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ اس نظام کا آغاز حضورؐ کی مکّی زندگی سے ہو گیا تھا جب اسلامی مملکت کا قیام تو ایک طرف، (مسلمانوں کی مختصر سی) جماعت کی زندگی بڑی عُسرت اور مفلوک الحالی میں گزر رہی تھی۔ اس زمانے میں حضورؐ نے جماعت کے لئے کیا طریقِ کار اختیار فرمایا تھا، اس کا اندازہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

> اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا یا ان کے ہاں (کسی حادثہ کی وجہ سے) فاقوں کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

مدینہ پہنچنے کے بعد، اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی۔ حضورؐ کی وفات کے وقت اس کی وسعت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیل چکی تھی لیکن اس سربراہِ مملکت (علیہ التحیّۃ والسّلام) کی اپنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق

حضورؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا' دوسرا نہیں ہوتا تھا جسے تہہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی' ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

مرض الموت کے وقت حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کردو (یعنی بیت المال میں بھیج دو تا کہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں) لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا' وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا ــــ محمدؐ کا اپنے ربّ کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا (یعنی بیت المال میں بھیج دیا)[1]۔

جہاں تک حضورؐ کے ترکہ کا تعلق ہے' بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمادیا تھا کہ

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطورِ ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

آنخضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار' نہ بکری نہ اُونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اور بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے اپنے خچر اور ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

یہ اس لئے کہ اگرچہ مملکت ایسی وسیع وعریض تھی لیکن اس کے ساتھ' رعایا جس قدر رفلاکت زدہ تھی اور ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی جو عظیم ذمہ داری حضورؐ نے اپنے اوپر لے رکھی تھی' اس کی وجہ سے حضورؐ اپنا معیارِ زندگی اس سے بلند کر ہی نہیں سکتے تھے۔

معاشی ذمہ داریاں

سربراہِ مملکت کی ذمہ داریوں کا اندازہ حضورؐ کے ان ارشاداتِ گرامی سے لگایا جا سکتا ہے جو کتبِ تاریخ واحادیث میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مسندِ امام احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔

1۔ اس قسم کی ایک روایت پانچویں باب میں بھی گزر چکی ہے جس سے واضح ہے کہ حضورؐ کو یہ خیال اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات ہی میں نہیں آیا تھا بلکہ حضورؐ کا زندگی بھر یہی مسلک رہا تھا کہ زائد از ضرورت مال گھر میں نہ رہے' بیت المال میں چلا جائے۔

اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی کو محسوس نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث (یتیم) ہے‘ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست ’’اللہ اور اس کا رسولؐ ‘‘ (یعنی اسلامی نظامِ حکومت) ہے۔ (ترمذی)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مرجائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو اور وہ تنگدستی کی وجہ سے اسے ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہوگی۔ چنانچہ حضورؐ نے اعلان فرمادیا تھا کہ

میں مسلمانوں سے‘ ان کے اپنے افرادِ خاندان کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو وفات پا جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔ (ابوعبیدہ‘ کتاب الاموال)

دیگر روایات (مسلم۔ترمذی وغیرہ) میں ہے کہ ایسے شخص کے قرض کی ادائیگی تو حکومت کے ذمے ہوگی لیکن جو کچھ وہ بطور ترکہ چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا حق ہوگا۔ اسی سلسلہ میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنادے اور وہ لوگوں کی ضروریات کی طرف سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپروائی برتے گا۔ (ابوداؤد)

یہی روایت ترمذیؔ میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

جو امام‘ ضرورت مندوں‘ محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

زائد از ضرورت

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے‘ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد مال اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ حضورؐ کے زمانے میں اس انتہائی اصول پر کس انداز سے عمل ہوتا تھا‘ اس کا اندازہ مسلم کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں‘ حضرت ابوسعیدؓ نے فرمایا کہ:

ہم لوگ رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو وہ اُس آدمی کو دے دے جسے اُس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زائد زادِراہ ہو وہ اُسے دے دے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمادیا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کسی چیز کے رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ:

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھ‘ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں بخل سے کام نہ لے۔ میں نے کہا‘ اے اللہ کے رسولؐ ‘ یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یا یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنم کا ایندھن

بننا پڑے گا۔ (حاکم)

مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ:

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال' میرا مال کہتا ہے۔ حالانکہ مال میں اس کا حصہ تین چیزیں ہوتی ہیں۔(1) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔(2) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے اور (3) جو کچھ وہ دوسروں کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے اور یا دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہ ہیں معاشی نظام کے متعلق وہ چیدہ چیدہ اقوال واعمالِ نبویؐ جو ہمیں کتبِ روایات میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے' حضورؐ' قرآن کے معاشی نظام کی (کہ جسے نظامِ ربوبیّت کہا جاتا ہے) صرف ابتداء کر سکے تھے لیکن حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ میں' اس ابتداء میں بھی اِنتہاء کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ حضورؐ نے' ضرورت مندوں کے لئے وظائف مقرر کرنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیا تھا جسے حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانے میں مزید ترقی دی تھی (اس کی تفصیل حضرت عمرؓ کے زمانے کے معاشی نظام میں بیان کی جائے گی)۔ حضورؐ مختلف قبائل میں اپنے عمّال بھیجتے کہ وہ وہاں کے ضرورت مند لوگوں کی فہرستیں مرتب کر کے مرکز میں بھیجیں۔ مرکز سے ان کی مناسب امداد کی جاتی۔ نیز آپؐ نے زرعی اصلاحات کا بھی آغاز فرما دیا تھا (اس کی تفصیل بھی عہدِ فاروقی کے نظام کے ضمن میں سامنے لائی جائے گی)۔

سیرتِ صدیقیؓ

رسولؐ اللہ کے بعد' خلافت کا بارِ امانت حضرت صدیق اکبرؓ نے اٹھایا۔ ایک تو ان کا عہدِ خلافت بڑا مختصر تھا اور دوسرے ان کا بیشتر وقت' اندرونی اور بیرونی سازشیں فرو کرنے میں صَرف ہو گیا۔ اس لئے انہیں بھی معاشی نظام کو اس کے انتہاء تک پہنچانے کا موقعہ نہ ملا لیکن اس کے باوجود انہوں نے افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کو وظائف کی صورت میں پورا کرنے کے لئے بڑے اہم اقدامات کئے (ان کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے' وہ اسوۂ رسولؐ اللہ کی جگمگاتی تصویر تھے۔ خلافت سے پہلے' آپ تجارت کرتے تھے اور اچھے خوشحال تھے۔ خلافت کی ذمہ داریوں نے آپ کا سارا وقت لے لیا' تو آپؓ نے حضرت عمرؓ کی تجویز اور دیگر صحابہؓ کے مشورہ سے' بیتّ المال سے وظیفہ لینا قبول کر لیا لیکن وہ اتنا ہی تھا جس میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا غریبانہ انداز سے گزارہ ہو سکے۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کو یہ خیال بار بار ستا رہا تھا کہ معلوم نہیں میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جس قدر لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس اضطراب کو مبدّل بہ سکون کرنے کے لئے انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے

کہا کہ ایک مختصر سا قطعہ زمین ان کے پاس ہے' اُسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم انہوں نے بیت المال سے لی ہے' اُسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ اس حساب کو یہیں بیباق کر کے خدا کے سامنے گئے۔

مجھے اپنے ''یادداشتوں کے کاغذات'' میں دو واقعات ایسے ملے ہیں جن سے سیرتِ صدیقیؓ مہرِ تابندہ کی طرح جگمگاتی ہوئی سامنے آ جاتی ہے لیکن (مجھے افسوس ہے کہ) میں ان کے حوالے لکھنا بھول گیا۔ اس لئے میں انہیں درجِ کتاب کرنے میں متأمل تھا۔ لیکن چونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کی حیاتِ طیبہ کے دیگر کوائف و احوال پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایات صحیح ہوں گی' اس لئے میں انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں' بایں اُمید کہ اگر ان میں سے کسی صاحب نے انہیں کتبِ تاریخ و سیر میں دیکھا ہو تو مجھے ان کے حوالے سے مطلع فرما دیں۔

وظیفہ کا تعیّن

پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ سوال زیرِ غور تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہئے تو حضرت صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم سے کم روزانہ اُجرت کیا ہے' وہی اُجرت آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے آپ سے کہا کہ اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا؟ تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ اس میں میرا گزارہ اسی طرح ہوگا جس طرح اس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے اور اگر گزارہ نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا تا کہ اس طرح میرا وظیفہ بھی بڑھ جائے۔ جوں جوں مزدوروں کی اُجرت بڑھتی جائے گی' میرا معیارِ زندگی اُسی نسبت سے بلند ہوتا جائے گا۔

زائد از ضرورت

(2) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن کھانے کے بعد آپؓ نے بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں؟ انہوں نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے' اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز آتی نہیں تو آج یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے جو اُس دن محسوس کیا کہ آپ میٹھی چیز پسند کرتے ہیں تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آٹا ہر روز آتا تھا' اس میں سے مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اُس کے بدلے میں بازار سے کھجور کا شیرہ منگا لیا جائے۔ اس طرح یہ حلوہ پک گیا ہے ـــــ آپ نے اُسے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔

کھانے کے بعد سیدھے بیت المال کے مودیؔ کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے' آج سے اس میں ایک مٹھی کے برابر کم کر دینا' کیونکہ ہفتہ بھر کے تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ ہے عملی تفسیر قرآنِ کریم کے اصول کی جس میں کہا گیا ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ اے رسولؐ! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضرورت کے لئے کس قدر دے دیں؟ قُلِ الْعَفْوَ [2:219] ان سے کہیں کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ سب۔ لہٰذا اگر ایک مٹھی بھر آٹا بھی اپنی ضرورت سے زائد ہے تو ایک مردِ مومن اسے بھی صَرف میں نہیں لائے گا۔ اسے دوسروں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے دے دے گا۔

ایسے ہوتے ہیں وہ حضرات جن کے ہاتھوں اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ [13:29]۔

عہدِ فاروقیؓ

قبل اس کے کہ ہم اس گوشے کی طرف آئیں کہ حضرت عمرؓ نے، اسلامی حکومت کے بنیادی فریضہ (ایتائے زکوٰۃ یا ربوبیّتِ عالمینی) کو کس انداز سے پورا کیا تھا اور اس کے لئے کیا کیا عملی اقدامات کئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ انہیں اس فریضہ کا احساس کس قدر شدت سے تھا اور انہوں نے (باتباعِ سنتِ رسولؐ اللہ) خود اپنی زندگی کو کس طرح قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل میں رکھا تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ

(i) ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ لیکن

(ii) وہ اپنی اس ذمہ داری کو براہِ راست پوری نہیں کرتا۔ اسے اسلامی مملکت پورا کرتی ہے۔

رزق کی جستجو کرو

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

تم میں سے کوئی شخص، رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ اے اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو' آسمان سے سُن نہیں برسا کرتا۔ اللہ' ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

غور فرمایئے' قرآنی غوامض پر آپ کی نگاہ کس قدر عمیق تھی۔

حقوق اللہ

جو آپ نے کہا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے'' اس سے ہمیں (مسلم میں درج شدہ) ایک حدیثِ قدسی یاد آ گئی۔ ہمارے ہاں عام طور پر حقوق کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ـــ یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لیکن قرآن میں ''حقوق اللہ'' کا ذکر (سوائے ایک مقام کے) کہیں نہیں ملتا۔ ہر جگہ حقوق العباد (یعنی ایک

انسان کے ذمے دوسرے انسانوں کے حقوق) ہی کی تاکید ملتی ہے۔ وہ ایک مقام جہاں "اللہ کے حق" کا ذکر آیا ہے، سورۂ انعام کی آیت نمبر 142 ہے جہاں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کھیتوں کی فصلیں اور باغات کے پھل، سب عطیاتِ خداوندی ہیں ——— انہیں بطیبِ خاطر کھاؤ پیو۔ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ [6:141] لیکن فصل کاٹتے وقت، اس میں سے "خدا کا حق" بھی دے دیا کرو۔ اس "حق" کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ [56:63-73] یعنی "بھوکوں کا حصہ" ہے یعنی جسے خدا نے اپنا حق کہا ہے، اس کے متعلق بھی وضاحت کر دی کہ وہ درحقیقت ضرورت مندوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جس ایک مقام پر خدا نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے، وہ بھی درحقیقت بندوں ہی کا حق ہے۔ قرآنِ کریم کے اس پس منظر میں اس حدیث کو دیکھئے جسے عام طور پر حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے[1]۔ (روایت کے مطابق) رسول اللہؐ نے فرمایا:

> خداوند عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا: "اے ابنِ آدم! میں بیمار پڑا، تو تُو میری عیادت کو نہ آیا"۔
>
> ابنِ آدم جواب دے گا، پروردگار! میں تیری عیادت کو کیسے آتا تُو تو رب العالمین ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تُو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تُو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔
>
> اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا"۔ وہ کہے گا پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا تُو تو خود ہی سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تُو نے اُسے کھانا کھلا دیا ہوتا تو اسے میرے پاس پا لیتا۔ (اسی طرح اللہ تعالیٰ پیاسے کو پانی پلانے کے متعلق کہے گا۔) (مسلم، بحوالہ العدل الاجتماعیہ، سیّد قطب)

رزق کی تنگی

یہ ہیں وہ "خدا کے حقوق" جو اسلامی حکومت کی وساطت سے پورے ہوتے ہیں۔

(2) قرآنِ کریم نے رزق کی تنگی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى [20:124] جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے، ہم اس کی روزی تنگ کر دیتے ہیں اور اسے ہم قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔ اور سورۂ نحل میں ہے کہ "خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہیں جس میں ان

[1] "احادیثِ قدسی" حدیثوں کی ایک خاص قسم ہے جس میں خدا کی طرف سے واحد متکلم کے صیغے میں بات کی جاتی ہے۔ ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک اس قسم کی حدیثیں عام طور پر وضعی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں عام احادیث سے بھی زیادہ "مقدس" سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے کہ خدا کا کلام، کتاب اللہ (قرآن مجید) سے باہر بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس قسم کی روایات کے وضعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ، ہم نے اس حدیث کو اس لئے نقل کیا ہے کہ جو لوگ ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں، ان پر واضح ہو جائے کہ "حقوق اللہ" درحقیقت حقوق العباد ہی کا دوسرا نام ہے۔ "فی سبیل اللہ" کا مفہوم بھی عالمگیر نوعِ انسانی کی منفعت کے امور ہیں۔

قوموں کو مبتلا کر دیا جاتا ہے، جو کفرانِ نعمت کرتی ہیں" (16:112)۔ دوسری طرف، قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر قوانینِ خداوندی کو فراموش کر دیا جائے تو رزق کی فراوانی بھی قوموں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے (28:58)۔

حضرت عمرؓ نے افراط و تفریط کے ان دونوں گوشوں کو ایک ہی قول میں اس طرح سمٹا دیا کہ

اے اللہ! میرے لئے رزق کی اتنی افراط بھی نہ ہو جائے کہ میں تجھ سے سرکشی اختیار کر لوں، اور نہ اتنی کمی کر دینا کہ میں تیری راہ کو فراموش کر کے اور ہی راستے اختیار کرنے لگ جاؤں۔

دولت کی اَفراط سے اندیشہ

حضرت عمرؓ کا یہی احساس تھا جس کی بناء پر یہ واقعہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب جلولا کا مالِ غنیمت آیا تو اُسے دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لوگ اُسے دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم رہے تھے، لیکن حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ مسجد کے ایک گوشے میں کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔ حضرت ابنِ عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! یہ وقت فخر و مسرت کا ہے یا رونے کا؟ آپ نے فرمایا ابنِ عوف! اِس وقت ہم لوگوں کی حالت کچھ اور ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ہمارے بعد، ہماری قوم کی حالت بھی ویسی ہی نہ ہو جائے جیسی دولت کی افراط سے اقوامِ سابقہ کی ہو گئی تھی۔ دولت کی فراوانی سے وہ آپس میں ایک دوسرے کی دُشمن ہو گئیں اور ان میں حسد کے جذبات ابھر آئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بحضور ربّ العزت عرض کیا کہ

اِلٰہ العالمین! تو میری حفاظت فرما کہ میں کہیں ہلاکت کی طرف نہ چلا جاؤں۔ میں نے قرآن میں (تیری اس بات کو) سن لیا ہوا ہے کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ [68:44] ہم ایسی قوموں کو اس طرح بتدریج تباہی کی طرف لے جاتے ہیں کہ انہیں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

اگر ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا

(3) ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہر ذی حیات (دآبۃ) کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے" (11:6)۔ یہ ذمہ داری اسلامی حکومت پر کس طرح عائد ہوتی ہے، اسے حضرت عمرؓ نے ایک فقرہ میں اس جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ بلیغ انداز ذہن میں نہیں آ سکتا۔ آپ نے فرمایا

لو مات کلب علیٰ شاطی الفرات جوعاً لکان عمر مسئولا عنه یوم القیمة۔ (توفیق الرحمٰن۔ مطبوعہ مصر)

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

شاہ ولیؒ اللہ نے ازالۃ الخفا میں، ایک اور قول نقل کیا ہے جس میں کلب (کتے) کی جگہ جمل (اونٹ) کہا گیا ہے۔ بہر حال، کتا ہو یا اونٹ، خلافت کی ذمہ داری کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے۔ وہ جو روایات میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک شخص کو خدا نے

اس لئے اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ اور ایک عورت کو اس لئے داخلِ جہنم کر دیا کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا تھا کہ نہ اُسے خود ہی کچھ کھانے پینے کو دیتی تھی اور نہ ہی کھلا چھوڑتی تھی کہ وہ اپنا پیٹ آپ بھر لے' تو یہ اسی فریضۂ خداوندی سے عہدہ برآ ہونے کی تاکید تھی۔

محتاج عورتیں

(4) ایک دفعہ آپ کے خادم (حضرت) اسلمؓ نے کہا کہ بیت المال میں ایک اونٹنی آئی ہے' جو اندھی ہے' اُسے کیا کیا جائے۔ آپ نے جب یہ دیکھا کہ اس کا کوئی مصرف نہیں تو فرمایا کہ اُسے ذبح کر لو۔ ذبح کرنے کے بعد آپ نے اس کا گوشت ازواجِ مطہراتؓ اور صحابۂ کبارؓ کے ہاں تحفۃً بھیج دیا۔ گوشت ملنے پر حضرت عباسؓ آئے اور کہا کہ امیر المومنین! آپ ہمارے لئے ہر روز اسی طرح کیا کرتے تو کیا اچھا ہوتا؟ اس پر آپ نے فرمایا

عباسؓ! مدینے میں بہت سی بھوکی عورتیں ہیں جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ ان کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔

معاشرہ میں عورتیں سب سے زیادہ کس مپرسی کی حالت میں ہوتی ہیں۔ اس لئے' جب حضرت عمرؓ نے یہ کہنا چاہا کہ میں ایسا انتظام کرنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں کوئی فرد محتاج نہ رہے تو آپ نے اسے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

اگر میں زندہ رہا تو (مدینہ تو ایک طرف) عراق تک کی بیواؤں کو ایسا بنا دوں گا کہ وہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں۔

(5) کفالتِ عامہ کے سلسلہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ

قلمروِ خلافت میں بلاتخصیصِ مذہب وملت' ہر تنگدست کی امداد کی جائے۔ ہر مقروض کا قرضہ ادا کیا جائے۔ ہر کمزور' ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے۔

یعنی کوئی ضرورت مند ایسا نہ رہنے پائے جس کی ضرورت حکومت کی طرف سے پوری نہ کی جائے۔

(6) ہم (سابقہ باب میں) دیکھ چکے ہیں کہ محتاجوں اور ناداروں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی احتیاج کی اطلاع خود خلیفہ تک پہنچائیں۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ رعایا کے ہر فرد کی ضروریات سے باخبر رہے اور انہیں از خود پورا کرے۔ اس سلسلہ میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جو محتاج آپ تک پہنچ جاتا اس کی ضروریات کا پورا کرنا آپ کسی اور پر نہ چھوڑتے' خود دیکھتے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک قاصد (قیس اشجعی) آپ کے پاس آیا۔ اس کا بیان ہے کہ

میں آیا تو آپ لکڑی کی ٹیک لگائے اس طرح کھڑے تھے جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو کھانا کھلوا رہے تھے۔ آپ چکر لگاتے جاتے اور فرماتے جاتے۔ اے یرفاؔ! اسے گوشت دے' اسے روٹی دے' اسے شوربا دے۔

احترامِ انسانیت

اس طرح افرادِ معاشرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے اور ایسا کرنے میں احترامِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت اسلمؓ کی روایت ہے کہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار گیا تو وہاں ایک نوجوان عورت آپ سے ملی اور کہنے لگی کہ امیر المومنین! میرا شوہر مر گیا اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے' ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں۔ میں خفاف بن ایماء الغفاری کی بیٹی ہوں جو حدیبیہ میں رسول اللہ کے ساتھ تھے۔ آپ اس کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ گھر آئے اور ایک تنومند و توانا اونٹ پر سامانِ رسد اور دیگر اشیائے ضروریہ لاد کر اس کے پاس لے گئے اور کہا کہ بیٹی! اسے ہنکا لے جا۔ اب تجھے خود آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمام ضروری سامان تم تک خود بخود پہنچ جایا کرے گا۔ ایک شخص نے دیکھا تو کہا' امیر المومنین! آپ نے اس لڑکی کو بہت زیادہ دے دیا۔ فرمایا کہ تجھے کیا خبر کہ وہ کس باپ کی بیٹی اور کس بھائی کی بہن ہے؟ یہ میں جانتا ہوں۔

(7) قحط کے زمانے میں آپ نے رعایا کے کھانے پینے کے جو انتظامات کئے تھے' انہیں ہم سابقہ باب میں بیان کر چکے ہیں۔ جب بدوی قبائل کے بھوکے لوگ ہجوم کر کے مدینہ آ گئے تھے' تو آپ نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ

> جس جس گھر میں کچھ وسعت ہے' میں اس گھر کے افراد کی تعداد کے برابر' ان محتاجوں کو ان کے خاندانوں کا جزو بنا دوں گا تا کہ جو کچھ اس خاندان کے لئے ایک وقت میں پکتا ہے' اسے یہ سب مل کر کھا لیں۔ اس سے لوگ ہلاکت سے بچ جائیں گے۔

اس کے بعد' دوسرا قدم یہ تھا کہ اہلِ مدینہ اور باہر سے آنے والوں کے لئے مشترکہ دسترخوان بچھا دیئے گئے اور جو کچھ مدینہ میں موجود تھا اور جو کچھ باہر سے آیا اسے سب نے مل بانٹ کر کھا لیا۔ یہ اس سنتِ رسول اللہ کے اتباع میں تھا جس کی رُو سے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں اشعری قبیلہ والوں میں سے ہوں۔ اسی ارشادِ نبویؐ کی تشریح میں حضرت ابنِ عمرؓ کہا کرتے تھے کہ

> اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کر کھائیں۔

بات ہم یہ کر رہے تھے کہ قرآنی مملکت میں رزق کی ذمہ داری افراد کی الگ الگ نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی نظام کی ہوتی ہے۔ مملکت میں جو سامانِ زیست بھی ہو' وہ سب کے لئے مشترک ہوتا ہے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کسی دعوت میں گئے تو دیکھا کہ اہلِ خانہ کے ملازم' دسترخوان پر موجود نہیں۔ دریافت کرنے پر صاحبِ خانہ نے کہا کہ ہم پہلے کھا لیتے ہیں وہ بعد میں کھاتے ہیں۔ اس پر آپ نے برافروختہ ہو کر فرمایا:

> خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہو گا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر آپ نے ان ملازموں کو بلایا اور پہلے انہیں کھلایا اور بعد میں خود کھایا۔

پیاس سے مرجانے والے کا خون بہا

(8) رزق کے معاملہ میں، حکومت کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فاروقِ اعظمؓ ایسی شدت برتتے تھے کہ ایک دفعہ ایک بستی کے رہنے والوں نے ایک پیاسے مسافر کو پانی نہ دیا اور وہ پیاس کی وجہ سے مرگیا تو آپ نے اس کا خون بہا ادا کیا اور پھر اُسے اُس بستی والوں سے وصول کیا۔ اسی فاروقی فیصلہ کی رُو سے، قانون بن گیا کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک پیاس سے مرجائے تو اہلِ بستی پر اس کی دیت (خون کی قیمت) لازم آجاتی ہے۔

امام ابن حزمؒ کے فتاویٰ

(ضمناً) امام ابن حزمؒ (وفات 456ھ) اندلس کے مشہور محدث اور فقیہہ تھے۔ انہوں نے ان قوانین کو اپنی کتاب المحلّٰی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ

> فقہاء کا قول ہے کہ اگر کوئی پیاسا ہے اور اسے موت کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے تو اُس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں پانی پائے، چھین کر پی لے اگرچہ اس کے لئے اسے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس کے بعد، امام ابن حزم لکھتے ہیں:

پھر اس میں کیا فرق ہے کہ پیاس کی وجہ سے موت سے بچنے کے لئے جنگ کو جائز قرار دیا جائے اور بھوک اور عریانی کے سبب موت سے بچنے کے لئے قتال سے منع کیا جائے حالانکہ نوعیت دونوں کی ایک جیسی ہے۔

اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ:

> مضطر (یعنی جو بھوک پیاس سے مجبور ہو جائے) کو مقاتلہ کا حق حاصل ہے۔ اس مقاتلہ اور مقابلہ میں اگر وہ مضطر مارا جائے تو حق روکنے والے پر اس کا خون بہا لازم آجائے گا لیکن اگر وہ روکنے والا مارا جائے تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ اس لئے کہ کسی کے حق کو روکنے والا درحقیقت بغاوت کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا، تو وہ اسی بنا پر تھا۔

یہ امام ابن حزمؒ کا فتویٰ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مضطؔر کو مقاتلہ کا حق انفرادی طور پر نہیں دیا جانا چاہیئے۔ اس سے معاشرہ میں فوضویت (انارکی) پھیل جائے گی۔ یہ حق، مضطر کی طرف سے حکومت کو حاصل ہونا چاہیئے۔ بہر حال، یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جس پیاسے کو اہلِ بستی نے پانی نہیں دیا تھا اور وہ پیاس سے مرگیا تھا، اس کی دیت، حضرت عمرؓ نے خود ادا کر کے، اسے اہلِ بستی سے وصول کیا تھا۔ یہ تھا رزق کے معاملہ میں حکومت کی ذمہ داری کا عملی مفہوم۔

حکومت کے واجبات کس کے ذمے ہو سکتے ہیں

(9) حضرت عمرؓ کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے جب متعلقہ شخص حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو چکا ہو۔ اسی ضمن میں' ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان کردہ واقعہ بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں' اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد' حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں' ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔

اللہ کا مال اللہ کے بندوں کے لئے

(10) یہ تھی مختصراً' رزق کے معاملہ میں خلافت (اسلامی حکومت) کی ذمہ داریوں کی ایک ہلکی سی جھلک۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب حکومت' یہ فریضہ اپنی ذمہ داری کے طور پر ادا کرے' تو اس سے وہ رعایا کے سر پر احسان نہیں دھرے گی۔ (مثال کے طور پر) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحط کے دوران' حضرت عمرؓ نے کس طرح اپنے آپ کو فاقوں سے اَدھ مؤا کر لیا اور جب تک اس کا اطمینان نہیں کر لیا کہ ہر بھوکے کو کھانے کے لئے مل گیا ہے' اپنے منہ میں ایک لقمہ تک نہیں ڈالا' اور وہ لقمہ اسی کھانے کا تھا جو ہر ایک نے کھایا تھا۔ جب قحط رفع ہو گیا اور قافلے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ انہیں رخصت کرنے کے لئے خود تشریف لے گئے۔ وہ لوگ اپنا اپنا سامان لاد رہے تھے اور خوش و خرم واپس جا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر آئے۔ اہلِ قافلہ میں سے (بنی محارب کے) ایک شخص نے آپ سے عرض کیا کہ اہلِ قافلہ کو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ سب آپ کے ممنونِ احسان اور شکر گزار ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

بھئی! تم نے ایسا کیوں کہا۔ جو کچھ میں نے آپ لوگوں پر خرچ کیا ہے' یہ مال میرا یا میرے باپ خطاب کا نہیں تھا۔ یہ اللہ کا مال تھا۔ (اس لئے میری شکر گزاری کیسی؟)

مال اللہ کا ہوتا ہے اور سربراہِ مملکت کی حیثیت (حضور نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق) قاسم کی ہوتی ہے۔ وہ اسے احکامِ خداوندی کے مطابق تقسیم کرتا ہے (زاد المعاد) اور حضرت عمرؓ کی یہی سب سے بڑی خصوصیت تھی جسے حضرت ابنِ عباسؓ نے آپ کی وفات کے وقت ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے اور برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔

امام مہدی

(ضمناً) وہ جو ہمارے ہاں ''امام مہدی'' کا تصور ہے کہ ان کے زمانے میں' اسلام کا نظام (الدین) ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ زمین' ظلم وتشدد کی جگہ عدل وانصاف سے معمور ہو جائے گی۔ کرۂ ارض کا ہر فرد مطمئن اور مسرور ہوگا' تو اُس نظام کے سربراہ کے متعلق (روایت ہے کہ) حضورؐ نے فرمایا کہ وہ **یقسم المال صحاحا** (وہ سرمایہ کو صحیح طور پر تقسیم کرے گا)۔ کسی نے دریافت کیا کہ صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا تو آپؐ نے فرمایا **بالسویۃ بین الناس** (تمام انسانوں میں مساوات کی رُو سے)[1]۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا غیر متعلق نہیں ہوگا کہ ہمارے نزدیک' امام مہدی کے متعلق یہ عام تصور کہ آپ آخری زمانہ میں' خدا کی طرف سے مامور ہو کر آئیں گے اور ان کے ہاتھوں دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوگا' قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے' ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد' کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا' مامورین من اللہ صرف حضراتِ انبیاءِ کرامؑ ہوتے تھے جن کا سلسلہ حضورؐ خاتم النبیین کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد' دنیا میں اسلامی نظام کو قائم اور بلند کرنے والے افرادِ اُمت حضورؐ کے متبعین ہوں گے۔ انہی کو خلفائے راشدین کہا جائے گا اور یہی[2] مہدی کہلائیں گے۔ خود حضورؐ نبی اکرم کا ارشادِ گرامی اس پر شاہد ہے۔ جب آپ نے فرمایا تھا کہ:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمُهْدِيِّيْنَ (مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین المہدئین کے طریقوں کی پیروی لازم ہے۔

لہٰذا' جو مردِ مومن' جس زمانے میں قرآن کا نظام قائم کر کے سنتِ رسولؐ اللہ کا احیاء کرے گا وہی اس زمانے کا مہدیؑ اور امامِ برحق ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اس کے برعکس:

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

بنا بریں' حضرات خلفاء راشدینؓ ہی وہ امام مہدی تھے جو رزق کی تقسیم مساوی مساوی کرتے تھے (یعنی ہر ایک کی ضرورت کے

1۔ مجمع الزوائد۔ باب ماجاء فی المھدی۔

2۔ شیعہ حضرات کا اپنے ائمہ کرام (منجملہ امام مہدی) کے متعلق عقیدہ کچھ اور ہے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہم یہاں سنیوں کے عقیدہ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

مطابق) اور یہی تھی وہ سب سے بڑی خصوصیت جس کا ذکر حضرت ابنِ عباسؓ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت کیا تھا۔ نیز حضرت علیؓ کا وہ قول جس میں آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ:

آپ کے عمّال اس قدر امانت دار اس لئے ہیں کہ آپ خود امین ہیں۔

ذمہ داری کا احساس

حضرت عمرؓ کو اس امانت کا احساس کس قدر شدید تھا اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

(1) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا' امیر المومنین! کدھر؟ کہنے لگے' مالِ زکوٰۃ کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے' اُسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کر لے۔ آپ نے کہا کہ خدا کی قسم! یہ تو اونٹ ہے' اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی (اور جب باز پرس عمرؓ سے ہو گی تو یہ ڈیوٹی بھی عمرؓ ہی کی ہونی چاہئے کہ وہ گم گشتہ اونٹ کو تلاش کرے)۔

(2) ایک دن سخت گرمی تھی۔ حضرت عثمانؓ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دو اونٹ ہنکائے چلا آ رہا ہے۔ گرمی سے زمین تپ رہی تھی۔ فضا جھلس رہی تھی۔ آپ نے دل میں کہا کہ نہ جانے اس شخص کو کیا مصیبت پیش آئی ہے کہ اس وقت یوں بھاگے بھاگے پھر رہا ہے؟ قریب آنے پر دیکھا کہ وہ امیر المومنین حضرت عمرؓ ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا کہ اس گھڑی کیا مصیبت آئی تھی۔ فرمایا' بیت المال کے دو اونٹ باقی اونٹوں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ انہیں باقی اونٹوں سے ملا دوں تا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں اور اللہ مجھ سے مؤاخذہ کرے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آپ اندر تشریف لایئے۔ سایہ میں بیٹھئے' پانی پیجئے۔ ہم یہ کام کسی دوسرے سے کرائے دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ شکریہ! آپ آرام کیجئے۔ یہ کام میں خود ہی کروں گا۔ یہ کہا اور اونٹوں کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

جس شخص نے قوی[1] و امین انسان کو دیکھنا ہو' وہ انہیں دیکھ لے۔

(3) یہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ بیت المال کے بیمار اونٹ کو کس طرح تیل کی مالش کر رہے تھے اور آپ نے باہر سے آنے والے وفد کے قائد حضرت احنف بن قیسؓ کو کس طرح اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ جس شخص کے احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم تھا' بہ حیثیتِ امیر المومنین' اس نے اپنی پوزیشن کیا رکھی تھی۔

1۔ قوی و امین کی بات پہلے بھی گزر چکی ہے۔

2- سربراہِ مملکت کی اپنی پوزیشن

وظیفہ

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد، حسبِ معمول، سب سے پہلے سوال خلیفہ کے وظیفہ کا سامنے آیا۔ اس کے متعلق رفقاء نے مختلف مشورے دیئے لیکن جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا وظیفہ آپ مقرر کیا تھا، اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اپنے لئے آپ وظیفہ تجویز کیا اور وہ یہ تھا:

> کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا، ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو اُن کا حال سو میرا حال۔

بیت المال میں حق

بیت المال میں سے اتنا سا لیتے وقت بھی دل پر جو بوجھ تھا اس کا اظہار نہایت بلیغ اور مؤثر انداز سے کیا۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ تم یتیموں کے مال کا نہایت دیانتداری سے انتظام کرو۔ اگر تم ضرورت مند نہیں ہو تو اس خدمت کے معاوضہ میں کچھ نہ لو لیکن اگر تم خود صاحبِ احتیاج ہو تو اس کے عوض قاعدہ اور قانون کے مطابق تھوڑا بہت لے سکتے ہو (4:6)۔ حضرت عمرؓ نے (اپنے وظیفہ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ

> اللہ کا مال میرے لئے یتیم کے مال کی طرح ہے۔ اگر ضرورت نہیں ہوتی تو اُسے ہاتھ تک نہیں لگاتا اور حاجت مند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں۔

اربابِ تحقیق کا اندازہ ہے کہ حضرت عمرؓ جو کچھ اپنے لئے بیت المال سے لیتے تھے وہ بقدرِ دو درہم روزانہ کے ہوتا تھا اور (علامہ طنطاوی کی تحقیق کی رُو سے) ایک درہم ہماری چونی کے برابر ہوتا تھا۔ اس حساب سے حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے زیادہ سے زیادہ آٹھ آنے یومیہ لیتے تھے۔ لیکن اس میں گزارہ بڑی تنگی سے ہوتا تھا۔ رفقاء نے اسے محسوس کیا تو کسی کو اس کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ سے کہتا کہ اس میں اضافہ کر لیجئے۔ انہوں نے مشورہ کر کے، آپ کی بیٹی، اُمّ المومنین، حضرت حفصہؓ کو اس کے لئے آمادہ کیا۔ وہ باپ کے پاس گئیں اور کہا کہ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے مملکت کو کشائش عطا کر دی ہے، آپ بھی اپنے روزینے میں کچھ اضافہ فرما لیجئے تا کہ گزارہ قدرے سہولت سے ہو جائے۔ آپ نے سنا تو جواب میں فرمایا کہ:

> بیٹی! تم نے اپنی قوم کا ساتھ دیا لیکن اپنے باپ کے ساتھ خیر خواہی نہ کی۔ جہاں تک تمہارے مشورہ کا تعلق ہے، میں واضح

کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے گھر والوں کا میرے مال اور میری جان پر حق ہے۔ دین اور امانت میں ان کا کوئی حق نہیں۔

امیر المومنین کا کھانا

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو وظیفہ اپنے لئے مقرر کیا تھا اس میں قریش کے ایک عام آدمی کے معیار کے مطابق کھانا اور دو جوڑے (سالانہ) کپڑے تھے۔ اب دیکھئے کہ اس کھانے اور ان کپڑوں کی کیفیت کیا تھی۔ پہلے کھانے کو لیجئے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ساریہؓ کا پیغام بر[1] جب آپ کے پاس آیا ہے تو آپ اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور اسی کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آ گیا' کھانے میں جَو کی روٹی' زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ امیر المومنین! آپ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جواب میں کہا:

> ابنِ فرقد! سرزمینِ عرب میں اس وقت مجھ سے زیادہ صاحبِ مقدرت کوئی ہے؟

اس نے جواب میں کہا کہ کوئی نہیں! تو آپ نے فرمایا کہ اس مقدرت کے باوجود میں جو گیہوں کے بجائے جَو کی روٹی کھاتا ہوں تو اس کی وجہ عدم مقدرت نہیں' کچھ اور ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ میں ایسا تو نہیں کہہ سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:

> عمر کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اُسے اِس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

یہ تو عام حالات میں کھانے کا معیار اور اصول تھا۔ قحط کے زمانے میں آپ نے اپنے' اور اپنے اہل و عیال پر جو مزید پابندیاں عائد کر لی تھیں' ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ عام حالات میں جب سالن میسر آتا تھا تو وہ ایک ہی ہوتا تھا۔ دستر خوان پر کبھی ایک سے زیادہ سالن نہیں دیکھے گئے۔ "ایک سے زیادہ سالن" کا بھی آپ کے نزدیک معیار عجیب تھا۔ ایک دفعہ کھانے میں گوشت اور دودھ آیا تو آپ نے کہا کہ یہ دو سالن ہیں۔ ان میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی کھایا جائے گا اور ان میں سے بھی وہ کھایا جائے گا جس کے متعلق اطمینان ہو کہ وہ عام مسلمانوں کو میسر آ سکتا ہے۔ ایک دفعہ آذربائیجان کا قاصد آتے وقت آپ کے لئے وہاں کا کچھ حلوہ لیتا آیا۔ آپ نے چکھا تو فرمایا کہ بہت اچھا ہے لیکن ساتھ ہی پوچھا کہ کیا یہ حلوہ وہاں تمام مسلمانوں کو میسر آ جاتا ہے۔ قاصد نے کہا کہ نہیں! یہ تو خاصہ کی چیز ہے۔ یہ سن کر آپ نے ہاتھ روک لیا اور فرمایا کہ اسے واپس[2] لے جاؤ۔ اس کے ساتھ ہی عامل کو خط لکھا کہ:

> میاں! اس قسم کا حلوہ کھانا نہ تمہارے بس کی بات تھی نہ تمہاری ماں کے۔ وہی کچھ کھاؤ اور مسلمانوں کو کھلاؤ جو کچھ ہم اپنے

1۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ عتبہ بن فرقد کے ساتھ پیش آیا تھا جو کوفہ کے عامل تھے۔

2۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اُسے شہداء کے بچوں میں تقسیم کر دیا۔

گھروں میں کھاتے ہیں۔

اس قسم کی پُرتکلف چیزوں کے استعمال سے اجتناب کیوں برتا جاتا تھا؟ اس کے لئے آپ نے ایک دفعہ جو دلیل دی تھی وہ دیدۂ بصیرت کے لئے وجۂ صد فروغ ہے۔ حضرت جابر بن عبدؓاللہ نے کہا کہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے ہاں گیا تو میرے ہاتھ میں تازہ گوشت کا ٹکڑا تھا۔ آپ نے کہا کہ جابرؓ یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ گوشت کھانے کو جی چاہا تھا' خرید لایا۔ فرمایا:

> کیا صورت یہ ہوئی کہ جس چیز کو جب بھی جی چاہا' اسے خرید لیا؟ کیا تو اس ارشادِ خداوندی سے نہیں ڈرتا جس میں کہا گیا ہے کہ جب کفار کو جہنم کے کنارے لایا جائے گا تو وہ خدا سے عرض کریں گے کہ کیا اس زندگی کی خوشگواریوں میں ہمارا کوئی بھی حصہ نہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا [46:20] تم اپنے حصے کی خوشگوار چیزیں دنیاوی زندگی میں لے کر ختم کر چکے ہو۔

جب کھانا سامنے آیا تو وہ قدرے پُرتکلف تھا۔ فرمایا کہ:

> یہ تو ہمارے لئے ہوا۔ اُن محتاجوں کے لیے کیا ہے جو بھوکے مر رہے ہیں اور جنہیں نانِ جویں تک میسر نہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے کہا کہ "ان کے لئے جنت ہے"۔ یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور فرمایا کہ خالدؓ!

> اگر ہماری قسمت میں یہ ہے اور ان کی مقدر میں جنت' تو پھر سوچو کہ یہ فرق کتنا بڑا ہوا؟

واضح رہے کہ حضرت عمرؓ اپنے آپ کو ان آسائشوں سے اس لئے محروم نہیں رکھتے تھے کہ آپ (اہلِ تصوف کی طرح) زہد و تورع کی فقیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ قطعاً نہیں۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنے والوں کو آپ کس طرح ڈانٹتے تھے' یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس کی وجہ وہ تھی جسے آپ نے ان الفاظ میں بیان فرما دیا تھا کہ:

> اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مجھے ان کا احساس ہی نہیں ہوگا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا۔

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ

> اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔

امیر المومنین کا لباس

کھانے کے بعد لباس کی طرف آیئے یعنی سردی اور گرمی کے لئے ایک ایک جوڑے کی طرف۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "میں نے عمر ابن الخطابؓ کو دیکھا آپ کے ازار میں اکیس پیوند چمڑے کے اور ایک پیوند کپڑے کا تھا"۔ حضرت انسؓ نے

بیان کیا ہے کہ "میں نے حضرت عمرؓ کی قمیص میں، ان کے مونڈھوں کے درمیان چار پیوند دیکھے"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ "میں ایک دن حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے گیا۔ آپ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ گدھے کے گلے میں سیاہ رسی بندھی تھی اور حضرت عمرؓ ایک قمیص اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ تہبند کا یہ عالم کہ وہ پنڈلیوں سے اوپر چڑھتا جا رہا تھا، میں اُسے ایک طرف سے ٹھیک کرتا تو وہ دوسری طرف سے اوپر چڑھ جاتا۔ یہ دیکھ کر آپ مسکرائے اور کہا کہ اسے چھوڑ دو، یہ تمہاری بات نہیں مانے گا۔ اتنے میں ہم ایک باغ میں داخل ہو گئے تو آپ نے تہبند میری طرف پھینکتے ہوئے فرمایا کہ ذرا ہاتھ بٹاؤ اور اسے دھو ڈالو۔ یہ کہہ کر قمیص خود دھونے لگ گئے۔

کبھی کبھی آپ، وقتِ مقررہ پر گھر سے باہر نہیں آتے تھے۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ذمہ دار یہ میرے کپڑے ہیں۔ ایک ہی جوڑا ہے، اسے دھو کر ڈال دیتا ہوں، تو یہ سوکھنے میں دیر لگا دیتا ہے۔

حج کا خرچ

حج کے اجتماع میں شرکت، امیر المومنین (اور دیگر عمّالِ حکومت) کی "سرکاری ڈیوٹی" تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ صدرِ مملکت کس "شان و شوکت" سے یہ سفر کرتے تھے ان کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں ایک دفعہ حج کے سفر میں حضرت عمرؓ کے ساتھ رہا۔ آپ کے لئے نہ کہیں خیمہ لگایا گیا نہ سائبان۔ نہ کوئی ایسی عمارت تھی جس میں آپ آرام کر سکتے۔ جہاں قیام کرنا ہوتا، ایک چادر کسی درخت پر ڈال دیتے اور اس کے سائے میں ہم سب آرام کر لیتے"۔

حضرت یسارؓ بن نمیر کی روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس مرتبہ حج پر کُل کیا خرچ آیا۔ میں نے کہا پندرہ دینار (دوسری روایت میں دو سو اسی درہم کہا گیا ہے)۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "ہم نے بیت المال کا بہت سا روپیہ اڑا دیا"۔

مکان، امیر المومنین کا وہی تھا جس میں آپ، زمانہ خلافت سے پہلے رہا کرتے تھے۔ جب ایوانِ حکومت وہی مسجد تھی تو ایوانِ صدر جداگانہ کیوں ہوتا؟ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے آپ کو اطلاع دی کہ انہوں نے صدرِ مملکت کے لئے مصر میں ایک مکان بنوایا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں جواب دیا کہ "بھائی ذرا سوچو! حجاز میں رہنے والے کا مکان مصر میں کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مکان کو رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رہنے دو"۔

ضمناً، مکانات کے متعلق عام لوگوں کے لئے بھی آپ کی ہدایت یہی تھی کہ وہ نہایت سادہ سے ہونے چاہئیں۔ جب کوفہ کی چھاؤنی تعمیر ہوئی ہے تو وہاں پہلے بانس کے مکانات بنائے گئے۔ ایک دفعہ ان مکانوں میں آگ لگ گئی تو وہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اس پر آپ نے اجازت دے دی کہ ان کی جگہ مکانات پختہ بنا لئے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ کوئی شخص نہ تین کمروں سے بڑا مکان بنائے، نہ زیادہ اونچا۔

امیر المومنین کی زندگی

بہرحال' یہ تھی امیر المومنین کی زندگی۔ ایک دفعہ قیصرِ روم نے ایک قاصد مدینہ بھیجا کہ وہ حالات کا جائزہ لے۔ اس نے مدینہ پہنچ کر لوگوں سے پوچھا کہ آپ کا بادشاہ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں' ایک امیر ہے جو مدینے سے باہر کہیں گیا ہے۔ وہ آپ کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ آپ اپنے چغے کو سر کے نیچے رکھے بالو ریت پر دھوپ میں سو رہے ہیں اور آپ کا پسینہ پیشانی سے ٹپک کر زمین کو تر کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور بے ساختہ کہنے لگا کہ ''عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔ ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے وہ بیدار اور خوف زدہ رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا دین برحق ہے۔ اگر میں قاصد کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو اسی وقت اسلام قبول کر لیتا۔ اب جا کر واپس آؤں گا تو اسلام قبول کر لوں گا''۔

یہ تھا اندازِ زیست اس امیر المومنین کا جس کی مملکت بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا ایسا انداز کیوں تھا؟ اس لئے کہ جس معلّم (علیہ التحیۃ والسّلام) سے اسؓ نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی' اُنؐ کا ارشاد تھا کہ:

> سربراہِ مملکت کی حیثیت محض ایک خزانچی (قاسم) کی ہوتی ہے۔ اس کے پاس ڈھیروں مال جمع رہتا ہے لیکن سب اس لئے کہ جہاں تقسیم کرنے کا اُسے حکم دیا جائے' وہاں تقسیم کر دے۔ (زادالمعاد' جلد نمبر 2)

اِسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہماری اور قوم کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ سفر کے لئے نکلے تو انہوں نے اپنا اپنا سرمایہ کسی ایک شخص کے سپرد کر دیا کہ وہ اس سے مشترکہ طور پر سفر کے اخراجات پورے کرتا جائے۔ کہا' کیا اس صورت میں اُس شخص کے لئے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کرے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بس یہی کیفیت قوم اور اس کے سربراہ کی ہے۔

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ بیت المال سے قرض تک لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ تھی امیر المومنین کی زندگی۔ ہم نے' اسلام کے معاشی نظام کے سلسلہ میں' خود سربراہِ مملکت کی زندگی کو پیش کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ اس نظام کو وہی شخص متشکل کر سکتا ہے جو اپنی زندگی اس قسم کی رکھے اور اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

آمدنی اور اس کی تقسیم

صحاؔح کی مشہور حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت میں جن امور کے متعلق خصوصیت سے باز پُرس ہوگی ان میں ایک اہم معاملہ یہ بھی ہوگا کہ مآل کے متعلق پوچھا جائے گا کہ:

کہاں سے لیا' کہاں خرچ کیا

من این اکتسبه وفیما انفقه

اس نے اس مال کو کہاں سے حاصل کیا اور کہاں کہاں خرچ کیا۔

یعنی یہی نہیں کہ مال کے خرچ کرنے کے متعلق ہی باز پُرس ہوگی' بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے وہ مال کس طریق سے حاصل کیا تھا۔ سو جب یہ باز پُرس ایک ایک فرد سے ہوگی تو حکومت سے اُس کا مؤاخذہ بدرجۂ اُولیٰ ہوگا۔ اسلامی حکومت اس امر کی جوابدہ ہوتی ہے کہ ''اس نے کہاں سے لیا اور کیسے خرچ کیا''۔

مالِ غنیمت

جغرافیائی پوزیشن اور آب و ہوا کے لحاظ سے ملکِ عرب کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے اس کے ذرائع پیداوار نہایت محدود تھے۔ ملک کا بیشتر حصہ ریگستان تھا۔ اس میں جہاں جہاں نخلستان تھے' وہاں گھاس چارہ ہو جاتا تھا اور اس سے قبائل بھیڑ بکریاں پال لیتے تھے۔ یہی ان کا مال تھا اور اسی مال کی لڑائیوں میں لُوٹ پڑتی تھی —— بلکہ یوں کہئے کہ اکثر و بیشتر اسی مال کی خاطر لڑائیاں ہوتی تھیں —— عربی زبان میں' بھیڑ بکریوں کو غنم کہتے ہیں اس لئے جنگ میں لُوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ لہٰذا' ان کے ہاں آمدنی کا بیشتر حصہ مالِ غنیمت پر مشتمل ہوتا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جنگ میں جو شخص اپنے غنیم کو قتل کر دے' اس کا مال و اسباب اس (قاتل) کو بطورِ غنیمت مل جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس میں اصلاح کی اور کہا کہ سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ جنگ' مالِ غنیمت کے لئے نہیں کی جائے گی بلکہ اس لئے کی جائے گی کہ خدا کا نظامِ عدل و انصاف غالب رہے (كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا)۔ اس ایک اصلاح سے جنگ کا جذبۂ محرکہ یکسر بدل گیا۔ اب رہا مالِ غنیمت' سو اس کے متعلق فرمایا کہ اسے انفرادی طور پر لُوٹا نہیں جائے گا بلکہ اسے اجتماعی طور پر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے گا جو اسے انفرادی اور اجتماعی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے گی۔ سورۂ انفال میں ہے:

> یاد رکھو! جو کچھ تمہیں بطور مالِ غنیمت حاصل ہو' اس کا پانچواں حصہ ''اللہ اور رسولؐ'' کے لئے اور ذی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن السّبیل کے لئے ہے (8:41)۔

یہ اس مالِ غنیمت کے متعلق ہے جو حریف سے جنگ کرنے کے بعد حاصل ہو لیکن اگر دشمن بغیر جنگ کئے بھاگ جائے اور کچھ مال و اسباب پیچھے چھوڑ جائے (جسے اصطلاح میں مالِ فے کہا جاتا ہے) تو اس کے متعلق کہا کہ وہ سب کا سب حکومت کی تحویل میں چلا جائے گا (59:7)۔

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خُمس) یا مالِ فے' جو حکومت کی تحویل میں جائے گا' وہ سربراہِ مملکت کی ذاتی ملکیت قرار نہیں پائے گا۔ سربراہِ مملکت کو تو' دیگر افرادِ معاشرہ کی طرح' کفاف (روزینہ) ملے گا جس سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی

ضروریات پوری ہوں۔ یہ مال' مملکت کی اجتماعی ضروریات پوری کرنے اور رفاہِ عامہ کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور نبی اکرمؐ نے یہ فرما کر اس کی تشریح کر دی کہ:

تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لئے پانچواں حصہ ہے اور یہ حصہ بھی تمہی لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلم)

اب رہا وہ مال جو لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا' اس کے متعلق قرآنِ کریم نے دو بنیادی اصول بیان کر دیئے۔ ایک یہ کہ:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [59:7] جو کچھ رسول تمہیں دے دیں (بطیبِ خاطر) قبول کر لو۔ جو نہ دیں اس سے رُکے رہو۔ یعنی اس تقسیم کا اختیار حکومت کو حاصل ہے۔ ہر ایک کو اس کا فیصلہ بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہئے۔ اور دوسرا اصول خود حکومت کے لئے کہ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ [59:7] ایسا نہ ہو کہ یہ مال تم میں سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتا رہے۔ یعنی تقسیم ایسی نہ ہو کہ یہ مال اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتا رہے۔ اسے تمام معاشرہ میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہئے جس طرح انسانی جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے کہ ہر عضو کو ضرورت کے مطابق سامانِ نشو ونما ملتا رہتا ہے۔ اس اصول پر نبی اکرمؐ نے جس طریق سے عمل فرمایا' جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان وجد میں آ جاتا ہے۔

تاریخِ انسانیت کا اہم ترین اور مشکل ترین مسئلہ دولت (یا سامانِ رزق) کی تقسیم کا ہے۔ اس کے لئے یکے بعد دیگرے مختلف اصول وضع ہوئے اور متعدد طریق کار اختیار کئے گئے۔ لیکن ہر اصول و طریق کے بعد انسانیت کو بصد حسرت و یاس کہنا پڑا کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اس سلسلۂ سعیٔ لاحاصل کی آخری کڑی کارل مارکسؔ (کے نظامِ کمیونزم) کا وہ اصول ہے جسے اس باب میں حرفِ آخر قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ

صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے ضرورت کے مطابق دیا جائے

ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

یہ اصول واقعی بڑا طمانیت بخش ہے لیکن یہ بھی اسی ''سلسلۂ سعیٔ لاحاصل'' کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ خود کارل مارکسؔ اور لیننؔ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ اصول ہے تو بڑا انسانیت ساز' لیکن اسے عمل میں کس طرح لایا جائے' یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ اشتراکی دنیا میں سوشلزم کا نظام تو کسی حد تک جاری ہو سکا لیکن کمیونزم کا نظام کہیں آزمایا تک نہیں گیا۔ کارلؔ مارکس نے تو اپنے رفقاء کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

اس مسئلہ پر بحث و تمحیص بھی نہ کی جائے)[1]۔

مذکورہ بالا اصول فی الواقعہ بڑا درخشندہ ہے لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسے سب سے پہلے پیش کس نے کیا تھا؟ اسے کارل مارکس نے نہیں، حضور نبی اکرمؐ نے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا (جب ساری دنیا نظامِ سرمایہ داری کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی) اور نہ صرف نظری طور پر پیش کیا تھا بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ میں تمام سپاہی یکساں حصہ لیتے تھے اور اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق نبرد آزمائی کرتے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان کا حصہ یا تو (سب کے لئے) یکساں ہونا چاہئے تھا یا ان کی خدمات کے مطابق۔ لیکن حضورؐ نے اصول یہ طے فرمایا کہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق حصہ دیا جائے (بخاری، کتاب الجہاد)۔ اور عملاً اس کا مظاہرہ یوں ہوتا تھا کہ مجرد (غیر شادی شدہ) کو ایک حصہ ملتا تھا اور اہل و عیال والے کو دو حصے (ابوداؤد، کتاب الخراج والامارہ)۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب بعد میں، مالِ غنیمت کو اس طرح تقسیم کرنے کے بجائے، افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دینے کا طریق اختیار کیا گیا تو اس کے لئے بھی اسی اصول کو بنیاد قرار دیا گیا —— یعنی وظیفہ ہر ایک کی ضروریات کے مطابق، نہ کہ خدمات کے تناسب سے!

اراضیات کا بندوبست

خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کیا تو جن چیزوں پر اس کی زندگی اور پرورش کا دارومدار تھا انہیں بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا —— "ساتھ ہی"، نہیں، بلکہ یوں کہئے کہ انسانوں کی پیدائش سے بھی بہت پہلے —— پانی، ہوا، روشنی، حرارت، سب انسان کی پیدائش سے بھی پہلے، دنیا میں بکھرے ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے بلا معاوضہ (بطورِ موہبت) عطا ہوئے تھے لیکن ان کے ساتھ، انسان کو خوراک کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے خزانے زمین (ارض) میں مدفون تھے اور زمین بھی خدا کی طرف سے بلامزدو معاوضہ عطا ہوئی تھی۔ شروع شروع میں دنیا میں انسانوں کی آبادی بہت کم تھی اور زمین کی قدرتی پیداوار اس کثرت سے کہ کسی کے دل میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھے بھوک لگی تو میں کھاؤں گا کہاں سے۔

اوّلین جنتِ ارضی

قرآنِ کریم نے انسانوں کی اس اوّلین زندگی کو "جنتِ ارضی" کہہ کر پکارا ہے جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا [2:35] جہاں کسی کو بھوک لگے اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ ذرا آگے بڑھے تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ زمین کھود کر (بذریعہ کاشت) اس کے اندر سے غذا برآمد کی جائے۔ اس سے انسانوں کی زرعی معیشت کا دَور شروع ہوا۔ زمین کھلی پڑی تھی۔ ہر شخص، یا ہر خاندان اور قبیلہ، اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اسے کاشت کر کے خوراک حاصل کر لیتا تھا۔

1۔ تفصیل میرے مقالہ "اسلامی سوشلزم" میں ملے گی۔

نظامِ سرمایہ داری کی ابتداء

کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں وہ دن سب سے زیادہ منحوس تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر لا دیا جو اُس سے زیادہ تھا جتنا وہ آقا اُس غلام پر صَرف کرتا تھا۔ اس سے ایک انسان دوسرے انسان کے لئے آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ اسی سے نظامِ سرمایہ داری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ وہ صنعتی دَور نہیں تھا کہ غلاموں کے مالک ان سے کچھ چیزیں بنوا کر اپنے لئے آمدنی حاصل کرتے۔ وہ زرعی معیشت کا دور تھا اس لئے وہ اپنے غلاموں سے زمین ہی کاشت کرا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے صاحبِ اقتدار لوگوں نے زمین پر لکیریں کھینچ کر ''میری زمین اور تیری زمین'' کا انسانیت کُش تصور وضع کیا۔ اس سے ''خدا کی زمین'' خدا کے بندوں کے لئے عام نہ رہی' انسانوں کی ملکیت بن گئی۔ قرآن نے اس انسانیت سوز تصور کا نہایت سختی سے اَبطال کیا اور زمین (یعنی سرچشمۂ رزق) پر ذاتی ملکیت کو انسانیت کے خلاف سنگین جرم قرار دیا۔ (تفصیل اس اجمال کی سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے)۔

قرآنِ کریم نے جو اصول دیا (کہ زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہئے تاکہ وہ اس کا انتظام اس طریق سے کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست مہیا ہوتا رہے) اسے اسلامی مملکت نے عمل میں لانا تھا۔ لیکن (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) انسانی معاشرہ میں اس قسم کی بنیادی تبدیلی شباشب نہیں لائی جا سکتی۔ اسے حالات کے تقاضے کے مطابق' بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے اس انقلاب کی ابتداء فرمائی۔ مکہ تو وادیٔ غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ زمین) تھی اس لئے وہاں زرعی اصلاحات کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہاں اسلامی مملکت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مدینہ میں انصار کے پاس زرعی زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات تھے' جن میں وہ کاشت کرتے تھے۔ اسی لئے اس انقلاب کی ابتداء وہاں سے ہوئی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ نے اصولی طور پر اعلان فرمایا کہ:

انّ الارض' ارض اللّٰہ۔ والعباد' عباد اللّٰہ۔ (ابوداؤد)

زمین بھی اللہ کی ہے اور انسان بھی اللہ کے بندے ہیں' اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

چونکہ زیرِ نظر کتاب کا اساسی موضوع عہدِ فاروقیؓ سے متعلق ہے' اس لئے ہم اس مقام پر ان اصلاحات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں حضور نبی اکرمؐ نے آہستہ آہستہ نافذ فرمایا۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ حضورؐ نے اس طریق کی ممانعت فرما دی جس کی رُو سے ایک شخص زمین کا مالک قرار پاتا تھا اور دوسرا شخص اس کی زمین میں کاشت کرتا تھا اور اس کے عوض مالکِ اراضی اس مزارع سے یا زمین کی پیداوار میں سے ایک حصہ (بٹائی) لے لیتا تھا' یا نقد کرایہ (پٹہ)۔ اسے اصطلاح میں مزارعت کہتے تھے جو ہمارے ہاں عام ہے (بلکہ یوں کہئے کہ مسلمانوں میں صدیوں سے مسلسل چلا آ رہا ہے)۔ حضورؐ نے اصولاً یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ:

جس شخص کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے[1] (مسلم۔ابوداؤد۔وغیرہ)

اس فیصلہ کی عملی تنفیذ کے سلسلہ میں ہمیں کتبِ احادیث میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابنِ ابی نعیمؓ کی روایت ہے کہ:

رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گزر اُدھر سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی۔ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین، صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔ (ابوداؤد)

حضورؐ کے اس فیصلہ کی تشریح میں نسائی میں یہ تصریح آئی ہے۔

رسولؐ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا۔

فرمایا، نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی، بھوسہ تو لے سکتا ہے۔ فرمایا بالکل نہیں۔

شام وعراق کی اراضیات کا مسئلہ

جس انقلاب کی اِبتداء اس طرح ہوئی تھی وہ عہدِ فاروقیؓ میں کئی منزلیں آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گیا تھا جہاں اراضیات کو مملکت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ یہ سوال اس وقت زیرِ غور آیا جب شام اور عراق کا علاقہ فتح ہوا۔ عراق میں دجلہ وفرات کی وادیاں صحیح معنوں میں زرخیز (سونا اُگلنے والی) تھیں۔ اس قسم کی، اس قدر وسیع اراضیات جب مفتوحہ قرار پائیں تو ان کی تقسیم کا سوال سامنے آیا۔ اس سے پیشتر مفتوحہ زمینوں کو بھی مالِ غنیمت قرار دیا جاتا تھا، اس لئے وہ سپاہیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اگر حضرت عمرؓ ان اراضیات کو بھی حسبِ دستورِ سابق، سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہتے تو اس کے لئے کسی غور وفکر اور بحث وتمحیص کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان کا خیال اس سے مختلف تھا اس لئے انہوں نے ضرورت سمجھی کہ اسے مجلسِ مشاورت میں پیش کیا جائے۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے — اس حیثیت سے بھی کہ اس میں، اُس فیصلہ کے خلاف فیصلہ کیا گیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں نافذ العمل تھا اور اس جہت سے بھی کہ معاشیات کے سلسلہ میں یہ ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق جو بحث ہوئی تھی، اُسے پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے جب ''غیر رسمی طور پر'' صحابہؓ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار فرمایا تو آپ نے دیکھا کہ جہاں اکثر صحابہؓ آپ سے متفق تھے، بعض کو اس سے اختلافات بھی تھا — اِن (مؤخر الذکر) میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ جیسے حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے، حضرت عمرؓ نے مجلسِ مشاورت کے سامنے اپنی تقریر میں فرمایا:

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ زمین کو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دیدے یا روکے رکھے۔ یہ آخری الفاظ بطورِ تہدید نظر آتے ہیں۔ اتنا بہرحال، واضح ہے کہ حضورؐ نے زمینوں کو بٹائی پر دینے یا فروخت کرنے سے منع کر دیا تھا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کردوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ اس میں ان کا کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آمدنی ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طبقہ میں منتقل ہوتی رہے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں بھی فساد کرنے لگیں گے۔

اس کی تائید میں حضرت علیؓ نے تقریر کی جس میں فرمایا:

میری رائے ہے کہ کاشتکاروں اور اراضی کو جوں کا توں رہنے دیجئے تاکہ یہ (اراضیات) سب لوگوں کے لئے یکساں معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔ (فوجوں میں زمین تقسیم کرنے سے یہ انہی میں سمٹ کر رہ جائے گی)۔

حضرت معاذؓ نے فرمایا:

اگر آپ نے زمینیں تقسیم کر دیں تو زرخیز زمینوں کے بڑے بڑے ٹکڑے فوج میں بٹ جائیں گے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد کسی کی وارث کوئی عورت ہوگی اور کسی کا وارث کوئی اکیلا مرد۔ اس کے علاوہ سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کے لئے حکومت کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لئے آپ کو وہ کام کرنا چاہئے جس میں آج کے لوگوں کے لئے بھی فائدہ اور سہولت ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی۔

اس تجویز کی مخالفت میں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے جو تقاریر فرمائیں، ان کا ملخص یہ تھا کہ:

جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہئے اسی طرح جس طرح رسولؐ اللہ نے خیبر تقسیم کر دیا[1]۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی اولاد کے لئے ہیں اور بعد والے اپنی اولاد کے لئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے، متعیّن طور پر پوچھا کہ

کیا یہ اراضی اور ان کے غیر مسلم مالک، اللہ نے ہمیں فتح کے نتیجہ میں نہیں دیئے۔

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

اے عبدالرحمٰن! بات وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں لیکن میں ان اراضیات کی تقسیم کے حق میں نہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب، میرے بعد، کوئی ایسا ملک فتح نہیں ہوگا جس سے مسلمانوں کو اتنا نفع حاصل ہو، جتنا اب تک ہو چکا ہے، بلکہ (یہ بھی ممکن ہے کہ) آئندہ فتح ہونے والے علاقے مسلمانوں پر بار ثابت ہوں۔ سوا گر شام اور عراق کی اراضیات

1۔ خیبر کی اراضی کے معاملہ میں بھی تاریخ میں بڑا الجھاؤ ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق عہدِ فاروقیؓ سے نہیں اس لئے ہم اسے زیرِ بحث نہیں لانا چاہتے۔

موجودہ مسلمانوں میں تقسیم کردی گئیں تو آئندہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے مال کہاں سے آئے گا اور آج کے بعد فتح ہونے والے علاقوں کے یتیم اور بیواؤں کی کفالت کیونکر کی جا سکے گی!

لیکن یہ حضرات اس پر بھی حضرت عمرؓ کی تجویز سے متفق نہ ہوئے۔ لہٰذا طے پایا کہ اس مسئلہ پر مجلسِ مشاورت کی آئندہ نشست میں غور کیا جائے۔ اس مجلس کی دوسری نشست میں انصار کے قبیلہ اوس وخزرج کے ممتاز عمائد کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں، مہاجرین کے مقابلہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس نشست کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا:

میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کس نے میری مخالفت کی ہے، نہ اس پر فخر کہ کس نے میری موافقت کی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں، اُسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے) اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

آپ نے یہاں تک فرمایا تھا کہ آوازیں آنے لگیں — ''اے امیر المومنین! ہمیں تسلیم ہے کہ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہی مناسب ہے''۔ حضرت عمرؓ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

آپ نے میرے ان دوستوں کی آوازیں سنی ہوں گی جو اس باب میں میری مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں شاید ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میرے نزدیک کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا جائز نہیں۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے آج تک کسی شخص کے جائز حق پر تصرف کر کے اس پر ظلم نہیں کیا۔ یہ حضرات خود گواہ ہیں کہ مالِ منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا حتیٰ کہ خمس بھی اُس کے مناسب موقعہ پر صَرف کر دیا ہے۔ اب سوال زمین کا ہے۔ اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ (اسے مملکت کی تحویل میں رہنے دیا جائے۔ اس کے انتظام کے متعلق میں نے سوچا ہے کہ) اسے موجودہ کاشت کاروں کے پاس رہنے دیا جائے اور ان سے خراج وصول کر لیا جایا کرے تاکہ یہ آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جا سکے اور اس کے ذریعے فوج کے اخراجات نیز موجودہ اور بعد میں آنے والی

نسلوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ آپ حضرات غور کیجئے کہ کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ آخر' جزیرہ' بصرہ' کوفہ' عراق' شام' مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں فوجیوں کی چھاؤنیاں نہیں بنانی پڑیں گی؟ آخران کا خرچ کہاں سے پورا کیا جائے گا؟

اس مقام پر دو قسم کی روایات سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے سورۂ حشر کی ان آیات سے جن کا ذکر اب کیا جائے گا' اسی مجمع میں استدلال فرمایا تھا جس پر تمام حضرات متفق ہو گئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہاں بھی اختلاف ہوا تو آپ نے مزید غور وفکر کے لئے تین دن کی مہلت طلب کی اور اس دوران میں قرآنِ مجید پر گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ تیسرے دن جب پھر مجلس کا انعقاد ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب اللہ پر مزید غور وفکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس سے اپنی تجویز کے حق میں راہنمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ حشر کی آیات (59:7-10) تلاوت فرمائیں اور کہا کہ دیکھئے' ان میں مالِ فَے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس میں

(1) مہاجرین کا حق ہے — مہاجرین میں' جنگ میں شرکت کرنے والوں اور شرکت نہ کرنے والوں میں کوئی تخصیص و تمیز نہیں کی گئی۔ صرف احتیاج (ضرورت مندی) کو شرط قرار دیا گیا ہے۔

(2) انصار کا حق ہے اور ان میں بھی مندرجہ بالا تفریق نہیں کی گئی۔

ان دونوں کے بعد کہا گیا ہے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ [59:10] اور ان لوگوں کا بھی حق جو ان کے بعد آئیں۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس قرآنی استدلال کو سن کر' صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے اور وہ (مخالفین و موافقین سب) جوشِ مسرت سے بیک زبان پکار اُٹھے کہ

آپ کی رائے بالکل درست ہے۔ ہم سب آپ سے متفق ہیں۔

اس طرح اس مشکل ترین اور اہم ترین معاملہ کا فیصلہ نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔

مستنبط نتائج

آگے بڑھنے سے پیشتر' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے جو اہم اصولی نتائج مستنبط ہوتے ہیں' ان پر غور کر لیا جائے — ان تاریخی واقعات کو سامنے لانے کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے۔ وہ اصولی نتائج یہ ہیں کہ:

(1) اسلامی نظامِ مملکت کی رُو سے' قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول تو ابدی طور پر غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان اصولوں کی جزئیات' اور ان پر عمل کرنے کے طریق' حالات کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ عہدِ فاروقیؓ کی اسلامی حکومت نے' اس اہم مسئلہ میں جو فیصلہ کیا وہ اس سے مختلف تھا جس پر عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں عمل ہوتا رہا۔ اس فیصلہ کے متعلق صحابہؓ میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ ایسا کرنا خلافِ سنت ہے اور اسے صحیح سمجھنا انکارِ رسالت ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی (نویں باب میں) بہ تفصیل بیان کیا جا چکا ہے' تاریخ میں اس قسم کی متعدد مثالیں مذکور ہیں جن کی رُو سے' حضرت عمرؓ نے اپنے سے پہلی حکومتوں کے فیصلوں میں تبدیلی کر دی اور بعض امور میں نئے فیصلے بھی دیئے۔ یہی طریق آج کی ''اسلامی حکومت'' بھی اختیار کرے گی' جو' جب اور جہاں بھی قائم ہوگی۔ یعنی وہ قرآنی اصولوں کی جزئیات کی تعیین میں صاحبِ اختیار ہوگی کہ اپنے زمانے اور حالات کے مطابق جس قسم کا جزئی قاعدہ چاہے' مرتب اور نافذ کر دے۔

(2) اس قسم کا فیصلہ کرنے کا حق کسی فرد کو حاصل نہیں ہوتا؛ حتیٰ کہ امیرلمومنین کو بھی (انفرادی حیثیت سے) نہیں۔ اس کا فیصلہ امت کی مجلسِ مشاورت میں بحث وتمحیص کے بعد ہوسکتا ہے۔

(3) مجلسِ مشاورت میں سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی دیگر ارکان جیسی ہوتی ہے اور ہر رکن کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(4) اختلافی امور کے فیصلہ کا معیار یہ ہے کہ خدا کی کتاب اس باب میں کیا راہنمائی دیتی ہے۔

(5) اس راہنمائی کے سامنے آ جانے پر' تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور مخالف' موافق سب اس کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور

(6) اسلامی حکومت میں ''علماء'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا جن سے اختلافی معاملات میں فتویٰ مانگا جائے۔ اس میں تمام امور کے فیصلے حکومت کرتی ہے اور انہی فیصلوں کو (جو قانون کی حیثیت سے نافذ کئے جاتے ہیں) ''شریعتِ اسلامی'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اراضیات کے متعلق مذکورہ بالا فیصلہ اصولی حیثیت رکھتا ہے' اس لئے اس کا اطلاق عراق اور شام کی زمینوں تک محدود نہیں رہا۔ مصر کی زمینوں پر بھی یہی فیصلہ نافذ کیا گیا۔ اس فیصلہ کا اعلان حضرت عمرؓ نے ان مختصر اور جامع الفاظ میں فرما دیا کہ

لنا قراب الارض تمام زمینیں ہماری (یعنی حکومت کی) ہیں۔ (کتاب الاموال)

زمینیں واپس بھی لی جاسکتی ہیں

اِسی بنا پر' حکومت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مفادِ عامہ (یعنی ربوبیتِ عامہ) کے پیشِ نظر' اراضیات کا جو انتظام مناسب سمجھے' کرے۔ قادسیہ (ایران) کی لڑائی میں' قوم بجیلہ کے کافی افراد جنگ میں شریک تھے۔ فتح کے بعد' حضرت عمرؓ نے وہاں کی زمینوں میں سے خاصا رقبہ ان افراد کو دے دیا لیکن دو تین سال کے بعد' جب حکومت کو ضرورت پڑی' تو ان سے یہ قطعات واپس لے لئے گئے (کتاب الاموال)۔ لوگوں کو جو رقبے اس طرح دیئے جاتے تھے انہیں قطائع کہا جاتا تھا۔ قطائع کے متعلق اصول یہ تھا کہ یہ کسی خاص مقصد (بالخصوص افتادہ زمین کو آباد کرنے) کے لئے دیئے جاتے تھے اور حکومت کو اس کا حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ جب مناسب سمجھے انہیں واپس لے لے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ جن لوگوں کو خود

رسولؐ اللہ نے قطائع عطا فرمائے تھے' مفادِ مملکت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے ان میں سے بعض کو واپس لے لیا۔ (مثلاً) رسولؐ اللہ نے وادیٔ عقیق میں ایک قطیعہ حضرت بلالؓ بن حارث کو' جو حضورؐ کے قریب ترین صحابہ میں سے تھے' دے رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ رسولؐ اللہ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہیں دی تھی کہ اسے نہ آپ خود آباد کریں' نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں۔ لہٰذا' جتنی زمین آپ آباد کرسکیں' اپنے پاس رکھیں' باقی زمین حکومت کے حوالے کر دیں۔ یہ سن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ جو زمین مجھے رسولؐ اللہ نے عطا فرمائی تھی میں اسے واپس نہیں کروں گا خواہ میں اُسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے زمین کی واپسی پر اصرار کیا اور آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر باقی زمین واپس لے لی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص زمین آباد نہیں کرے گا' اس سے وہ زمین واپس لے لی جائے گی[1]۔ جن لوگوں کے پاس زمین رہے گی ان سے حکومت مفادِ عامہ کے سلسلہ میں کیا لے گی' اس کے لئے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ:

حکومت صرف وہ لے سکتی ہے جو کاشت کار کی ضروریات سے زائد ہو۔

یہ فیصلہ' قرآنِ کریم کے اس اصول کی ترجمانی کر رہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کتنا دیں ـــــ قُلِ الْعَفْوَ ـــــ ان سے کہیں کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو' وہ سب'' (2:219)۔

چراگاہیں

اُس زمانے میں' مویشی پالنا' نظامِ معیشت میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس مقصد کے لئے چراگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے متعلق حضورؐ نے فرمادیا تھا کہ:

لا حمیٰ الا للّٰہ و رسولہ چراگاہیں صرف خلافت کی ہیں۔ (بخاریؒ)

حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ پہلی چراگاہوں کو مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھا بلکہ ان میں اضافہ بھی فرمایا۔ ان چراگاہوں کے متعلق تاکید تھی کہ ان میں غریبوں کے مویشی چریں چگیں۔ جن صاحبِ ثروت کے ہاں اپنا انتظام ہے' ان کے جانور ان ''پبلک چراگاہوں'' میں نہ آئیں۔ حضرت اسلمؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک کارندے ہنیؓ کو پبلک چراگاہ کا محافظ مقرر فرمایا اور اُسے تاکید کی کہ:

جو لوگ غریب ہیں' ان کے جانوروں کو یہاں چرنے دو۔ دیکھو (صاحبِ ثروت مثل) عثمانؓ بن عفان اور عبدالرحمٰن بن

1۔ زمین کو بے آباد رکھنا تو ایک طرف' مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں شیخ علاؤالدین سمنانیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص زمین کا ایسا قطعہ رکھتا ہے جس سے ہزار مَن غلہ حاصل ہوسکتا ہے' اگر اُس کی سستی اور کوتاہی سے اس سے نو سو مَن غلہ حاصل ہوا اور اس وجہ سے مخلوقِ خدا سو مَن غلہ سے محروم رہ گئی تو قیامت کے دن اس سے اس کی باز پرس ہوگی۔

عوفؓ کے اونٹ یہاں داخل نہ ہونے پائیں کیونکہ اگر ان کے جانوروں کو چارے کی ضرورت ہوگی تو ان کے لئے بہت سی کھیتیاں اور کھجوروں کے درخت موجود ہیں۔لیکن اگر غریبوں کے جانور بھوکے مرنے لگے تو وہ سوائے اس کے کہ میرے پاس واویلا کرتے ہوئے آئیں اور کیا کرسکیں گے۔

حضرت عمرؓ ان چراگاہوں کی حفاظت خود کیا کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ کسی نے ان کے گھاس' چارہ یا درختوں کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔

جب حضرت عمرؓ نے مدینہ کی چراگاہ کو سرکاری تحویل میں لیا اور اس پر نگران مقرر کردیئے تو ایک بدوی نے آ کر آپ سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ''اے عمرؓ! کیا ہم نے اسلام کی خاطر اس لئے لڑائیاں لڑی ہیں کہ آپ ان چیزوں کے استعمال پر ہماری نگرانی کریں''؟ اس پر آپ خفا ہوئے اور اس سے کہا کہ سُن رکھو!

مال اللہ کا مال ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں۔اس لئے میں ایسا نہیں کرسکتا (کہ انہیں ضرورت مندوں کے لئے مختص نہ کردوں)۔

پانی روکا نہیں جاسکتا

باقی رہے چشمے' سو ان کا پانی تو کوئی روک ہی نہیں سکتا تھا۔ایک دفعہ ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میری زمین تک پانی پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے لیکن جس شخص کی زمین سے وہ راستہ گزرتا ہے وہ مجھے اس میں سے پانی نہیں لے جانے دیتا۔آپ نے اس شخص کو بلایا اور اس سے ڈانٹ کر کہا کہ تجھے پانی کے لئے راستہ دینا ہوگا۔

یہ تو تیری زمین ہے اگر پانی کا راستہ تیرے پیٹ کے سوا کوئی اور نہیں ہوگا تو وہ تیرے پیٹ کے اوپر سے پانی لے جائے گا۔

مملکت کی آمدنی بے انتہا بڑھ گئی

بات اساساً اراضیات کی ہو رہی تھی۔آپ نے اراضیات کو مملکت کی تحویل میں لے کر ان کی سروے (پیمائش) کرائی۔ زمین کی حیثیت اور نوعیت کے اعتبار سے اس کی قسمیں مقرر کیں اور پھر اسی نسبت سے ان کا خراج (لگان) مقرر کیا۔اس حُسنِ انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت کے خراج میں محیر العقول اضافہ ہوگیا۔جب حضرت ابوہریرہؓ بحرین کا خراج لے کر آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا لائے ہو؟ انہوں نے کہا کہ پانچ لاکھ۔آپ نے کہا کہ کچھ جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو! حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ ایک لاکھ ایک لاکھ (اسے پانچ بار دہرایا)۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔نیند کا خمار ہے۔جاؤ جا کر بال بچوں میں سوؤ' صبح آنا۔یہ صبح گئے تو پانچ لاکھ پیش کردیئے۔یہ ایک علاقہ کا خراج تھا! اس سے مملکت

کی کل آمدنی کا اندزہ لگا لیجئے۔

لیکن مملکت کی اس قدر مرفہ الحالی' صرف حُسنِ انتظام کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ (بلکہ بنیادی طور پر اس میں) سربراہِ مملکت کی دیانت وامانت بھی شامل تھی۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کس حد تک متشدد تھے' اس کا اندازہ ہم ان واقعات سے لگا سکتے ہیں جو گزشتہ ابواب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت ہم ان میں صرف ایک واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عمرؓ کے پاس تھوڑا سا دودھ لائے جسے پی کر آپ خوش ہوئے۔ اس سے پوچھا کہ یہ دودھ تم کہاں سے لائے ہو۔ اس نے کہا کہ فلاں چشمہ پر صدقہ (بیت المال) کے اونٹ جمع تھے اور نگران ان کا دودھ دوہ رہے تھے۔ اس میں سے انہوں نے مجھے بھی دے دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حلق میں انگلی ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا اور فرمایا کہ بیت المال سے کچھ بھی بلا قیمت لینا جائز نہیں قرار پا سکتا۔

سربراہِ مملکت کی اپنی اس احتیاط کا نتیجہ تھا کہ دیگر عمالِ حکومت بھی اس قدر امین اور دیانتدار تھے اور اسی امانت و دیانت کے ساتھ حُسنِ انتظام کا نتیجہ تھا کہ مملکت میں زرّ و مال کی اس قدر فراوانی تھی۔

وظائف کا تعین

لیکن مملکت میں زرّ و مال کی فراوانی مقصود بالذّات نہیں تھی' یہ ایک عظیم مقصد کا ذریعہ تھی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ''ایتائے زکوٰۃ'' (22:41) ہے۔ یعنی (ابتداء) افرادِ معاشرہ (اور آخرالامر عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا' ذرائعِ پیداوار کو مملکت کی تحویل میں لینا اور دیگر وسائلِ آمدنی میں نظم وضبط پیدا کرنا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا مملکت کے لئے اس عظیم ذمہ داری سے عہد برا ہونے کا موجب ہے۔ جو مملکت اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتی اس کے لئے ذرائعِ پیداوار کو اپنی تحویل میں لینا تو ایک طرف' کسی فردِ معاشرہ سے ایک حبّہ تک وصول کرنا بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کا پورا کرنا' مملکت کے حالات کی نسبت سے ہی ہو سکتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے جب اس مملکت کی بنیاد ڈالی تو کیفیت یہ تھی کہ ملک میں افلاس اور غربت کا دور دورہ تھا اور مملکت کی آمدنی نہ ہونے کے برابر۔ یہ تھے وہ حالات جن میں حضورؐ کے لب پر اکثر اس قسم کی دعائیں رہتی تھیں کہ:

پرودگار! یہ بھوکے ہیں تو اُنہیں پیٹ بھر کر کھلا۔
یہ ننگے ہیں' تو اُنہیں کپڑے پہنا۔
یہ پیدل سفر کرتے ہیں' تو اُنہیں سواری عطا فرما۔

صدقہ کا نفسیاتی اثر

ظاہر ہے کہ ان دعاؤں سے مقصد یہ تھا کہ مملکت کو اس قدر فراوانی حاصل ہو جائے کہ وہ ان محتاجوں اور ناداروں کی تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے قابل ہو جائے۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس پروگرام کی منزلِ اوّل میں' یہ ضروریات' انفرادی طور پر' خوشحال لوگوں کے عطیات (صدقات) کی رُو سے پوری ہوتی تھیں لیکن انفرادی خیرات و صدقات کا جو نفسیاتی اثر ہوتا ہے' نگہِ رسالتؐ اس سے بے خبر نہیں تھی — آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ **الصّدقه تميت القلب** — صدقہ و خیرات انسان کے قلب کی موت ہیں۔ اسی لئے آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ ''کسی کا اپنی پشت پر بوجھ لادنا بہتر ہے اس سے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے'' (بخاری کتاب الزکوٰۃ)۔ بنابریں' حضورؐ نے کوشش فرمائی کہ حاجت مندوں کی ضروریات' انفرادی خیرات کے بجائے' حکومت کی طرف سے پوری ہوا کریں۔ اس مقصد کے لئے آپؐ نے وظائف کا سلسلہ شروع فرمایا۔ وظائف کے تعین کے لئے حضورؐ نے اصول کیا اختیار فرمایا تھا' اس ضمن میں علامہ ابن القیم (زادالمعاد میں) لکھتے ہیں کہ:

> حضورؐ دولت مندوں اور غریبوں کو برابر برابر نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم فرماتے تھے۔ آپؐ ضرورت کے مطابق عطا فرماتے تھے۔ یعنی کنواروں کی شادی کرتے تھے' مقروضوں کا قرض ادا کرتے تھے اور غریبوں کو بقدرِ حاجت دیتے تھے۔

ہر ایک کی ضرورت کے مطابق

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عہد میں' مملکت کی آمدنی میں وسعت ہوئی تو آپ نے وظائف کے سلسلہ کو بھی اُسی نسبت سے آگے بڑھایا اور اصول بھی وہی برقرار رکھا جسے رسول اللہؐ نے اختیار فرمایا تھا یعنی کسی قسم کی تخصیص و تمیز کے بغیر' ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔ اس پر بعض صحابہؓ نے (جن میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بھی شامل تھے) اعتراض کیا اور کہا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی' اس کی خاطر اس قدر تکلیفیں برداشت کیں' ہجرت کی' جہاد کئے' ان کے ساتھ ترجیحی سلوک ہونا چاہیے۔ صدیقِ اکبرؓ نے ان کے جواب میں جو کچھ فرمایا' وہ اربابِ بصیرت کے لئے ابدی مشعلِ ہدایت ہے۔ آپ نے کہا کہ

> آپ لوگوں نے ان حضرات کی جس اولیّت و افضلیّت کا ذکر کیا ہے' میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ انہیں اس کا اجر ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا لیکن یہ معاش کا معاملہ ہے جس میں ترجیحی سلوک کے بجائے اصولِ مساوات تقاضائے عدل ہے۔ یعنی بلا تخصیص ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔ (کتاب الاموال۔ ابی عبید)

اس کے خلاف اعتراض

آپ اس دلیل پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کی محکمیت کس طرح ذہنوں میں سکون اور دلوں میں سرور پیدا کرتی ہے۔ لیکن' اس کے ساتھ ہی جب ہم صحابہ کرامؓ کے اعتراض پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک ثانیہ کے لئے رُکنا پڑتا ہے' بالخصوص جب ہم ان میں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی دیکھتے ہیں جن کی قرآنِ کریم کے نظامِ ربوبیت پر اس قدر گہری نگاہ تھی۔ اِس وقت یہ اعتراض ''معصوم'' سا نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس سے' اُس تاریخ نے' جو ہمارے دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھی' ایک بنیادی اینٹ رکھی تھی جس پر نظامِ سرمایہ داری کی بلند عمارت تعمیر کرنی مقصود تھی۔ تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ دید ہے کہ اس نے ''زکوٰۃ'' کی سرمایہ دارانہ تعبیر کے لئے بھی حضرت عمرؓ ہی کو منتخب کیا کہ وہ حضورؐ تک صحابہؓ کا اعتراض پہنچائیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اور اب وظائف کے اصول کے خلاف اعتراض کرنے والوں کی فہرست میں بھی انہیں شامل کر دیا گیا ہے۔

مَردم شُماری

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں مملکت کی آمدنی اتنی کثیر نہیں تھی اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وظائف کا سلسلہ عالمگیر نہیں ہو سکا تھا۔ عہدِ فاروقیؓ میں مملکت کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو آپ نے فیصلہ کیا کہ وظائف کا سلسلہ عام کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مردم شماری کرائی۔ اس مردم شماری پر تبصرہ کرتے ہوئے' مشہور جرمن مستشرق فان کریمر لکھتا ہے کہ:

> یوں تو مردم شماری قدیم ایشیائی سلطنتوں میں بھی کی جاتی تھی اور سلطنتِ روما میں بھی' لیکن اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی فردِ حکومت کے ٹیکس سے بچنے نہ پائے۔ (حضرت) عمرؓ نے جو مردم شماری کرائی تو اس سے مقصد کچھ اور تھا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ کوئی فرد اپنے اس حق سے محروم نہ رہنے پائے' جو از رُوئے اسلام' مملکت کے ذمے واجب تھا۔[1]

وظائف کا ترجیحی معیار

ان اعداد و شمار اور احوال و کوائف کے مطابق آپ نے مختلف فہرستیں مرتب کرائیں اور انہیں وظائف کے رجسٹروں میں درج کیا۔ (روایات کی رُو سے) آپ نے وظائف کے تعیّن میں' ترجیحی سلوک کا اصول اختیار کیا اور ترجیح کے لئے دو معیار مقرر کئے۔ (i) رسولؐ اللہ سے قرابت داری۔ اور (ii) مسابقت فی الاسلام۔

مسابقت فی الاسلام کی بنا پر مدارج میں اختلاف خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کی تائید میں یہی دلیل پیش کی تھی۔ اس حد تک اس باب میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن ان مدارج کو معاش کی تقسیم کا معیار قرار دینا (اگر یہ

---

1. ORIENT - UNDER CALIPHS. (بحوالہ اسلام کے معاشی نظریئے' از یوسف الدین)

روایت صحیح ہے تو) آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔اس کا جواب وہی تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیا تھا(اور جو اوپر گزر چکا ہے)۔

قرابت داری کا معیار

لیکن حسب ونسب کی بنا پر مدارج کا تعین تو قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔اس نے یہ کہہ کر کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا [46:19] ''ہر ایک کا درجہ اس کے اعمال کے مطابق ہے'' اور اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [49:13] ''تم میں سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (کیریکٹر میں بلند) ہے'' حسب ونسب کے بُت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔اور یہ قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسالتؐ کا وہ امتیازی کارنامہ ہے جسے ہم دنیا کے سامنے (بجا طور پر) نہایت فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔بنابریں' ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہو سکتے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا اصول اختیار کیا ہوگا۔واضح رہے کہ ہم حضرت عمرؓ (یا کسی اور انسان) کو منزّہ عن الخطا تصور نہیں کرتے۔منزّہ عن الخطا تو صرف وحیٔ خداوندی ہو سکتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرآنِ کریم کے کسی اصول کی عملی تعبیر و تشکیل میں اجتہادی غلطی ہو جانا اور بات ہے لیکن یہ چیز کہ دست پروردگانِ رسالت مآبؐ (صحابہ کبارؓ) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف کوئی اقدام کریں' اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔اگر کسی معاملہ میں تاریخ ایسا بیان کرتی ہے' تو وہ یقیناً تاریخ کی غلطی ہے۔یہ بات کہ قُربِ رسالتمآبؐ کی بنیاد مسلمانوں کے اعمال ہیں نہ کہ نسبی تعلق' خود حضرت عمرؓ کی اس روایت سے بھی واضح ہے جو تعینِ وظائف ہی کے سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ سے قرابت داری کی بنا پر وظائف کے تعین کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے اہلِ قبیلہ بنوعدی آپ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے خود اپنا نام وہیں کیوں نہیں رہنے دیا جہاں رسول اللہؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے رکھا تھا۔اس پر آپ نے انہیں غصب آلود نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا:

> اے بنوعدی! تم چاہتے ہو کہ میری پشت پر سوار ہو کر کھاؤ اور تمہاری وجہ سے میری نیکیاں برباد ہو جائیں۔ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔جب تمہارا نمبر آئے گا تب ہی نام لکھا جائے گا......خدا کی قسم! ہمیں دنیا میں جو عزت ملی ہے اور ہم آخرت میں اپنے عمل کے بدلے اللہ کے جس ثواب کے امیدوار ہیں' وہ سب محمد رسول اللہؐ کا صدقہ ہے۔اس لئے آپؐ ہی ہمارا شرف ہیں' اور آپؐ کی قوم اشراف العرب! اس کے بعد جو ان سے قریب ہیں پھر وہ جو اُن سے قریب ہیں۔

اس کے بعد (اسی روایت میں ہے کہ) آپ نے ان سے کہا کہ

> (اپنے نسب کی طرف نہ جاؤ) یاد رکھو! اگر اہلِ عجم ہم سے عمل میں بڑھ گئے تو وہ قیامت کے دن ہماری نسبت رسول اللہؐ سے زیادہ قریب ہوں گے۔لہٰذا' تم میں سے کوئی شخص حسب نسب پر نگاہ نہ رکھے۔جو اعمال اللہ کے ہاں مقبول ہیں' وہی کرنے چاہئیں کیونکہ جس کا عمل کوتاہ ہوگا اس کا نسب اُسے نہ بڑھا سکے گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس (ایک ہی) روایت میں دو متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ایک یہ کہ مدارج کا معیار انسان کے اعمال

ہیں نہ کہ حسب ونسب۔ جس کے اعمال اچھے ہوں گے' وہی رسول اللہؐ سے زیادہ قریب ہوگا' جس کے اعمال کوتاہ ہوں گے اس کا نسب اُسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد قرآنی تعلیم اور عملِ رسول اللہؐ کے عین مطابق ہے' لہٰذا روایت کا اتنا حصہ یقیناً قابلِ قبول ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ — یعنی شرف کا معیار رسول اللہؐ سے نسبی تعلق ہے — قرآنی اصول اور اسوۂ رسولؐ کے خلاف ہے اس لئے اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی اصول کے مطابق' بلال حبشیؓ (جو السابقون الاولون میں سے تھے) رسول اللہؐ سے زیادہ قریب تھے' بہ نسبت حضورؐ کے حقیقی چچا (حضرت) عباسؓ کے جو ہجرت' بلکہ جنگِ بدر کے بعد اسلام لائے تھے۔ اسلام نے حسب ونسب کی انسانیت سوز تمیزوں کو ختم کر کے' کس طرح مساواتِ انسانیہ کا عَلَم بلند کیا' اس کی سب سے اہم شہادت' حضورؐ کا حجۃ الوداع کا وہ خطبہ ہے جس میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ

الا! لا فضل العربی علی العجمیٰ ولا العجمی علیٰ عربی. ولا الاحمر علیٰ اسود. ولا الا سود علیٰ احمر. الا بالتقویٰ (مسند احمد)

لوگو! آگاہ رہو کہ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر' سرخ کو سیاہ پر سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں بجز تقویٰ کے۔

آپؐ نے اپنے اہلِ خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو اعلانیہ کہہ دیا کہ

اے اہلِ قریش! اپنے لئے خود سامان تیار کرو۔ میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ کام نہیں آ سکوں گا۔ اے بنی عبدِ مناف! میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔ اے عباس ابنِ مطلب! میں اللہ کے حضور تمہارے ذرّہ برابر کام نہیں آ سکوں گا۔ اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے رسولؐ کی پھوبھی صفیہؓ! اپنے لئے کچھ کر لو۔ میں خدا کے حضور تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ (متفق علیہ)

معاشی تقسیم کے معاملہ میں بھی آپؐ نے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ سے' جو آپ کو سب سے زیادہ عزیز تھے' فرمایا کہ

یہ نہیں ہو سکے گا کہ میں تمہیں کچھ دوں اور اہلِ صُفّہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ بھوک کے مارے ان کے پیٹ چپکے جا رہے ہوں۔ (مسندِ احمد)

دوسرے مقام پر آپؐ نے ان سے فرمایا کہ

یہ نہ ہوگا کہ میں تمہاری خدمت کروں اور اہلِ صُفّہ کو فاقہ کشی کے لئے چھوڑ دوں۔ (ایضاً)

اس سے واضح ہے کہ حضورؐ کے رشتہ داروں سے' محض اس بنا پر کہ وہ حضورؐ کے قرابت دار ہیں' کوئی ترجیحی سلوک خود حضورؐ کی تعلیم اور مسلک کے خلاف ہے۔ اور تقسیمِ رزق کے معاملہ میں آپؐ نے بہ صراحت فرما دیا کہ اس کا معیار ''ضرورت'' ہے نہ کہ قرابت داری۔

وظائف کی مقدار

بہرحال، (تاریخ کے بیان کے مطابق جسے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، صحیح تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہے) حضرت عمرؓ نے ترجیحی سلوک کے معیار کے مطابق وظائف کا تعین کیا۔ ان کی مقدار کے متعلق روایات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن بہ ہیئتِ مجموعی، آپ نے حضورؐ کی ازواجِ مطہراتؓ (اُمہات المومنینؓ) کو بارہ بارہ ہزار درہم دیئے۔ حضرت عباسؓ کو حضورؐ سے ان کی قرابت کی بنا پر، پانچ ہزار درہم۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور آپ کے صاحبزادگان حضرت حسنؓ و حسینؓ کے لئے بھی پانچ پانچ ہزار مقرر فرمائے۔ جو صحابہؓ، رسولؐ اللہ کے زیرِ لوا، ابتدائی جنگوں میں شریک ہوئے تھے، انہیں چار چار ہزار عطا فرمایا۔ فتحِ مکہ سے پہلے، ہجرت کرنے والوں کو تین تین ہزار اور فتحِ مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کے لئے دو دو ہزار مقرر کئے۔ باقی لوگوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا۔ وظیفہ سے کوئی بھی محروم نہ رہا۔

یہاں تک تو معیارِ مدارج تھا لیکن نوزائیدہ بچوں کے سلسلہ میں معیار، ضرورت تھا۔ چنانچہ آپ نے ہر نومولود کے لئے سو درہم مقرر کئے (جو اس کے یومِ پیدائش سے شروع ہوجاتے تھے) اور جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا وظیفہ میں اضافہ ہوتا جاتا تاآنکہ وہ سنِ بلوغ پر پہنچ کر، عام معیار کے مطابق وظیفہ حاصل کرلیتا۔ لاوارث بچوں کی نگہ پرداخت مختلف گھرانوں کے سپرد کر دی جاتی اور ان کا وظیفہ بھی دوسرے بچوں کی طرح مقرر کردیا جاتا۔

عیال داری کا بوجھ کس قدر باعثِ پریشانی ہوتا ہے، اس کا آپ کو خود احساس تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ سب سے بڑی مصیبت کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کم مال اور کثرتِ عیال۔
آپ کے اس احساس کے پیشِ نظر بھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ آپ نے وظائف کے تعیّن میں ''عیال کے بوجھ'' کے بجائے مدارج کے ترجیحی سلوک کو معیار قرار دیا ہوگا۔

اپنے بیٹے پر فوقیت

(تاریخ کا بیان ہے کہ) آپ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا اور اپنے بیٹے عبداللہؓ بن عمرؓ کا تین ہزار۔ بیٹا شکایت لے کر باپ کے پاس پہنچا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں نے اُسے، تم سے زیادہ وظیفہ اس لئے دیا ہے کہ ''رسولؐ اللہ اُسے تم سے اور اس کے باپ کو تمہارے باپ سے زیادہ چاہتے تھے''۔

وظائف خود تقسیم کرتے تھے

تقسیمِ وظائف کے معاملہ میں آپ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حزام بن ہشام کعبیؓ، اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ (انہوں نے کہا) کہ ''میں نے عمر ابنِ خطابؓ کو دیکھا کہ خزاعہ کا رجسٹر لئے جارہے تھے۔ قدید پہنچ کر

انہوں نے ہر شادی شدہ عورت اور دوشیزہ لڑکی کو بلایا اور اس کا وظیفہ اپنے ہاتھ سے اُسے دیا۔ وہاں سے عسفان پہنچے اور اسی طرح ایک ایک کا وظیفہ اُسے پہنچا دیا‘‘۔ یعنی حضرت عمرؓ مدینہ اور اس کے اطراف کی بستیوں میں وظائف خود پہنچاتے تھے اور دوسرے شہروں میں اپنے عمال کے ذریعے تقسیم کراتے جنہیں احتیاط برتنے کی سخت تاکید تھی۔

خوراک کا معیار

یہ نقد وظائف‘ خوراک کے علاوہ تھے جو ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ فی کس کس قدر خوراک دی جائے‘ آپ نے (اپنے معمول کے مطابق) عملی طریق اختیار فرمایا۔ آپ نے ایک جریب آٹا پکوا کر لوگوں کو اپنے سامنے کھلایا۔ اس سے تیس آدمی سیر ہو گئے۔ پھر اسی طرح شام کو پکوا کر کھلایا اور جب اطمینان کر لیا کہ اتنا آٹا کافی ہوتا ہے تو اس کے مطابق ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا۔ اسی کے مطابق آپ نے اپنے عمّال کو بھی ہدایات بھیجیں اور اس کے ساتھ ہی تاکید کر دی کہ ’’لوگوں کی خوراک ان کے گھر پر پہنچاؤ اور اتنا دو جس سے ان کا اور اُن کے بچوں کا خوب گزارہ ہو جائے۔ یاد رکھو! مُٹھی مُٹھی دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں ہو سکتے‘‘ — اخلاق کا معاش سے کس قدر گہرا تعلق ہے‘ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کی ہدایات کے آخری الفاظ سے لگ سکتا ہے۔

تاریخ سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ افرادِ معاشرہ کے وظائف اور راشن مقرر ہو جانے کے بعد معاشرہ کا کاروبار کس نہج سے چلتا تھا‘ لیکن جب ہم‘ قرآن کی رُو سے مملکت کی ذمہ داری اور اس کی عملی شکل کے لئے حضورؐ کا وہ ارشادِ گرامی سامنے رکھیں جس کا ملخص یہ تھا کہ ہر کام کرنے والے کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے تو اُس معاشرہ کا نقشہ اصولی طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی مملکت نے تمام افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری لے کر‘ انہیں معاشی پریشانیوں سے فارغ کر دیا کہ وہ اپنے اپنے فرائضِ مُفَوّضہ (یعنی جو کام اُن کے سپرد کیا گیا ہے) کی بجا آوری پورے اطمینان سے کر سکیں۔ اِسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ہدایات جاری کر دی تھیں کہ اس کے بعد‘ عمّالِ حکومت‘ اپنے لئے کوئی اور ذریعہ رزق تلاش اور اختیار نہ کریں۔

مزید ذرائعِ آمدنی کو بند کر دیا

اسی سلسلہ میں علامہ جوہری طنطاویؒ لکھتے ہیں کہ:

> جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مال کی کثرت ہوئی تو آپ نے رجسٹر بنوائے اور تمام سرکاری ملازمین اور قاضیوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے مال جمع کرنے سے روک دیا اور مسلمانوں پر اراضی بطور جائیداد رکھنا اور کاشت کاری کرنا یا کرانا‘ حرام قرار دے دیا کیونکہ ان کے اور ان کے اہل وعیال کے معاش کا بندوبست بیت المال سے کر دیا گیا تھا۔ (نظام العالم والأمم۔ جلد نمبر 2)

اس معیار کے مضر اثرات

حضرت عمرؓ نے بنابر احتیاط، اس قسم کی ہدایات نافذ فرمائیں لیکن تقسیمِ وظائف کا جو اصول اختیار کیا تھا ان ہدایات سے ان کے مضرت رساں نتائج تو برآمد ہونے سے نہیں رُک سکتے تھے۔ قرآن کے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فاضلہ دولت (SURPLUS MOENY) جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے کسی کے پاس نہ رہے۔ ''وظیفہ مطابقِ ضرورت'' کے اصولِ مساوات[1] کی رُو سے کسی کے پاس فاضلہ دولت نہیں رہتی اور اس طرح قُلِ الْعَفْوَ (زائد از ضرورت مال اپنے پاس نہ رکھنے) کے ارشادِ خداوندی پر خود بخود عمل ہوتا رہتا ہے لیکن جب وظائف کا معیار یہ نہ رہے تو پھر، جن لوگوں کو ان کی ضروریات سے زیادہ ملے گا ان کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جائے گی۔ اس خدشہ کی طرف حضرت عمرؓ کی توجہ بھی مبذول کرائی گئی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے حالات دریافت کیے تو انہوں نے کہا کہ

> امیر المومنین! لوگ آپ کو دعائیں دیتے ہیں جو آپ نے ان کے لئے اس قدر وظائف مقرر کر دیئے اور راشن عطا فرما دیا لیکن بعض گھرانے ایسے ہیں جو کھانا بہت کم کھاتے ہیں اور بعض زیادہ کھاتے ہیں۔ سو جو لوگ کم کھاتے ہیں (یعنی ان کے اخراجات کم ہیں) تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ زیادہ کھا کر اپنا وظیفہ وغیرہ ختم کر دیں گے؟

العذریؔ نے بات واضح کر دی کہ جن لوگوں کو ان کے اخراجات سے زیادہ وظیفہ ملتا ہے وہ زائد مال کو کیا کریں؟ وہ اسے خرچ تو کر نہیں سکیں گے۔

آپ نے جواب دیا کہ یہ ان کا حق ہے جو میں نے انہیں پہنچا دیا۔ اگر کسی کے پاس رقم بچ جاتی ہے تو اُسے روکا تو نہیں جا سکتا۔ وہ اس سے کچھ بکریاں خرید لے اور مویشی پالے اور اس طرح کچھ رقم جمع کر لے۔ شاید میرے بعد ایسے والی آئیں جو وظائف بند کر دیں تو یہ اندوختہ اُس وقت اُن کے کام آئے گا۔

یہ اُس مشکل کا حل نہیں تھا جس کی طرف العذریؔ نے اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس طرح لوگوں کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جائے گی اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔

فاضلہ دولت کی کیفیت یہ تھی کہ جب امّ المومنین حضرت زینبؓ کا وظیفہ ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے رقم دیکھ کر فرمایا کہ میں اتنی خطیر رقم کو کیا کروں گی۔ میری کئی بہنیں اس کی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں، یہ انہیں دے دینا چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے اسے اپنے ان عزیزوں میں بانٹ دیا جنہیں زیادہ ضرورت تھی۔

1۔ ''اصولِ مساوات'' سے مراد یہ نہیں کہ ہر شخص کو وظیفہ (یا سامانِ رزق) یکساں ملے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انفرادی خصوصیات و امتیازات سے قطعِ نظر، سامانِ رزق ہر ایک کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں زمینوں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی (زمین سب مملکت کی تحویل میں تھی)۔ اس لئے زائد از ضرورت روپے سے نہ زمین خریدی جاسکتی تھی' نہ جائیدادیں بنائی جاسکتیں۔ البتہ بعض لوگوں نے اس سے تجارت شروع کر دی تھی۔

غلطی کا احساس

وظائف کا یہ نظام 20ھ میں شروع ہوا تھا۔ دو ہی سال کی قلیل مدت میں جب اس کے مضرت رساں نتائج سامنے آنے شروع ہوئے تو (روایات کے مطابق) حضرت عمرؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ازالہ کے لئے آپؓ نے فرمایا کہ:

(1) جب مجھے اپنے پہلے فیصلہ پر نظرِ ثانی کا موقعہ ملا تو میں دولت مندوں سے ان کی فاضلہ دولت لے کر حاجتمندوں میں تقسیم کر دوں گا۔

(2) اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو سارے ملک کا دورہ کروں گا اور وظائف کا اصول' حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح مساوات پر مبنی کر دوں گا۔

(3) اس مساوات میں یہ نہیں کروں گا کہ بلند لوگوں کو پست لوگوں کی سطح پر لے آؤں بلکہ پست لوگوں کو بلند لوگوں کی سطح پر لے جاؤں گا اور اس طرح آخری آدمی کو پہلے آدمی سے ملا دوں گا۔ اور

(4) یہ کچھ اس طرح کروں گا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جس تک گھر بیٹھے اس کا رزق نہ پہنچ جائے' اگرچہ اس نے کوئی کام بھی نہ کیا ہو اور کوئی مشقت بھی نہ اٹھائی ہو (یعنی جہاد وغیرہ میں شرکت کی شرائط بھی اٹھا دی جائیں گی اور معیار صرف ضروریات قرار دے دیا جائے گا)۔

لیکن اس ''اگلے سال'' کے آنے سے پہلے ہی آپ کی شہادت ہو گئی اور یہ خوں گشتہ آرزوئیں حسرت بن کر رہ گئیں۔

عہدِ عثمانیؓ میں نتائج سامنے آ گئے

ہم اس کتاب کو عہدِ فاروقیؓ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن تاریخ کا بیان ہے کہ تعیینِ وظائف سے متعلق حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے اثرات عہدِ عثمانیؓ میں جا کر نمودار ہوئے' اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ تاریخ نے اس عہد کے متعلق جو کچھ کہا ہے' اسے بھی سامنے لے آئیں۔ اس ضمن میں سیّد قطب (مرحوم) اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام' میں لکھتے ہیں:

(حضرت) عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت عمرؓ کے دونوں ارادوں میں سے ایک کو بھی عملی جامہ نہ پہنایا۔ جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد دولت جمع ہو گئی تھی' اُسے بھی واپس نہ لیا اور وظائف بھی اُسی ترجیحی سلوک کے مطابق

تقسیم کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں' بلکہ اُنہوں نے وظائف میں اور بھی وسعت کر دی؛ چنانچہ دولت مندں کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ضرورت مندوں کی تنگی بسا اوقات بڑھتی گئی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے انہی دولت مندوں کو بڑے بڑے انعامات وعطایا سے نوازا۔ پھر قریش کو اس کی بھی اجازت دے دی کہ وہ دوسرے ممالک میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں[1] اور ان کے جو مال بیکار پڑے ہوئے ہیں انہیں تجارت میں لگا سکتے ہیں۔ سب سے آخر' انہوں نے ان دولت مندوں کے لئے اسے بھی مباح (جائز) قرار دیا کہ وہ سواد غیر سواد' جس علاقے میں چاہیں' زمینیں اور جائیدادیں خرید سکتے ہیں۔ اس سے جاگیرداری کا نظام' اسلامی اجتماعیت پر مسلط ہونا شروع ہو گیا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) اپنی کتاب' الفتنۃ الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ:

> جب فساد زیادہ بڑھ گیا تو اُسے روکنے کے لئے (حضرت عثمانؓ) نے ایک ''اختراع'' کی جس کے نتائج ان کی منشاء کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔ ان کی اختراع یہ تھی کہ سوائے ان لوگوں کے جن کا کسی خاص شہر میں رہنا مملکت کے تقاضا کے لئے ضروری ہو (مثلاً فوج کے افراد)' باقی لوگ جس جگہ چاہیں قیام کر سکتے ہیں۔ وہ جہاں جائیں گے ان کی جائیداد وہیں منتقل کر دی جائے گی۔ مدینہ والوں نے (حضرت) عثمانؓ کی اس ''اختراع'' کو سنا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ آپ ان لوگوں کی جائیدادوں کو دوسری جگہ کیسے منتقل کر دیں گے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ یہ اس طرح کہ ہم ان جائیدادوں کو خرید لیں گے اور اس کی قیمت سے یہ لوگ جہاں چاہیں اور جائیدادیں خرید سکیں گے۔ مدینہ والے بہت خوش تھے کہ خدا نے ان پر ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے جو ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ لوگ دوسرے مقامات میں بسنے کے لئے منتشر ہو گئے۔ (بحوالہ طبری 30ھ)

نظامِ جاگیرداری کی ابتداء

اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ

> یہ چیز حجاز وعراق تک ہی محدود نہ رہی بلکہ تمام بلادِ عرب اور مفتوحہ علاقوں تک پھیل گئی اور ہر طرف بڑی بڑی جاگیرداریاں اور وسیع وعریض زمینداریاں قائم ہو گئیں۔ اس طرح اسلام میں ایک نئے طبقہ نے' جو بلوتقراطیہ (PROLETARIAT) کہلاتا ہے' جنم لے لیا۔

تاریخ کے متعلق ہمارا مسلک

یہ ہے اس تاریخ کا بیان جو اُس دور (عہدِ عباسیہ) میں مرتب ہوئی جب ملوکیت اور اس شجرۃ الزقوم کی مختلف شاخیں —— سرمایہ داری' زمینداری' جاگیرداری' طبقاتی امتیازات وغیرہ —— مسلمانوں کے معاشرہ پر مسلط ہو چکی تھیں۔ اس تاریخ کے

1۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ دوسرے ممالک میں سکونت اختیار نہ کریں۔

متعلق ہم اپنا موقف و مسلک ایک سے زیادہ بار واضح کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ:

(1) قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں صحابہ کرامؓ (مہاجرین و انصار) کو ''مومنِ حقّا'' قرار دیا اور ان کی مغفرت کا اعلان کیا ہے۔

(2) لہٰذا' اگر تاریخ میں کوئی ایسی بات ان حضرات کی طرف منسوب ہے جو ایک ''مومنِ حقّا'' کی خصوصیات کے خلاف ہے تو ہم اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ کوئی بات جو قرآنِ کریم کی شہادت کے خلاف جاتی ہے' کسی مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ہمارا ایمان خدا کی کتاب پر ہے' تاریخ پر نہیں۔

نظامِ سرمایہ داری کو (جس میں زمینداری' جاگیرداری سب شامل ہیں) قرآنِ کریم نے انسانیت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم اسے مٹانے کے لئے آیا تھا' نہ کہ مسلّط و مستحکم کرنے کے لئے۔ لہٰذا' اگر تاریخ میں صحابہ کبارؓ (اور خلفائے راشدینؓ کا مرتبہ تو ان میں اور بھی بلند ہے) کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جاتی ہے جس سے نظامِ سرمایہ داری کے قیام اور اِستحکام کی نشاندہی ہوتی ہو' ہم اسے بلا تأمل مسترد کر دیں گے ــــ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم کے کسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے طریقِ کار میں کوئی اجتہادی غلطی ہو جانا' اور بات ہے لیکن خود قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف' علی الرغم کوئی قدم اٹھانا' کسی ''مومنِ حقّا'' کی سیرت و کردار کے مطابق قرار نہیں پا سکتا۔ اس لئے ہم صحابہ کبارؓ کے متعلق تصور تک نہیں کر سکتے کہ انہوں نے ایسا کیا ہوگا۔ یہ ہمارا مسلک ہے لیکن اگر کوئی شخص' کتاب اللہ کے مقابلہ میں انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کو زیادہ مستند سمجھتا ہے اور اس لئے صحابہ کبارؓ کی طرف اس قسم کے خلافِ اسلام اقدامات کی نسبت کو صحیح تصور کرتا ہے تو یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت[1] در آئی تو مفاد پرست طبقہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ ہمارے اقدامات خلافِ اسلام ہیں تو ہوا کریں۔ اُس وقت ہنوز عوام میں اتنی حمیّتِ دینی باقی تھی کہ وہ علانیہ خلافِ اسلام اقدامات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ طبقہ' قرانِ کریم کی رُو سے اپنے اقدامات کو مطابقِ اسلام ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے ترکیب یہ سوچی کہ وضعی روایات کی رُو سے' عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ ایسی مرتب کر دی جائے جس سے انہیں' اپنے (خلافِ اسلام) اقدامات کے جواز کی سند مل جائے۔ اس طرح ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ مرتب ہوئی اور پھر' اسی مقصد کے پیشِ نظر' اس تاریخ کو مقدس ایسا بنا دیا گیا کہ اس پر کسی قسم کی تنقید' کفر کے مرادف قرار پا گئی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور اس تاریخ کو سلف کی تائید اور ''تواتر'' کی

1۔ اس کے اسباب و علل کیا تھے' یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اگر مجھے فرصت اور توفیق نصیب ہوئی تو میرا ارادہ ''اسلام کی تاریخ'' لکھنے کا بھی ہے۔ اس میں بتایا جائے گا کہ اسلام کیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ اس اسلام میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آ رہا ہے۔ سرِدست' کتاب کے آخری باب میں اس کے متعلق اختصاراً کچھ لکھا جائے گا۔

سند بھی حاصل ہوتی چلی گئی ـــ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ آپ (مثلاً) قرآنِ کریم کی نصِ صریح سے ثابت کر دیں کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز نہیں' تو اس کے جواب میں تاریخ سے اس قسم کے واقعات پیش کر دیئے جائیں گے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا' اور فلاں اتنی بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ اور اس کے بعد کہا جائے گا کہ فرمایئے! صحابہ کبارؓ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے یا آپ؟ یعنی ہمارے ہاں تاریخی سند کو اوّلیت حاصل ہوگئی ہے اور قرآنِ کریم اس کے تابع آ چکا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ سمجھا جائے کہ تاریخ کا وہی بیان صحیح ہوسکتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو' کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کا وہی مفہوم صحیح ہوسکتا ہے جو تاریخ کے مطابق ہو۔

پھر' تاریخی بیانات میں تضاد بھی ہے۔ اسی تاریخ میں ایک طرف (حضرت) عثمانؓ دکھائی دیتے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد و نہایت دولت کے مالک تھے اور وہیں' دوسری طرف' حضرت ابوذر غفاریؓ کھڑے نظر آتے ہیں جو (خلیفۃ المسلمین) حضرت عثمانؓ کے منہ پر کہہ رہے ہیں کہ اکتنازِ دولت از روئے قرآن حرام ہے۔ نتیجہ ان تاریخی تضادات کا یہ ہے کہ ہر شخص (اور ہر فرقہ) کو اپنے اپنے خیال یا مسلک کی تائید میں سند حاصل ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دار' اپنے مسلک کے جواز میں ''حضرت عثمانؓ والا اسلام'' پیش کر دیتے ہیں اور سوشلسٹ ''حضرت ابوذر غفاریؓ والا اسلام''۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کا (بزعمِ خویش) سرمایہ دارانہ اسلام پیش کرنے والے حضرات' ان کے متعلق طبریؔ کے اس بیان کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

> اس وقت میرے پاس سواری کے دو اونٹوں کے سوا اور کوئی اونٹ نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس کوئی دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری رہ گئی ہے۔ حالانکہ خلافت سے پہلے تمام عرب میں میرے پاس سب سے زیادہ اونٹ اور بکریاں تھیں۔ لیکن آج میرے پاس نہ کوئی بکری ہے نہ کوئی اونٹ سوائے سواری کے ان دو اونٹوں کے جو میں نے سفرِ حج کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔ (تاریخ طبری' جلد نمبر 4 صفحہ 347' مطبوعہ مصر' جدید ایڈیشن)

یہ ہے ہماری تاریخ کی کیفیت۔

صحیح مسلک

اگر تاریخ کے بجائے' قرآنِ کریم کو سند و حجت تسلیم کر لیا جائے (کہ وہ ہی دین میں سند و حجت ہے) اور تاریخ کو اس کے تابع رکھا جائے' تو اس قسم کے ''مختلف اور متضاد اسلاموں'' کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسلام وہی ایک اسلام باقی رہے جسے قرآن کی سند حاصل ہو۔

اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تاریخ کو تاریخ کا مقام دیا جائے۔ اسے ایسا مقدس نہ بنا دیا جائے کہ اسے چھونا تک حرام قرار دے دیا جائے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے اسلام کا احیاء ہوسکتا ہے اور اس کے لئے ہمارا قدامت پرست طبقہ

تیار نہیں۔

بہر حال، ہم ان تاریخی بیانات کو وضعی سمجھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تعیینِ وظائف کے معاملہ میں ''ترجیحی سلوک'' کو معیار قرار دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ نے سرمایہ داری نظام اور جاگیرداری نظام کو از سرِ نو قائم کر دیا تھا۔ ان حضرات کی خلافت، اسلام کے استحکام کے لئے تھی، دورِ جاہلیت کے نظامہائے حیات کو واپس لانے کے لئے نہیں۔

واللہ علیٰ ما نقول شھید

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بارہواں باب

سُخنے نگفتۂ را چو قلندر را نہ گفتم

درسینہ تا بچند برآرم، فرو برم!
ایں نیم قطرہ خوں کہ زمژگاں چکیدنی است

جیسا میں کتاب کے تعارف میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں‘ میری زندگی کا نصفِ اوّل‘ قدامت پرستی کی تیرہ و تار وادیوں میں گزرا۔ تعلیم بھی ہوئی تو اُسی نہج پر اور تربیت بھی ہوئی تو اُسی ماحول میں جس میں شریعت اور طریقت (تصوّف) پہلو بہ پہلو گامزن تھے؛ بلکہ یوں کہیے کہ شریعت‘ طریقت کے تابع رہتی تھی۔ اُس اندازِ تعلیم و تربیت میں اوّل تو قرآنِ کریم کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے اور اگر کبھی اسے سمجھنے کو جی چاہے تو اُسے تقلیدی رنگ میں‘ اَسلاف کی تفاسیر کی رُو سے سمجھا جاتا ہے۔ ”تقلیدی رنگ“ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی عقل و فکر اور علم و بصیرت کو کام میں نہ لائے بلکہ جو کچھ اَسلاف کی طرف سے منتقل ہو کر آ رہا ہے‘ اسے وحیٔ مُنزل مِنَ اللہ کی طرح صحیح اور تنقید سے بالاتر سمجھے۔ اگر کسی مقام پر ”عقلِ گستاخ کچھ شرارت کرے“ اور دل میں اس قسم کا وسوسہ بیدار کر دے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا‘ تو اس قسم کے شیطانی وساوس سے خدا سے پناہ مانگے اور یہ کہہ کر دل کو اطمینان دے لے کہ صحیح وہی ہے جو بزرگوں نے کہا ہے۔ اس لئے کہ سالک بے خبر نَبود زِ راہ و رسمِ منزلہا۔

اس کے بعد میری زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوا جس میں‘ مَیں نے قرآنِ کریم کو غور و تدبّر اور عقل و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس پر قریب چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے‘ جس میں سوائے ایسے مواقع کے جن میں‘ میں معذور ہی نہ ہو گیا ہوں‘ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے خدا کی اس کتابِ عظیم کے حقائق و معارف پر غور و فکر نہ کیا ہو۔ آرزو ہے کہ زندگی کا باقیماندہ حصہ بھی اسی روش پر گزر جائے کہ یہ کتاب ایک بحرِ بے پایاں ہے جس کے حقائق کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے؛ بلکہ اس میں جوں جوں انساں آگے بڑھتا ہے‘ سامنے کا کنارہ اور پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔

دُعا کا مفہوم سمجھنے میں دشواری

اس مرحلہ میں بہت سے مقامات ایسے آئے جن میں مجھے برسوں ایک ایک نکتہ پر غور کرنا پڑا اور تب کہیں جا کر بات سمجھ میں آئی۔ انہی نکات میں ایک نکتہ دعا کے متعلق تھا۔ قرانِ کریم میں دعا (یعنی خدا کو پکارنے) کے متعلق متعدد آیات ہیں۔ ان میں سورۂ بقرہ کی حسبِ ذیل آیت خاص اہمیت رکھتی ہے اس میں کہا گیا ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ [2:186]

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو، سو میں تو قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر، تا کہ نیک راہ پر آئیں۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس ترجمہ اور اس کی رُو سے متعیّن کردہ مفہوم کو صحیح سمجھنے میں میری دشواری یہ تھی کہ اس میں کہا گیا ہے کہ ''میں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے''۔ لیکن یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے، اور روزمرہ کا مشاہدہ بھی کہ دعا مانگنے والے خدا سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں دعائیں مانگتے ہیں جو قبول نہیں ہوتیں۔ جب ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے تو پھر قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ، ہر دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (کم وبیش) سب میری نظروں سے گزرا لیکن مجھے اس سے اطمینان نہ ہوا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا، دعا تو ہر ایک کی قبول کر لیتا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ جو کچھ دعا مانگنے والا چاہتا ہے اسی کے مطابق ہو جائے۔ خدا وہ کرتا ہے جو اس کے لئے بہتر ہو۔ لہٰذا، اگر دعا کرنے کے بعد، کسی کی مصیبت رفع نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا تکلیف یا مصیبت میں مبتلا رہنا اس کے حق میں بہتر ہے۔ علاوہ اس کے کہ یہ توجیہہ بڑی کمزور ہے، یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کے بھی خلاف جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ [27:62] وہ کون ہے جو مصیبت زدہ کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اس کی مصیبت رفع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وہ خدا، اور صرف خدا ہے جو ایسا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی اِلٰہ نہیں۔ یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مصیبت زدہ کی مصیبت رفع ہو جائے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ مصیبت زدہ کی مصیبت رفع ہو یا نہ ہو، اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے حق میں وہی بہتر ہے، قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا ارشاد کے بھی خلاف ہے۔

ایک مفہوم

میں غور وفکر کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان مقامات میں ''خدا کو پکارنے'' سے مراد، اس سے صحیح راستے کی راہنمائی طلب

کرنا ہے۔ انسان، بعض اوقات ایسے مقامات پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ یہ الجھاؤ اس کے لئے بڑی پریشانی کا باعث ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط سمت کی طرف مڑ جاتا ہے تو نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر اس دوراہے پر اُسے صحیح راستے کا نشان مل جائے تو اس کی پریشانی رفع ہوجاتی ہے۔ قرانِ کریم زندگی کے ہر دوراہے پر انسان کی راہنمائی صحیح راستے کی طرف کرتا ہے جس سے اس کی پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے تعلیم یہ دی ہے کہ زندگی کے ہر دوراہے پر تم خدا سے راہنمائی طلب کرو۔ یعنی اس کی کتاب کی طرف رجوع کرو وہ (قرآن) تمہارے سوال کا جواب دے گا اور صحیح راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کردے گا۔ یہ مفہوم ہے خدا کے قریب ہونے اور ہر پریشاں خاطر کے سوال کا جواب دینے کا۔

ان آیات کا مفہوم تو میں یہی سمجھا تھا لیکن ایک اور آیت تھی جس سے میری نگاہ کا رُخ ایک اور طرف پلٹ گیا۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد مدینہ میں اسلامی مملکت کا قیام وجود میں آ گیا اور وہاں کے مسلمان اُن تکالیف اور پریشانیوں سے، جو اُنہیں مکی زندگی میں پیش آتی تھیں، محفوظ ہو گئے، لیکن جو مسلمان مکہ میں گھر گئے تھے، اُنہیں مخالفین بے حد تنگ کرتے تھے۔ یہ بے کس و بے بس، مظلوم و مقہور، کمزور و ناتواں، مسلمان، رہ رہ کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے، التجائیں کرتے تھے کہ وہ ان کی مدد کرے اور کسی طرح اُن کے مصائب سے انہیں نجات دلائے۔ خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اُن کی مشکلات کا حل ''براہِ راست'' پیدا کردے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کیا کیا، اسے غور سے سنئے۔ سورۃ النّساء میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے مسلمانوں سے کہا کہ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا [4:75]

(اے مدینہ کے مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اُٹھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ (مکہ کے) ستم رسیدہ، کمزور و ناتواں، مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے، جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے، کسی طرح نکال لے۔ اپنے ہاں سے ہمارے لئے کوئی سرپرست بھیج۔ کوئی مددگار اِدھر پہنچا۔

دوسرا مفہوم

یہاں دیکھئے، مکہ کے مظلوم، خدا سے دعا کر رہے ہیں، اور خدا مدینہ کے مسلمانوں سے کہہ رہا ہے، کیا تم سن نہیں رہے کہ وہ کس طرح آہ و فغاں کرتے ہوئے ہمیں پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کو کیوں نہیں پہنچتے؟ اس سے میں نے دعا کا یہ مفہوم سمجھا کہ خدا دعا کرنے والے کی مدد براہِ راست نہیں کرتا۔ وہ ان کی مدد اپنے ان بندوں کے ذریعے کرتا ہے جو مظلوم کی مدد کرنا اپنا

فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس سے دعا کی قبولیت کا ایک اور گوشہ میری سمجھ میں آیا اور قرآنِ کریم کے دیگر کئی ایک مقامات سے اس کی تائید بھی سامنے آ گئی۔

اسی سے قرآنِ کریم کا یہ نکتہ بھی میری سمجھ میں آیا کہ جس طرح خدا کا قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے' اسی طرح وہ انسانوں کی دنیا میں بھی روبعمل رہتا ہے۔ لیکن انسانی حساب وشمار کے مطابق اس کی کارفرمائی یا نتیجہ خیزی کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے ـــــ خدا کا ایک ایک دن' ہمارے حساب وشمار کے مطابق' ہزار ہزار سال (32:5) کا بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے (70:4) لیکن جب انسانوں کی کوئی جماعت' قوانینِ خداوندی کو انسانی معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کے لئے اُٹھتی ہے' تو وہ قوانین' انسانوں کے حساب وشمار کے مطابق اپنے نتائج مرتب کر دیتے ہیں اور اس طرح جو انقلاب (خدائی رفتار کے مطابق) صدیوں میں جا کر مشہود ہونا تھا' وہ' اس جماعت کے ہاتھوں' دنوں میں وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ اس جہت سے' یہ جماعتِ مومنین خدا کی رفیق قرار پاتی ہے (لیکن رفیقِ ادنیٰ ـــــ رفیقِ اعلیٰ حضور نبی اکرمؐ کے الفاظ میں' خدا ہی رہتا ہے)۔

مکہ کے مظلومین نے خدا سے جو دعائیں مانگی تھیں' ان کی قبولیت کے سلسلہ کا آغاز بدرؔ کے میدان سے ہو گیا تھا۔ اُس میدان میں' مجاہدین کا لشکر مکہ کے (بلکہ یوں کہئے کہ ساری دنیا کے) مظلومین ومقہورین کی امداد کے لئے' سربکف وشمشیر بدست' مخالفین کے سامنے صف آراء ہو گیا تھا۔ تاریخ کے اس فقیہ المثال معرکہ کا ذکر کرتے ہوئے' اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس دن فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى [8:17] مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے' ہم کر رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے' ہم چلا رہے تھے۔

خدا کے تیر اور تمہاری کمانیں

غور فرمایئے! اس دن تلواریں بھی یہی مجاہدین چلا رہے تھے اور تیر بھی انہی کی کمانوں سے نکل رہے تھے' لیکن خدا نے انہیں اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں' ان انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا فریضہ اپنے ذمے لیتے ہیں۔ غالبؔ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ایسے حسین وبلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ (نعت کے لٹریچر میں) اس سے بہتر شعر (کم از کم) میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس نے کہا ہے کہ:

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است   اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بندۂ مومن۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود   بندۂ مومن قضائے حق شود[1]

1۔ اس مقام پر انہی ارشادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دعا کے متعلق تفصیلی بحث میری تصنیف کتابُ التقدیر میں ملے گی' جہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعا کا نفسیاتی اثر خود انسان کی اپنی ذات پر کیا پڑتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا ارشادِ گرامی

بہر حال، یہ تھا دعا کا مفہوم جو قرآنِ کریم پر غور و فکر سے میری سمجھ میں آیا تھا اور اسی کے مطابق میں نے "مفہوم القرآن" میں بھی لکھا تھا۔ بایں ہمہ، مجھے اس کی جستجو رہی کہ کیا صدرِ اوّل میں اس مفہوم کی کہیں سے تائید مل سکتی ہے؟ اور میری خوشی کی انتہاء نہ رہی جب مجھے خود جناب فاروقِ اعظمؓ کے ہاں یہی مفہوم مل گیا — یہی مفہوم اور ایسے بلیغ ترین انداز میں جو میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ لشکرِ اسلام کو روانہ کیا تو اعوص کے مقام تک انہیں رخصت کرنے کے لئے گئے۔ وہاں کھڑے ہو کر آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں کہا:

انی بینکم وبین اللّٰہ۔ ولیس بینی وبینہ' احدا۔ وان اللّٰہ قد الزمنی دفع الدعاء عنہ۔ فاء نھوا شکاتکم الینا۔ فمن لم یستطع فالی من یبلغنا۔ ناخذلہ الحق غیر متمتع۔

(النھایۃ لابن اثیر۔ بحوالہ طنطاوی صفحہ 236) ← (النھایۃ لابن اثیر۔ بحوالہ طنطاوی صفحہ 236)

لوگو! یاد رکھو! میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں۔ لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔ لہٰذا، تم اپنی شکائتیں مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص براہِ راست مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنی شکایت ان لوگوں تک پہنچا دے جو مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم (ہر پکارنے والے کا) حق، بغیر کسی پریشانی کے اس تک پہنچا دیں گے۔

اس سے میری نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی اور وہ بے ساختہ اسلام کے اس بطلِ جلیل کے احترام میں جُھک جُھک گئیں جسے تعلیم و تربیتِ نبویؐ نے قرآن فہمی کے اس مقامِ بلند تک پہنچا دیا تھا! میری نگاہیں احترام میں جُھک گئیں اور مجھے محسوس ہوا کہ یہی تھے وہ مومن جن کے متعلق خود خدا نے کہا تھا کہ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ [33:43] اللہ اور اس کے ملائکہ تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ تم پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں۔

آپ ان الفاظ پر ایک بار پھر غور فرمایئے کہ:

اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دُعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔

اور سوچئے کہ اس قدر عمیق حقیقت کو کس قدر لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے! ظاہر ہے کہ انسان، خدا سے اس وقت دعا مانگتا ہے جب اس کی کوئی ضرورت رُک جائے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ میں سے کسی کی کوئی جائز ضرورت رُکی نہ رہے۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ فلاں کی کوئی ضرورت رُک گئی ہے تو وہ فوراً اس کے پورا کرنے کا انتظام کرے اور اس طرح اس کی دعا کو وہیں روک لے، خدا تک پہنچنے ہی نہ دے۔

اور اس کے اندر یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ

گویا مملکت کے سربراہ کے خلاف خدا سے شکایت ہوگی کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔ یہ مطلب تھا حضرت عمرؓ کے اس اعلانِ گرامی کا کہ میں ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دوں گا کہ تم میں سے کسی کو میرے خلاف خدا سے شکایت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

یہ تھا مقصد اسلامی مملکت کے قیام کا اور یہ تھیں اس کے سربراہ کی ذمہ داریاں! ضرورت مندوں کی دعاؤں کے قبول ہونے کے لئے قرآنی نظامِ مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ خدا' بندوں کی مشکلات براہِ راست حل نہیں کرتا' اس نظام کی وساطت سے کرتا ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے اس کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کے سربراہ کا ہاتھ ''اللہ کا ہاتھ'' بن جاتا ہے (48:10) اور انسانوں کی دنیا میں' جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں' وہ اس کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ یہی ہوتا ہے وہ بندۂ مومن جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کارکُشا کارساز

اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی ہوگی کہ اپنی مصیبتوں اور مشکلوں کے لئے ہم جو ہر روز خدا سے دُعائیں مانگتے ہیں' وہ قبول کیوں نہیں ہوتیں! یہ براہِ راست قبول ہو نہیں سکتیں۔ یہ پوری ہوتی ہیں ''مقرّبینِ بارگاہِ خداوندی'' کی وساطت سے۔ لیکن یہ ''مقرّبینِ بارگاہِ خداوندی'' خانقاہوں اور مزاروں میں نہیں ہوتے۔ یہ قرآنی مملکتِ خداوندی کے ایوانوں میں ملتے ہیں۔ یہ حضرات نہ ''روحانیت'' اور ''مظہرِ شانِ الوہیت'' کے مدعی ہوتے ہیں اور نہ ہی ''ظل اللہ علی الارض''[1] (زمین پر خدا کے سایہ کے) مدعی۔ یہ احکام واقتدارِ خداوندی کی روشنی میں اس قسم کے معاشرہ کو قائم کرتے ہیں جس میں کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہتی۔ یہ اس کا (CREDIT) بھی خود نہیں لیتے بلکہ جن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا [76:9] ''ہم تم سے کسی قسم کے معاوضہ کے تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں''۔

1۔ مجوسی شہنشاہوں کے تتبع میں' مسلمان بادشاہوں نے بھی اپنے لئے ''ظل اللہ علی الارض'' کا تمغہ وضع کر لیا تھا۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ ذاتِ گرامیؐ کہ جس سے اعظم واعلیٰ ہستی آسمان کی آنکھ نے نہ دیکھی تھی نہ دیکھ سکے گا' اپنے آپ کو عبدہ (خدا کا غلام) کہے اور اس میں انتہائی فخر محسوس کرے' اور یہ حضرات ''زمین پر خدا کا سایہ'' ہونے کے مدعی ہوں! تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا!!

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تیرہواں
باب

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بُود

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

فاروقِ اعظمؓ نے 13ھ میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اب ہم 23ھ میں پہنچ گئے ہیں۔ اس دس سال کی قلیل ترین مدت میں (جو قوموں کی زندگی میں' کلمح البصر ہوتی ہے) جو انقلابات رُونما ہوئے' ان کی تفصیل کے لئے ایک جداگانہ (مستقل) تصنیف کی ضرورت ہے۔ مختصر الفاظ میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ مختلف اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ جن حالات میں یہ جدید مملکت وجود میں آئی تھی اور جس قوم کے ہاتھوں یہ متشکل ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر کیا آپ کو دنیا کی کسی اور قوم کے ہاں اتنی قلیل مدت میں ایسے وسیع اور عظیم انقلاب کی مثال ملتی ہے؟

خارجی دنیا میں انقلاب

فتوحات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دس سال کی قلیل مدت میں' پورے کا پورا ایران' شام' عراق' مصر' مملکتِ اسلامیہ کا جزو بن چکے ہیں۔ یہ اُس زمانے میں ہوا جب سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات و اسباب آمد و رفت کی حالت یہ تھی کہ گھوڑے اور اونٹ سے زیادہ تیز رفتار سواری کوئی نہ تھی اور سانڈنی سوار کے سوا' نامہ و پیام اور احکام و ہدایات رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان حالات میں' فاروقِ اعظمؓ مدینہ میں بیٹھے' ہزاروں میل دُور جنگ کے میدانوں کے نقشے مرتب کرتے' کمانڈروں اور سپہ سالاروں کو ہدایات بھیجتے اور علاقہ فتح ہو جانے پر' وہاں کا نظم و نسق سرانجام دیتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقوں کا سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ اس قدر دُور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے ممالک میں سے کسی ایک میں' بغاوت تو ایک طرف' خفیف سی سازش بھی نمودار نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے

کہ جو قومیں اسلامی مملکت کے زیرِ نگین آئیں وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھیں۔ ہر قوم، دوسری قوموں سے مذہب، زبان، نسل، تہذیب و تمدن اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصورات میں الگ تھی اور یہ سب مل کر، خود عربوں سے الگ۔ یہ تمام باہمد گر متضاد عناصر ایک مملکت کی وحدت میں اس طرح سمو گئے کہ نہ ان میں کوئی تفاوت رہا نہ فتور، نہ اختلال رہا نہ اختلاف ـــــ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ ملکوں کا فتح کر لینا آسان ہے لیکن اس قسم کے متضاد عناصر میں اس طرح کی ہم آہنگی پیدا کر دینا کارے دارد۔ دیگر ممالک سے قطع نظر، خود سرزمینِ عرب کے اندر کچھ کم متضاد عناصر نہیں تھے اور انہوں نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مرکز کے تابع نظم و نسق کی زندگی بسر کرنی شروع کی تھی۔ ان میں بھی کہیں بغاوت نہیں اُبھری، سرکشی نمودار نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس طرح کے ڈسپلن اور فرماں پذیری کا ثبوت دیا جیسے وہ ہزاروں سال سے اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں فاروقِ اعظمؓ خاصے سخت گیر تھے۔ ان کی سرزنش بڑی شدید اور گرفت بڑی آہنی ہوتی تھی۔ اس باب میں وہ جری سے جری کمانڈر اور بڑے سے بڑے حاکم اور والی تک کو نہیں بخشتے تھے لیکن اس کے باوجود، کیا مجال جو ان میں سے کسی نے ان کے کسی حکم کے خلاف آنکھ تک بھی اٹھائی ہو۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اُس مملکت کی کوئی مستقل فوج (STANDING ARMY) نہ تھی جو حکومت کے زیرِ کمان ہو۔ تمام فوج، افرادِ مملکت پر مشتمل تھی، جو عند الضرورت رضا کارانہ جمع ہو جاتے اور انہی سے فوج ترتیب پا لیتی تھی۔ آپ سوچئے کہ جس حکومت کے پاس اپنی الگ مستقل فوج نہ ہو اور جو ہتھیار فوج کے پاس ہوں وہی عام افرادِ مملکت کے پاس موجود ہوں، اس میں کہیں ہلکی سی بغاوت کا بھی نمودار نہ ہونا، تاریخ کا فقید المثال کارنامہ نہیں؟ مفتوحہ علاقوں میں اس قدر امن و سلامتی اور خود اپنی قوم میں اس قدر صلح و آشتی، کس بات کا ثبوت ہے! صرف اس بات کا کہ نظامِ مملکت اس قدر عدل و احسان کے درخشندہ قرآنی اصولوں پر مبنی تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ نہ صرف مطمئن بلکہ شاداں و فرحاں تھا اور سربراہِ مملکت کا اپنا کردار اس قدر پاکیزہ اور بلند تھا کہ اس میں کسی کو کسی مقام پر انگشت نمائی کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ تاریخِ عالم اس قسم کے نظام اور نظام کے سربراہ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا اوف اِسلام'' کا مقالہ نگار اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> یہ حقیقت یقیناً باعثِ صد تعجب ہے کہ مکہ کے ایک سادہ سے شہری نے کس طرح ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے۔ اس نے، تنہا اس نظامِ حکومت کے ذریعے جس کے خلاف کسی نے کوئی آواز بلند نہ کی، ان بدّوؤں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنایا جو اس سے پہلے، قواعد و ضوابط کے نام تک سے آشنا نہ تھے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ اس نے بدّوؤں کے سرداروں کو، جن کے ہاتھ میں ان قبائل کا پورے کا پورا اقتدار تھا، کس طرح کنٹرول میں رکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قدر وسیع و عریض فتوحات تنہا عمرؓ کا کارنامہ نہیں تھا۔ لیکن یہ تنہا اسی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ اس نے اتنے اتنے

بڑے جرنیلوں کو کبھی عنان گسیختہ نہ ہونے دیا اور بنواُمیہ جیسے شہ زور اور صاحبِ اقتدار قبیلہ تک کی صلاحیتوں سے تو فائدہ اٹھایا لیکن انہیں صاحبِ اقتدار نہیں ہونے دیا۔ اس نے خالد بن ولیدؓ جیسے سپہ سالار کو جس طرح معزول کیا' اس سے ہم ان (حضرت عمرؓ) کے سیاسی تدبّر اور اقتدار کی محکمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر' ہم بلاتأمل' انہیں سیاسی نابغہ (POLITICAL GENIUS) کے معزز لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ (نہ صرف ان کی فتوحات کی بنا پر بلکہ اس لئے بھی کہ) انہوں نے' اس قسم کے متضاد عناصر پر جن سے یہ جدید مملکت عبارت تھی' کس طرح وحدت اور استحکام کا نقش ثبت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کہ عمرؓ کا زمانہ خلافت' بظاہر شخصی حکومت کا دَور نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جنونِ ملوکیت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ (صفحہ 983' 1934ء ایڈیشن)

داخلی دُنیا میں اِنقلاب

پھر یہ انقلاب صرف خارجی دنیا میں ہی نمودار نہیں ہوا تھا۔ اُس قوم کی داخلی دنیا میں بھی جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی' وہ بھی عدیم النظیر اور فقید المثال تھی۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ عرب جن کی تگ و تاز کا بنیادی مقصد لوٹ مار تھا اور جو محض مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے ہر وقت آمادۂ جنگ و پیکار رہتے تھے' ان میں ایسا نفسیاتی تغیر واقعہ ہو گیا کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ایران کی فتح میں اِس قدر مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا جو اُن کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا لیکن اس میں سے کسی سپاہی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہ رکھی اور سارے کا سارا لا کر میرِ سپاہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف' ہم نے ایک بدو لڑکی کو رات کی تنہائیوں میں' اپنے خیمہ کے اندر' خود اپنی ماں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں' لیکن اس کے باوجود مَیں دودھ میں پانی نہیں ڈالنا چاہتی کیونکہ خلیفہ نے کہا تھا کہ جب کوئی اور دیکھنے والا نہ ہو تو اللہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے) دنیا کے بڑے بڑے فاتحین ملکوں کو فتح کر سکتے ہیں' بڑے بڑے مدبرین بساطِ سیاست پر انقلاب برپا کر سکتے ہیں لیکن قلوب کی دنیا میں ایسا انقلاب برپا کرنا دست پروردگانِ رسالتؐ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔

ہیکل کا خراجِ تحسین

اسی انقلاب کے پیشِ نظر ہیکل نے جن الفاظ میں' بارگاہِ فاروقیؓ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے' وہ بڑے جامع ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے کہا ہے کہ:

> دس برس اور کچھ مہینے حضرت عمرؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے گزارے۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے وقف تھے۔ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی انہیں کوئی پراوہ نہ تھی۔ ان کا دل' ان کی عقل اور ان کے اعضاء و جوارح' اُس بارِ عظیم

کے اٹھانے میں مصروف رہتے تھے جو قضاو قدر نے ان کے شانوں پر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کے سپہ سالارِ اعظم تھے' فقہائے اسلام میں انہیں فقیہِ اکبر کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ایک ایسے مجتہد تھے جن کی رائے سند سمجھی جاتی اور جن کا اجتہاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے انصاف پسند اور پاک دامن قاضی تھے جو مقدمات کے فیصلے کرتے اور طاقت وروں سے کمزوروں کو اُن کا حق دلواتے تھے' وہ تمام مسلمانوں کے ––– بڑے سے پہلے چھوٹے' طاقت ور سے پہلے کمزور اور مالدار سے پہلے فقیر کے ––– شفیق و مہربان باپ تھے۔ وہ بندۂ مومن تھے جن کے اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے ایمان نے ان کی خود اعتمادی میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کی رائے کی قدر و قیمت اُن پر اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار سیاست دان تھے جو اپنے ارادوں کو جانتے تھے اور اُنہیں اپنی مقدرت کے دائرے سے نکلنے نہ دیتے تھے اور ان کی مقدرت کے ساتھ ساتھ اُن کے ارادے بھی وسیع ہوتے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ نظر حکمران تھے جن کی عقل و حکمت نے اُن کے لئے مختلف النسل' مختلف اللسان اور مختلف المذاہب قوموں پر حکومت کرنا آسان بنا دیا تھا اور وہ رعایا کے معاملات کی تدبیر اس طرح کرتے تھے کہ لوگ ان سے اُپرائیں نہیں بلکہ قریب تر ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے کوئی عجیب نہیں اگر اُن کے عہد میں مسلمانوں کو سچے ایمان نے ابھارا' اُن کے دلوں میں شہادت فی سبیل اللہ کی تڑپ پیدا کی اور انہوں نے ایران' عراق' شام' مصر اور دوسرے ممالک فتح کر لئے اور فاروقِ اعظمؓ کے ان امتیازات کے پیشِ نظر کوئی حیرت نہیں اگر عرب مغرب کی انتہائی حدوں سے لے کر مشرق کے انتہائی سِروں تک تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ حالانکہ اسلام سے پہلے وہ ایک خانہ بدوش قوم تھے جو صرف انفرادی اغراض کے لئے جیتی تھی اور اجنبی اقتدار کی محکوم تھی۔

کتنی مہتم بالشّان تھی وہ کوشش' جو حضرت عمرؓ نے' دس سال کی مدت میں' یہ بارِ عظیم اٹھانے کے لئے صَرف کی تھی۔

اور طٰہٰ حسین کا

اور مصر ہی کا ایک اور نامور مفکر (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) اس باب میں لکھتا ہے:

میں نہیں جانتا کہ تاریخِ انسانی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا سا زندہ' حسّاس' محتاط اور معصیت سے خائف ضمیر رکھتا ہو۔ جو اپنے حق میں ان باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو' ان امور سے بھی اِبا کرتا ہو جن سے اِبا نہیں کیا جاتا اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولوالعزم انسان ہی کر سکتا ہے۔

(الفتنۃ الکبریٰ)

اور اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت

فاروقِ اعظمؓ اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدّن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔ (ایضاً)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب (الفتنۃ الکبریٰ) درحقیقت ان حوادث وفتن پر مشتمل ہے جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں نمودار اور ان کی شہادت پر منتج ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اس میں محض تمہیداً وہ کچھ لکھا گیا ہے جس کے اقتباسات اوپر درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں، جب وہ ان اسباب وعلل پر تبصرہ کرتا ہے جو اس فتنۃ الکبریٰ (شہادتِ امیر المومنین حضرت عثمانؓ) کا موجب بنے، تو اس کی نگاہ پھر حضرت عمرؓ کی طرف اٹھتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

> جب ان تمام امور کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جن حالات نے حضرت عثمانؓ کو آگھیرا تھا وہ ان کے اور ان کے رفقاء کی طاقت سے باہر تھے۔ کہا جائے گا کہ حضرت عمرؓ کو بھی تو ایسے ہی حالات سے سامنا کرنا پڑا تھا اور انہوں نے ان پر قابو پالیا تھا لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان منفرد شخصیتوں میں سے تھے جنہیں عالمِ انسانیت شاذونادر ہی پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی غیر معمولی شخصیتیں دراصل اپنے جانشینوں کو سخت مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا کر جاتی ہیں بلکہ اگر احتیاط مانع نہ ہو تو میں یہاں تک بھی کہوں گا کہ درحقیقت حضرت عمرؓ کی عبقریت[1] (غیر معمولی صلاحیت) ہی ان حالات کی ذمہ دار ہے جن میں حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی گھر گئے —— وہ عبقریت جو حضرت عمرؓ کے بعد ان کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ ملی جن میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ (ایضاً)

اور جس کی مثال کی تلاش میں آسمان آج تک مصروفِ گردش ہے۔

اگلا پروگرام

عہدِ فاروقیؓ میں مملکت تو بے شک اس قدر وسیع وعریض ہوگئی تھی اور اس میں نظم ونسق بھی قائم ہوگیا تھا، لیکن قرآنِ کریم کی بلند اقدار کے مطابق، داخلی دنیا کا انقلاب ہنوز حجاز اور اس میں بسنے والے عربوں تک محدود تھا۔ اس کے بعد، حضرت عمرؓ کے سامنے یہ پروگرام تھا کہ جن ممالک کو انہوں نے فتح اور جن اقوام کو انہوں نے مسخّر کیا تھا، ان میں بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے کہیں زیادہ دِقّت طلب اور صبر آزما تھا لیکن حضرت عمرؓ اس کا عزم کر چکے تھے اس لئے کہ یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، خلافت سے مقصود تسخیرِ ممالک نہیں، بلکہ انسانی دنیا میں صحیح آسمانی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تسخیرِ ممالک اس مقصدِ عظیم کا ذریعہ ہے، مقصود بالذّات نہیں، اسی مقصد کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو میرا ارادہ ہے کہ اگلے سال مملکت کا دورہ کروں گا اور ہر ملک کے مقامی حالات کا جائزہ لے کر

1. عبقریت GENIUS-NESS

وہاں قرآنی نظام کے نفاذ کی عملی تدابیر اختیار کروں گا۔

اَلمیہ

لیکن ان کی آنکھوں نے وہ ''اگلا سال'' دیکھا ہی نہ' اور انسانیت کا مقدر بدلتے بدلتے رہ گیا۔ تاریخ عالم کا یہ المیہ اس قدر حیرت انگیز' زہرہ گداز' جگرسوز اور دوررس نتائج کا حامل ہے کہ اس پر آسمان کی آنکھ جس قدر بھی خون کے آنسو بہائے کم ہے۔ اس حادثۂ کبریٰ کے بعد' چودہ سو سال کی تاریخ' انسانیت کی حرماں نصیبیوں اور سوختہ بختیوں کی الم انگیز داستان کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس پیغام بر انقلاب کو دس سال بھی اور مل جاتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ ابنِ آدم نے اس فردوسِ گم گشتہ کو مدت ہوئی پالیا ہوتا جس کی تلاش میں وہ اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے —— ستاروں کی آنکھ محوِ حیرت ہے کہ بعض حوادث کس طرح تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں!

اور یہ حادثہ تھا کیا؟ بجلی کی چمک' کوندے کی لپک' جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا لیکن جس نے عالمِ انسانیت کی متاعِ حیات کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا —— وہ حادثہ جسے تاریخ نے چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور نہیں سمجھی کہ اس اجمال میں زمانے کی کتنی گردشیں مستور ہو کر رہ گئی ہیں۔

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شُد

حادثہ کی تفصیل اتنی ہی ہے کہ 26 ذی الحجہ' 23ھ' مؤذن نے فجر کی نماز کی اذان دی۔ صحابہؓ مسجدِ نبوی میں جمع ہو گئے۔ حضرت عمرؓ امامت کے لئے کاشانۂ خلافت سے باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ نمازیوں کی دو ایک صفیں سیدھی نہیں۔ انہیں اشارہ سے سیدھا کیا۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے ابھی تکبیر کہی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا[1] اور نہایت تیز خنجر سے ان پر متعدد وار کئے۔ آپ کی آنتیں کٹ گئیں۔ حادثہ کی تفصیل ختم ہو گئی۔

قاتل کا خنجر سینۂ عمرؓ میں نہیں' قلبِ کائنات میں پیوست ہو گیا۔

قاتل وار کر کے بھاگا۔ نمازیوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے اُن پر بھی وار کئے۔ یہاں تک کہ بارہ آدمی زخمی ہو گئے۔ ان میں سے' ایک کے قول کے مطابق' چھ اور دوسرے کے مطابق نو جانبر نہ ہو سکے۔ جب آخرالامر اس پر قابو پالیا گیا تو اُس نے اُسی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس طرح جرم کی اوّلین شہادت ہمیشہ کے لئے مٹ گئی اور باقی صرف خنجر رہ گیا جس کی زبان نے جو کچھ بیان کیا وہ ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔

تاریخ نے اس المیہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ہمارے سامنے ''حیرت'' کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اگر اس زمانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ رُونما ہوتا تو حکومت ان سارے نمازیوں کو بھی شاملِ تفتیش کر لیتی جو اُس مسجد میں موجود تھے' کہ ان کی

1۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ سامنے سے نہیں آیا تھا' نمازیوں کی صفِ اوّل میں کھڑا تھا اور وہیں سے اُس نے حملہ کیا تھا۔

آنکھوں کے سامنے ایک شخص سربراہِ مملکت پر (چھپ کر، دور کھڑا، بندوق سے نہیں بلکہ) پاس آ کر خنجر سے حملہ کرتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی مدافعت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ آخر امام اور نمازیوں کی پہلی صف میں فاصلہ ہی کتنا تھا؟ اگر قاتل سامنے سے آیا تھا تو مسجد میں نماز کی حالت میں، کسی شخص کا اس طرح سامنے سے آنا، بجائے خویش ایک غیر معمولی اور اندیشہ خیز واقعہ تھا جس سے انہیں چوکنا ہو جانا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ صفِ اوّل میں سے نکل کر آگے بڑھا تھا تو باقی نمازی خاموش کھڑے کیا دیکھتے رہے؟ آج کی حکومت بے شک انہیں شاملِ تفتیش کر لیتی لیکن ہم تو ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ (یہ کم و بیش) تمام نمازی، انصار و مہاجرین کا گروہ تھے جن کے مومنِ حقّا ہونے کی شہادت قرآن نے دی ہے اور جو اپنے امیر کے جاں نثار پروانے تھے، ان کے متعلق یہ وسوسہ و وہم و گمان میں بھی نہیں آنا چاہئے کہ وہ (معاذ اللہ) اس سازش میں شریک[1] تھے۔ تاریخ نے جو کچھ اس حادثہ کے متعلق بیان کیا ہے (جو بادیٔ النظر میں بڑا ہی سطحی سا دکھائی دیتا ہے) اگر وہ صحیح ہے تو ان حضرات کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ناقابلِ فہم حد تک غفلت برتی۔ بہرحال، یہ ان کی غفلت کا نتیجہ تھا یا عدمِ تدبّر یا فقدانِ احتیاط کا، زمانے کے لئے حیرت و استعجاب کی ایک دنیا اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

آخری لمحاتِ زندگی

خنجر کے وار سے حضرت عمرؓ کی آنتیں کٹ گئی تھیں، زخم سے برابر خون بہے جا رہا تھا۔ جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو آپ نے پہلا سوال یہ کیا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے۔ جب جواب اثبات میں ملا تو آپ کو اطمینان ہوا۔ دوسرا سوال قاتل کے متعلق تھا جب معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر مسلم، غیر عرب ہے تو آپ نے اس پر بھی اظہارِ اطمینان کیا کہ وہ کسی مسلمان اور اپنی قوم کے فرد کے ہاتھوں شہید نہیں ہوئے۔

طبیب بلائے گئے اور انہوں نے بصد تأسف کہہ دیا کہ زخم جان لیوا ہے۔ امیر المومنین تھوڑے سے وقت کے مہمان ہیں۔

جانشینی کا مسئلہ

غور کیجئے کہ ایک شخص کی انتڑیاں کٹ چکی ہیں — اس سے درد کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے — خون متواتر بہے جا رہا ہے۔ اسے دم بدم نقاہت بڑھ رہی ہے۔ معالج مایوس ہو چکے ہیں۔ موت سامنے کھڑی ہے اور مہلت یونہی گھڑی دو گھڑی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے میں، اس عظیم شخصیت کو کون سا خیال پریشان کر رہا ہے! یہ کہ میرے بعد، نظم و نسقِ مملکت کا کیا ہو گا! میرا جانشین کیسا ہو گا۔ اس انتہائی کرب والم اور اضطراب وانحطام کے عالم میں، آپ نے جس سکوت و سکون

1۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ کیا واقعہ ان کے مشورہ یا علم سے سرزد ہوا ہے۔ اس پر لوگ کانپ اٹھے اور کہا کہ معاذ اللہ، معاذ اللہ، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

اور جس تدبر و تحمل سے اس اہم ترین مسئلہ کے متعلق ایک جامع اسکیم مرتب فرمائی' جب مؤرخین اس پر غور کرتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ کسی موزوں شخصیت کو نامزد فرما دیجئے' جس طرح حضرت صدیقِ اکبرؓ نے آپ کا نام تجویز کر دیا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا (آزاد کردہ) غلام' سالمؓ اور ابو عبیدہؓ بن جراح میں سے کوئی زندہ ہوتا تو میں اس کی سفارش کر دیتا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اپنے بیٹے' عبداللہؓ سے کیوں گریز فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تجھے غارت کرے تو مجھے کون سے راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے (دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا سلیقہ نہیں آیا' تم اسے سربراہِ مملکت بنانے کا مشورہ دے رہے ہو!)۔ ہمارے نزدیک' اصل بات وہی ہے جو متعدد روایات میں آئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''یہ بات پسندیدہ نہ ہوگی کہ میں اپنے گھر والوں کے لئے خلافت چاہوں۔ اگر یہ اچھی بات ہے تو خاندانِ خطاب اس سے بہرہ یاب ہو چکا ہے اب یہ سعادت دوسروں کے حصے میں آنی چاہئے اور اگر اس میں کوئی خرابی کی بات ہے تو خاندانِ خطاب میں سے ایک اسے بھگت چکا ہے' باقیوں کو محفوظ رہنے دیجئے''۔

انتہائی سوچ اور بچار کے بعد آپ نے چھ حضرات پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت متعیّن کر دی۔ اور کہہ دیا کہ یہ لوگ باہمی مشاورت سے آپس میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں ـــــ یعنی حضرت عثمانؓ۔ (2) حضرت علیؓ۔ (3) حضرت زبیرؓ بن عوام۔ (4) حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ۔ (5) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (6) حضرت سعد ابی وقاص (رضی اللہ عنہم)۔ ان کے علاوہ اپنے بیٹے' عبداللہ کو بھی نامزد کیا لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف مشورہ دے سکے گا' خلافت کے لئے نہ امیدوار بن سکے گا' نہ منتخب کیا جا سکے گا۔ گویا ابنِ عمرؓ کی حیثیت اس کمیٹی کے (CO-OPTED) ممبر کی سی تھی۔

قرض کی ادائیگی

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد' اپنی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے ذمے کچھ قرض تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو معلوم تھا کہ آپ نے یہ رقم قرض لے کر نادار مسلمانوں پر خرچ کی تھی۔ آپ نے مشورہ دیا کہ آپ بیت المال سے روپیہ لے کر یہ قرض ادا کر دیں' ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔ آپؓ نے فرمایا کہ ہاں! بعد میں آپ لوگ میری رعایت سے یہ طے کر دیں گے کہ بیت المال کا قرضہ معاف کر دیا جائے۔ اس سے تم تو مطمئن ہو جاؤ گے لیکن جس مصیبت میں' مَیں (اللہ کے حضور) ماخوذ ہو جاؤں گا اس سے مجھے کون چھڑائے گا! میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے باپ کے قرضہ کی ذمہ داری لے لی اور ان کے دفن ہونے سے پہلے اسے ادا کر دیا۔

قبر کی جگہ

حضرت عمرؓ کی دلی خواہش تھی کہ آپ اپنے محترم رفقاء حضور نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہم پہلو' حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹے' عبداللہؓ سے کہا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ عمرؓ آپ کی خدمت میں

سلام عرض کرتا ہے —— دیکھنا' امیر المومنین عمر نہ کہنا' صرف عمرؓ کہنا —— اور مستدعی ہے کہ آپ انہیں پہلوئے حضورؐ میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ وہ جگہ میں نے اپنے لئے مختص کر رکھی تھی لیکن میں عمرؓ کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے آ کر حضرت عائشہؓ کا پیغام سنایا تو آپ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو ایسا کرنا کہ میرا جنازہ لے کر جانا اور حضرت عائشہؓ سے ایک بار پھر اجازت طلب کرنا' ہوسکتا ہے کہ اِس وقت انہوں نے میری خاطر ایسا کہہ دیا ہو' اگر وہ میری وفات کے بعد بھی اجازت عطا فرما دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا' ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

نزع کے عالم میں بھی اس قدر احتیاط' کسی فاروقؓ ہی سے ممکن ہوسکتی ہے! کتنا نازک تھا یہ مقام اور کس قدر باریک تھا یہ فرق!

ولِلّٰہِ درُ' من قال

مرا مرنا' خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔

تقدیر کا مفہوم

تقدیر کے متعلق حضرت عمرؓ کی نگہ بلند اور فکرِ عمیق' عمواس کے طاعون کے واقعہ میں ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے خنجر مارا گیا' تو وہ کہہ رہے تھے کہ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا [33:38] ''اللہ کا امر مقررہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے''۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ حادثوں سے موت اُس وقت واقع ہوتی ہے جب حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتی جائے۔ لہٰذا' یہ حادثہ اللہ کے اسی قانون کے مطابق رُونما ہوا ہے۔

یہ ہے تقدیر کا دوسرا مفہوم!

مواخذۂ آخرت کا خیال

یوں تو آپؓ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب آپ کو مواخذۂ آخرت کا خیال نہ ہو لیکن موت کے قریب' فطرۃً یہ احساس اور بھی شدید ہوگیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اس خیال سے پریشان نہ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم آپ کو مَس تک نہیں کرے گی۔ اس شخص نے آپ کی طرف دیکھا تو آپؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ آپ نے اس سے کہا کہ ''اس باب میں تیرا علم بہت قلیل ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس آنے والے محاسبہ کے فدیہ میں دنیا کے سارے خزانے صَرف کر دیتا''۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے آپ سے کہا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور ہر ایک کے حصے برابر برابر تقسیم

کرتے تھے اس لئے آپ امیر المومنین، امین المومنین، سیّد المومنین ہیں''۔ یہ سن کر آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابنِ عباسؓ! کیا تم اللہ کے حضور میرے لئے یہ شہادت دو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں میں اس کی شہادت دوں گا۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

لیکن لوگ جس قدر ان کی تعریف کرتے تھے' ذمہ داریوں کے محاسبہ کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمر ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

> اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہو گا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہو گی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

اسی حالت میں آپ نے اپنے اعزہ سے کہا کہ مجھے عام مسلمانوں کی طرح سادہ پانی سے غسل دینا' اس میں مشک وعنبر نہ ملانا۔ مجھے معمولی کفن دینا کہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہو گی تو وہ اُسے اچھے ملبوس میں بدل دے گا اور اگر میں ایسا نہ ہوا تو میرا اچھے سے اچھا لباس بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہئے۔

آخری وقت فرمایا کہ اُف! اگر اللہ نے میری لغزشوں سے درگزر نہ فرمایا تو میرا انجام کیا ہو گا! یہ الفاظ زبان پر تھے کہ اسلام کا یہ آفتابِ عالمتاب غروب ہو گیا' ہمیشہ کے لئے غروب!

ایک مزدور' حضرت صہیبؓ رومی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور حجرۂ حضرت عائشہؓ میں' حضور نبی اکرمؐ اور صدیق اکبرؓ کی معیّت میں دفن کر دیئے گئے۔ طوبیٰ لھم وحسن ماب۔ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کے دن اُن پر حملہ ہوا اور دوسری صبح' 27 ذی الحجہ کو آپ دفن کئے گئے۔ لیکن دوسری روایت میں ہے کہ وہ اتوار کے دن یکم محرم 24ھ کو دفن کئے گئے۔ بعض روایات میں آپ کی تاریخِ وفات 8 یا 10 محرم بھی بیان کی گئی ہے۔

آپ کی عمر کتنی تھی' اس کے متعلق متعیّن طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں عدد السنین (سالوں کی گنتی) کا اندازہ کچھ ایسا ہی تھا' اس لئے صدرِ اوّل کی ممتاز ترین ہستیوں کے سنِ ولادت اور عمر کے متعلق بھی متعین طور پر بہت کم معلوم ہو سکتا ہے۔ اور تو اور' خود حضور نبی اکرمؐ کی عمر شریف کے متعلق بھی پختہ طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ طبقاتِ ابنِ سعد اور طبری' ابتدائی دَور کی مستند کتبِ تاریخ سمجھی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں حضورؐ کی عمر ساٹھ برس' تریسٹھ برس' اور پینسٹھ برس لکھی ہے۔ فاروق اعظمؓ کی عمر کے متعلق بھی یہی کیفیت ہے۔ مختلف روایات کی رُو سے آپ کی عمر پچپن برس' ساٹھ برس' اکسٹھ برس' تریسٹھ برس' اور پینسٹھ برس کی قرار پائی ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ 23ھ میں ہوئی لیکن (جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے) آپ کے سنِ پیدائش کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر فاروقِ اعظمؓ کی عمر تریسٹھ برس کی تسلیم کر لی جائے تو آپ' نبی اکرمؐ سے 13-12 برس عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

رفقاء کا خراجِ تحسین

آپ کی وفات کے بعد' آپ کے رفقاء (دیگر صحابہ کبارؓ) نے جن جذباتِ خلوص و محبت کا اظہار فرمایا اور جو خراجِ تحسین و آفریں آپ کی بارگاہ میں پیش کیا' اس کی تفصیل خاصی گنجائش طلب ہے۔ ہم ان میں سے چند ایک کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب' حضرت عمرؓ کے جنازے کے قریب آئے اور فرمایا:

مجھے آپ جیسے اعمالِ حسنہ والے انسان سے زیادہ کوئی محبوب نہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں بھی آپ جیسے اعمال لے کر اللہ کے ہاں پہنچوں۔ (صحیح مسلم و ابنِ ماجہ' بحوالہ طنطاوی' طبع بیروت' صفحہ 461)

کتنی بڑی بات ہے جو چند لفظوں میں کہہ دی گئی ہے! حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ نے بیان کیا ہے کہ جب آپ کا جنازہ قبر کے قریب لایا گیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا ''ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے''۔ پھر فرمایا ''لوگو! جب صالح لوگوں کا ذکر کیا جائے تو عمرؓ کا ذکر کیا کرو''۔ آپ (حضرت علیؓ) حضرت عمرؓ کو یاد کر کے اکثر رویا کرتے تھے۔ جب آپ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

میں عمرؓ کی وفات پر اس لئے روتا ہوں کہ ان کی وفات سے اسلام میں ایک ایسا رخنہ پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ (تاریخ الخلفاء و ابنِ جوزی ــــ بحوالہ طنطاوی' صفحہ 461)

علامہ طنطاویؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں باہمی اختلاف کے دوران' آپ (حضرت علیؓ) نے دیکھا کہ بعض لوگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق کچھ نازیبا الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ برسرِ منبر تشریف لے گئے اور ایک طویل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تذکارِ جلیلہ کے بعد کہا:

ان کے بعد عمرؓ خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ ان سے ناراض تھے اور کچھ راضی۔ لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو جو پہلے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھی (حضرت ابوبکرؓ) کے نقوشِ قدم پر معاملات کو سنوارا۔ وہ ان دونوں کا اس طرح اتباع کرتے تھے جیسے بچہ اپنی ماں کا۔ بخدا وہ (حضرت عمرؓ) رفیق و رحیم اور مظلوموں کے لئے باعثِ تقویت و رحمت و نصرت تھے۔ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرتے۔ اللہ تعالیٰ نے حق ان کی زبان پر اتارا اور صدق کو ان کی شان ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ ہم خیال کیا کرتے تھے کہ ان کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے۔ انہوں نے اسلام لا کر اسلام کو تقویت بخشی اور اپنی ہجرت کو دین کے لئے وجۂ استحکام بنایا۔ اللہ نے منافقین کے دلوں میں ان کا رعب طاری کر دیا تھا اور مومنوں کے دلوں میں ان کی محبت استوار کر دی تھی۔ رسول اللہؐ نے انہیں جبرئیل اور (حضرت) نوحؑ کے ساتھ تشبیہ دی تھی۔ طاعتِ الٰہی میں نقصان اٹھانا انہیں اس نفع سے زیادہ

محبوب تھا جو معصیتِ خداوندی سے حاصل ہو۔ تم ان جیسے کہاں سے لاؤ گے! (طنطاوی۔طبع بیروت۔صفحہ 462)

حضرت ابوعبیدہ ابنِ جراحؓ کہا کرتے تھے کہ ''جب حضرت عمرؓ انتقال کر جائیں گے تو اسلام کمزور ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں عمرؓ کے بعد زندہ رہوں''۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے (حضرت) عمرؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

> بخدا! وہ حلیفِ اسلام، پناہ گاہِ یتیماں، محلِ ایمان، منتہائے احسان، کمزوروں کے فریاد رس، عوام الناس کے مددگار تھے۔ انہوں نے حق کو نہایت استقامت اور احتسابِ خویش کے ذریعے قائم کیا۔ حتیٰ کہ دین غالب آ گیا، ملک فتح ہو گئے اور میدانوں اور کہساروں پر اللہ کا نام بلند ہونے گا۔ (الریاض النضرۃ۔ بحوالہ طنطاوی صفحہ 463)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

> تم قرآن اس طرح پڑھا کرو جس طرح عمرؓ پڑھا گئے ہیں۔ وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے کہ لوگ ان میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی نہ نکلتے۔ ان کی شہادت کے بعد وہ قلعہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب لوگ اسلام سے نکل سکتے ہیں۔
>
> (طنطاوی صفحہ 464)

نیز (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فرمایا:

> اگر عمرؓ کا علم ایک پلڑے میں اور عرب کے تمام قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا بھاری ہوگا۔ آپ کتابِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم اور دینِ خداوندی کے سب سے بڑے فقیہہ تھے۔ آپ کا داخلِ اسلام ہونا، اسلام کے لئے باعثِ فتح و نصرت، آپ کی ہجرت موجبِ تقویت اور آپ کی حکومت رحمت تھی۔
>
> (طنطاوی۔صفحہ 464)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

> جس کسی نے عمرؓ کو دیکھا اس نے جان لیا کہ اللہ نے انہیں، اسلام کو (دیگر تمام سہاروں سے) مستغنی کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں، منفرد تھے۔ (ابنِ جوزی۔ بحوالہ طنطاوی صفحہ 466)

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ ـــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ـــــ اور اس پر اپنی طرف سے صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ

> اگر آج اسلام، ایک زندہ و پائندہ مکمل نظامِ معاشرہ (دین) کی شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ عہدِ فاروقیؓ کا اسلام ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اس کی بنیاد رکھی، صدیقِ اکبرؓ نے خارجی خطرات سے اس کی حفاظت کی اور فاروقِ اعظمؓ نے اسے پروان چڑھایا۔ (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)

سازش کا انکشاف

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اس امر کا احساس قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ شہادتِ حضرت عمرؓ کے حادثۂ فاجعہ کے سلسلہ میں جو کچھ جاننے کے لئے قارئین اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں' اسے سامنے لائے بغیر آگے نہ بڑھا جائے ـــــ لیکن وہ معاملہ بڑا اہم بھی ہے اور نہایت شکیب آزما بھی۔

حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام ابولُولُوء فیروز تھا۔ یہ نصرانی المذہب' ایران کا باشندہ تھا۔ نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا اور والیٔ کوفہ' حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحویل میں آ گیا اور انہی کے ہاں رہنے لگا۔ حضرت عمرؓ کسی ایسے قیدی کو مدینے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے جو بالغ ہو چکا ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ ابولُولُوء بڑا چابکدست' ہنرمند (لوہار' بڑھئی اور نقاش) ہے اسے مدینہ آنے کی اجازت دے دیجئے' یہ وہاں کے لوگوں کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔ آپ نے اسے اجازت دے دی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک دفعہ یہ شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت مغیرہؓ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں' میں کام زیادہ پیسوں کا کرتا ہوں اور وہ مجھے بہت کم مزدوری دیتے ہیں۔ آپ نے تفصیل معلوم کرنے پر کہا کہ اُس کی شکایت بے جا ہے۔ حضرت مغیرہؓ اس پر زیادتی نہیں کر رہے۔ یہ سن کر وہ ہونے کو تو واپس ہو گیا لیکن حضرت عمرؓ کے خلاف انتقام کی آگ کو سینے میں چھپائے رکھا۔ ایک دفعہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس سے گزرا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تو کہتا ہے کہ میں ایسی چکی بنا سکتا ہوں جو ہوا سے چلے۔ اس نے آپ کی طرف تُرش روئی سے دیکھا اور کہا کہ ''میں آپ کے لئے ایسی چکی بنادوں گا کہ تمام لوگ اس کے متعلق باتیں کیا کریں گے''۔ کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے' آپ نے ان سے کہا کہ یہ شخص آج مجھے دھمکی دے گیا ہے۔ چنانچہ وہ موقعہ کی تلاش میں رہا اور اُس صبح آپ پر حملہ کر دیا۔

صاف نظر آ رہا ہے کہ تاریخ کا یہ بیان بڑا سطحی سا ہے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اتنی سی بات فیروزؔ کو ایسے سنگین اور جرأت آزما جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لئے کافی جذبۂ محرکہ قرار نہیں پا سکتی۔ مدینہ جیسے دارالخلافہ میں' حضرت عمرؓ جیسے سربراہِ مملکت کے قتل کے لئے اس سے کہیں زیادہ قوی جذبۂ محرکہ کی ضرورت تھی۔ اس جذبۂ محرکہ کی غمازی اس خنجر نے کر دی جس سے فیروزؔ نے (حملہ کے بعد) خودکشی کر لی تھی۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے وہ خنجر دیکھا تو کہا کہ میں نے اس خنجر کو کل' ہرمزانؔ اور جفینہؔ کے پاس دیکھا تھا' میں نے ان سے پوچھا کہ تم اس چھری سے کیا کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس سے گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ دودھارا خنجر اس مقصد کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے کہا کہ میں (حضرت) عمرؓ کے قاتل' ابولُولُوء کے پاس سے گزرا۔ جفینہؔ اور ہرمزانؔ اس کے ساتھ تھے اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ میں دفعتہً ان کے پاس پہنچا تو وہ بھاگے اور ایک خنجر ان کے ہاتھوں

سے گر پڑا جس کے دو پھل اور بیچ میں دستہ تھا۔ ذرا دیکھوں کہ وہ خنجر کیسا ہے جس سے (حضرت) عمرؓ کو شہید کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے خنجر کو دیکھا تو کہا کہ یہ وہی خنجر ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

ہرمزآن وہی ایرانی گورنر تھا جو پا بجولاں حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا اور (پانی کا پیالہ زمین پر گرا کر) ایک پُرفریب چال سے قتل ہونے سے بچ گیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو کر مدینہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا تھا ـــــ اور جفینہ، حیرہ کا رہنے والا عیسائی تھا جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا دودھ شریک بھائی تھا۔ وہ اس رشتہ سے اُسے مدینہ لے آئے تھے جہاں وہ لوگوں کو پڑھایا لکھایا کرتا تھا ـــــ زبانِ خنجر نے اس طرح ایک گہری سازش کا راز افشا کر دیا۔

سازشیوں کا قتل

حضرت عمرؓ کے بیٹے، حضرت عبیداللہؓ کو جب اس سازش کا یقین ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ باپ کے قتل کے قصاص کے لئے جوش میں اُٹھے، تلوار ہاتھ میں لی۔ پہلے ہرمزآن کو قتل کیا پھر جفینہ کو۔ اس کے بعد ابولُولُوء کی ایک صغرسن بیٹی سامنے آئی تو اُسے بھی قتل کر دیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔

ضمناً، حضرت عبیداللہؓ کا یہ اقدام، اسلام کے قانونِ عدل کی رُو سے درست نہیں تھا، چنانچہ بعد میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کے قتل کئے جانے کا مشورہ دیا لیکن خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ نے خود خون بہا ادا کر کے معاملہ کا تصفیہ کر دیا۔ اس مقام پر ایک تجسّس طلب ذہن پھر متعجب رہ جاتا ہے کہ اس معاملہ کو نجی اور انفرادی، وارداتِ قتل اور ذاتی انتقام تک محدود رکھا گیا ـــــ اور حکومت نے اس سازش کی تحقیقات کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو عالمِ اسلام (شاید) ان خطرات سے (کم از کم بڑی حد تک) محفوظ ہو جاتا جو بعد میں وقوع پذیر ہوئے اور جس سے تاریخ کا نقشہ بدل گیا۔

لیکن ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ موجبِ حیرت اس حقیقت کا احساس ہے کہ بعض اوقات، بڑے سے بڑے دیدہ ور، نہایت دوراندیش، انتہائی محتاط، مدبر سے بھی کس طرح ایسی چوک ہو جاتی ہے جس کے نتائج و عواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔

احتیاط کی کمی

حضرت عمرؓ نہایت محتاط اور دوراندیش واقعہ ہوئے تھے۔ (مثلاً) جنگِ بدر کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن آپ مدینے میں، چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے، معرکہ بدر کے احوال و کوائف بیان کر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص مسجدِ نبویؐ کے باہر اونٹ سے اُترا ہے اور حضورؐ کی بابت دریافت کر رہا ہے۔ آپ فوراً آگے بڑھے۔ دیکھا کہ وہ عمیر بن وہب ہے ـــــ یعنی ان ممتاز قریشیوں میں سے ایک جنہوں نے ابھی ابھی بدر میں ذلّت آمیز شکست کھائی تھی۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں جانا چاہتا تھا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ اسے اندر بھیج دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اسے آزادانہ اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی تلوار کے پرتلے سے اس کی مشکیں کسیں اور انصار سے کہا کہ اسے اسی حالت میں حضورؐ کی خدمت میں لے جاؤ اور وہاں چوکنے

رہو کہ اس قسم کے دشمنوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ہرمزان نے عمیر بن وہب سے بھی زیادہ ذلّت آمیز شکست کھائی تھی اور جس پُرفریب طریقہ سے اس نے اپنی جان بچائی تھی وہ بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں تھا۔ پھر کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اسے اتنا قریب کر لیا کہ اس سے امورِ مملکت میں مشورے بھی لیتے رہے۔

آپؓ نے حکم دے رکھا تھا کہ بالغ قیدیوں کو مدینہ میں نہ آنے دیا جائے (حالانکہ بعض صحابہ بالخصوص حضرت عباسؓ چاہتے تھے کہ ایرانی قیدیوں کو مدینے آنے دیا جائے لیکن آپ نے اس کی سخت مخالفت کی تھی)۔ لیکن اس کے باوجود فیروز کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور اس کی نقل و حرکت پر کوئی نگاہ نہ رکھی ـــــ اگر عام حالات میں اس ضرورت کا احساس نہیں ابھرا تھا تو ہرمزان، جفینہ، فیروز وغیرہ کی خفیہ ملاقاتوں سے تو اس اندیشہ کو بیدار ہو جانا چاہئے تھا۔ حیرت ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا؟ لیکن ہم آج اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں جب کہ حقیقت تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ ذریعہ تو لے دے کے تاریخ ہی ہے اور تاریخ جس سطحی طور پر اس حادثہ کے آگے گزر گئی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

تاریخ کے بعض بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض گوشوں کی طرف سے، مبہم طور پر ہی سہی، اس ہونے والے حادثہ کے متعلق اشارات کئے گئے ہیں۔ (مثلاً) جبیر بن معطم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے آخری حج میں، میں ان کے ساتھ تھا۔ ہم جبلِ عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص نے پکارا، یا خلیفۃ الرسولؐ اللہ، پھر کہا یا امیر المومنین! بنولہب کے ایک بدو نے سُنا تو کہا کہ کون چلّا رہا ہے، واللہ، امیر المومنین اس سال کے بعد، جبلِ عرفات پر کبھی کھڑے نہیں ہوں گے۔ جب صبح ہوئی تو رمی الجمار کے وقت ایک کنکر آپ کے سر پر آ کر لگی جس سے ایک رگ پھٹ گئی۔ میں نے اُسی شخص کو پھر دامنِ کوہ سے کہتے ہوئے سنا کہ اس سال کے بعد امیر المومنین یہاں کبھی نہیں ٹھہریں گے۔

عینیہ بن حصن نے آپ سے کہا کہ ''یا تو آپ اپنی حفاظت کیجئے یا اہلِ عجم کو مدینہ سے باہر نکال دیجئے کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ ان میں سے کوئی آپ پر وار نہ کر دے''۔

سب سے اہم روایت آپ کی زوجہ مطہرہ (حضرت علیؓ کی صاحبزادی) حضرت اُمّ کلثومؓ کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ کعب احبار کہتا ہے کہ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے کعب کو بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! جلد بازی سے کام نہ لیجئے، ذی الحجہ ختم نہیں ہوگا کہ آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ آپؓ نے فرمایا کہ تم کبھی کہتے ہو جہنم میں، کبھی کہتے ہو جنت میں۔ اس نے کہا کہ یا امیر المومنین! ہم کتابِ خداوندی میں آپ کو جہنم کے دروازے پر پاتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس میں گرنے نہ دیں پھر جب آپ کی وفات ہو جائے گی تو لوگ قیامت تک جہنم میں دھڑا دھڑ گرتے جائیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دن پھر حاضرِ خدمت ہوا اور کہا کہ امیر المومنین! آپ وصیّت کر دیجئے کیونکہ آپ تین دن کے اندر اندر وفات پا جائیں گے۔ آپ نے کہا کہ تمہیں

کیسے معلوم ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کتابِ خداوندی میں ایسا لکھا پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تورات میں عمرؓ ابن خطاب کا ذکر ہے! اس نے کہا کہ آپ کے نام سے تو آپ کا ذکر تورات میں نہیں لیکن اس میں جو قرائن و شواہد اور حلیہ اور شمائل مذکور ہیں وہ بالکل آپ کے سے ہیں' اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ اس کے بعد دو دن متواتر آپ کے پاس آتا رہا اور جس صبح کو یہ ناشدنی واقعہ ہونا تھا اس سے پہلی رات کو آکر واضح الفاظ میں کہا کہ اب وقت باقی نہیں رہا۔

کعب احبارؔ، مدینہ میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسلام تو نہیں لایا تھا' لیکن نبی اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی عام مسلمانوں اور امیر المومنین سے خلا ملا رکھتا تھا[1]۔ جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو پھر اسلام لے آیا۔

جو روایات اوپر درج کی گئی ہیں ہم ان کی بالکلیہ صداقت کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خلاف سازش کی بھنک' ان لوگوں نے پالی تھی' لیکن وہ علانیۃً یا غیر مبہم طور پر اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے اشارات و کنایات کے پردوں میں حضرت عمرؓ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ کعبؔ احبار نے اسے جو کتابِ خداوندی کا مقدس نقاب اوڑھایا ہے تو اس سے بھی غالباً اس کا مقصد یہی تھا کہ حضرت عمرؓ تک وارننگ بھی پہنچ جائے اور وہ (کعبؔ) اس کے لئے (COMMITTED) بھی قرار نہ پائے۔ (اگرچہ ایک اور مصری مؤرخ عباس محمود العقادؔ کی رائے یہ ہے کہ خود کعبؔ بھی اس سازش میں شریک نظر آتا ہے۔ ہم ان کی اس رائے سے بھی متفق نہیں' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود آکر حضرت عمرؓ کو اس قسم کی وارننگ کیوں دیتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس کا علم تھا لیکن وہ بعض مصالح کی بنا پر متعیّن طور پر اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا)۔

اگر ان روایات میں کچھ بھی صداقت ہے تو حیرت ہوئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان انتباہات کو بھی درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے صاحبِ عزیمت انسان کو جب زندگی میں اس قدر محیر العقول کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں تو اس میں اس حد تک خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بہرحال' یہ حضرت عمرؓ کی (ضرورت سے زیادہ) خود اعتمادی تھی یا آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ کے رفقاء کی عدمِ احتیاط' نتیجہ اس کا نوعِ انسان کے لئے ایک ایسا عالمگیر نقصان ہے جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے عالمِ انسانیت میں صفِ ماتم بچھ گئی' اور نامعلوم ابھی یہ صفیں کب تک بچھی رہیں!

اور نچوڑ اس داستانِ خونچکاں کا یہ کہ ایرانؔ نے مسلمانوں کے ہاتھوں جو اِس قدر ذلّت آمیز شکست کھائی تھی' یہ اس کے انتقام کا پہلا قدم تھا ــــ اس کے بعد کے اقدامات کے لئے چودھواںؔ باب دیکھئے۔

1۔ حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے دورہ کے وقت' کعب احبارؔ سے آپ نے جو کچھ فرمایا تھا' وہ اُس مقام پر درج کیا جا چکا ہے۔

بزمِ انجم

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں!

گزشتہ صفحات میں، عالمِ انسانیت کے اس بطلِ جلیل کے بے شمار ایسے اقوال آپ کے سامنے آئے ہیں جو سمائے تاریخ پر درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور چونکہ وہ قرآن کے اَبدی حقائق پر متفرع ہیں اس لئے مرورِ زمانہ ان کی تابندگی پر کبھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ وہ آج بھی اسی طرح تروتازہ ہیں اور ہمیشہ اسی طرح سرسبز و شاداب رہیں گے۔ وہ ان صفحات میں درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں ترتیب کی مالا میں پرو کر یکجا کر دیا جائے تاکہ ان سے کسبِ ضیاء کرنے میں آسانی رہے۔ جناب فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا:

1- حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ۔ (ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے)۔ (چوتھا باب)

2- اللہ نے کائنات تمہارے لئے پیدا کی ہے اور تمہیں اپنے لئے۔ " "

3- "واللہ اعلم" مت کہو۔ جو بات نہیں جانتے اس کے متعلق سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔ " "

4- مسئلہ تقدیر کا حل — میں اللہ کی ایک تقدیر سے ہٹ کر اللہ ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ " "

5- اللہ، انسانوں کو براہِ راست رزق نہیں دیتا، انسانوں کے ذریعے دیتا ہے۔ " "

6- متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر (اللہ کے قانونِ زراعت پر) بھروسہ کرتا ہے۔ " "

7- ان اللہ یرفع بالقرآن اقوامًا ویضع بالقرآن اقوامًا (اللہ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے قرآن کے مطابق کرتا ہے۔ " "

8- محض لا اِلٰہ کہہ دینے سے جنت نہیں مل سکتی، جنت عمل سے ملتی ہے۔ " "

9- حجرِ اسود صرف ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ (چوتھا باب)

10- کسی قوم سے مقابلہ کے وقت یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں' تمہاری خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں — یہ ہے کامیابی کا راز۔ (پانچواں باب)

11- اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔ 〃 〃

12- جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔ 〃 〃

13- مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ دھوکا کھاتا ہے۔ (چھٹا باب)

14- ہماری عزت وعظمت اسلام کے صدقہ میں ہے۔ اس لئے سب تعریف وستائش اسی کی ہونی چاہئے نہ کہ ہماری۔ 〃 〃

15- خلافت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو حساب دیتے وقت بتایا جاسکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا! اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو وہ خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔ (ساتواں باب)

16- کسی کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ باہمی معاملات میں کھرا ثابت ہو' نہ کہ وہ جو نمازیں بہت پڑھتا ہو۔ 〃 〃

17- بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ سزا اُسے دی جائے گی جس نے اُسے اُس حالت تک پہنچایا۔ (حاطب ابن بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ)۔

18- اگر کسی کی وجاہت کے خیال سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے تو اللہ کی بادشاہت اور قیصر وکسریٰ کی حکومت میں فرق کیا ہوا! (جبلہ بن ایہم کا واقعہ)۔ 〃 〃

19- لوگوں کو ان کی مائیں آزاد جنتی ہیں' انہیں غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ 〃 〃

20- جب تک سربراہِ مملکت پر وہی کچھ نہ گزرے جو رعایا پر گزرتی ہے' اُسے ان کی تکالیف کا احساس کیسے ہوسکتا ہے۔ (آٹھواں باب)

21- اللہ تعالیٰ' حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔ (نواں باب)

22- عمر کی رائے وحیٔ خداوندی نہیں۔ یہ ایک انسان کی رائے ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اسے سند اور سنت نہ بناؤ۔ 〃 〃

-23 حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہوتو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو جائے تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔ (نواں باب)

-24 طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار' دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ " "

-25 جس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے محبت نہیں وہ رعایا کے لئے شفیق کس طرح ہوسکتا ہے۔ " "

-26 جو شخص خود کسی منصب کا خواہشمند ہو' اسے اس پر تعینات نہیں کرنا چاہئے۔ " "

-27 رعایا اس وقت تک اپنے حاکم کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہتا ہے۔ جب وہ فسق و فجور میں پڑ جاتا ہے تو رعایا اس سے بھی زیادہ فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔ " "

-28 ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہئے۔ " "

-29 وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو' لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں' اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔ " "

-30 گورنر کو لکھا کہ ایسا بن کر رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف ہو اور بدقماش خوفزدہ۔ " "

-31 جو شر پیدا کر کے غالب آیا' وہ غالب نہیں' مغلوب ہے۔ جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا' وہ کامیاب نہیں' ناکام ہے۔ " "

-32 جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار نہیں۔ اس کا مطلب حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔ " "

-33 جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلاموں کی طرح مخلص اور امین ہو۔ " "

-34 جھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو' عجمیوں کا سا تکلف نہ کرو۔ " "

-35 جس میں تکبر دیکھو' سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ " "

-36 اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ " "

-37 جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں' وہ قصرِ سعدؓ نہیں قصرِ فساد ہے۔ " "

-38 مرد کا حسب اس کا دین' نسب اس کی عقل اور مردانگی اس کا حُسنِ خلق ہے۔ نکاح کے رشتوں کے لئے یہ خوبیاں تلاش کرو۔ (دسواں باب)

-39 ازدواجی زندگی میں تصوراتی معیار (IDEALISM) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ " "

-40 ایک زاہدِ مرتاض سے کہا کہ اللہ تجھے غارت کرے، ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹ رہا ہے۔ (دسواں باب)

-41 دنیا کی سب سے بڑی مصیبت، کم مال اور کثرتِ عیال ہے۔ 〃 〃

-42 جوانوں سے کہا کہ جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تا کہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہِ ندامت نہ ہو۔ 〃 〃

-43 کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اُسے غصہ کی حالت میں نہ آزمالو۔ 〃 〃

-44 انسان کی عجیب حالت ہے۔ اس کے بیل یا گدھے میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے لیکن اس کی اپنی ذات میں جو خرابی پیدا ہو جائے اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتا ـــــ یعنی یہ اپنے آپ کو اپنے بیل اور گدھے جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔ 〃 〃

-45 ایک شخص نے آپ کی تعریف کی تو کہا کہ کیا تو مجھے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ 〃 〃

-46 کسی شخص کے متعلق رسوا کُن الفاظ استعمال نہ کرو۔ 〃 〃

-47 فیصلہ باطن کی پاکیزگی کے دعویٰ کے مطابق نہیں ہوگا، ظاہرا اعمال و کردار کی رُو سے ہوگا۔ 〃 〃

-48 وعظ سے بچو۔ اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ 〃 〃

-49 انسان کو چاہئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچّے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آ جائے تو مرد بن جائے۔ 〃 〃

-50 اگر فراتؔ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ 〃 〃

-51 امیر المومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اُسے یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ (گیارھواں باب)

-52 اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کر کھائیں۔ 〃 〃

-53 خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔ 〃 〃

-54 رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے، جب وہ حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو جائے۔ 〃 〃

-55 لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو۔ مُٹھی مُٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔ 〃 〃

-56 اللہ نے مجھے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اُس تک نہ پہنچنے دوں۔ (بارھواں باب)

-57 (عُمر کے آخری لمحات میں فرمایا) اگر عمرؓ نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی (عمرؓ کی) ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے نزدیک بے وزن ہو جائیں گی۔ (تیرھواں باب)

58- حکومت کی اصلاح تین چیزوں سے ہوسکتی ہے —— امانات (ذمہ داریوں) کی ادائیگی' قوت کے ساتھ گرفت اور قرآن کے مطابق فیصلے۔ اور دولت کی اصلاح دو چیزوں سے ہوسکتی ہے —— حق کے ساتھ لیا جائے اور باطل میں صَرف ہونے سے بچایا جائے۔ (جابیہ کا خطبہ)

59- ہم اُنہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا حکم اللہ نے دیا ہے' اور انہی سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔ (ایک تقریر)

60- جس نے اپنی مدد کے لئے ''فلاں خاندان'' کہہ کر آواز دی' سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد قبائلی اور خاندانی تفریقات ختم ہوجاتی ہیں۔ (حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے نام خط)

قادسیہ کی فتح کی خبر سننے کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی وہ بھی اس قابل ہے کہ اسے اس سلکِ مروارید میں شامل کر دیا جائے۔ آپ نے کہا:

بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنانا چاہوں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا فریضہ میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر مَیں اس فریضہ کو اس طرح سرانجام دوں کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں اطمینان کی زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے اور اگر خدانخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری انتہائی بدبختی ہوگی۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت بھی کرتا رہتا ہوں —— لیکن صرف قول سے نہیں' عمل سے بھی۔

اور مدائن کی فتح کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

آج مجوسیوں کی حکومت فنا ہوچکی۔ اب وہ اپنے ملک میں بالشت بھر زمین کے بھی مالک نہیں ہوسکیں گے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں۔ مسلمانو! خدائے تعالیٰ نے تمہیں مجوسیوں کی زمین' مجوسیوں کی سلطنت' مجوسیوں کے اموال و املاک کا مالک بنایا ہے تاکہ اب تمہارے اعمال و افعال کو جانچے' پس تم اپنی حالت نہ بدل لینا۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو اللہ تم سے بھی حکومت چھین لے گا اور کسی دوسری قوم کو دے دے گا۔

یہ آپ کی آخری نصیحت تھی۔ اس کے چند ہی روز بعد' آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اور آیئے! ابدی حقائق کے ان گلہائے شاداب کو اپنے دامن میں لئے' ہم بھی اس حسین و جمیل محفل سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوں کہ

اَبدی بادِ بہارِ تُو کہ در انجمنت
کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چودھواں
باب

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہُوا تیرے بعد!

(اِنتقام)

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ [3:118]

بغض ونفرت کے بعض جذبات کبھی کبھی ابھر کر ان کی زبان تک آ جاتے ہیں لیکن وہ حسد وانتقام کی اس آگ کے مقابلہ میں کچھ نہیں جو اِن کے سینوں میں دبی ہوئی ہے۔

ایران کا شکست خوردہ گورنر' ہرمزانؔ' جب پا بجولاں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو اُس وقت ان دونوں میں جو مکالمہ ہوا تھا' اُسے ایک بار پھر سامنے لایئے[1]۔ حضرت عمرؓ نے اُس سے کہا تھا کہ ہرمزانؔ! یہ کیا بات ہے کہ اس سے پہلے عربوں نے جب بھی تم لوگوں کے سامنے آنے کی جرأت کی' تم نے انہیں نہایت آسانی سے پسپا کر دیا لیکن اب حالت یہ ہے کہ وہی عرب تمہاری پوری کی پوری مملکت کو فتح کئے جا رہے ہیں اور تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم پا بجولاں میرے سامنے ہو اور تمہارا شاہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔

ہرمزانؔ نے جواب میں کہا تھا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اس سے پہلے جب جنگ ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف عرب۔ ایرانیوں کے لئے تنہا عربوں کو شکست دے دینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اب جو جنگ ہوتی ہے تو اس میں ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا —— ہمارے لئے ان دو قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم شکست کھا جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی قوت کا راز

کیسی عمیق حقیقت تھی جسے ہرمزانؔ دو لفظوں میں بیان کر گیا —— اور حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی دیدہ وری کی داد دینی پڑتی ہے' جن کی نگاہیں' اسلام کی اس منفرد اور بسیط حقیقت تک ایسے صاف اور شفاف انداز سے پہنچ گئیں اور اس طرح انہوں نے جماعتِ مومنین کی بے پناہ قوت کا راز پا لیا۔ ہرمزانؔ نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات کی ترجمانی تھی جن

1۔ دیکھئے چھٹا باب۔

میں کہا گیا ہے کہ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ [8:19] ''خدا مومنین کے ساتھ ہے''۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ [30:47] ''مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے''۔ ایرانی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مومنین کے ساتھ ہے' ہم (یا دنیا کی کوئی طاقت) ان پر غالب نہیں آ سکتی۔ لہٰذا' ان سے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے ان کے خدا کا ساتھ چھڑا دیا جائے۔

ان سے قرآن چھڑا دو

اور اس کے بعد' ہماری ساری تاریخ اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارا خدا کس طرح چھڑایا گیا۔ ظاہر ہے کہ خدا مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے' بہ نفسِ نفیس' زمین پر نہیں آ جاتا تھا۔ ''خدا کے ساتھ'' ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اُس زمانے میں مسلمان خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ اس کے دین کا تمکّن' اور خدا کے اس وعدے کا عملی ثبوت تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا [4:141] ''خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں ہونے دے گا''۔ ان کے ہاتھوں شکست خوردہ قوموں کی سازش یہ تھی کہ ان سے خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کو الگ کر دیا جائے۔ اسی کو اقبالؒ ''عجمی سازش'' کہہ کر پکارتا ہے۔ واضح رہے کہ جب اقبالؒ عربی اسلام کے مقابلہ میں عجمی اسلام کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد عرب اور ایران کے دو ملک نہیں ہوتے۔ عربی اسلام سے اس کی مراد ہوتی ہے وہ اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے عالمِ انسانیت کو عطا فرمایا اور جو' اَب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور عجمی اسلام سے مراد مروجہ اسلام ہے جس میں تحریف ہو چکی ہے۔ وہ اوّل الذکر کو عربی اس لئے کہتا ہے کہ اس کی اوّلین مخاطب قوم عرب تھی اور وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا اور ثانی الذکر کو عجمی اس لئے کہ اس کی تحریف کی ابتداء بھی ایران سے ہوئی تھی اور جن غیر قرآنی نظریات' تصورات اور معتقدات سے یہ اب مرکب ہے' ان کا معتدبہ حصہ بھی قدیم ایرانی (مجوسی) مذہب اور تمدن پر مشتمل ہے۔

ایران اور روما کی فتوحات میں فرق

صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے ایران اور روما دونوں سلطنتوں کو پاش پاش کیا تھا لیکن ان میں ایک نبیادی فرق تھا۔ روما کی سلطنت کے صرف بعض حصے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے' نہ ان کی پوری کی پوری مملکت کا خاتمہ ہو گیا تھا' نہ ان کی تہذیب مٹی تھا۔ اس کے برعکس' ایران کی مملکت بھی ختم ہو گئی تھی اور ان کی وہ ہزار ہا سالہ تہذیب بھی' جس پر انہیں اس قدر فخر و ناز تھا' مٹ گئی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کی اس فتح کا زخم' ایرانیوں کے دل پر بڑا گہرا تھا اور اسی لئے وہ' مسلمانوں' (بلکہ اسلام) کے خلاف انتقام جوئی میں پیش پیش تھے۔ باقی اقوام' یہودی' نصاریٰ' طبعاً اُن کا ساتھ دیتے تھے۔ کوشش ان سب کی یہی تھی کہ مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہو جائے ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور پوری طرح کامیاب ہوئے۔

ایرانی اسلام لے آئے

ایرانؔ اور رومؔا میں ایک فرق اور بھی تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' مسلمانوں نے ان کے ممالک فتح کئے تھے لیکن وہاں کی آبادی کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل رہی — کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا کیونکہ ایسا کرنا قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف تھا۔ سلطنتِ رومؔا کے مفتوح علاقوں کے باشندے (عیسائی) عام طور پر اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن ایرانؔ کے باشندے بالعموم مسلمان ہوگئے۔ ان میں سے اکثر جیوشِ اسلامیہ کے حملوں کے وقت' ساتھ کے ساتھ مسلمان ہوتے گئے۔ ان اسلام لانے والوں میں' ایرانی عوام ہی نہیں تھے' ان کے اربابِ دانش و بینش اور اعیانِ دساتیر وضوابط بھی تھے۔ مثلاً شاہنشاہ یزدگردؔ نے ویلم کی قوم سے ایک منتخب دستہ تیار کیا تھا جس کی تعداد چار ہزار تھی۔ یہ ''جُندِ شاہنشاہ'' یا بادشاہ کا لشکرِ خاص کہلاتا تھا۔ فتح قادسیہ کے بعد یہ لشکر ایرانیوں سے الگ ہوکر' اسلام لے آیا اور حضرت سعد ابنِ ابی وقاصؓ کی اجازت سے کوفہ میں آباد ہوگیا۔ اسی طرح' یزدگرد کی فوجِ ہراول کا سردار' ایک جلیل القدر افسر تھا جو سیاؔہ کے لقب سے مشہور تھا۔ یزدگرد جب اصفہان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے سیاؔہ کو ایک منتخب لشکر کے ساتھ اسلامی افواج کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا' لیکن وہ مقابلہ کرنے کے بجائے' اپنے لشکر سمیت مسلمان ہوگیا۔ یہ سب بصرہ میں آباد ہوگئے۔ باذانؔ' نوشیرواں کی طرف سے یمنؔ کا گورنر تھا۔ اس کی رکاب میں جس قدر فوج تھی اس میں سے بھی بیشتر مسلمان ہوگئے تھے۔

اساورہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ شاہنشاہ یزدگردؔ کا ذاتی لشکر بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ یہ لوگ صرف فوجی سپاہی نہیں تھے بلکہ اکبرؔ کے نورتنوں کی طرح' شاہنشاہ کے مشیرِ خاص تھے اور اَساوؔرہ کہلاتے تھے۔ ایران میں شاہنشاہ کے تقرب اور عزت وعظمت کا سب سے بڑا نشان' سونے کا کنگن ہوتا تھا۔ جنہیں یہ نشان مرحمت ہوجاتا وہ اہلِ اساوؔرہ کہلاتے تھے۔ (اسوؔرہ کنگن کو کہتے ہیں' قرآنِ کریم میں اہلِ جنت کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (سونے کے کنگن پہنے ہوں گے (18:31) تو اس سے مراد بلند مدارج (مراتب) ہے۔ فتوحات کے بعد' یہ لوگ فوج درفوج اور جوق درجوق اسلام لاتے چلے گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے (نہ کہنا چاہتے ہیں) کہ یہ سب (اسلام لانے والے) دل میں کوئی کھوٹ لے کر مسلمان ہوئے تھے' لیکن (جیسا کہ آگے چل کر نظر آجائے گا) ان کے اربابِ فکر ونظر کا بیشتر حصہ اسی مقصد کے لئے زمرۂ اُمتِ مسلمہ میں داخل ہوا تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں میں اپنے قدیم مجوسی نظریات ومعتقدات آسانی سے پھیلا سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ (اُس زمانے کی) عربوں جیسی سادہ ذہنیت کی حامل قوم' ایرانی فکر کی پیچیدگیوں اور ان کی عیارانہ سیاست کی دسیسہ کاریوں کی حریف ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے وہ اس میدان میں' ان سے نہایت آسانی سے مات کھا گئے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ لیکن ان میں سے جو لوگ نیک نیتی سے بھی مسلمان ہوئے تھے' ان کا اسلام لانا ایسا ہی تھا جیسا ان بدوّی قبائل کا اسلام لانا جن کے متعلق

قرآنِ کریم میں ہے کہ...... قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا اِن سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا تمہیں یہ کہنا چاہئے کہ تم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ [49:14] ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے باخبر تھے' چنانچہ ان کے پیشِ نظر یہ پروگرام تھا کہ ان نومسلموں کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے' ہرمزان کی سازش کارگر ہوگئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ' (حضرت) عمرؓ کا وجود ہے' جب تک اسے راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا' ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ وہ رکاوٹ دُور ہوگئی تو اگلا راستہ صاف اور آسان ہوگیا۔ نومسلم عوام کی تعلیم و تربیت بھی نہ ہو سکی اور ان کے عیار طبقہ کے لئے مسلمانوں میں اپنے خیالات پھیلانے کیلئے فضا بھی سازگار ہوگئی۔

اس مقصد کے لئے' عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک محاذ کا مقصد اسلامی سلطنت کو کمزور کر کے اپنا سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا اور دوسرے کا منتہیٰ اسلام کو کسی نہ کسی طرح عجمی تصورات' نظریات و معتقدات کے رنگ میں رنگ (بلکہ ڈبو) دینا۔ بلکہ (اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو) سیاسی غلبہ بھی ان کے لئے مقصود بالذّات نہیں تھا۔ وہ بھی اس دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ جو کچھ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا وہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

نازک مقام

لیکن یہ وہ وادی ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے ''فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں'' اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے مروجہ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس عجمی سازش کا شکار' اور غیر اسلامی تصورات سے ملوث نہ ہو چکا ہو —— یہ اسلام' اربابِ شریعت کا ہو' یا اصحابِ طریقت کا اور اربابِ شریعت میں سے بھی کسی فرقہ یا مسلک کا ہو' اس پر عجمی (غیر قرآنی) تصورات کا ٹھپہ ضرور لگا ہوا ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ جب مروجہ اسلام کے متعلق کہا جائے کہ یہ غیر اسلامی معتقدات و نظریات سے ملوث ہے' تو یہ بات ہمارے مذہب پرست طبقہ پر یقیناً گراں گزرے گی۔ اس لئے کہ وہ اس پر مصر ہوتے ہیں کہ جس اسلام کے وہ پیرو ہیں' وہی حقیقی اسلام ہے۔ بظاہر یہ بات ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز سی نظر آتی ہے کہ اگر کسی مروجہ عقیدہ یا مسلک کے متعلق بتا دیا جائے کہ وہ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے تو یہ حضرات اس پر کیسے مُصر ہو سکتے ہیں کہ حقیقی اسلام وہی ہے جس پر وہ کاربند ہیں۔ لیکن یہ چیز کتنی ہی ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز کیوں نہ ہو' ہے یہ حقیقت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں سند اور حجت' روایات اور تاریخ ہیں' اور قرآن کا وہی مفہوم قابلِ قبول ہو سکتا ہے جس کی تائید روایات اور تاریخ سے ہوتی ہو۔

کتبِ روایات و تاریخ

یعنی یہ حضرات، بجائے اس کے کہ روایات اور تاریخ کو قرآن کے تابع رکھیں، قرآن کو روایات اور تاریخ کے تابع رکھتے ہیں (تفصیل ان امور کی ذرا آگے چل کر ملے گی)۔ اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ روایات کے مجموعے ہوں یا کتبِ تاریخ، یہ سب ایرانیوں کی مرتب کردہ ہیں۔ سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں صحاحِ ستہ، یعنی صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات کی احادیث کی چار کتابیں ایسی ہیں۔ یہ مجموعے سنیوں کے ہوں یا شیعوں کے، ان کے جمع اور مرتب کرنے والے سب ایرانی تھے۔ اسی طرح تاریخ کی سب سے پہلی اور قابلِ اعتماد تصنیف امام طبریؒ کی ہے۔ وہ بھی ایرانی تھے (تفسیر کی سب سے پہلی کتاب بھی انہی کی ہے)۔ اور یہ سب کتابیں بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے زبانی روایات کی بِنا پر، تیسری، چوتھی صدی ہجری میں مُرتّب ہوئیں۔ صدرِ اوّل کے اتنے عرصہ بعد، اس طرح مرتب شُدہ کتبِ روایات و تاریخ جس قدر قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں، ظاہر ہے۔

تقیّہ

جہاں تک شیعہ حضرات کی کتبِ روایات اور تاریخ کا تعلق ہے، ان کے سلسلہ میں ایک دشواری اور بھی لاحق ہوتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں تقیّہ، دین کے مسلّمات (بلکہ اساسات) میں سے ہے۔ تقیّہ کیا ہے؟ اور دین میں اس کا مقام کیا، اسے ہم، ان حضرات کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب، اصولِ کافی[1] سے بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے باب تقیّہ میں لکھا ہے:

(1) فرمایا حضرت ابوجعفر علیہ السّلام نے کہ مخالفین سے بظاہر میل ملاپ رکھو اور باطن میں مخالفت رکھو۔

(2) حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے امرِ امامت کو اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے۔ بلکہ چاہیئے یہ کہ نا اہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں۔ ہمارے دوستوں سے ہمارا سلام کہو اور کہو کہ رحم کرے اللہ اس بندہ پر جو بحالتِ تقیّہ ہمارے مخالفوں سے اپنی دوستی ظاہر کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اے سلیمان! تم اس دین پر ہو کہ جس نے چھپایا، خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا اللہ نے اُسے ذلیل کیا۔

یہ ہے تقیّہ —— اور اس کا مقام یہ ہے کہ:

فرمایا حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہ اے معلّی! تقیّہ میرا اور میرے آباء کا دین ہے۔ جس کے لئے تقیّہ نہیں اس کے لئے دین نہیں۔ (اردو ترجمہ سید ظفر حسین صاحب قبلہ، جلد دوم صفحہ 247-240)

1۔ اصولِ کافی اور فروعِ کافی اور ان کے تراجم کا تعارف ذرا آگے چل کر کرایا جائے گا۔

اسی کے مطابق ان ائمہ کرامؒ کا عمل بھی تھا۔ کافی میں ہے:

میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام کو فرماتے سنا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ ہم نہیں کہتے مگر حق' تو اس کو چاہیے کہ وہ اکتفا کرے اس پر جو ہم سے جانا ہے اور اگر ہم سے کوئی بات ایسی سنی جو حکمِ خدا کے خلاف ہو تو سمجھ لے کہ ہم نے تم سے دشمنوں کے ضرر کا دفعیہ چاہا ہے۔ یعنی بصورتِ تقیہ اس کو بیان کیا ہے۔ (الشافی۔ جلد اوّل' صفحہ 73-72)

ایک اور روایت میں ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک شیعہ سے فرمایا کہ اگر میں تم سے اس سال ایک حدیث بیان کروں اور دوسرے سال جب آؤ تو اس کے خلاف بیان کروں تو تم کس پر عمل کروگے۔ میں نے کہا' آخر والی پر۔ امام نے فرمایا اللہ تم پر رحم کرے گا۔ (یعنی پہلی روایت بِنا بر تقیہ تھی)۔ (ایضاً صفحہ 73)

ظاہر ہے کہ ان حضرات کی مرتّب کردہ کتبِ احادیث و تاریخ سے اصل حقیقت کا معلوم کرنا' ناممکنات میں سے ہے۔

ایک واقعہ ـــــ حضرت عائشہؓ کی عُمر

یہ ہے ہمارے ہاں کی (سُنی اور شیعہ حضرات کی) کتبِ روایات و تاریخ کی جمع و تدوین کی حقیقت' لیکن انہیں مقدس ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا' کفر قرار دے دیا جاتا ہے۔ ان کی تقدیس کے سلسلہ میں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔

ہمارے ہاں یہ امر بطور مسلمہ مانا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال کی تھی۔ یہ بات ایک طرف قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہے جس کی رُو سے بلوغت' نکاح کی شرط ہے۔ دوسری طرف' اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیّبہ کے خلاف جس قسم کا اعتراض وارد ہوتا ہے' اس پر مستشرقین کی تصنیفات شاہد ہیں۔ راقم الحروف نے ایک مدّت کے تجسّس و کاوش کے بعد' بالتّحقیق ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ اس پر ان حضرات کو سجدۂ شکرانہ ادا کرنا چاہیئے تھا کہ غلط روایات نے دامنِ رسالتمآبؐ پر جو داغ لگایا تھا' اور جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو دریدہ وہنی کا موقعہ مل جاتا تھا' اِس تحقیق سے وہ داغ دُھل گیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ردِ عمل کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس سے بخاری شریف کی روایت کو غلط تسلیم کرنا پڑتا ہے' جو کفر ہے۔ لہٰذا' یہ شخص منکرِ حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ چنانچہ میرے خلاف ایک ہزار 'علمائے کرام' نے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

یہ ہے ان کتابوں کی تقدیس کا عالم ـــــ اور ظاہر ہے کہ یہ خود اسی عجمی سازش کا ایک حصہ ہے اور اُسے کامیاب بنانے اور اَبدیّت عطا کرنے کا نہایت محکم ذریعہ۔ ان حالات میں آپ سوچیئے کہ جب ہم ان تاریخی بیانات اور روایات کو وضعی قرار دیں گے جن پر ہمارے مروجہ اسلام کے خلافِ قرآن نظریات و معتقدات کی بنیاد ہے تو ہمارا قدامت پرست طبقہ اس سے کیسے متفق ہو سکے گا؟

میرا مسلک

روایات اور تاریخ کے باب میں میرا جو مسلک ہے' اسے میں (اس کتاب کے) مقدمہ میں وضاحت سے بیان کر چکا ہوں۔ مختصراً وہ مسلک یہ ہے:

(1) دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب' قرآنِ مجید ہے' جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ ہماری کتبِ روایات وتفسیر میں جو باتیں' قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں' انہیں صحیح سمجھنا چاہیئے اور جو اس کے خلاف ہیں' انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔

(2) حضور نبی اکرمؐ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے اور جملہ صحابہ کبارؓ کے مومنِ حقّا ہونے پر قرآن کی شہادت۔ اس لئے کتبِ روایات اور تاریخ میں جو باتیں ایسی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ داغدار ہوتی ہو' یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کسی قسم کا طعن پڑتا ہو' انہیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ ہے میرا مسلک۔ باقی رہے دورِ صحابہؓ کے بعد کے وہ بزرگ جنہیں واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے (خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے بتایا جائے)' جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں' اگر ان میں کوئی بات ایسی ہے جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہے' تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس بات کی نسبت غلط ہے۔ اگر وہ دین کے بزرگ تھے' تو وہ ایسی بات کہہ یا کر نہیں سکتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص' اس کے باوجود' اس پر اصرار کرتا ہے کہ اس کی نسبت ان کی طرف بالکل صحیح ہے تو پھر اللہ کا یہ ارشاد میرے لئے کافی ہوجاتا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں دنیا سے گزر گئے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۚ جو کچھ انہوں کیا' اس کے ذمہ دار وہ ہیں' جو کچھ تم کرو گے اس کے ذمہ دار تم ہوگے۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ [2:141] ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا ان میں جتنی باتیں ایسی ہیں جو قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہیں' ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ صحابہ کبارؓ یا بزرگانِ عظام کی طرف ان کی نسبت' غلط ہے۔ میں نہ شیعہ ہوں نہ سُنّی' نہ اہلِ فقہ ہوں' نہ اہلِ حدیث۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی آخری' مکمل اور غیر متبدل کتاب مانتا ہوں اور حضورؐ ختمی مرتبت کو خدا کا آخری رسول' جس پر نبوت ختم ہوگئی۔ میں تاریخ اور روایات کا جائزہ قرآنِ کریم کی روشنی میں لیتا ہوں۔ جو کچھ میں نے آئندہ صفحات میں لکھا ہے' اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عجمی سازش نے کس چابکدستی سے قرآن کا دامن اُمت کے ہاتھوں سے چھڑا کر' اسلام کو کیا سے کیا بنا دیا۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے' تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بات کسی کو ناگوار گزرے' تو (اگرچہ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں' تاریخ اور روایات پر ہوگی' بایں ہمہ) مَیں' ان سے معذرت طلب ہوں کہ کسی کی آزردگی خاطر میرا شیوہ نہیں۔

وما تو فیقی الا با اللہ العلی العظیم۔

اُس زمانے کے اہلِ ایران

ایک وضاحت اور بھی ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام میں اس تحریف کا آغاز ایران سے ہوا اور اس میں جس قدر غیر اسلامی نظریات و معتقدات در آئے' وہ ایران کے قدیم مذہب مجوسیّت سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم موجودہ اہلِ ایران کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں' قطعاً نہیں۔ ان سے مراد اُس زمانے کے اہلِ ایران ہیں۔ وہ سب قصۂ ماضی ہو چکے ہیں' اس لئے اگر (از رُوئے تاریخ) ان پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری' اُن کے بعد آنے والوں یا موجودہ اہلِ ایران پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا' آئندہ صفحات میں جو کچھ ایران کے متعلق کہا جائے گا' اس سے اُس زمانے کے اہلِ ایران مراد ہوں گے۔ اس وضاحت کو ہر مقام پر پیشِ نظر رکھئے۔

مسئلہ خلافت

وہ پہلی چٹان جس سے ٹکرا کر اُمت کی کشتی دو ٹکڑے ہو گئی' مسئلہ خلافت ہے۔ پہلے یہ مسئلہ محض سیاسی تھا لیکن بعد میں اس نے مذہبی شکل اختیار کر لی اور اس طرح یہ اُمتِ واحدہ' دو مستقل مذہبی فرقوں (سنی اور شیعہ) میں اس طرح بٹ گئی کہ اس خلیج کے پاٹنے کی کوئی شکل ہی نہیں۔ ہم تیسرے باب (متعلقہ خلافت) میں دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ کا انتخاب اُمت کے باہمی مشورے سے عمل میں آتا ہے۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا تو حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر اس سے اختلاف کیا کہ وہ رسول اللہؐ کے ترکہ کے وارث ہیں اور خلافت بھی اسی میں آتی ہے' اس لئے خلافت ان کا حقِ وراثت ہے جسے کوئی اور انہیں لے جا سکتا۔ اپنے اس دعویٰ کو منوانے کے لئے انہوں نے کچھ عرصہ تک تگ و تاز بھی کی لیکن حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ خلافتِ فاروقیؓ کے زمانے میں بھی اس باب میں خاموشی رہی لیکن حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ پھر نہ بُجھ سکی۔

بطورِ حقِ وراثت

ابنِ جریر طبری نے اپنی تاریخ میں' حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے واقعہ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ہم پوری تفصیل میں جانے کے بجائے (بغرضِ اختصار) اس کا اتنا حصہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ''جب حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آ گیا تو حضرت علیؓ منہ موڑ کر چل دیئے لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے ٹوکنے پر مڑے اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ —— ''فریب ہے' کتنا بڑا فریب'' (طبری' جلد نمبر 3)۔ نہج البلاغہ (جو حضرت علیؓ کے خطبات اور دیگر ارشاداتِ گرامی پر مشتمل ہے) شیعہ حضرات کے ہاں بڑی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کا ایک مشہور خطبۂ شقشقیہ کے نام سے منقول ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے

بعد' ہر سہ خلفاء نے ان کے حقِ خلافت کو' جو انہیں وراثتاً ملتا تھا غصب کر لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان حالات پر صبر کیا اور ''اپنی میراث کو تاراج ہوتے دیکھتا رہا''۔

اری تراثی نهبا۔ (نہج البلاغہ' شائع کردہ غلام علی اینڈ سنز' 1963ء ایڈیشن' صفحہ 37-136)

لیکن خلافت بطور حقِ وراثت کے دعویٰ میں ایک سقم تھا جس کی وجہ سے یہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) بنو عباس نے یہ دعویٰ کیا کہ وراثت کی بنا پر خلافت ان کا حق ہے' نہ کہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا۔ ان کی پیش کردہ دلیل یہ تھی کہ شریعت کی رُو سے' چچا کی موجودگی میں' چچا کے بیٹے کو حقِ وراثت نہیں پہنچتا۔ رسولؐ اللہ کی وفات کے وقت' حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ موجود تھے۔ لہٰذا' حضورؐ کی وراثت کے حقدار وہ تھے' نہ کہ حضورؐ کے چچا کے لڑکے حضرت علیؓ۔ بنو عباس کے اس دعویٰ کی بنا پر یہ بحث خاندانی یا سیاسی بن کر رہ گئی۔ اس نے جو مذہبی شکل اختیار کی' اس کی بنیاد دوسری تھی۔ اس بنیاد تک پہنچنے کے لئے کچھ تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

اہلِ ایران کا اپنے شہنشاہوں کے متعلق عقیدہ

اہلِ ایران کا اپنے بادشاہوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ عام انسان نہیں' بلکہ فوق البشر ہوتے ہیں اور خدائی صفات و اختیارات کے حامل۔ وہ لوگوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی طرف سے حکومت کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے حکومت ان کا اور صرف انہی کا حق ہوتا ہے اور کوئی شخص ان کا یہ حق چھین نہیں سکتا۔ یہ حق ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کا سایہ اور اس کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے' اس لئے لوگوں پر ان کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔ ساسانی شہنشاہوں کے زمانہ میں یہ عقائد شدت اختیار کر چکے تھے کہ اتنے میں قرآن آیا اور اس نے ان تمام عقائد کو باطل قرار دے دیا۔

عبداللہ ابنِ سبا

عہدِ حضرت عثمانؓ میں ایک عجیب و غریب شخصیت تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہے' جو عبداللہ بن سبا کے نام سے مشہور' اور ابن السوداء کے لقب سے معروف ہے۔ بعض مؤرخین اسے ایک فرضی شخصیت[1] قرار دیتے ہیں لیکن جو اس کی واقعیت کے قائل ہیں' ان کا بیان ہے کہ یہ یمن کا رہنے والا یہودی تھا جو مدینہ میں آ کر مسلمان ہوا۔ اس نے کچھ عرصہ وہاں رہ کر رموزِ مملکت سے واقفیت حاصل کی اور اس کے بعد وہاں سے نکل کر کوفہ کو اپنی خفیہ سازشوں کا اوّلین مرکز بنایا۔ بعض تاریخی روایات میں ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے مدائن (ایران) میں بھی رہا تھا۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا اور وہاں سے سازش کا جال ہر طرف پھیلانا شروع کر دیا۔ اس سازش کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت علیؓ کے حق میں خلافت سے

1۔ مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری (الفتنۃ الکبریٰ ــــ حضرت عثمانؓ)

دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ 35ھ میں، ایک مسلح لشکر نے، جو اہالیانِ مصر، بصرہ اور کوفہ پر مشتمل تھا، مدینہ پہنچ کر، خلیفۃ المسلمین، حضرت عثمانؓ کا گھیراؤ کیا اور آخر الامر انہیں روزِ روشن میں شہید کر ڈالا اور حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ شہادتِ حضرت عثمانؓ کے بعد (تاریخ کے بیان کے مطابق) جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے زیرِ قیادت اُمت میں باہمی تصادم ہوا (جسے جنگِ جمل کہا جاتا ہے) تو عبداللہ بن سبا حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا۔ اسی کی وہ جماعت تھی کہ جب انہوں نے فریقین میں صلح کے آثار دیکھے تو حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ پھر یہی جماعت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان، جنگِ صفین کے موقعہ پر، حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہو کر اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہی۔

رجعت کا عقیدہ

لیکن یہ عبداللہ بن سبا کا سیاسی کردار ہے۔ اس کی وہ سازش جس نے اسلام کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اس کے وہ نظریات تھے جن کا پراپیگنڈہ اس نے اس شدّومد سے کیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ مجھے مسلمانوں کی اس سادگی پر تعجب آتا ہے کہ یہ اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے لیکن رسولؐ اللہ کے دوبارہ دنیا میں آنے کو نہیں مانتے۔ ان کی مراجعت دنیا میں ضرور ہوگی۔ رسولؐ اللہ کے متعلق یہ عقیدہ تو مسلمانوں میں عام نہ ہو سکا، لیکن (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) شیعہ حضرات کے ہاں بعض ائمہ کے متعلق یہ عقیدہ پھیل گیا۔ اسے رجعت کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔

(تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے بعد اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہر پیغمبر کا ایک خلیفہ اور وصّی ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے وصی، حضرت علیؓ ہیں۔ حضورؐ کی نص (واضح ارشاد) کے مطابق، حضرت علیؓ کو آپؐ کے بعد خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔ جن لوگوں نے انہیں خلیفہ نہیں بننے دیا انہوں نے ان کے حق کو غصب کیا ہے۔ اب مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو معزول یا قتل کر کے حضرت علیؓ کو ان کی جگہ خلیفہ بنائیں اور اس طرح اپنی سابقہ غلطی کی تلافی اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔

امامتِ منصوص کا نتیجہ

ان معتقدات کی اشاعت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں، خلافت کے متعلق اس قسم کے نظریات پھیلنے شروع ہو گئے، جو ایرانی اپنے شہنشاہوں کے متعلق رکھتے تھے، ان نظریات کی رُو سے کہا گیا کہ خلافت (جس کی جگہ امامت کی اصطلاح اختیار کی گئی، جو خلافت کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے) ان مصالحِ عامہ میں سے نہیں جنہیں خدا انسانوں کی فکر و نظر کے سپرد کر دے اور جو اُمت کے متعین کر دینے سے متعین ہو جائے۔ یہ دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے۔ رسولؐ کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ اسے یونہی چھوڑ جائے اور اُمت کے حوالے کر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُمت کے لئے ایک امام مقرر کر جائے، چنانچہ وہ، اس کے لئے، خدا کے حکم کے مطابق، وصیت کر کے جاتا ہے۔ رسولؐ اللہ نے امامت کے لئے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت فرمائی تھی۔ اسی جہت سے آپ (حضرت علیؓ) کو وصیِ رسولؐ اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، ہر امام، اپنے بعد

ہونے والے امام کے حق میں وصیت کر کے جاتا ہے' اور چونکہ یہ وصیت' خدا کے حکم کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے امام' منصوص یا مامور من اللہ ہوتا ہے (یعنی خدا کی طرف سے مقرر کردہ امام)۔ وہ ہر غلطی سے منزّہ اور ہر خطاء سے پاک ہوتا ہے' اس لئے اسے امامِ معصوم کہا جاتا ہے۔ لہٰذا' امامِ منصوص کے علاوہ' کسی اور کا جانشینِ رسولؐ اللہ بن بیٹھنا غصبِ امامت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ یہ امامت صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق ہے۔

کفر وایمان کا خطِ امتیاز

ظاہر ہے کہ خلافت کے متعلق یہ عقیدہ' سنیوں کے عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہے۔ اس سے امت میں (پہلی مرتبہ) دو ایسے فرقے وجود میں آ گئے جن میں مستقل نزاع پیدا ہوگئی۔ اس سے آگے بڑھ کر اِمامِ منصوص کی معرفت' اصولِ ایمان میں سے قرار دے دی گئی۔ اس لئے یہ نقطہ' کفر اور ایمان میں حدِ فاصل بن گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے' شیعہ اور سُنّی مسلمانوں کے دو فرقے قرار نہیں پاتے' بلکہ (شیعہ حضرات کے عقیدہ کی رو سے) غیر شیعہ (جو امام منصوص کے قائل نہیں) دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے شیعہ حضرات کے نزدیک' سُنّی مسلمان ہی قرار نہیں پاسکتے۔ پھر' جس طرح' آگے چل کر' سنیوں میں متعدد فرقے پیدا ہوگئے' اسی طرح شیعہ بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ لیکن جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے' اس پر ان کے سب فرقے متفق ہیں (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی' جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ شیعہ حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ عقائد اُس علم پر مبنی ہیں جو ان کے ائمہ کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا)۔

ایرانی نظریہ

(تاریخی روایات کی رُو سے) جن خیالات' کی تخم ریزی عبداللہ بن سبا نے کی تھی وہ ان شکلوں میں برگ و بار لائے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ شخص یمن کا رہنے والا تھا' لیکن چونکہ یمن اُس زمانے میں ایرانیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا اور وہاں ایرانی بکثرت آباد تھے' اس لئے ابن سبا کے اِن خیالات کا سرچشمہ ایرانیوں کے معتقدات ہی تھے۔ وہ اس کے بعد زیادہ عرصہ کوفہ اور بصرہ میں رہا جہاں ایرانیوں نے (اسلام لانے کے بعد) سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ نیز' وہ مدائن میں بھی رہا' جو ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ان قرآئن کی رُو سے قیاس کا رُخ اسی طرف جاتا ہے کہ اس کے یہ خیالات ایرانی معتقدات ہی کا عکس تھے۔ ہیکل نے اس باب میں' انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی شائع کردہ ''تاریخ المؤرّخ'' کا ایک طویل اقتباس' اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایرانیوں نے اسلام اختیار کیا تو اس کا اثر سیاسی اور مذہبی گوشوں پر بڑا گہرا پڑا۔ اس میں لکھا ہے:

> ایرانی عقیدہ' ملک کے بادشاہ کو ''خدا کا بیٹا'' قرار دیتا تھا اور اسے پیدائشی طور پر عظمت و تقدس کا دیوتا سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمدؐ کے عم زاد بھائی اور شرعی وارث حضرت علیؓ کے گرد جمع ہوگئے جنہیں خلافت سے دُور رکھا گیا تھا' اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ہالا قائم کر دیا

گیا جو اُن کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ پھر جس طرح ان کے بزرگ، کسریٰ کو آسمان کا بیٹا، مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اُسے ''سید و مرشد'' لکھا جاتا تھا، اسی طرح انہوں نے، اپنے اسلام کے زمانے میں حضرت علیؓ کو امام کا لقب دے دیا، جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے۔

جب حضرت علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے گرد۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج سے، امامت، مقدس حق کے ساتھ رشتہ بدامن ہوگئی۔ پھر کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت، جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر، رسولؐ اللہ کے قرابت داروں، بنو عباس کو، تخت پر بٹھا[1] دیا، ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصولِ امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جس تاج کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں صَرف کر دی تھیں۔

(عمر فاروق اعظمؓ، از محمد حسین ہیکل، اُردو ترجمہ صفحہ 419)

حضرت شہر بانو کے متعلق شیعہ روایت

یزدگرد کی بیٹی کی امام حسینؓ کے ساتھ شادی کا ذکر چھٹے باب میں آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کی احادیث کی کتاب، اصول الکافی میں جو روایت آئی ہے وہ بھی غور طلب ہے، اس میں ذکرِ مولدِ علی بن الحسینؓ کے ضمن میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ کا نام سلامہ (زیادہ مشہور شہر بانو ہے۔ ممکن ہے یہ نام اسلامی ہو) بنتِ یزدگرد بن شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ تھا۔ اور یزدگرد ایران کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے بعد ہے:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بنتِ یزدگرد حضرت عمر کے پاس آئیں تو مدینہ کی باکرہ لڑکیاں ان کا حسن و جمال دیکھنے بالائے بام آئیں۔ جب مسجد میں داخل ہوئیں تو چہرہ کی تابندگی سے مسجد روشن ہوگئی۔ عمر نے جب ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کہا بُرا ہو ہرمز کا کہ اس کی سوئے تدبیر سے یہ روزِ بدنصیب ہوا۔ حضرت عمر نے کہا کیا تو مجھے گالی دیتی ہے (کہ میرے دیکھنے کو روزِ بد کہا) اور ان کی اذیت کا ارادہ کیا۔ اُنہوں نے کہا ایسا نہیں ہے۔ امیر المومنین نے کہا، اس کو اختیار دو کہ یہ مسلمانوں میں سے کسی کو اپنے لئے اختیار کر لے۔ اس کے حصۂ غنیمت میں اس کو سمجھ لیا جائے۔ جب اختیار دیا گیا تو وہ لوگوں کو دیکھتی ہوئی چلیں (اور امام حسینؓ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا)۔ امیر المومنین

---

1. اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔

نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ کہا جہاں شاہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا' نہیں بلکہ شہر بانو۔ پھر امام حسینؑ سے فرمایا' اے ابوعبداللہ! تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے پیدا ہوگا جو اہلِ زمین میں سب سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ علی ابن الحسین پیدا ہوئے' پس وہ بہترین عرب' ہاشمی ہونے کی وجہ سے اور بہترین عجم تھے ایرانی ہونے کی وجہ سے۔

(کتاب الشافی' جلد اوّل' صفحہ 79-578۔ ترجمہ اصولِ کافی' جلد اوّل)

حضرت سلمانؓ فارسی

حضرت علیؓ کے ساتھ اہلِ ایران کے سلسلۂ روابط کی ایک کڑی (تاریخی روایات کی رُو سے) ایک اور شخصیت بھی ہیں ـــــ یعنی حضرت سلمان فارسیؓ جو معروف صحابی ہیں۔ اُن کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مؤرخ ابنِ اثیر نے (اپنی کتاب' اسد الغابہ فی سیرۃ الصحابہؓ) میں لکھا ہے کہ حضرت سلمانؓ اصحابِ رسول اللہؐ میں سے تھے۔ ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈھائی سو برس سے لے کر چھ سو برس تک بیان کی جاتی ہے۔ انہوں نے حواریانِ حضرت مسیحؑ کا زمانہ پایا تھا اور ان کی صحبت میں رہے تھے۔ انہیں حضرت مسیحؑ کی پیشگوئی دربارہ بعثتِ احمدؐ (فارقلیط) کا علم تھا' اور یہ بھی کہ آپؐ کا ظہور یثرب میں ہوگا۔ انہیں ایک یہودی نے جو مالِ تجارت لے کر یثرب کی طرف آ رہا تھا پکڑ کر غلام بنالیا اور اس طرح یہ اس کے ساتھ وہاں آ گئے۔ ہجرت کے بعد' یہ مدینہ آ کر حضورؐ کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپؐ نے انہیں صحابہؓ کی مالی مدد سے یہودی کی غلامی سے نجات دلائی۔ جب آپؐ نے مدینہ میں مہاجرین اور انصار میں مؤاخات قائم کی تو (حضرت) سلمانؓ کا ان دونوں میں سے کسی میں بھی شمار نہ ہوا۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ـــــ **سلمان من اھل بیتی** ـــــ یعنی سلمانؓ میرے اہلِ بیت میں سے ہے۔ (بحوالہ ازالۃ الخفا۔ شاہ ولی اللہؒ)

یوں حضرت سلمان فارسیؓ کا شمار ''اہلِ بیت'' میں کرلیا گیا۔ اس کے بعد' کتبِ روایات میں مذکور ہے کہ جب سورۂ جمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی **وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ** [62:3] نبی اکرمؐ' اپنی قومِ مخاطب کی طرف بھی رسول ہیں' اور ان کی طرف بھی جو ان کے بعد آنے والے ہیں' تو صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ ان (بعد میں آنے والوں) سے کون لوگ مراد ہیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ آپؐ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے' آپؐ نے ان کے زانو (یا سر) پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ وہ اِس کی قوم کے افراد ہوں گے اور ان میں ایک شخص اس عظمت و شان کا پیدا ہوگا کہ ایمان خواہ ثریا میں بھی کیوں نہ ہو' وہ اُسے وہاں سے بھی اتار لائے گا اور علمِ اوّلین و آخرین کا وارث ہوگا۔ اسی طرح جامع ترمذی میں ہے کہ جب آیت ...... **وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** [47:38] نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم دین سے پھر جاؤ گے' تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا' تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسولؐ اللہ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ـــــ اس کی قوم کو۔ اس کی قوم کو۔

ان روایات کی رُو سے' ایک تو عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کی برتری ثابت ہوگئی اور دوسرے' ایک '' آنے والے'' کے عقیدہ

کا دروازہ کھل گیا۔

یہ ہیں حضرت سلمان فارسیؓ کے کوائف، جن کے متعلق شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد (اہلِ بیت کو چھوڑ کر) صرف تین مسلمان باقی رہ گئے تھے ـــــ یعنی حضرت مقدادؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ[1]۔

''تاریخ المؤرّخ'' کا جو اقتباس پہلے درج کیا جا چکا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ ایرانی اس گھرانے کو تاج پہنا نہ سکے جنہیں تاج پہنانے کے لئے انہوں نے اپنی کوششیں صَرف کر دی تھیں لیکن انہوں نے 'سلطنت' بنی اُمیہ کے ہاتھ سے چھین کر، بنوعباس کے ہاتھ میں دے دی جو رسولؐ اللہ کے قرابتدار تھے۔ چونکہ ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے کے ایرانیوں نے کس طرح اسلامی مملکت میں اندرونی خلفشار پیدا کر کے، اُسے کمزور کر دیا، اس لئے تاریخ کا یہ گوشہ بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ان سازشوں کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا جن کے نتیجہ میں سلطنت، بنی اُمیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنوعباس کی طرف منتقل ہوگئی اور پھر سقوطِ بغداد کے بعد اس کا خاتمہ ہی ہوگیا۔

امام حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری

حضرت علیؓ کے زمانے میں، مملکت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی ـــــ ایک حصہ حضرت علیؓ کے زیرِ اقتدار تھا جس کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔ دوسرا حصہ حضرت معاویہؓ کے زیرِ نگین، اس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، ان کے بڑے صاحبزادہ، امام حسنؓ ان کے جانشین ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد، وہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے۔ ابنِ خلدون کی تصریح کے مطابق:

> امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کوفہ کے بیت المال میں جس قدر رقم ہے وہ انہیں دے دی جائے۔ اس رقم کی مقدار پانچ کروڑ تھی۔ نیز یہ کہ دارالجبرو کا خراج بھی (جو فارس کا ایک حصہ تھا) انہیں ادا کیا جاتا رہے۔ (ابن خلدون، جلد 2، صفحہ 456)

حسنینؓ کے امیر معاویہؓ کے ساتھ تعلقات

اس معاملہ کے طے پا جانے کے بعد، سلطنت پوری کی پوری امیر معاویہؓ (بنی امیہ) کی طرف منتقل ہوگئی۔ واضح رہے کہ ان حضرات کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ (مثلاً) علامہ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ:

1۔ میں نے اس کا حوالہ ''فروغِ کافی، باب الروضہ'' لکھ رکھا ہے لیکن اس وقت میرے پاس فروغِ کافی کی جلد اوّل ہے جس میں باب الروضہ نہیں۔ وہ باب غالباً اس کی دوسری جلد میں ہے لیکن شیعہ حضرات کے ہاں یہ روایت مسلّم ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں، ان میں دو اور اصحاب کا بھی اضافہ ہے ـــــ یعنی حضرت علیؓ کے غلام حضرت قنبر اور حضرت عمار بن یاسرؓ کا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کے دعویٰ خلافت کی تائید کی تھی۔

جب خلافتِ معاویہؓ قائم ہوگئی تو (حضرت) حسینؓ اپنے بھائی (حضرت) حسنؓ کے ساتھ اُن کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کی بڑی عزت کرتے، نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے، اور گراں قدر عطیات سے انہیں نوازتے۔ انہوں نے ایک ایک دن میں دو دو لاکھ درہم عطا کئے۔ (البدایہ والنہایہ۔ جلد 8)

یہ سلسلہ امام حسنؓ کی وفات کے بعد، امام حسینؓ کے ساتھ بھی جاری رہا۔ نہج البلاغہ کے شارح، ابنِ ابی الحدید نے لکھا ہے کہ معاویہؓ دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم عطا کئے۔ اور ان کے فرزند (یزید) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسے دگنا کر دیا۔ یہ عطایا حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں، امام حسنؓ و حسینؓ کو ہر سال عطا ہوتے تھے۔

(شرح ابنِ ابی الحدید، جلد نمبر 2)

باہمی رشتہ داریاں

پھر ان کی باہمی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ (مثلاً) امام حسینؓ کی بھتیجی، یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی صاحبزادی، سیدہ امّ محمد، یزید کے عقد میں تھیں اور امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ (والدہ حضرت علی اکبر) امیر معاویہؓ کی حقیقی بھانجی تھیں۔

بنی اُمیہ اور بنی عباس کی رقابت

جب سلطنت، بنی امیہ کی طرف منتقل ہوگئی تو ایرانیوں کی سازشوں کا رُخ بھی انہی کی طرف پھر گیا۔ اس مقصد کے لئے انہیں بنی عباسؓ کی شکل میں ایک مؤثر مہرہ ہاتھ آ گیا۔ بنی عباسؓ اور بنی اُمیہ ایک ہی شجر کی دو شاخیں تھیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے شجرۂ نسب پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔ قریش میں عبدِ مناف ایک ممتاز شخصیت گزری تھی، وہ ان دونوں خاندانوں کا مورث تھا۔ اس سے سلسلہ یوں آگے چلا:

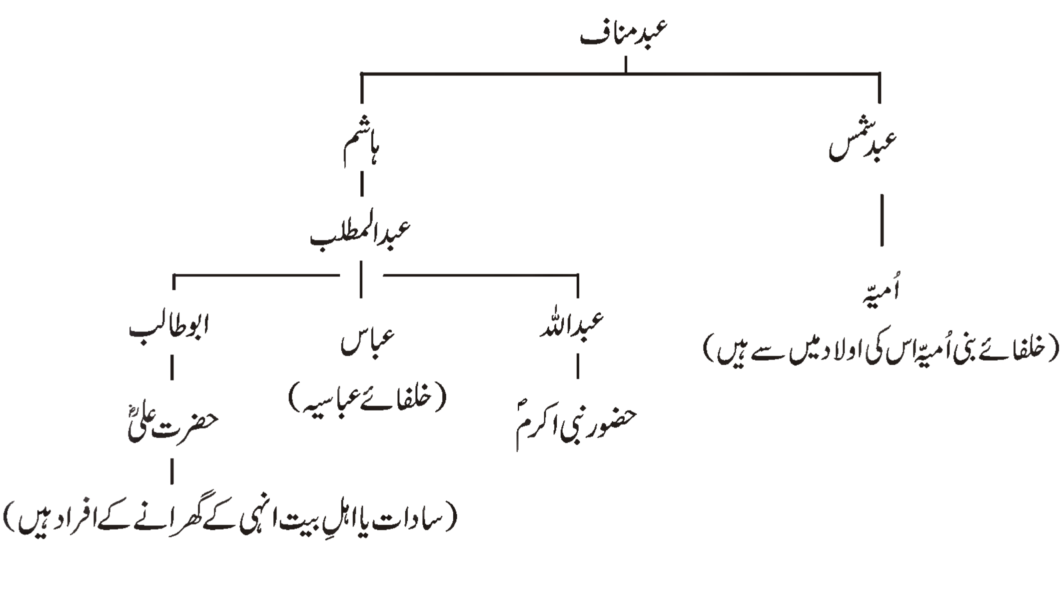

بنی اُمیہ برسرِ اقتدار آئے تو بنی عباس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ایرانی اس قسم کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ اس مقام پر تاریخ میں ایک اور شخصیت سامنے آتی ہے جو ابو مسلم خراسانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈہ کا سب سے بڑا داعی تھا۔ بنی عباس کی اپنی کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس کی بنا پر عوام کو ان کا طرفدار بنایا جا سکتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ابو مسلم نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا' البتہ اس کا ہدف تبدیل کر دیا۔ اس نے اس عقیدہ کو پھر سے عام کیا کہ خلافت ''اہلِ بیت'' کا حقِ وراثت ہے' یہ انہی کو ملنی چاہیئے۔ ''اہلِ بیت'' کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل شجرۂ نسب کا سامنے لانا ضروری ہے۔

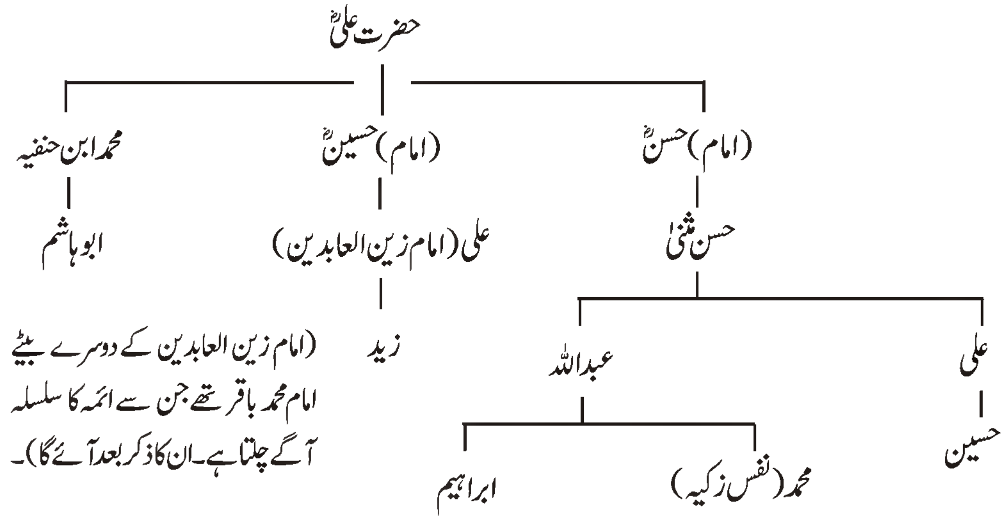

سادات اور علوی

امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ ان کی اولاد کو عام طور پر سادات کہا جاتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں جن سے آپ کے ہاں بکثرت اولاد ہوئی۔ روایات کی رُو سے' ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو بیٹے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ' دوسری بیویوں سے پیدا ہوئے' ان کی اولاد علوی کہلاتی ہے (مندرجہ بالا شجرہ نسب میں' ہم نے اِن میں سے اُن کے صرف ایک بیٹے' محمد ابن حنفیہ کا نام لکھا ہے کیونکہ موضوعِ زیرِ نظر سے سرِدست انہی کا تعلق ہے)۔ شیعوں کے دو معروف فرقے (اثنا عشری اور اسماعیلی' جن کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آتا ہے) امامت کو امام زین العابدین کے بیٹے امام باقر اور ان کی اولاد میں متوارث تسلیم کرتے ہیں' لیکن ایک فرقہ (زیدیہ) اسے' ان کے دوسرے بیٹے' زید کی طرف منتقل شدہ سمجھتا ہے۔ ان کا ایک اور فرقہ' امامت کو حضرت علیؓ کے بعد' اُن

کے بیٹے محمدؒ ابن حنفیہ کی طرف منتقل کرتا ہے' اسے فرقہ کیسانیہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس مقام پر ان حضرات (اور فرقوں) کا اجمالی سا تعارف اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ بنی اُمیہ کے خلاف جو محاذ قائم ہوئے تھے' ان میں اگرچہ سب سے نمایاں حیثیت بنوعباس کی تھی' لیکن چند ایک مقامات پر فاطمیین اور علویین نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

ابو مسلم خراسانی

خلفائے بنی امیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے بیٹے' علیؒ کو ایک گاؤں حمیمہؒ میں' جو مدینہ سے دمشق کے راستے پر واقعہ تھا' جاگیر عطا کر رکھی تھی۔ وہ اسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ فرقہ کیسانیہ کے امام ابو ہاشم کا ادھر سے گزر ہوا اور اتفاقاً ان کا انتقال حمیمہؒ میں ہو گیا۔ چونکہ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا اس لئے بنی عباس نے دعویٰ کر دیا کہ وہ علیؒ کے لئے حقِ امامت کی وصیت کر گئے ہیں۔ اس طرح بنوعباس کے دل میں امامت کا داعیہ پیدا ہو گیا اور کیسانیہ ان کے داعی بن گئے۔ علی کی وفات کے بعد' ان کا بیٹا محمدؒ' امام قرار پایا۔ اس نے سوچا کہ بنی عباس کے نام میں کوئی ایسی کشش نہیں جس سے عوام ان کی طرف راغب ہو جائیں' اس لئے اس نے اپنے دعاۃؒ سے کہا کہ وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں کسی کا نام نہ لیں' بلکہ کہیں کہ امامت ''اہلِ بیت'' کا حق ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے خراسانؒ کو اپنا مرکز قرار دے لیا کیونکہ وہاں ایرانیوں کی تائید بآسانی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس مقام پر ابو مسلم خراسانی ہمارے سامنے آتا ہے۔ ابراہیم بن عثمان بن بشار اس کا نام تھا۔ یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہرؒ کی اولاد سے تھا۔ اصفہانؒ میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے ابراہیم نے ان کی صلاحیتوں کو بھانپا اور پراپیگنڈہ کا شعبہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے ''اہلِ بیت'' کے نام سے اس قدر شد و مد سے پروپیگنڈہ کیا کہ سلطنتِ بنی امیہ کی بنیادوں میں تزلزل واقعہ ہو گیا۔ اس دوران میں' فاطمیینؒ نے بھی بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائیاں کیں۔ (مثلاً) 61ھ میں کربلا کا واقعہ ظہور میں آیا۔ 122ھ میں' امام زین العابدینؒ کے فرزند' زید نے کوفہ سے بغاوت کی' 126ھ میں زید کے بیٹے یحییٰ نے خراسان سے۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد میں سے' عبداللہ ابنؒ معاویہ نے 127ھ میں کوفہ سے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکے[1]۔

''امام مہدی'' کی آمد

لیکن ابو مسلمؒ کا پروپیگنڈہ کامیاب ہو گیا۔ اس زمانے میں ایک ''آنے والے'' (مہدیؒ) کا عقیدہ بھی عام ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی روایات بھی پھیلائی جا رہی تھیں کہ وہ آنے والا' خراسان کی طرف سے آئے گا۔ اس کے لشکر کا لباس بھی سیاہ ہو گا اور جھنڈے بھی سیاہ رنگ کے۔ ابو مسلم نے اس ''آنے والے'' کا پراپیگنڈہ بڑی شدّ و مد سے کیا اور جب دیکھا کہ فضا سازگار ہو گئی ہے تو وہ سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈے کے ساتھ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ نکلا۔ اس نے 128ھ میں خراسان فتح

1۔ فاطمیینؒ نے اپنی سلطنت' پہلے شمالی افریقہ اور بعد میں مصر میں قائم کی۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

کر لیا اور 132ھ میں' ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد' بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت بنوعباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کا پہلا خلیفہ عبداللہ تھا' جو سفاح کے لقب سے مشہور ہے۔ بنی عباس نے بنی امیہ سے جو انتقام لینا تھا وہ تو لیا' لیکن اس خطرہ کے ماتحت کہ ابو مسلم کہیں زیادہ طاقت نہ پکڑ لے' 137ھ میں اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

حقِ خلافت کے متعلق خط و کتابت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عباسیوں نے سلطنت "محبتِ اہلِ بیت" کے نقاب میں حاصل کی تھی۔ اہلِ بیت کو یہ بات فطرۃً کھٹک رہی تھی کہ سلطنت حاصل کرنے کے لئے ہر جگہ ان کا نام لیا گیا اور جب وہ حاصل ہو گئی تو بنوعباس اس کے مالک بن بیٹھے۔ چنانچہ محمد نفس زکیہ ان کے خلاف اُٹھے لیکن ناکام رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ امامت کی وارث حضرت علیؓ کی اولاد ہے' حضرت عباسؓ کی نہیں۔ عباسی خلیفہ منصور نے ان کے اس دعویٰ کی تردید کی اور کہا کہ وراثت کے اصول کے مطابق خلافت' آلِ عباس کو ملنی چاہئے۔ اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔ ہم اسے بتمامہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ خلافت' جو قرآنی اصول کے مطابق' بلا لحاظ نسل و نسب' صرف جوہرِ ذاتی کی بنا پر کسی کو امت کے مشورے سے تفویض ہونی چاہئے تھی' کس طرح وراثت قرار پا گئی۔ خط و کتابت ملاحظہ فرمائیے۔ پہلا خط خلیفہ ابوجعفر عبداللہ بن محمد (منصور ـــــ عباسی خلیفہ) کا' محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) کے نام ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور دنیا میں فساد پھیلائیں' ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں برخلاف کاٹ لئے جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں۔ اس لئے میں اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا واسطہ دے کر عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے کہ میں تمہارے اوپر قابو پاؤں تم توبہ کر لو گے تو میں تمہاری اور تمہارے تمام بھائیوں کی اور ساتھیوں کی اور معتقدوں کی جو اس بغاوت میں شریک ہیں' جان بخشی کر دوں گا۔ نیز دس لاکھ درہم تم کو دوں گا کہ جہاں چاہو رہو اور تمہاری جو ضروریات ہوں گی ان کو پورا کرتا رہوں گا۔ تمہارے اہلِ بیت اور شیعہ میں سے جو لوگ میرے قید خانوں میں ہیں' ان کو چھوڑ دوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو اپنے کسی معتمد کو بھیج دو کہ آ کر مجھ سے عہد نامہ لکھوا لے"۔

اس کے جواب میں نفس زکیہ نے لکھا:

> از جانب محمد بن عبداللہ مہدی امیر المومنین بنام عبداللہ بن محمد ـــــ میں بھی تمہارے لئے اسی قسم کی امان پیش کرتا ہوں

جس قسم کی تم نے پیش کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے اس کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ وصی اور امام تھے۔ ہم جو ان کے بیٹے ہیں' زندہ ہیں پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے اس کے وارث بن گئے۔ تمہیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جونسبی فضائل ومفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکے۔ زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم' خاص کر ہاشم کی اولاد میں' مَیں نسب میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں۔ میری رگوں میں امہاتِ اولاد کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا۔ دنیا میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' میں ان کا بیٹا ہوں۔ صحابہؓ میں میرے باپ حضرت علیؓ اسلام میں سب سے اوّل' علم میں سب سے فائق اور جہاد میں سب سے افضل تھے۔ میری ماں حضرت خدیجہؓ ہیں جنہوں نے اس اُمت میں سب سے پہلے نماز پڑھی۔ پھر حضرت فاطمہؓ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔ زمانۂ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت حسنؓ اور حسینؓ ہیں جو بہشتی نوجوانوں کے سیّد ہیں' ان میں سے بڑے کا میں بیٹا ہوں۔ اب دیکھو حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں۔ امام حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف سے رسولؐ اللہ کا بیٹا ہوں۔ اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جہنم میں بھی اس نے اس کا لحاظ کیا۔ یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا۔ اس طرح پر نیکوں میں سب سے بہتر' نیک اور گنہگاروں میں سب سے کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کر کے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی مسلم یا معاہد کے حق کے جو تمہارے ذمہ ہو' امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمہارے' عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کون سی ہے؟ ابنِ ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابو مسلم خراسانی کو دی تھی''۔ فقط

منصور کو جب یہ خط پہنچا تو اس کے کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منصور نے کہا کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آپڑے تو خود مجھے جواب لکھنا چاہئے۔ اس نے لکھا:

از ابو جعفر عبداللہ بن محمد امیر المومنین بنام محمد بن عبداللہ۔

تمہارا خط مجھ کو ملا۔ عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلاء میں مقبول بننے کے لئے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں جن کی ساری نبیاد عورتوں پر ہے۔ حالانکہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار شخص زندہ تھے (حمزہؓ عباسؓ ابو طالب اور ابولہب)۔ ان میں سے دو اسلام لائے' جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمہارا باپ تھا۔ تم نے عورتوں کا ذکر

کر کے ان کی قرابت پر جو فخر کیا ہے' یہ نادانی ہے۔ اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسولؐ اللہ کی والدہ کے لئے ہوتی۔ لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سربلند کرتا ہے۔

تعجب ہے کہ ابو طالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو پر بھی تم نے ناز کیا ہے۔ سوچو تو کہ ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمہارا نسب والدین کی طرف سے رسولؐ اللہ تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ واقعی کوئی فضیلت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسولؐ اللہ کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ [33:40]

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے۔

ہاں تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بے شک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعے سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔ اسی قرابت کی بنیاد پر تمہارے باپ حضرت علیؓ نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فاطمہؓ کو ابوبکرؓ سے لڑا کر رنجیدہ کیا۔ اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو اطلاع نہیں کی اور جب انہوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو لے جا کر ان کو دفن کر دیا مگر کوئی ابوبکرؓ کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا۔ خود آنحضرتؐ کی بیماری کے زمانے میں بھی وہ موجود تھے لیکن نماز پڑھانے کا حکم آپؐ نے ابوبکرؓ کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہو گئے۔ پھر خلافت اصحابِ شوریٰ میں آئی۔ اس میں بھی وہ انتخاب میں نہ آ سکے اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ ان کے بعد انہوں نے طلحہؓ اور زبیرؓ پر سختی کی' سعدؓ بن ابی وقاص سے بیعت لینی چاہی۔ انہوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔ جب علیؓ گزر گئے' امام حسنؓ ان کی جگہ پر آئے۔ معاویہؓ نے شام سے لشکر کشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رقم ان سے لے کر اپنے شیعہ اور خلافت دونوں کو معاویہؓ کے سپرد کر دیا اور مدینہ چلے گئے۔ لہٰذا' اگر تمہارا کچھ حق بھی تھا تو تم اس کو فروخت کر چکے۔ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمہارے امتیاز کا لحاظ رکھا' تمہارے باپ ابو طالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا' نہایت افسوسناک ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لئے فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمہاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے تم آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔ خود تمہارے خاندان میں زین العابدین تھے

وہ تمہارے دادا حسن بن حسن سے بہتر تھے۔ پھر ان کے بیٹے محمد باقر تمہارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں حالانکہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعویٰ کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کُل بنی ہاشم سے بہتر ہو‘ بنی ہاشم میں سے رسولؐ اللہ بھی ہیں۔ تمہیں یہ تو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملے میں تمہارے باپ حضرت علیؓ نے پنچوں سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ تم نے یہ سنا ہوگا کہ پنچوں نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمہارے عم حسینؓ ابنِ علیؓ‘ ابنِ زیاد کے مقابلے کے لئے کوفہ میں آئے اور جو لوگ ان کے حامی تھے‘ انہی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمہارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لئے اٹھے۔ بنی امیہ نے اُن کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمہارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمہارے اوپر جو لعنتیں بھیجا کرتے تھے‘ اس کو بند کیا‘ تمہارے رتبے بڑھائے۔ اب انہی امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علیؓ کی فضیلت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو عباس و حمزہ (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ محفوظ گزر گئے اور حضرت علیؓ ان جنگوں میں پڑے جن میں مسلمانوں میں خون ریزی ہوئی۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں سقائیہ حاج اور زمزم کے متولی حضرت عباسؓ تھے نہ کہ ابو طالب۔ حضرت عمرؓ کی عدالت میں تمہارے باپ نے اس کا دعویٰ بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

رسولؐ اللہ نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباسؓ کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لئے کل اولادِ عبدالمطلب میں سے آنحضرتؐ کے وارث وہی ہیں۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت سے لوگ خلافت حاصل کرنے کے لئے اُٹھے لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا۔ لہٰذا قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد ہی کے حصہ میں آئی۔

بدر کی لڑائی میں تمہارے چچا طالب اور عقیل کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباسؓ کو بھی آنا پڑا‘ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مر جاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے۔ نیز آغازِ اسلام میں قحط کے زمانے میں حضرت عباسؓ ہی نے ابو طالب کی امداد کی۔ پھر تمہارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں انہوں نے ہی ادا کیا۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تمہارے اوپر ہیں۔ ہمارے باپ نے تمہارے باپ پر احسان کئے اور ہم نے تمہارے اوپر۔ اور جن رُتبوں پر تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے‘ ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لئے۔ والسلام۔

''اِن خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکومتِ الٰہی کا تصور دماغوں سے کس قدر بعید ہو چکا تھا کہ ابو جعفر منصور جیسا اہلِ سنت کا عظیم الشان خلیفہ اور نفس زکیہ جیسا اہلِ بیت کا مہدی تسلیم کیا ہوا امام اس کو وراثتی تسلیم کر رہے ہیں۔ صرف جھگڑا یہ ہے کہ یہ وراثت بیٹی کی اولاد کو پہنچتی ہے یا چچا کی''۔[1] (تاریخ الامت ـــ جلد ہشتم' علامہ اسلم جیراجپوریؒ)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس خط و کتابت میں بجز خاندانی تفاخر اور طعن و تشنیع کے' کچھ نہیں۔ اس کے بعد منصور نے ایک لشکرِ جرّار' (امام) نفس زکیہ کے خلاف بھیجا جس نے انہیں شکست دے کر قتل کر دیا۔ یہ 145ھ کا واقعہ ہے۔

برامکہ

ابو مسلم ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا' یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کے بعد' ایک ایرانی فرد نہیں' بلکہ خاندان' اِسی عزم کو لے کر عباسیوں کے ہاں آ گیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت کو زندہ تو نہ کر سکا' لیکن اس نے مسلمانوں کی اس عظیم مملکت (عبّاسیہ) میں نہ اسلام رہنے دیا نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیّت نے لے لی اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔ تاریخ میں یہ خاندان برامکہ کے لقب سے مشہور ہے۔ برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے لیکن اکثریت کا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کی اصلیت ''برماہ گاہ'' ہے ـــ یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متوّلی یا پجاری ـــ اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برامکیوں کا جدِّامجد' جاماسپ بن یشتاسپ تھا جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موبد مقرر ہوا اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری مملکت کا موبدِ موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔ یہ وہ اعلیٰ ترین منصب تھا جس کے سامنے شہنشاہوں تک کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اس کے بعد اسے مملکت کا دستورِ اعظم (یعنی وزیرِ اعظم) بھی مقرر کر دیا گیا۔ اس خاندان کی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ایران کے پیامبر (جناب) زردشت نے اپنی بیٹی کا نکاح' جاماسپؔ سے کر دیا تھا اور جاماسپؔ کی ایک بھتیجی (جناب) زردشت سے منسوب تھی۔ ہم پہلے عباسی خلیفہ (عبداللہ محمد بن علی' ملقب بہ سفاح) کے دربار میں' خالد برمکی کو ایک نہایت بلند ذمہ دار منصب پر فائز دیکھتے ہیں۔ (چونکہ ہمارے پیشِ نظر برامکہ کی تاریخ نویسی نہیں) اس لئے ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کیسے ہوا تھا۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ بنو عباس کے

1۔ اسی قسم کی ایک بحث خلیفہ مامون الرشید اور امام علی رضا کی عیون الاخبار میں منقول ہے۔ مامون نے امام موصوف سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہو؟ بولے کہ رسول اللہؐ سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی قرابت پر۔ مامون نے کہا کہ اگر حضرت علیؓ کی قرابت کی بنیاد پر یہ دعویٰ ہے تو آنحضرتؐ نے ایسے ورثہ چھوڑے تھے جن میں سے بعض ان میں سے بھی زیادہ قریبی اور بعض انہی کے درجہ کے تھے اور اگر فاطمہؓ کے رشتہ کی بنیاد پر ہے تو ان کے بعد اس کے حقدار حسنؓ اور حسینؓ تھے۔ اور ان کی موجودگی میں حضرت علیؓ نے خلافت پر قبضہ کر کے اُن کا حق کیوں غصب کیا۔ امام علی رضا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے خلیفہ کے زمانہ ہی میں اس خاندان نے اس قدر اثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا۔ خلیفہ کے ساتھ خالدؔ کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خلیفہ کی بیٹی کو خالدؔ کی بیوی نے دودھ پلایا تھا اور خالد کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے۔ خلیفہ المہدیؔ کے زمانے میں خالدؔ کو صوبہ فارس کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔ خالدؔ کا بیٹا یحیٰؔ اس سے بھی زیادہ زِیرک اور قابل تھا۔ خلیفہ منصور نے اسے آذربائیجان کا حاکم مقرر کر دیا لیکن خالد نے اس کے لئے' اس سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر گوشہ تلاش کیا ـــــ یعنی اُسے ولی عہد ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ یہ اتالیق' خاندانِ برامکہ کے لئے انتہائی عروج اور سطوت کا موجب بن گئی اور ایک گونہ موروثی قرار پا گئی۔ فضلؔ اور جعفرؔ' یحیٰؔ کے دو بیٹے' باپ اور دادا سے بھی زیادہ قابل تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کا سارا کاروبار' یحیٰؔ کے سپرد تھا جسے وہ اپنے ان دونوں بیٹوں کے مشورہ سے سرانجام پاتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ خلافت نام کو عباسیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن درحقیقت برامکہ کی تحویل میں۔

سارا معاشرہ عجمیت کے رنگ میں

اس خاندان نے مملکت میں سیاسی سطوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ مملکت کے ہر گوشے کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ یحیٰؔ نے بغداد میں بیتؔ الحکمۃ قائم کیا جس میں' عجم کی تاریخ اور لٹریچر کا معتدبہ ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے بحث و مناظرہ کی مجالس بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیں۔ ان مجالس میں' ایرانی' یہودی اور نصاریٰ علماء اور فلاسفرز ایک طرف ہوتے تھے اور مسلمان علماء دوسری طرف اور موضوعِ بحث' اسلامی عقائد ونظریات ہوتے تھے۔ ان مباحثوں کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اول تو عرب سادہ سی قوم تھی جو فلسفیانہ نکات آفرینیوں اور منطقی موشگافیوں میں الجھنا جانتی ہی نہ تھی' پھر' مملکت کی سیاسی مصلحتوں نے انہیں اس قدر دبا کر رکھا تھا کہ ان کا جذبۂ حریّت ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے مدِمقابل' اُس ایرانی قوم کے اہلِ علم ودانش تھے جو قرنہا قرن سے فلسفہ' منطق اور الٰہیات کے مسائل پر غور وفکر کے حامل تھے' ان کے ساتھ یہود ونصاریٰ جو (یوں کہیئے کہ) یونانی فلسفہ کے ماہر تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہر مباحثہ کے بعد' اسلامی عقائد ونظریات کے متعلق شکوک وشبہات کا سیلاب امنڈ آتا اور ان کے مقابلہ میں' عجمی تصوّرات ومعتقدات نہایت معقول دکھائی دیتے۔ علاوہ ازیں' مملکت کے سارے خزانے برامکہ کی تحویل میں تھے۔ یہ ان (مجوسی' یہودی اور عیسائی) مناظرین کو اس قدر انعام واکرام سے نوازتے کہ ان مذاہب کے علماء دُور دُور سے کھنچ کر ان مجالس میں شامل ہوتے۔ برامکہ کی اس سازش سے' قرآنی اسلام کس طرح عجمی اسلام بن کر رہ گیا' اس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی کیونکہ سرِدست ہم اپنی بحث کو ایرانیوں کے سیاسی اثر وغلبہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

یحیٰؔ برمکی کی اولاد تو خاصی تھی لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ان میں سے فضلؔ اور جعفرؔ بڑے نامور تھے۔ عباسی خاندان میں برامکہ کے علوِ مرتبت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ فضل اور ہارون الرشید دودھ شریک بھائی تھے ـــــ یعنی ہارون

الرشید کی والدہ خیزرانؔ نے (جو تاریخ میں نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے) اپنے بیٹے ہارون اور فضل کو ایک ساتھ دودھ پلایا تھا۔ اس کی گود میں ایک طرف ہارون ہوتا تھا تو دوسری طرف فضل۔ جب ہارون برسرِ اقتدار آیا تو اس نے فضلؔ کو مملکت کے بلند ترین مناصب پر فائز کرنا چاہا لیکن (جس طرح خالد نے یحییٰ کے سلسلہ میں کیا تھا) یحییٰ نے مصلحتاً فضل کو محلات کے اندر رکھا اور امورِ مملکت جعفر کے سپرد کیے۔ یوں مملکت کی داخلی اور خارجی شاہ رگیں ان دونوں بھائیوں کی گرفت میں چلی گئیں۔ اس گرفت کا رُخ متعیّن کرنے کے لئے' ان کے بوڑھے باپ (یحییٰ) کا تجربہ ان کے ساتھ تھا۔ سلطنت کلیتہً ان تینوں کے ہاتھ میں تھی لیکن' جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے' قوت' ثروت' دولت اور حکومت کے نشہ نے ان کے ہوش و حواس پر اثر ڈالنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی سازشی کاروائیوں میں احتیاط برتنی چھوڑ دی اور رفتہ رفتہ ہارون الرشید پر ان کی حقیقت بے نقاب ہونی شروع ہوگئی۔ یہیں سے ان کے زوال کی ابتداء ہوئی۔

برامکہ کا انجام

ہارون الرشید جب بھی ملک میں دورہ کرتا تو جس جس جگہ اس کے خیمے نصب ہوتے' اُسے معلوم و محسوس ہوتا کہ وہاں حکومت برامکہ کی ہے' اس کی نہیں۔ اس سے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہونی شروع ہوگئی جو آہستہ آہستہ برامکہ کی تباہی کا موجب بنی۔ اس نے جعفر کو قتل کرا دیا۔ یحییٰ اور فضل کو قید کر دیا اور انہیں اس قدر اذیتیں دیں کہ ان کی تفصیل سن کر روح کانپنے لگتی ہے۔ اس نے خاندانِ برامکہ کی تمام جائیدادیں ضبط کرلیں۔ مملکت سے ان کا صفایا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے جعفر کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس نے ہارون الرشید کی ہمشیرہ کے ساتھ خفیہ نکاح کر لیا تھا لیکن محققین کے نزدیک اس ''واقعہ'' کی حیثیت افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ جعفر کے قتل اور دیگر برامکہ کے زوال کے اسباب وہی تھے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جنہیں ابنِ خلدون نے نہایت وضاحت سے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔

برامکہؔ بے شک ختم ہوگئے۔ وہ ایرانی سلطنت کا احیاء بھی نہ کر سکے لیکن وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے' اس میں بڑے کامیاب ہوئے' انہوں نے عباسیوں کی عربی مملکت کو خالصتہً ایرانی' ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی' اور ان کے مذہب (اسلام) کو عجمی بنا دیا۔ (ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جو اسلام اس کے بعد آگے چلا وہ عجمی اسلام تھا۔ محمد رسول اللہؐ کا لایا ہوا' دینِ خداوندی نہیں تھا)۔ ابو مسلم اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھا۔ اس نے ایرانی رضا کاروں کو عباسی فوج میں داخل کر کے' عسکری قوت کو بھی غیر عربی بنا دیا تھا۔ اس نے خالدؔ برمکی کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا اور اسی کی سفارش پر اس نے عباسیوں کے دربار تک رسائی حاصل کی تھی۔ فضل برمکی نے اپنے عہدِ وزارت میں صوبہ خراسان میں جس قدر فوج بھرتی کی' وہ بھی خالص ایرانی تھی' اس فوج کی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ علاوہ ازیں' مملکت کے قریب قریب تمام کلیدی مناصب پر ایرانی (برامکہ) فائز تھے۔ مرکز اور اضلاع کے خزانوں پر ایرانی افسر مقرر تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ (عام عرب تو ایک طرف) خود خلیفہ

ہارون الرشید کو بھی یحییٰ کی منظوری کے بغیر اپنی سلطنت کے خزانۂ عامرہ سے ایک پیسہ تک نہیں مل سکتا تھا۔

جب (امام) محمد بن علی عباس کا انتقال ہوا تو ابو مسلم نے امام کے ماتم میں فوج کی وردی سیاہ کر دی اور مملکت کے علم پر سیاہ حریری پردے چڑھا دیئے اور (امام) ابراہیم عباسی معہ اپنے خاندان کے سیاہ پوش ہو گئے اور اسی دن سے عباسیوں نے سیاہ لباس کو اپنا خاندانی شعار بنا لیا۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' یہی سیاہ لباس اور علم تھے' جو "آنے والے" کی روایتی نشانی بن کر ابو مسلم کی کامیابی کا باعث بنے تھے — غور کیجئے کہ یہ شخص کس قدر ماہر شاطر تھا)۔ ابو مسلم نے اس طرح عباسیوں کے ظاہری شعار کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا اور برامکہ نے ان کی نفسیات تک کو بدل کر عجمی بنا دیا اور سارا معاشرہ اسی رنگ میں رنگا گیا۔ خالد کے عہدِ وزارت میں ایران کے جشنِ نوروز کا آغاز عباسی مملکت میں ہو گیا تھا اور جعفر برمکی نے اپنے دور میں جشنِ مہر جان کی تقریب کو عام کر دیا۔ یہ دونوں تقریبیں مجوسیوں کی عیدیں تھیں (ایران میں اب تک جشنِ نوروز بطور عید منایا جاتا ہے)۔ ہمارے ہاں (یعنی — مسلم ممالک میں) شبِ بارات (یا برأت) کی تقریب اور اس کی آتش بازی خود برامکی آتشکدوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ برامکہ شیعہ تھے لیکن شیعہ مؤرخ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو شیعہ اور سُنّی نسبتوں سے متعارف کرنا ہی غلط ہے۔ یہ اسلام تو لے آئے تھے لیکن مجوسیت ان کے رگ و ریشے میں حلول کئے ہوئے تھی۔ انہوں نے اپنے اسی قدیم ایرانی مذہب کے عقائد و تصورات کو اسلامی پردوں میں چھپا کر عام کر دیا اور یہی ان کا مقصد تھا۔

فاطمینِ مصر

عباسیوں کی داستان کا سلسلہ دراز ہے اور ایرانیوں کے ہاتھوں ان کی آخری تباہی کا زمانہ ہنوز دُور۔ اس مقام پر ہمیں تھوڑے سے وقت کے لئے رُک کر یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دوران میں علوبین اور فاطمینِ مصر کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ یہ اپنے انداز اور طریق کے مطابق' عباسی سلطنت کے خلاف وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے۔ تاریخی تحقیق کے مطابق' انہوں نے 138ھ سے لے کر 358ھ تک' قریب باسٹھ مرتبہ حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ہر بار ناکام[1] رہے۔ ان میں سے صرف ایک جماعت اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی جو فاطمین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے خلیفہ نے رقادہ (شمالی افریقہ) میں' 297ھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ یہ شیعوں کے مشہور فرقہ اسماعیلیہ سے متعلق تھا۔ 358ھ تک اس سلطنت کا دائرہ شمالی افریقہ تک محدود رہا۔ اس کے بعد اس نے شام اور مصر کو بھی فتح کر لیا۔ اس جہت سے اسے "دولتِ فاطمینِ مصر" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور شیعہ مذہب (اسماعیلیہ) کے پھیلانے میں نمایاں سرگرمیاں دکھلائیں۔ اس مقصد کے لئے' قاہرہ میں ایک وسیع و عریض مسجد جامع تعمیر کی جس کا نام جامعِ ازہر رکھا۔ یہ مسجد درحقیقت اس مذہب کی نشر و اشاعت کا سرچشمہ اور مرکز تھی (جامع ازہر مصر میں اب تک موجود ہے لیکن اب وہ سُنیوں کی درس گاہ ہے)۔ رفتہ رفتہ

1۔ بہ حوالہ "تحقیقِ مزید بہ سلسلہ خلافتِ معاویہ و یزید" از محمود احمد عباسی۔

داخلی انتشار کی وجہ سے اس حکومت میں ضعف آنا شروع ہو گیا جو اُس زمانے میں، جب صلیبی جنگیں شروع تھیں، انتہا تک پہنچ گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ حکومت، دوسری مسلمان حکومتوں کے ساتھ مل کر صلیبیوں کا مقابلہ کرتی، یہ خود صلیبیوں کے ساتھ مل گئی۔ لیکن صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دی تو اس کے ساتھ ہی فاطمی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد، یہ مملکت دوبارہ عباسی سلطنت کا جزو بن گئی۔ یہ 567ھ کی بات ہے۔

اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ دولتِ فاطمیہ کے حکمرانوں کا اپنے آپ کو فاطمی مشہور کرنا غلط تھا۔ اس سلطنت کا بانی درحقیقت عبداللہ بن میمون القداح تھا جو ایران کا رہنے والا دہریہ تھا اور بظاہر (اسماعیلی امام) محمد بن اسماعیل کے نام پر بیعت لیتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فاطمی مشہور کر کے، اس آزاد مملکت کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن دوسرے محققین کا خیال ہے کہ یہ صحیح النسب فاطمی تھے۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عباسی سلطنت کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوئیں اور ان میں سے کون سی سازش کامیاب ہوئی۔ یہ سازش، بالواسطہ ایرانی تھی یا بلاواسطہ، اس سے ہمارے مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر قداحؔ (ایرانی) خود فاطمی نہیں تھا تو فاطمیین کی کامیابی میں اس کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔

اب چلئے واپس بغداد کی طرف۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ پہلے ابومسلم نے اور بعد میں برامکہ نے عباسی مملکت کو کس طرح ایرانی عقائد و تصورات کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔

دیلمی حکومت

ابومسلم قتل ہو گیا۔ برامکہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ، ایرانیت کا جو بیج بو گئے تھے، وہ بڑھتا، پھولتا پھلتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عباسی سلطنت کا مرکز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا اور صوبے زور پکڑتے چلے گئے۔ ان میں ایرانؔ پیش پیش تھا۔ اس کی بیّن مثال دیالمؔ (یا بنی بویہ) کی سلطنت ہے۔ دیالمؔ کا خطّہ جو بحرِ خزرؔ کے جنوب میں واقعہ ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات میں شامل ہوا لیکن وہاں کے باشندے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے، بعد میں وہ مسلمان ہو گئے۔ بویہؔ دیلمی ان میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس کے تین بیٹے (علی، حسن اور احمد) بھی باپ کی طرح نامور تھے۔ ان میں سے علی نے خاصی قوت حاصل کر لی۔ یہ شخص دولتِ دیالمؔ یا بنی بویہؔ کا بانی ہے۔ ان بھائیوں نے آہستہ آہستہ پہلے ایران کے مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی اور عراق تک کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد، بغدادؔ کے بعض امراء کے ایماء پر آگے بڑھے اور 334ھ میں، احمد، بغداد میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ مستکفی نے اس کا شاہانہ استقبال کیا (اس سے آپ اس زمانے کے عباسی خلفاء کے ''اقتدار'' کا اندازہ لگا سکتے ہیں!)۔ خلیفہ نے اس کی سلطنت کو تسلیم کر لیا اور علی کو عماد الدّولہ، حسن کو رکن الدّولہ اور احمدؔ کو معزّ الدولہ کے خطاب سے نوازا اور سکوں پر ان کے نام مسکوک کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

بغداد' شیعیت کا مرکز

اس کے بعد کیفیت یہ تھی کہ خلیفہ صرف ایک مذہبی رئیس رہ گیا جس کا نام خطبوں میں لیا جاتا تھا۔حکومت بنی بویہ کے ہاتھ میں تھی۔ابھی معزالدولہ کو زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لئے چالیس دن ہوئے تھے کہ اس نے خلیفہ مستکفی کو معزول کر کے قید کر دیا' اور وہ بھی نہایت ذلّت آمیز طریق سے۔بنی بویہ غالی شیعہ تھے۔معزالدولہ وہ شخص ہے جس نے پہلے پہل بغداد میں عاشورہ محرم منانے کا حکم دیا۔اس حکم میں کہا گیا تھا کہ سب لوگ اپنی دکانیں بند رکھیں' امام حسینؓ کا ماتم کریں اور عورتیں اپنے بال کھول کر نوحہ کرتی ہوئی باہر آئیں۔اسی طرح اس نے 18ذی الحجہ کو عیدِ غدیر منانے کا بھی فرمان جاری کیا۔بغداد کی آبادی بالعموم سنّیوں پر مشتمل تھی۔انہوں نے ان احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معزالدولہ نے ان پر سختی شروع کر دی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ بہت سے سنّی وہاں سے ہجرت کر گئے۔

عباسی سلطنت کا خاتمہ

447ھ تک' بنی بویہ کی حکومت رہی جس کا خاتمہ سلاجقہ نے کیا۔ان کی حکومت 590ھ تک قائم رہی۔سلاجقہ کے زوال کے بعد' قریب چھیاسٹھ سال تک بغداد میں عباسیوں کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔اس کے بعد اس سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چراغ گُل ہو گیا۔جب چنگیز خان کا پوتا' ہلاکو خان برسرِ اقتدار آیا تو ابن العلقمی' خلیفہ بغداد کا وزیر تھا۔یہ غالی شیعہ تھا۔دوسری طرف محقق نصیرالدین طوسی' جو اسی قسم کا شیعہ تھا' ہلاکو خان کا وزیر تھا۔ان دونوں کی سازش سے' ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد خلیفہ مستعصم کو قتل کر دیا۔اس سے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔یہ محرم 656ھ کا واقعہ ہے۔

اس طرح' ایرانیوں نے جنگِ قادسیہ کی شکست کا بھرپور انتقام لے لیا۔یہ بنیادی طور پر اُس شکست کا سیاسی انتقام تھا جو انہوں نے مسلمانوں سے لیا۔

خود ایرانیوں کا اعتراف

ہم نے جو کہا ہے کہ اہلِ ایران نے اس طرح اپنی ہی اس شکست کا انتقام لے لیا جو انہیں عربوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی تو یہ ہمارا قیاس نہیں خود ایران کے اربابِ فکر و نظر اس کا اعتراف و اقرار کرتے ہیں۔حسین کاظم زادہ' عصرِ حاضر کے مشہور ایرانی مؤرخ ہیں' وہ اپنی کتاب ''تجلیاتِ روحِ ایران' در ادوارِ تاریخی'' میں لکھتے ہیں:

> جس دن سے سعد بن ابی وقاصؓ نے خلیفہ دوئم کی جانب سے ایران کو فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا' ایرانی اپنے دل میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے۔کینہ و انتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا تا آنکہ فرقہ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیتہً

بے نقاب ہو گیا۔ اربابِ علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد وظہور میں، اعتقادی مسائل اور نظری اور نقلی اختلافات کے علاوہ، ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو نہ کبھی بھول سکتے تھے نہ قبول اور معاف کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر، ننگے پاؤں پھرنے والے، بادیہ نشین، عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ:

ہمارے دانشمند بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا اور نہ ہی خاندانِ بنی اُمیہ سے دشمنی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اپنی عظمت اور حکومت بحال ہو جائے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علیؓ کے بعد ختم ہو گئی اور اُموی، خالص عربی حکومت، دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی اور اس طرح عرب، عجم پر بُری طرح مسلط ہو گیا۔ فلہٰذا، ہمارے لئے واحد چارۂ کار یہی تھا کہ ہم ہاشمیوں کا ساتھ دے کر، ان کو ابھارتے۔ ہمارے بزرگوں نے یہی کچھ کیا[1]۔

جب ایرانیوں نے ہاشمیوں کو ابھار کر، اُموی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ خود ہاشمیوں (عباسیوں) کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہلاکو کو بلا کر، عربوں کی اس سلطنت کا بھی خاتمہ کرا دیا۔ اس طرح انہوں نے بقول قاسم زادہ، اپنی شکستوں کا بدلہ عربوں سے لے لیا۔

لیکن یہ بدلہ وہ تھا جو انہوں نے عربوں (یا مسلمانوں) سے لیا، جو بدلہ انہوں نے اسلام سے لیا (جس نے ان کے مذہبِ مجوسیت کا خاتمہ کر دیا تھا) اس کا تذکرہ اب سامنے آتا ہے۔

اسلام کی اساسات

قبل اس کے کہ ہم اسلام کے خلاف ''عجمی سازش'' کی تفاصیل کی طرف آئیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدیدِ یادداشت کے لئے) اس دین کی اساسات کو مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو دیا، اور جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے:

(1) انسانی علم کا ذریعہ، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور تعلیم و تعلّم ہے۔ اس علم کو ہر انسان اکتسابی طور پر حاصل کر سکتا ہے۔

(2) لیکن ایک علم اور بھی تھا جسے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور برگزیدہ بندوں کو براہِ راست عطا کرتا تھا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے

1۔ ہم نے پہلا اقتباس، محمود عباسی صاحب کی کتاب ''تحقیقِ مزید بہ سلسلہ خلافتِ معاویہ و یزید'' سے لیا ہے اور دوسرا ملخصاً خواجہ عباد اللہ اختر (مرحوم) کے مقالہ ''عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر'' سے جو مجلّہ طلوعِ اسلام کی نومبر 1954ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔

اور جن حضرات کو یہ علم عطا ہوتا تھا انہیں انبیاء یا رسول۔ یہ علم آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو عطا ہوا اور اس کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ــــ بالفاظِ دیگر، نبوت حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد علم کا صرف اکتسابی ذریعہ باقی رہ گیا ــــ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کو براہِ راست اللہ سے علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

(3) جو وحی حضور نبی اکرمؐ کو دی گئی وہ بہ تمام وکمال قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے، مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی، محفوظ بھی ہے اور واضح بھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور اِسے غور و تدبر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسے، اس کی موجودہ شکل میں، خود حضور نبی اکرمؐ نے امت کو دیا تھا اور اس کے بعد اِس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی یا تغیّر و تبدل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے۔

(4) دین، جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے، ایک نظامِ حیات ہے جو اپنی آزاد مملکت میں عملاً متشکل ہوسکتا ہے۔ یہ مملکت، امتِ محمدیہؐ کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے۔ یہ امت، اپنے میں سے بہترین فرد کو، بطور سربراہِ مملکت منتخب کرتی ہے اور یہ سربراہ، امت کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام دیتا ہے۔ مقصد اس مملکت کا قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا اور اس کے اصول و اقدار کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا ہوتا ہے۔

(5) یہ مملکت، سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی اور حضورؐ کی وفات کے بعد، اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک آگے چلا۔ اس کے بعد اُمّت کی گاڑی کسی اور پٹڑی پر چل نکلی۔ اسی کا نام دین میں عجمی تحریف ہے؛ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) اس کا اوّلین سرچشمہ سرزمینِ ایران تھی، اس لئے اسے ''عجمی تحریف'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفہوم اس سے ہر وہ عقیدہ، تصور، نظریہ، مسلک و مشرب ہے، جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ وہ کہیں سے آیا ہو اور اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جاتی ہو۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُمّت میں سب سے پہلا اختلاف مسئلہ خلافت کی بنا پر نمودار ہوا۔ حضرت علیؓ کے دعوائے خلافت کے سلسلہ میں کہا یہ گیا کہ خلیفہ منتخب نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے۔ اسے امام کہا جاتا ہے۔ پہلے امام حضرت علیؓ ہیں اور آپ کے بعد یہ امامت، آپ کی اولاد میں متوارث جاری رہے گی، اُس وقت ہم نے اس عقیدہ کے صرف اس گوشہ کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق سیاست سے تھا۔ یہ دین پر کس طرح اثر انداز ہوا، اس کا ذکر اب سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان حضرات کا شجرۂ نسب سامنے آجائے جنہیں ائمہ (حاملِ امامت) تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہے۔

(1) حضرت علیؓ (م 40ھ)

(2) (امام) حسنؓ (م 49ھ)

(3) (امام) حسینؓ (م 61ھ)

محمد بن حنفیہ

(4) (امام) زین العابدین (م 95ھ)

(5) (امام) باقر (م 117ھ)

زید

(6) (امام) جعفر صادق (م 148ھ)

(7) (امام) موسیٰ کاظم (م 182ھ)

اسماعیل
(باطنی، فدائی، آغا خانی اور بوہرے وغیرہ انہی کی نسبت سے اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ یہ امامت کو اِن کی اولاد میں موروثی تسلیم کرتے ہیں۔)

(8) (امام) علی رضا (م 208ھ)

(9) (امام) محمد جواد (تقی) (م 220ھ)

(10) (امام) علی ہادی (نقی) (م 254ھ)

(11) (امام) حسن عسکری (م 260ھ)

(12) (امام) محمد (امام غائب)

فرقہ کیسانیہ

شیعوں کا پہلا فرقہ کیسانیہ ہے جو حضرت علیؓ کے بعد ان کے اس بیٹے (محمد بن حنفیہ) کو (جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہیں تھے بلکہ ان کی ایک اور بیوی، حنفیہ کے بطن سے تھے) امام مانتا تھا۔ بالفاظِ دیگر اس فرقہ نے فاطمیین کے مقابلہ میں علویین کو ترجیح دی۔ جب ان کے امام (محمد بن حنفیہ) کی وفات ہوگئی تو ان میں کے ایک گروہ نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ امام محمد

بن حنفیہ' مہدی موعود تھے' وہ دراصل مرے نہیں بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گئے ہیں' عنقریب دنیا میں واپس آئیں گے اور اپنی حکومت روئے زمین پر قائم کریں گے۔ آپ نے دیکھا کہ عبداللہ ابن سبا نے رجعت کے جس عقیدہ کو پھیلایا تھا انہوں نے اس کا اطلاق کس پر کیا؟ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس عقیدہ کا اطلاق اہلِ تشیع کی کئی ایک اور ہستیوں پر بھی ہوتا رہا ہے۔ کیسانیہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ امام' خدا کا مظہر یا اوتار ہوتا ہے اور خدا کی طرح حیّ و قیوم۔ اس جماعت کا مرکز خراسان تھا جہاں سے وہ سلطنتِ بنی امیہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلاتے رہتے تھے۔

زیدیہ فرقہ

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ کہلاتا ہے۔ یہ' امام کے متعلق حضرت علیؓ سے لے کر امام زین العابدؒین تک جمہور شیعہ سے متفق ہیں' لیکن اس کے بعد' ان کے فرزندِ اکبر' امام باقرؒ کے بجائے' ان کے فرزندِ اصغر' زید کو امام تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علیؓ کی اولاد میں تو رہے گی لیکن اس کے لئے کسی سلسلہ یا خاندان کی تخصیص نہیں۔ یہ شیعوں کا معتدل ترین فرقہ ہے جو اصول و فقہ میں سنیوں کے بہت قریب ہے۔

اِمامیہ و اسماعیلیہ

شیعوں کے جس گروہ نے امام باقرؒ کو امامِ برحق تسلیم کیا' وہ ان کے بعد' اُن کے بیٹے امام جعفر صادقؒ کی امامت کے بھی قائل رہے لیکن اُن کے بعد یہ پھر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ انہی دو گروہوں نے تاریخ میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد' ان کے فرزندِ اکبر' اسماعیلؒ امام منصوص ہیں اور دوسرے گروہ نے' ان کے بجائے' ان کے دوسرے بیٹے' امام موسیٰ کاظمؒ کو امام تسلیم کیا۔ اوّل الذکر کو' شش امامیہ (کیونکہ وہ پہلے چھ اماموں کو ائمۂ برحق تسلیم کرتے ہیں) یا اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ باطنی فدائی اور اس قسم کے دوسرے غالی شیعہ فرقے' عام طور پر انہی سے متعلق ہیں۔ آج کل' آغا خانی اور بوہرے' اس فرقہ کی دو مشہور شاخیں ہیں۔ دوسرا فرقہ اثنا عشری یا امامیہ کہلاتا ہے اور جمہور شیعہ اسی سے متعلق ہیں۔ یہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور اس سلسلہ کے آخری امام (محمدؒ) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے وہ زندہ ہیں اور عراق کے ایک غار میں مستور۔ قیامت کے قریب' ان کا ظہور ہوگا اور وہ ساری دنیا پر اپنی حکومت قائم کریں گے (انہی کو امام مہدی کہا جاتا ہے)۔

شیعوں کے غالی فرقے

شیعوں کا کوئی فرقہ بھی ہو' امام کے منصوص ہونے اور مہدویت (یعنی ایک آنے والے امام) کا عقیدہ ان سب کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن ان کے بعض غالی فرقوں کے عقائد بڑے ہی غلو پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) ان کا ایک فرقہ ''خرم دینیہ'' ائمہ کو (معاذ

اللہ) خدا، رسول اور ملائکہ تصور کرتا اور قیامت اور حساب کتاب کا انکار کرتا تھا۔ تناسخ کا قائل تھا۔ اسی کو وہ رجعت کہتے تھے ـــــ یعنی انسانی روح کا (اسی دنیا میں) ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل ہوجانا۔ رجعت کے متعلق بعض غالی فرقوں کا عقیدہ تھا کہ قیامت کے قریب نبی اکرمؐ اور دیگر تمام انبیاءؑ دنیا میں واپس آئیں گے اور وہ سب حضورؐ کی نبوت کا اقرار کریں گے۔ اسی طرح حضرت علیؓ بھی دنیا میں واپس تشریف لائیں گے اور حضرت معاویہؓ اور ان کی اولاد کو قتل کریں گے۔ فرقہ خطابیہ کا بانی، ابوالخطاب، امام جعفر صادقؒ کو (معاذ اللہ) خدا اور اپنے آپ کو ان کا رسول ظاہر کرتا تھا۔ بعض ائمہ جب اس قسم کے عقائد کی تردید اور مخالفت کرتے تو یہ لوگ کہہ دیتے کہ یہ حضرات ایسا کچھ تقیۃً کہتے ہیں، ورنہ دل سے یہ ہم سے متفق ہیں (تقیہ کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ بھی شیعوں کے تمام فرقوں میں مشترک ہے)۔ خطابیہ کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہر دورِ رسالت میں دو پیغمبر ہوتے ہیں ـــــ ایک ناطق اور دوسرا صامت۔ محمدؐ رسول اللہ ناطق پیغمبر تھے اور حضرت علیؓ صامت۔

بعض غالی فرقوں کے عقائد اس قدر مذموم تھے کہ ان کا ذکر کرنے سے بھی طبیعت اِبا کرتی ہے لیکن یہ سب اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے۔ حکومتِ وقت کے خلاف سازشیں کرنا ان کا شیوہ تھا ـــــ اور ظاہر ہے کہ وہ حکومت بنی اُمیہ کی تھی یا بنی عباس کی، بہر حال سنّیوں کی حکومت تھی ـــــ جب انہیں اپنی مساعی میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو یہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے تھے کہ خیر، کوئی بات نہیں، آخری زمانہ میں امامِ مستور آئیں گے اور شیعوں کی حکومت قائم کریں گے۔ یہ (غالی) فرقے اپنے اپنے وقت میں ابھرنے کے بعد ختم ہو گئے (اب ان کے محض "نقوشِ قدم" بعض مقامات پر پائے جاتے ہیں لیکن انہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں)۔ شیعوں کے دو فرقے البتہ ایسے ہیں جنہیں تاریخ میں نمایاں خصوصیت حاصل رہی ہے اور وہ اب بھی موجود ہیں۔ یعنی اسماعیلیہ (آغا خانی، خوجے اور بوہرے) اور امامیہ (اثنا عشری) جن کی اکثریت ہے۔ ان دونوں فرقوں کے اہم عقائد کا ذکر ناگزیر ہے۔ پہلے اسماعیلیہ کو لیجئے۔

اسمٰعیلیوں کے عقائد

اسماعیلی اپنے عقائد اور تعلیم کو اس شدت کے ساتھ مخفی رکھتے ہیں کہ ان کے متعلق کوئی بات یقینی طور پر کہنا مشکل تھا (اس فرقہ کا تو نام ہی "باطنی" تھا)۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے، خود اسی فرقہ کے ایک محقق، ڈاکٹر زاہد علی (سابق پروفیسر عربی و وائس پرنسپل، نظام کالج حیدر آباد دکن) نے بڑی ہمت اور جرأت سے کام لیا اور اپنے فرقہ کی مستند (مخفی) کتب و دستاویزات سے مرتب کردہ ایک کتاب شائع کر دی، جس کا نام ہے "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام"۔ ہمارے سامنے اس کتاب کا 1954ء کا ایڈیشن ہے اور ذیل میں جو کچھ درج کیا جاتا ہے، اسی سے مقتبس ہے۔ اس فرقہ کی اساس اور تعلیم کے متعلق اس کتاب میں لکھا ہے کہ:

اس دعوت کے بانی، ایرانی نژاد میمون القداح[1] یا ان کے فرزند سیدنا عبداللہ ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ایک ایسی مذہبی تحریک پیدا کرنا تھا جو خلافتِ عباسیہ کا مقابلہ کر سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں (امام عبداللہ) نے ایک انجمن بنائی جن میں ایسے افراد شریک کئے جو بالطبع معتزلیوں کے خیالات اور فلسفیوں کی رایوں کی طرف مائل تھے۔ اس تحریک کی کامیابی کے لئے اہلِ بیت کی مدد لینا پڑی تاکہ وہ شیعہ جن کو اہلِ بیت سے محبت تھی اسے جلد قبول کر لیں۔ (صفحہ 611)

ان کی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر زاہد علی نے لکھا ہے کہ ''ان کی ابتدائی بناء اس اصول پر ہے کہ آنحضرتؐ نے ظاہری شریعت وضع فرمائی اور مولانا علیؓ نے اس کے باطن یعنی تاویل کی تعلیم شروع کی۔ آپ کے بعد چھ اماموں نے باطنی تعلیم کی تکمیل کی، اور ساتویں امام (مولانا محمد بن اسماعیل) نے شریعتِ محمدیہؐ کے ظاہر کو معطل کر دیا۔ آپ کی نسل سے جو ائمہ ہوئے اور قیامت تک ہوں گے، وہ سب خلفائے قائم ہیں۔ ان میں سے اگر کسی خلیفہ کو موقعہ ملے تو وہ قائم کی حیثیت سے ظہور فرمائیں گے اور تاویل، یعنی علمِ باطن ظاہر کر کے تمام دنیا کو اسماعیلی مذہب کا پیرو بنائیں گے ...... اسماعیلی تعلیم کی بڑی خصوصیت راز داری اور پوشیدگی ہے۔ سیاسی مصلحتوں اور ملکی اغراض کے باعث ہم اپنے اصل عقیدے، اپنی دعوت کے بڑے بڑے ارکان کے سوا کسی دوسرے کو نہیں بتاتے تھے کیونکہ ہماری عام رعایا کا مذہب سُنّی تھا[2]۔ اس لئے ہم نے عام لوگوں کو جو تعلیم دی وہ اس تعلیم سے بالکل الگ تھی جو خاص خاص ارکانِ دعوت کو دی جاتی تھی بلکہ خود اسماعیلیوں میں بھی مستجیبوں، یعنی ابتدائی مدارج کے مومنین کو وہ بھید نہیں بتائے جاتے تھے جو بالغوں کو بتائے جاتے''۔

(مقدمہ ب)

ان کے عقائد کے متعلق لکھا ہے کہ ''امام کو رفعِ شریعت یعنی شریعت اٹھا دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ جب چاہے شریعت اٹھا سکتا ہے اور جب چاہے جاری کر سکتا ہے''۔ قرانِ کریم کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ''جس طرح یہود و نصاریٰ نے اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے علیحدہ کتابیں جمع کر لیں، مسلمانوں نے بھی اسی طرح کیا۔ رسولِؐ خدا نے کلام اللہ جمع کر کے اسے اپنے اصحاب کے سامنے اپنے وصی کے سپرد فرما دیا۔ یہ لوگ اس سے بے پرواہ ہو گئے اور اپنی رائے اور قیاس سے ایک الگ قرآن جمع کیا۔ اس کے بعد خلیفہ ثالث نے شیخین کا جمع کیا ہوا نسخہ جلا ڈالا اور ایک دوسرا نسخہ تیار کیا۔ پھر حجاج آیا اور اس نے خلیفہ مذکور کے نسخے کو لے کر آگ میں جھونک دیا۔ اس کے بعد اس نے جو چاہا نکال دیا اور ایسی کتاب تالیف کی جواب اُن کے پاس موجود ہے۔'' (مقدمہ)

محرفِ قرآن

ڈاکٹر زاہد علی نے ان اختلافات کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جو مسلمانوں کے مروّجہ قرآن اور حضرت علیؓ کے مرتب کردہ

1۔ اس کا ذکر، حکومتِ فاطمیہ کے ضمن میں آ چکا ہے۔

2۔ یہ مصر کی فاطمی حکومت کے زمانے کی بات ہے۔

قرآن میں پائے جاتے ہیں۔مثلاً سورہ مائدہ کی آیت [5:67] یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فِی علیّ ...... (واضح رہے کہ حضرت علیؓ کے مرتب کردہ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ان کے ائمہ کے پاس ہے اور اُسے قائم القیامۃ ہی کھولیں گے) تقیہ ان کے ہاں بنیادی عقیدہ ہے ـــــ نیز تاویل' جس سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا صحیح مفہوم اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں ہوتا' ان الفاظ کے باطنی معانی ہوتے ہیں جن کا علم ائمہ ہی کو ہوتا ہے۔قرآن کا حقیقی مفہوم انہی باطنی معانی (یا تاویل) کی رُو سے متعیّن ہوسکتا ہے۔اسی بناپر' نبی کو رسولِ ناطق (یعنی ظواہر پر حکم کرنے والا) اور وصی کو رسولِ صامت (یعنی باطن پر حکم کرنے والا) کہا جاتا ہے۔

باطنی معانی

تاویل کی بیّن مثال لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے باطنی معانی ہیں۔یعنی''لا امام الا امام الزمان'' (صفحہ 408) یا (مثلاً) وضو سے مراد حضرت علیؓ ہیں کیونکہ وضوء اور علی ہر ایک میں تین تین حرف ہیں اور صلٰوۃ (نماز) سے مراد آنحضرتؐ ہیں کیونکہ صلٰوۃ اور محمدؐ ہر ایک میں چار حرف ہیں۔لہٰذا' لا صلوٰۃ الا بوضوء کے معنی ہیں مولانا علیؓ کی وصایت (وصی ہونے) کے اقرار کے بغیر' آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار بے معنی ہے (صفحہ 424)۔یا (مثلاً) قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو شجرِ ممنوعہ کے استعمال سے منع کیا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ''امامِ مستقر مولانا ابو طالب نے آنحضرتؐ کو منع فرمایا تھا کہ تم (علم) تاویل کسی کو نہ بتانا' یہ صرف مولانا علیؓ کا حق ہے۔ظالم اوّل (ابلیس) نے دھوکے سے کچھ (علم) باطن آنحضرتؐ سے سیکھ لیا۔یہ آپؐ کا پہلا گناہ ہے۔آپ کا پچھلا گناہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی ایک بیوی سے یہ راز کہہ دیا کہ تمہارے باپ میرے وصی کا حق ظلم سے چھین لیں گے''[1] (صفحہ 461)۔یا (مثلاً) الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے اشارہ مولانا علیؓ کی طرف ہے'' (صفحہ 551)۔غرضیکہ اُن کے ہاں' قرآنِ کریم کی تمام آیات کا مفہوم اسی طرح (تاویل کی رُو سے) متعین کیا جاتا ہے اور یہ تاویلات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

امامت

اسماعیلی (اور دیگر شیعہ فرقوں) کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور مرکز' امام کا عقیدہ ہے۔اس عقیدہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

آنحضرتؐ کے دادا مولانا عبدالمطلب' ابراہیمؑ کی ذُرّیت سے ہیں۔آپ بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت عیسیٰؑ کے دَور میں مستقر امام تھے۔یعنی آپ میں نبوت' رسالت' وصایت اور امامت' چاروں مراتب جمع تھے۔آپ نے اپنے دو فرزندان' مولانا عبداللہ اور مولانا ابو طالب کو خدا کے امر و وحی سے الگ الگ رُتبے دیئے۔پہلے کو نبوت و رسالت کے رُتبے دے کر ظاہری دعوت کا صدر بنایا اور دوسرے کو وصایت و امامت کا درجہ دے کر باطنی دعوت کا رئیس مقرر کیا۔مولانا

---

1. معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔

ابو طالب نے نبوت و رسالت کا رتبہ آنحضرتؐ کو اور وصایت و امامت کا درجہ مولانا علیؑ کو دیا۔ مولانا ابو طالب کی شانِ عظمت و جلالت اس سے ظاہر ہے کہ آپ میں بھی مولانا عبدالمطلب کی طرح چاروں مراتب جمع ہو گئے تھے ...... آپ کے بعد یہی چاروں مراتب مولانا علیؑ کی ذات میں جمع ہیں (صفحہ 64-63)۔ چنانچہ مستقر امام' مولانا علیؑ ہی ہیں جن پر دلالت کرنے کے لئے آنحضرتؐ بھیجے گئے تھے ...... آپ نے جو آخری رسالت بہم پہنچائی وہ مولانا علیؑ کی ولایت ہے۔ گویا آپؐ کے مبعوث ہونے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ باطنی شرک کو مٹائیں۔ (اور باطنی شرک یہ ہے کہ) دنیا میں کوئی مشرک نہیں سب خدا کو واحد مانتے ہیں۔ اگر لوگ شرک کرتے ہیں تو مولانا علیؑ کی ولایت میں شرک کرتے ہیں (صفحہ 360)۔

امام کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ:

اگر تو اپنی آنکھوں سے امام کو زنا کرتے' شراب پیتے اور فواحش کا مرتکب ہوتا دیکھے تو اِسے اپنے دل و زبان سے منکر نہ سمجھ اور اس کے درست اور حق ہونے میں کچھ شک نہ کر' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ کو اس سے بچالیا ہے۔ (صفحہ 363)

بلکہ یہاں تک کہ:

ہمارے ائمہ معصومین کی شان انبیائے مرسلینؑ کی شان سے بدرجہا بلند ہے۔ دونوں میں مالک اور مملوک کا فرق ہے۔ ائمہ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔ بخلاف انبیائے مرسلینؑ کے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ان انبیاءؑ مرسلین میں موسیٰؑ تو ایک طرف خود آنحضرتؐ تک شامل ہیں[1]۔ (صفحہ 366)

آغا خانی اور بوہرے

ہندوستان میں' اسماعیلی' خوجوں (آغا خانیوں) اور بوہروں پر مشتمل ہیں۔ ان کے عقائد اور بھی عجیب و غریب ہیں جنہیں ہم' میرزا محمد سعید دہلوی (مرحوم) کی کتاب ''مذہب اور باطنی تعلیم'' کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

ادوارِ سابقہ میں جب حضرت علیؑ وشنو تھے تو حضرت محمدؐ نے ویدویاس کا قالب اختیار کیا۔ جب حضرت علیؑ اپنی معروفِ عام حیثیت میں نمودار ہوئے تو وہ وشنو کا دسواں اوتار (نش کلنکی) تھے ...... بعض خوجے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نعوذ باللہ خدا' اور سیدنا محمدؐ ان کے پیغمبر تھے۔ موجودہ آغا خان تک تمام نزاری[2] ائمہ' حضرت علیؑ کا اوتار تصور کئے جاتے ہیں' اور اس طرح انہیں بھی وہی مرتبۂ الوہیت حاصل ہے جو حضرت علیؑ کو حاصل تھا۔ خوجے اور شمسی ہندو انہیں اپنا

1۔ معاذ اللہ

2۔ اسماعیلیوں کا سب سے زیادہ مشہور فرقہ نزاری ہے جس کا ایک امام' حسن بن صباح تھا۔ باطنی فدائی اس کے معتقدین کہلاتے تھے۔ آغا خانیوں اور بوہروں کا تعلق اسی فرقہ سے ہے۔

معبود تصور کرتے ہیں ...... یہ لوگ آواگون یا تناسخ کے بھی قائل ہیں اور قیامت، جنت، دوزخ کے بھی —— قرآنِ مجید کو یہ سب سے آخری اور مستند وید خیال کرتے ہیں لیکن جو قرآن اس وقت ملتِ اسلامی کے درمیان ہے اس کو وہ مستند نہیں مانتے ...... نزار یہ فرقہ کا عموماً مسلک یہ رہا ہے کہ وہ جس ملک میں سکونت پذیر ہوتے ہیں، اس ملک کی شریعت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ترکستان میں وہ حنفی فقہ کے مقلد ہیں اور ایران میں اثناعشری فقہ کے پابند۔(صفحہ 342-339)

یہ ہیں مختصراً، شیعوں کے ایک اہم فرقہ، اسماعیلی کے عقائد۔

امامیہ یا اثناعشری

اس کے بعد آپ، ان کے دوسرے فرقہ امامیہ (اثناعشری) کی طرف آیئے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، شیعہ حضرات کا بنیادی عقیدہ امامت ہے، امامت کے متعلق اس فرقہ کے عقائد کیا ہیں، اسے ہم اس کتاب سے (براہِ راست) پیش کرتے ہیں جو اس فرقہ کے نزدیک مذہب کے ستون کی حیثیت رکھتی ہے —— یعنی کلینی کی کتاب الکافی۔ یہ ان حضرات کے نزدیک حدیث کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب ہے اور اس کی ہر حدیث، کسی نہ کسی امام سے مروی ہے۔

اصول الکافی

کتاب کا پورا نام ہے، الاصول الکافی، اور تالیف ہے، ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی الرازی، (متوفی 329ھ) کی۔ ہمارے سامنے اس کتاب کا وہ عربی نسخہ ہے جو مطبع الحیدری، طہران میں چھپا تھا اور جسے دار الکتب اسلامیہ، طہران نے شائع کیا تھا۔ اُردو ترجمہ ''حضرت ادیبِ اعظم، مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی'' کا ہے جسے شمیم بک ڈپو، ناظم آباد کراچی نے کتاب الشافی کے نام سے (1966ء میں) شائع کیا ہے[1]۔ اس میں امامت کے خصائص ولزوم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ خدا سے براہِ راست علم ملنے کا نام وحی ہے اور وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ آپؐ کی طرف نازل شدہ وحی، قرآنِ کے اندر درج ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں سند اور حجت قرآنِ مجید ہے اور اب کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے کوئی بات (جو قرآن سے باہر ہو) یہ کہہ کر منوائے کہ وہ خدا کا حکم ہے۔ خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا خاصۂ نبوت تھا۔ لیکن ہم اصول الکافی میں دیکھتے ہیں کہ اس میں امامت کو بھی شریک کر لیا گیا ہے، اگرچہ اس کے لئے اصطلاح نبی کی نہیں اختیار کی گئی، ایک اور اختیار کی گئی ہے۔ وہ اصطلاح ہے مُحدَّث (د کے زبر کے ساتھ) کی۔ الکافی میں ہے:

1۔ اصولِ کافی کا دوسرا حصہ ''فروعِ کافی'' ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی مولانا ظفر حسن صاحب کے قلم سے، شمیم بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔

محدّث کا عقیدہ

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ کَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبی وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے' اس کی آواز سنتا ہے لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے' خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا امام کی منزلت کیا ہے۔ فرمایا وہ فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ (الشافی' جلد اوّل صفحہ 203)

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھتے جایئے کہ اس روایت میں جو آیت لکھی گئی ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ [22:52] قرآنِ کریم میں' اس آیت میں ''وَلَا مُحَدَّثٍ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ اصولِ کافی (عربی) میں اس روایت کے نیچے حاشیہ میں لکھا ہے۔''ولا محدث'' انما هو قرأة اهل البيت عليه السلام۔ (جلد اوّل صفحہ 176)

''اہلِ بیت کی قرأت قرآنِ کریم میں اس آیت میں وَلَا مُحَدَّثٍ کے الفاظ آئے ہیں''۔ یہ بات آپ کے لئے وجۂ تعجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے)' بیشمار آیات ایسی ہیں جن کے متعلق (الکافی میں) کہا گیا ہے کہ جبریلِ امینؑ تو انہیں اِس طرح لے کر نازل ہوئے تھے لیکن مروّجہ قرآن میں' یہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس وقت ہم مُحَدَّث کے نظریہ سے بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔ یعنی مُحَدَّث وہ ہے جس کی طرف فرشتے پیغامِ خداوندی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ وہ ان کا کلام سنتا ہے لیکن انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ اس سے اگلی روایت میں ہے:

محدّث وہ ہے جو ملائکہ سے ہمکلام ہوتا ہے' ان کا کلام سنتا ہے لیکن انہیں دیکھتا نہیں اور نہ خواب نظر آتا ہے۔

(الشافی' جلد اوّل صفحہ 204)

ازاں بعد' ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ''میں اور میرے صلب سے گیارہ امام محدّث ہیں''۔

(الشافی' جلد اوّل' صفحہ 281)

اس میں اور نبوت میں عملاً کوئی فرق نہیں

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک خدا سے براہِ راست (بذریعہ ملائکہ) علم حاصل کرنے کا تعلق ہے' رسولؐ اور محدّث میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی تصریح الکافی کی دیگر روایات میں بھی موجود ہے۔ (مثلاً) قرآنِ کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [59:7] جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو' جس سے وہ روکے' اس سے رُک[1] جاؤ''۔

1۔ اس آیت کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔

کافی کی ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا مَاجَاءَ بِهٖ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلام اٰخُذُ بِهٖ وَمَانَهٰی عَنْهُ اَنْتَهٰی ـــ ''جو کچھ (حضرت) علیؓ نے فرمایا اس کو لو اور جس سے منع کیا ہے' اس سے باز رہو'' (شافی جلد اوّل صفحہ 225)۔ یہ اس لئے کہ جَرٰی لَهٗ مِنَ الْفَضْلِ مِثْلَ مَاجَرٰی الْمُحَمَّدُ' (شافی جلد اوّل صفحہ 225' عربی الکافی جلد اوّل صفحہ 197) یعنی' فضلِ خداوندی میں سے (حضرت) علیؓ کے لئے بھی وہی کچھ جاری ہوا تھا' جو رسولؐ اللہ کے لئے جاری ہوا تھا' یعنی دونوں کا سرچشمۂ علم ایک ہی تھا۔ اس کے بعد ہے:

امیر المومنینؑ اکثر فرمایا کرتے تھے میں اللہ کی طرف سے جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ میں فاروقِ اکبر ہوں' میں صاحبِ اعصا یعنی اجتماعِ مسلمین کا سبب ہوں' میں صاحبِ میثم یعنی وہ آیات ہوں جو دلیلِ امامت ہوں۔ میری وصایت (وصی ہونے) کا اقرار کیا ہے تمام ملائکہ' روح' اور مرسلین نے جس طرح اقرار کیا ہے محمد صلعم کے متعلق اور سوار کیا گیا ہوں منصبِ امامت پر' جیسے آنحضرتؐ (نبوت پر) .... اور یہ منصب ہمارا خدا کی طرف سے ہے۔

(شافی' جلد اوّل' صفحہ 225)

ایک اور روایت میں ہے:

امام اپنے زمانہ میں واحد و یگانہ ہوتا ہے۔ کوئی فضل و کمال میں اس کے نزدیک بھی نہیں ہوتا اور نہ کوئی عالم اس کے مقابلہ کا ہوتا ہے' نہ اس کا بدل پایا جاتا ہے نہ اس کا مثل و نظیر۔ وہ بغیر اکتساب اور خدا سے طلب کے ساتھ ہر قسم کی فضیلت سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اختصاص اس کے لئے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ (شافی' جلد اوّل صفحہ 231)

اس کے بعد' امام کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آلِ رسول میں سے ''نسلِ سیّدہ طاہرہ معصومہ سے ہوتا ہے'' (ایضاً' صفحہ 233)۔ ''انبیاء اور ائمہ علیہم السلام موفق من اللہ ہوتے ہیں اور علم و حکمتِ الٰہیہ کے خزانہ سے وہ چیز ان کو دی جاتی ہے جو ان کے غیر کو نہیں دی جاتی'' (ایضاً صفحہ 224)۔ ایک روایت میں بات اور بھی واضح ہوگئی ہے۔ فرمایا امام جعفر صادقؓ نے کہ:

اس (امام) کا علم اس وسیلہ سے ...... جو آسمان تک کھچا ہوا ہے تاکہ وحیٔ الٰہی کا سلسلہ قطع نہ ہو اور جو احکام من اللہ ہیں وہ نہیں حاصل ہوتے مگر بوسیلہ امام۔ اور خدا اپنے بندوں کے اعمال کو قبول نہیں کرتا جب تک معرفتِ امام نہ ہو...... امام خدا کا منتخب اور پسندیدہ ہوتا ہے' برگزیدہ اور مقبولِ خدا و رسول ہے۔ اور ایسا ہادی ہے جو محلِ اسرارِ الٰہیہ ہے ...... (خدا نے) خلق کے پیدا کرنے سے پہلے ان (ائمہ) کو پیدا کیا۔ (ایضاً صفحہ 36-235)

آپ نے غور فرمایا کہ نبی اور محدّث میں لفظی تغیر کے سوا کوئی فرق نہیں۔ یہ عقیدہ کہ ختمِ نبوت کے بعد بھی خدا انسانوں سے ہمکلام ہوتا ہے' (یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہوسکتا ہے) ازاں بعد کس کس شکل میں نمودار ہوتا رہا' اس نے کس طرح نبوت کے بند کئے ہوئے دروازہ کو چوپٹ کھول دیا' اور اس دروازے سے کون کون' کس کس انداز سے' داخل ہوئے اور ہوتے

جار ہے ہیں، اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔ سرِدست آپ امام کی مزید خصوصیات ملاحظہ فرمائیے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم وہ...... ہیں جن پر اللہ نے اپنی اطاعت فرض کی ہے[1]۔ لوگوں کو بدوں ہماری معرفت کے چارہ نہیں اور ہم سے جاہل رہنا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا وہ مومن ہے اور جس نے انکار کیا[2] وہ کافر ہے اور جس نے ہم کو نہ پہچانا لیکن انکار نہ کیا وہ گمراہ ہے، جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعتِ واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے...... فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے ہماری محبت ایمان ہے اور ہمارا بغض کفر...... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔ (شافی، جلداوّل، صفحہ16-215)

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے، امیر المومنین (یعنی حضرت علیؑ) کے متعلق فرمایا کہ:

رسولؐ اللہ کے بعد، مثلِ رسول ...... ان کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور ان پر تقدّم کرنے والا ایسا ہے جیسے خدا اور رسول پر سبقت کی...... اور ان پر فضیلت چاہنے والا ایسا ہے جیسے رسول ...... پر فضیلت چاہی اور چھوٹے یا بڑے حکم کو ان کے نہ ماننا شرک باللہ ہے۔ رسول اللہ وہ باب اللہ تھے جس میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔ وہ ایک راستہ تھے، جو اس پر چلا وہ اللہ سے مل گیا اور ایسے ہی امیر المومنین تھے۔ ان کے بعد، اور یکے بعد دیگرے تمام ائمہ کے لئے یہی صورت رہی۔

(شافی، جلداوّل، صفحہ227)

مسلمانوں میں قرآنِ کریم ہی دین میں سند و حجت تھی (اور ہے)۔ اس کے متعلق امام محمدؐ باقر نے فرمایا کہ

کسی کی یہ طاقت نہیں کہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس ظاہر و باطن قرآن کا پورا پورا علم ہے سوائے اوصیاء علیہ السلام کے۔ (شافی، جلداوّل، صفحہ261)

یہاں ظاہر کے ساتھ باطن کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔ ائمہ کے علم کے متعلق عقیدہ ہے کہ ان کا علم رسولؐ اللہ سے بھی زیادہ ہے یعنی علم کی ابتداء رسولؐ اللہ سے ہوئی تھی، انتہا ائمہ پر۔ الکافی میں ہے:

راوی کہتا ہے، میں نے ابوجعفر علیہ السلام کو کہتے سنا، اگر ہمارا علم زیادہ نہ ہوتا رہتا تو البتہ ہم اسے ختم کر دیتے۔ میں نے کہا، کیا ایسا علم بھی آپ کو حاصل ہوتا ہے جو رسولؐ اللہ کو نہ ہو۔ فرمایا صورت یہ ہے، پہلے رسولؐ پر پیش ہوتا ہے، پھر ائمہؑ پر اور پھر منتہیٰ ہوتا ہے ہماری طرف۔ (شافی، جلداوّل صفحہ291)

وحیؔ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ چونکہ یہ علم اکتسابی نہیں ہوتا اس لئے اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ رسول جب چاہتا اس پر وحی آجاتی۔ وحی کا نزول خدا کی مشیت پر موقوف ہوتا تھا، وہ جب چاہتا اور جو چاہتا رسول کو بذریعہ وحی بتا دیتا۔ اس کے برعکس

---

1 الشافی کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ الکافی کے الفاظ ہیں نحن الذین فرض اللّٰہ طاعتنا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے ''ہم وہ لوگ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے''۔

2 ہم نے پہلے لکھا ہے کہ معرفتِ امامؑ کفر و ایمان کا خطِ امتیاز قرار پا گئی۔ اس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ائمہ کے متعلق ہے:

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے' امام جب چاہتا ہے کہ جانے تو اس کو علم دے دیا جاتا ہے۔

(شافی' جلد اوّل صفحہ 295)

غیبؔ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ اس کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے' کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ البتہ خدا جس بات کا علم چاہے' حضراتِ انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی دے دیتا تھا۔ ائمہ کی علمِ غیب کے متعلق یہ کیفیت تھی کہ

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ جو امام یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا مصیبت پہنچے گی اور اس کا انجام کار کیا ہوگا' تو وہ مخلوقِ خدا کی راہنمائی نہیں کرسکتا اور خدا کی حجت نہیں ہوسکتا۔ (شافی صفحہ 295)

عیسائیت کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے اپنی جان دے کر' گناہ گاروں کو بخشوالیا' یعنی ان کا خون گنہ گاروں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ الکافی کی ایک روایت میں ہے کہ

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا' اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوا ہمارے شیعوں پر (بہ سبب ترکِ تقیہّ)۔ پس اختیار دیا مجھے اپنے اور ان کے قتل ہونے کے درمیان۔ پس میں نے اپنی جان دے کر ان کو بچالیا۔ (شافی' جلد اوّل' صفحہ 297)

ایک اور روایت میں ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا نہیں حیا کرتا عذاب دینے سے اس گروہ کے جو عبادت کرے تحتِ ولایت و محبتِ امام جابر' چاہے اس کے اعمال کتنے ہی نیک ہوں اور حیاء کرتا ہے عذاب دینے میں اس گروہ کو جو عبادت کرے امام منصوص من اللہ کی محبت کے ساتھ چاہے اس کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں۔ (شافی' جلد اوّل صفحہ 462)

نجات و سعادت کا یہی مدار ہے' کفر و ایمان کا یہی معیار ہے۔

ابوحمزہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا' علی وہ دروازہ ہیں جس کو اللہ نے کھولا ہے۔ جو اس میں داخل ہوا وہ مومن ہے اور جو اس سے خارج ہوا وہ کافر ہے۔ اور جو نہ داخل ہوا اور نہ خارج ہوا وہ اس طبقہ میں ہے جس کے متعلق خدا نے کہا کہ اس کے لئے میری مشیّت ہے (چاہے بخشوں چاہے نہ بخشوں)۔ (شافی' جلد اوّل' صفحہ 541)

ان ائمہ کی معرفت اُمتِ محمدیہؐ ہی پر لازم نہیں تھی' انبیاء سابقہ کی وساطت سے بھی ان کی پہچان کرا دی گئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ

فرمایا امام رضا علیہ السلام نے کہ تمام صحفِ انبیاء میں ولایتِ علیؑ کا ذکر تھا۔ خدا نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جو نبوتِ محمدؐ اور وصایتِ علی کا مُقِر نہ ہو۔ (شافی' جلد اوّل' صفحہ 41-540)

حضرت علیؓ کا مقام

حضرت علیؓ کی فضیلت کا ذکر آ گیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں' موجودہ شیعہ حضرات کے عقائد کی بھی دو ایک مثالیں پیشِ خدمت کر دی جائیں۔ لاہور سے (شیعہ حضرات کا) ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے —— معارفِ اسلام —— وہ ہر سال' بالعموم ستمبر۔اکتوبر میں' اپنا ایک خاص نمبر شائع کرتے ہیں جس کا عنوان ہوتا ہے —— علیؓ و فاطمہؓ نمبر۔اس رسالہ کی اشاعت بابت ستمبر' اکتوبر 1972ء میں علامہ مجلسیؒ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے' جس میں آپ نے فرمایا:

میں خدا کے اسمائے حسنیٰ' امثالِ علیا اور آیاتِ کبریٰ ہوں اور میں ہی جنت اور دوزخ کا مالک ہوں۔ میں اہلِ جنت کو جنت میں داخل کروں گا اور اہلِ نار کو جہنم میں ڈالوں گا اور میں ہی اہلِ جنت کی ترویج کروں گا اور میرے ہی ذمہ اہلِ جہنم کا عذاب کرنا ہے اور میرے ہی طرف ساری مخلوق کی بازگشت ہوگی' اور میں ہی مرکز ہوں' میری ہی طرف ہر ایک شئے بعد قضاء الٰہی رجوع کرتی ہے اور میرے ہی ذمہ ساری مخلوقِ خدا کا حساب ہے۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کے وقت احتجاج و اتمامِ حجت کیا اور میں ہی روزِ قیامت ان کا شاہد ہوں اور میں ہی وہ ہوں جس کے پاس کل مخلوق کی موت اور مصائب اور فیصلہ جات کا علم ہے اور جملہ آیات و معجزات و کتبِ انبیاء علیہم السلام میرے سپرد کی گئی ہیں اور ان کا محافظ ہوں اور میں لاٹھی والا اور نشان والا ہوں اور میں ہی ہوں جس کے لئے بادل' گرج' بجلی' تاریکیاں' روشنیاں' ہوائیں' پہاڑ' سمندر' ستارے' سورج اور چاند مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور میں ہی وہ ہوں جس نے اس علم کے ذریعہ جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے گن کر احصاء کیا ہوا ہے اور میں رازِ قدرت کے ذریعہ جو اللہ نے محمدؐ کو عطا فرمایا اور محمدؐ نے مجھے پہنچایا ہے۔ اور میں ہی ہوں جس کو خدا نے اپنا نام' اپنا کلمہ' اپنی حکمت' اپنی فہم عطا فرمائی ہے' اے معاشر الناس' پوچھ مجھ سے قبل اس کے کہ مجھ کو نہ پاؤ۔ خداوند! میں تجھ کو اپنا گواہ بناتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ **لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ العلی العظیم**

(صفحہ 61-60)

اسی رسالہ کی ستمبر 1971ء کی اشاعت میں تحریر ہے۔

اگر جناب مولا علیؑ نہ ہوتے تو جناب رسولِ خدا پیدا نہ ہو سکتے اور جناب رسولِ خدا پیدا نہ ہوتے تو **لولاک لما خلقت الافلاک**' زمین و آسمان پیدا نہ ہوتے' لہٰذا' علیؑ نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا۔ (صفحہ 8)

اسی رسالہ کی نومبر 1967ء کی اشاعت میں ہے:

قربان جائیں اس مظہر العجائب والغرائب اسد اللہ الغالبؑ کے کہ جب اُس نے توراتِ موسیٰؑ میں ظہور فرمایا تو خدا کا منہ

اور خدا کا کلام بن گیا۔ جب وہ زبورؔ میں جلوہ افروز ہوا تو تحمید و تمجید کا لباس اوڑھ کر لحنِ داؤدؑ بن گیا۔ جب اس کی تجلیات غزل الغزلات میں ظاہر ہوئیں تو تقدیس و عبودیت کی دعاؤں میں سلیمانؑ کا لہجہ بن گیا۔ جب وہ انجیلِ عیسٰیؑ میں نُور بار ہوا تو مددگار اور طفلِ معصوم بن گیا۔ جب وہ صحیفۂ یوحناؔ میں ضیا پاش ہوا تو اسپِ سفید پر سوار ہو کر شیر کی آواز میں آیاتِ حمد پڑھنے لگا۔ جب وہ قرآنِ حمید میں روشن ہوا تو جگہ جگہ اس کا ذکر' جگہ جگہ اس کی فضیلت' جگہ جگہ اس کی مدحت' جگہ جگہ اس کی شجاعت' جگہ جگہ اس کی کرامت۔ کبھی وہ یَدُ اللّٰہِ کی صورت میں خدا کا ہاتھ' کبھی وہ لِسَانُ' صِدْقًا نَبِیًّا کی صورت میں رسولوں کی سچی زبان۔ (صفحہ 91)

اسی تسلسل میں آگے لکھا ہے:

ذرا اور آگے چلئے ...... یہ بے مثال و بے نظیر امامِ اوّل زرتشت کے ژندو پاژند میں پہنچا تو شعلۂ جوالہ کی صورت میں' جین مت میں گیا تو شانتی اور اہنسا کی صورت میں' ویدوں میں اس نے روپ دھارا تو اُوم کی صورت میں' شاستروں میں سروپ دکھایا تو پرم آتما کی صورت میں' گیانوں میں قدم رکھا تو مہابلی کی صورت میں' گیتا میں جلوہ ریز ہوا تو نارائن کی صورت میں' رامائن میں ضوفشاں ہوا تو مہاتم کی صورت میں' اور دیوتاؤں کو نظر آیا تو سنگھ کی صورت میں' سنگھ! شیر' اسد' لائن —— اسی شیر کی' اسی سنگھ کی' ہزار ہا سال سے مندروں' شودواروں میں پرستش کی جا رہی ہے۔ کرشن جی کو جب چودہ معصوموں کے چودہ صفاتی روپ نظر آتے تھے' ایک روپ میں سنگھ یعنی شیر بھی دکھائی دیتا تھا۔ (صفحہ 92-91)

یہ ہیں دو چار مثالیں ان عقائد کی جو حضرت علیؓ کی فضیلت کے سلسلہ میں شیعہ حضرات میں رائج ہیں اور اس کا تو غالباً آپ کو علم ہی ہوگا کہ ان حضرات کا کلمہ اس طرح مکمل ہوتا ہے لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔ علی ولی اللّٰہ۔

(معارفِ اسلام' نومبر 1967' صفحہ 141)

موجودہ قران محرف ہے

آپ نے دیکھا کہ محدّث کے عقیدہ سے شروع ہو کر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کہ جب نجات وسعادت ائمہ منصوص کی اطاعت' بلکہ معرفت کے ساتھ مشروط ہوگئی تو پھر نہ (براہِ راست) قرآنِ کریم کی کوئی حیثیت باقی رہی نہ ختمِ نبوت کی کوئی اہمیت۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی ایسے عقائد بھی عام کئے گئے ہیں جن سے قرآن کی محفوظیت اور ابدیت ہی باقی نہ رہی۔ چنانچہ الکافی (کے باب کتاب الحجت) میں متعدد آیات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی لیکن مروّجہ قرآن میں اس طرح ہے"۔ ہم یہاں اس کی دو چار مثالیں پیش کرتے ہیں:

عن ابی عبداللّٰہ علیہ السلام فی قولہٖ تعالٰی لقد عھدنا الی آدم من قبل کلمات فی محمد وعلی وفاطمہ والحسن والحسین و الائمۃ علیھم السلام من ذریّتھم فنسی.ھکذا واللّٰہ نزلت علی محمد۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ لقد عھدنا کے متعلق فرمایا کہ وہ کلمات تھے محمدؐ وعلیؑ وفاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ اوران ائمہ کے متعلق جوان کی ذریت سے ہونے والے تھے۔آدم ان کو بھول گئے۔واللہ محمدؐ پر یونہی نزولِ آیت ہوا۔

(شافی' صفحہ513)

قرآن مجید میں یہ آیت اس طرح ہے **وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا** [20:115]

ایک روایت میں ہے۔

فرمایاامام جعفر صادق علیہ اسلام نے'آیت (**فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ**......)''عنقریب تم جان لوگے کہ کھلی گمراہی میں کون ہے۔اے جھوٹوں کے گروہ!تم کو میں نے ولایتِ علیؑ کی اپنے بعد آنے کی خبر دے دی تھی'اب کھلی گمراہی میں کون ہے'' کے متعلق (فرمایا) کہ یہ آیت اس مضمون کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ (شافی' جلداوّل' صفحہ517)

قرآنِ کریم میں صرف اتنا ہے **فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** [67:29]

ایک روایت میں ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی کہ''جب ایک سائل نے سوال کیا ایسے عذاب کا جو واقعہ ہونے والا تھا (ولایتِ علیؑ کے) منکروں پر اور جس کا کوئی دفع کرنے والا نہ تھا''۔امام نے فرمایا' واللہ! رسولؐ پر یہ اس طرح (یعنی بولایتِ علی کے ساتھ) نازل ہوئی تھی۔ (شافی' جلداوّل' صفحہ518)

قرآنِ مجید میں یہ آیات اس طرح ہیں **سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ** [70:1-2]

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس قسم کی آیات میں جو الفاظ خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے لیکن اب قرآن میں نہیں ہیں' وہ کس طرح حذف (گم) ہوگئے اس کے متعلق

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جبریل حضرت رسولِ خداؐ پر یہ آیت اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے''جن لوگوں نے (آلِ محمدؐ کا حق غصب کیا) انہوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایک دوسری بات سے۔پس ہم نے ان لوگوں پر (جنہوں نے آلِ محمدؐ کا) حق لے لیا تھا' آسمان سے اس لئے عذاب نازل کیا کہ وہ بدکار تھے۔

(شافی' صفحہ520)

قرآن کی آیت یوں ہے کہ: **فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ** [2:59]

قرآنِ کریم کی خصوصیتِ کبریٰ، اساسی اہمیت اور انفرادیت اس میں ہے کہ یہ خدا کی آخری، مکمل اور غیر متبدل کتاب ہے اور ایسی محفوظ کہ اس میں ایک حرف کی بھی نہ کمی بیشی ہوئی ہے (نہ ہوسکتی ہے) اور نہ ہی ردّ و بدل کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [15:9] اس کا ارشاد ہے)۔ اگر اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ شک پیدا ہو جائے کہ یہ اصل ہے یا نہیں، تو اس پر ایمان کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت انبیاء سابقہ کی طرف نازل شدہ محرف کتابوں (تورات، انجیل) کی سی رہ جاتی ہے۔ جو مثالیں ہم نے اوپر پیش کی ہیں (اور اس قسم کی متعدد اَور آیات بھی الکافی میں درج ہیں)۔ ان کی رُو سے قرآن کی محفوظیّت اور ابدیّت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کے باطنی معانی

جن آیات کے متعلق کہا کہ ان میں ردّ و بدل نہیں ہوا، ان کے معانی ایسے بیان کئے گئے جن کی سند قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔ ان معانی کی بنیاد (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) ائمہ کا وہ علم ہے جو انہیں خدا سے حاصل ہوتا تھا، اسے تاویل کہا جاتا ہے (تاویل اور قرآن کے باطنی معانی کے متعلق تفصیلی ذکر اسماعیلیہ کے عقائد کے ضمن میں آچکا ہے)۔ مثلاً قرآنِ کریم کی آیت عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ○ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ [78:1-2] "تم سے پوچھتے ہیں نباءِ العظیم کے متعلق" کے معانی کے سلسلہ میں:

> امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا — نباءِ عظیم سے مراد ولایت ہے۔ (راوی نے) سوال کیا۔ کیا ولایتِ خدا مراد نہیں۔ فرمایا ولایتِ امیر المومنین مراد ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صفحہ 514)

اسی طرح آیت وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا [10:105] کے متعلق:

> امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے مراد ولایت ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صفحہ 515)

قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے

یہاں تک بات موجودہ قرآن میں تحریف اور اس کے معانی میں تاویل کی ہو رہی تھی لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کافی (کتاب الحجۃ) کے انتالیسویں باب کی دو روایات میں دیکھئے جن کا مکمل ترجمہ درجِ ذیل ہے۔

> ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، میں آپ پر فدا ہوں، آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرا کوئی کلام سُن تو نہیں رہا۔ حضرت نے وہ پردہ اٹھایا جو اس مکان اور دوسرے کمرے کے درمیان تھا، میں نے جھانک کر دیکھا۔ حضرت نے فرمایا اب جو تمہارا دل چاہے پوچھو۔ میں نے کہا میں آپ پر فدا ہوں، آپ کے شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ایک باب علم کا تعلیم دیا جس سے ہزار باب علم کے

آپ پر اور منکشف ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا' اے ابو محمد (کنیت ابو بصیر)! رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ہزار باب علم کے تعلیم کئے اور ان پر ہر باب سے ہزار باب اور ظاہر ہوئے۔ میں نے کہا واللہ' علم اس کا نام ہے۔ پس حضرت کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا' اے ابو محمد! ہمارے پاس جامعہ ہے' لوگ کیا جانیں جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا حضور بتائیں جامعہ کیا ہے۔ فرمایا' وہ ایک صحیفہ ہے ستر ہاتھ لمبا رسولؐ اللہ کے ہاتھ سے اور رسولؐ اللہ نے اس کو اپنے ذہنِ مبارک سے بیان فرمایا اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے اس کو لکھا۔ اس میں تمام حلال و حرام کا ذکر ہے اور ہر اس شے کا جس کی احتیاج لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہلکے سے خراش کی دِیت کا بھی ذکر ہے۔ پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے اوپر رکھا اور فرمایا' اے ابو محمد! مجھے اجازت ہے۔ میں نے کہا' میں آپ پر فدا ہوں میں آپ کا ہوں جو چاہئے کیجئے۔ حضرت نے اپنی دو انگلیوں سے چٹکی لے کر فرمایا' اس کی دِیت کا بھی ذکر ہے۔ یہ آپ نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ میں نے کہا' واللہ علم یہ ہے۔ حضرت نے فرمایا' صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا ہمارے پاس جفر بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں جفر کیا ہے؟ میں نے پوچھا حضور جفر کیا ہے۔ فرمایا وہ ایک ظرف ہے آدم کے وقت سے جس میں انبیاء اور اوصیاء کے علم کا ذکر ہے اور ان تمام علماء کے علم کا جو بنی اسرائیل میں ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا' بس علم تو یہی ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا' ہمارے پاس مصحفِ فاطمہؑ بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ کیا ہے۔ میں نے کہا وہ کیا ہے۔ فرمایا' تمہارے اس قرآن سے (بلحاظ تفصیل و توضیح احکام) وہ مصحف تین گنا زیادہ ہے۔ تمہارے قرآن میں ایک حرف ہے یعنی اجمال ہے۔ میں نے کہا واللہ علم یہ ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں۔ پھر خاموش رہ کر فرمایا' ہمارے پاس علم **ما کان وما یکون** ہے قیامت تک کے واقعات کا۔ میں نے کہا واللہ علم اس کو کہتے ہیں۔ فرمایا' ہاں اس کے علاوہ بھی ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا ہے' فرمایا' جو حادثے رات اور دن میں ہوتے ہیں اور جو ایک امر دوسرے کے بعد اور ایک شے دوسری شے کے بعد دنیا میں ہوتی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی' ہمیں اس کا بھی علم ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سنا کہ 128 ہجری میں فلاسفہ (بعہدِ بنی عباس) ظاہر ہوں گے (جو منکرِ اسلام و توحید ہوں گے)۔ میں نے یہ مصحفِ فاطمہؑ میں دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا' مصحفِ فاطمہ کیا ہے۔ فرمایا جب رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا تو جناب فاطمہؑ پر ہجومِ اندوہ و غم ہوا' ایسا کہ جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خدا نے ان کے پاس اس غم میں تسلی دینے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا جس نے ان سے کلام کیا۔ حضرت فاطمہؑ نے یہ واقعہ امیر المومنین سے بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا اب جب فرشتہ آئے اور تم اس کی آواز سنو تو مجھے بتانا۔ چنانچہ جب پھر فرشتہ آیا تو حضرت فاطمہؑ نے آگاہ کیا۔ امیر المومنین علیہ السلام فرشتے کی تمام باتوں کو لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ باتیں اس مصحف میں لکھی گئیں۔ پھر فرمایا اُس میں حلال و حرام کا ذکر نہیں بلکہ آئندہ ہونے والے واقعات کا ذکر ہے۔

(الشافی' جلد اوّل' صفحہ 272-270)

یہاں آخر میں کہا گیا ہے کہ اس میں حرام وحلال کا ذکر نہیں لیکن اس کے دو ہی تین روایتوں کے بعد' ایک روایت میں ہے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سنا کہ ہمارے پاس وہ چیز ہے کہ ہم اس کی وجہ سے لوگوں کے محتاج نہیں بلکہ لوگ ہمارے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس کو رسولؐ اللہ نے لکھوایا اور حضرت (علیؓ) نے لکھا۔ اس میں حلال وحرام کا ذکر ہے۔ ہم جانتے ہیں اس اَمر کو جسے تم شروع کرتے ہو اور جانتے ہیں جب تم ختم کرتے ہو۔ (شافی' جلد اوّل' صفحہ 274-273)

خدا کی طرف سے یہ تمام احکام ملائکہ لے کر نازل ہوتے تھے۔ ملائکہ ائمہ حضرات کے گھروں میں کس انداز سے آتے تھے' اس کے متعلق

ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ میں حضرت علی بن الحسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر مجھے باہر رُکنا پڑا پھر میں اندر داخل ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کوئی چیز چُن رہے ہیں اور پردہ کے اندر ہاتھ سے ان کو دے رہے ہیں جو گھر میں ہے۔ میں نے کہا یہ کیا چیز آپ چن رہے ہیں۔ فرمایا یہ ملائکہ کے پروں کے ریشے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد جب ہم خلوت میں ہوتے ہیں تو ان کو جمع کر کے اطفال کے لئے تعویذ بناتے ہیں۔ میں نے کہا حضور کیا وہ آپ کے پاس آتے ہیں؟ فرمایا کہ ہم اپنے تکیوں سے حرکت کر نہیں پاتے کہ وہ آ جاتے ہیں۔ (شافی' جلد اوّل' صفحہ 485)

ایرانیّت کو ان عقائد سے کیا تعلق ہے؟

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ ہرمزان نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ہم لوگ تم (عربوں) سے شکست اس لئے کھا گئے ہیں کہ تمہارے پاس خدا کی کتاب ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم' تم پر کبھی غالب نہیں آ سکتے —— دنیا کی کوئی قوم بھی تم پر غالب نہیں آ سکتی —— اور اس کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کس طرح اس امت کے ہاں سے (عملاً) گُم کر دیا گیا۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(1) جو عقائد ونظریات سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آئے ہیں' وہ ائمہِ کرام کی طرف منسوب ہیں جو سب کے سب عرب تھے پھر اس میں ایرانیت کا کیا دخل ہے۔ اور

(2) یہ عقائد ونظریات' مسلمانوں کے ایک فرقہ (شیعہ حضرات) کے ہیں۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم (سُنّی حضرات) کے تو یہ عقائد نہیں۔ کیا ان کے ہاں سے بھی قرآن گُم ہو گیا' اور اگر ایسا ہوا تو وہ کیسے؟

یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور غور وفکر سے سمجھنے کے قابل۔ آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس حقیقت کو بارِ دگر سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نہ سُنّی ہوں نہ شیعہ' میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ میں قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں اور میرا عقیدہ

(بلکہ ایمان یہ ہے کہ) خدا کی یہ کتاب عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ' نظریہ' تصور' مسلک و مشرب جو اس کے خلاف جاتا ہو' میرے نزدیک درست نہیں ہوسکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگانِ سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو' تو (ان حضرات کے احترام کے پیشِ نظر) میں یہی کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ میری اس وضاحت کے بعد آگے چلئے۔

جامعینِ حدیث سب ایرانی تھے

گزشتہ صفحات میں جن عقائد و نظریات کا ذکر کیا گیا ہے' ان کی نسبت بے شک شیعہ حضرات کے ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق مستند طور پر کہا جاسکے کہ وہ خود ان حضرات میں سے کسی کی تصنیف ہے۔ ان حضرات کی طرف منسوب کردہ اقوال' ہمارے پاس جامعینِ روایات کے ذریعے پہنچے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) اثنا عشری جامعینِ احادیث میں' ثقۃ الاسلام کلینیؒ کو سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش مقامِ رَے (موجودہ طہرانؔ) میں 250ھ میں ہوئی اور وفات 329ھ میں۔ امامیہ شیعہ حضرات کے گیارہویں امام حسن عسکریؒ نے 260ھ میں وفات پائی اور ان کے بعد' ان کے بارہویں امام' محمد المنتظر' چار یا پانچ سال کی عمر میں' (بغداد کے قریب) سامرّا کے غار میں مستور ہوگئے[1]۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کلینیؒ نے' اپنی جمع کردہ روایات' کسی امام سے براہِ راست نہیں لیں' دوسرے راویوں سے حاصل کی ہیں۔ شیعہ حضرات کی حدیث کی باقی تین کتابیں' اس سے بھی بعد میں مدوّن ہوئی تھیں۔ یعنی من لا یحضرہ الفقیہ (شیخ محمد ابنِ علی' متوفی 381ھ) اور تہذیب اور استبصارؔ (ابوجعفر محمد بن حسن' متوفی 460ھ)۔

الکافؔی کی ضعیف روایات

الکافی کے متعلق کتاب الشافی (جلد اوّل) کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ

کافی کی سولہ ہزار ایک سو ننانوے احادیث میں صرف پانچ ہزار بہتر صحیح ہیں۔ باقی ایک سو چوالیس حسن' ایک ہزار ایک سو سولہ موثق' تین سو دو قوی اور نو ہزار چار سو پچاس ضعیف ہیں۔ (صفحہ 6)

انہی (مولانا سیّد ظفر حسن صاحب) نے کتاب فروعِ کافی کے ترجمہ میں تحریر فرمایا ہے:

فرقہ شیعہ نے اپنی کتابوں کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ من اوّلہ و آخرہ ان کی تمام احادیث صحیح اور متواتر ہی ہیں۔ کسی کتاب میں کسی حدیث کا پایا جانا اس کی صحت کا ثبوت نہیں کہا جاسکتا' جب تک وہ معیارِ حدیث پر صحیح نہ اُترے۔ (صفحہ 5)

---

1. ڈاکٹر زاہد علی (صفحہ 155)

مجھ پر انکارِ حدیث کا اتہام

اور راقم الحروف کے نزدیک ''معیارِ حدیث'' یہ ہے کہ کوئی حدیث جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہو' صحیح نہیں ہوسکتی۔ اسی بنا پر مَیں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے' اس میں سے جو عقائد اور تعلیم' قرآنِ کریم کے خلاف ہے' حضراتِ ائمہ کرام کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں ہوسکتی۔ ان کا شمار (سیّد ظفر حسن صاحب کی مندرجہ بالا تصریح کے مطابق) ضعیف روایات میں ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ شیعہ حضرات انہیں صحیح سمجھتے ہیں اس لئے مجھے اس باب میں کسی فیصلہ دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ ویسے بھی' مجھے اس سلسلہ میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ' شیعہ حضرات کی طرف سے' خود مجھے بھی' ''فتنۂ انکارِ حدیث'' سے متہم کیا گیا ہے۔ چنانچہ الشافی (جلد اوّل) کے مقدمہ میں' علامہ محمد حسن صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

> مگر افسوس ہے کہ بایں ہمہ' مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ حدیث کی افادیت کا منکر ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے — ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ — اس فتنہ کا حجرِ اساس تو پیغمبرِ اسلام کے آخری لحاتِ حیات میں آنجنابؐ کے مطالبۂ قلم و دوات کے جواب میں حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ (بخاری شریف......) کہہ کر رکھ دیا تھا اور انہی حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ کے قائل کے دورِ[1] خلافت میں حدیث بیان کرنے والوں کو دُرّے لگتے — (الفاروق' شبلی)۔ یہ نظریۂ فاسدہ' اسلام کے مختلف اَدوار سے گزر کر' مولوی چکڑالوی اور مسٹر پرویز کے وقت خوب برگ و بار لے آیا۔ اب جب کہ وہ اپنے اصلی رنگ و روپ اور حقیقی خدوخال کے ساتھ منظرِ عام پر ظاہر ہوا ہے تو حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ کے قائل بھی چلاّ اُٹھے ہیں اور اس خیال کے ابطال پر متعدد کتب و رسائل لکھ ڈالے ہیں مگر ان حضرات کو کون سمجھائے کہ — اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست۔ (مقدمہ الشافی' جلد اوّل صفحہ 3)

میرا ''انکارِ حدیث'' اتنا ہی ہے جو میں کہتا ہوں کہ جو حدیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے' رسول اللہؐ یا بزرگانِ دین کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ وہ کوئی ایسی بات کہہ نہیں سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔ میں نے کبھی نہیں کہا — ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ — جو احادیث قرآن کے خلاف نہیں' میں انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ کہنے کے جرم میں مجھے جس ذاتِ گرامی (حضرت عمرؓ) کے ساتھ ہم رشتہ کیا گیا ہے' میرے لئے یہ سعادت کچھ کم باعثِ فخر نہیں۔

گرچہ خوردیم نسبت ایست بزرگ

1۔ مراد ہے حضرت عمرؓ سے۔

سُنیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں ـــــ یعنی اس سوال کی طرف کہ سُنیوں کے عقائد و تصورات پر ایرانی سازش نے کیا اور کس طرح اثر کیا۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ عجمی سازش کا محوری نقطہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآنِ کریم کی اہمیت و عظمت کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ خیال عام کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے قرآنِ مجید مرتب شکل میں اُمت کو نہیں دیا تھا، وہ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ جمع اور مرتب کیسے ہوا، اس کے لئے عجیب و غریب روایات ملتی ہیں (روایات کے متعلق ہم تفصیل سے بعد میں لکھیں گے)۔

جمعِ قرآن کے متعلق شکوک و شبہات

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اہلِ سنت والجماعت یعنی سُنّی حضرات کے احادیث کے متعدد مجموعے ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو، جنہیں صحاح ستّہ کہا جاتا ہے، مستند مانا جاتا ہے۔ پھر صحاحِ ستّہ میں سے دو کتابوں ـــــ مسلمؒ اور بخاریؒ، کو صحیحین، اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کتبِ روایات میں جمعِ قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

امام ابنِ ابی داوٗد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہوا، ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا، وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہوگئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے، میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کرلو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا، بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرحِ صدر کر دیا تھا، میرا بھی شرحِ صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہوگئی جو اُن کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہؐ صلعم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو، ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت لکھتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا، وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے حتیٰ کہ جس اَمر کے لئے ان دونوں کو شرحِ صدر ہوا تھا مجھے بھی شرحِ صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہوگئی جو اُن دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں، اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی ـــــ یعنی **لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ** (آلایہ) چنانچہ

میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہؓ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا۔[1]

(مقامِ حدیث صفحہ 276)

دیگر روایات میں ہے کہ (1) قرآنِ مجید کو جمع حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا' حضرت زیدؓ نے اس پر صرف نظرِ ثانی کی تھی۔ (2) اسے حضرت عمرؓ نے جمع کیا تھا۔ (3) حضرت عمرؓ نے بھی نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ نے۔ جیسا کہ باب چہارم حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ میں بیان کیا گیا ہے' ان روایات کی رُو سے' اس طرح جمع شدہ قرآنِ مجید میں بعض آیات درج ہونے سے رہ گئی تھیں اور تلاش کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انہیں حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی تھی۔ آیۂ رجم کے متعلق حضرت عمرؓ کو اصرار تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن میں موجود تھی۔ جب ان سے (ان کے زمانۂ خلافت میں) کہا گیا کہ اس آیت کو قرآن میں شامل کر دیا جائے تو آپ نے کہا کہ وہ اسے قرآن میں تو درج نہیں کریں گے' البتہ حکم اس کا باقی رکھیں گے' چنانچہ عمل اس آیت کے مطابق ہوتا رہا۔ یعنی زنا کی سزا سنگساری۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے کے مرتب کردہ صحائف' حضرت حفصہؓ کے پاس تھے۔ مروان نے انہیں اپنے زمانے میں ان سے لے کر جلا دیا (بعض روایات میں ہے کہ وہ نسخہ کنوئیں میں گر گیا تھا)۔ بہرحال' وہ کنوئیں میں گر گیا ہو' یا جلا دیا گیا ہو' وہ نسخہ (یا صحائف) اُمت کے پاس نہ رہے۔ جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے مرتب فرمایا تھا اس کے متعلق امام ابنِ ابی داؤد اپنی تصنیف ''کتاب المصاحف'' میں لکھتے ہیں کہ

> جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہو گئے اور انہوں نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر مجھے اس میں کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں۔ (لیکن کوئی بات نہیں) عرب انہیں اپنی زبانوں سے ٹھیک کر لیں گے۔

بعد میں (بزمانہ بنی اُمیہ) حجاج بن یوسف نے' مصحفِ حضرت عثمانؓ میں گیارہ جگہ تبدیلیاں کیں۔ مروّجہ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حجاج کا تصحیح کردہ ہے۔ علاوہ ازیں' خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مختلف صحابہؓ کے پاس جو قرآن کے نسخے تھے' ان میں اور مصحفِ عثمانؓ میں متعدد اختلافات تھے —— یہ ہے جو خود سُنیوں کی روایات میں قرآنِ کریم کے متعلق درج ہے۔

آپ سوچئے کہ جس قرآن کی جمع و تدین کے متعلق اس قسم کے خیالات عام کر دیئے جائیں' اس کی محکمیت کہاں باقی رہ سکتی ہے؟ (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ خیالات کس زمانے میں وضع اور عام کئے گئے اور ان میں ایرانیت کا کہاں تک دخل تھا)۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

بہرحال' قرآنِ مجید (روایات کی رُو سے جیسے تیسے بھی جمع ہوا) اُمت کے پاس آ گیا۔ اب اس کے متعلق یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اس میں بے شمار آیات منسوخ ہیں —— یعنی وہ آیات قرآن میں موجود ہیں' ان کی تلاوت بھی کی جاتی ہے لیکن حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات' قرآن ہی کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں

1. تفصیل ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں دیکھئے۔ وہیں ان تمام روایات کے حوالے بھی ملیں گے۔

اور دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیات، بعض احادیث کی رُو سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ اِس (دوسرے) عقیدہ کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر لکھیں گے۔ جہاں تک اوّل الذکر عقیدہ کا تعلق ہے، قرآن میں یہ کہیں درج نہیں کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اسے ''علماء'' پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس آیت کے متعلق چاہے کہہ دیں کہ اسے فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ یہ روش اس قدر عام ہوئی کہ قرآنِ مجید کی قریب پانچ سو آیات منسوخ قرار دے دی گئیں۔ اس تعداد میں مختلف زمانوں میں کمی بیشی ہوتی رہی تا آنکہ شاہ ولی اللہؒ نے انہیں گھٹا کر پانچ آیات تک محدود کر دیا ـــــ لیکن پانچ ہوں یا پانچ سو، یہ عقیدہ بہر حال موجود ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف پڑھی جاتی ہیں، ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ـــــ اور منسوخ ہو چکا ہے (خدا کے فیصلے کی رُو سے نہیں) کسی نہ کسی ''عالم'' کے فیصلے کی رُو سے۔

مِثلہٗ معہٗ

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو قرآن (منسوخ ہونے سے) بچ گیا ہے، اسے سمجھا کس طرح جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایرانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''محدَّث'' کے عقیدہ کی رُو سے کہا یہ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کی وحی رسول اللہؐ پر نازل ہوئی تھی اور دوسری قسم کی وحی ائمہ پر۔ ان کے صرف طریقِ تنزیل میں فرق تھا، وحی ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ یہ عقیدہ شیعہ حضرات کا تھا۔ سُنیوں کے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ضرور ہیں لیکن یہ دونوں رسول اللہؐ پر ہی نازل ہوئی تھیں ـــــ ایک کو وحیٔ جلی (یا وحیٔ متلو) کہا جاتا ہے اور دوسری کو وحیٔ خفی (یا وحیٔ غیر متلو)۔ وحیٔ جلی (یا متلو) قرآنِ مجید کے اندر درج ہے اور وحیٔ خفی[1] احادیث کے اندر۔ وحیٔ غیر متلو کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی ''مِثلہٗ معہٗ'' ـــــ قرآن کے ساتھ اس کی مثل'' ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن معدی کربؓ کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے:

> رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ مجھے الکتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور (**اِنّی اوتیت الکتاب ومثلہٗ معہٗ**)۔ یاد رکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہو گا، اپنے تخت پر بیٹھا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو جو کچھ اس میں حلال پاؤ اُسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ (ابوبکر خطیب بغدادی، کتاب الکفایہ)

یہ ''مِثلہٗ معہٗ'' احادیث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو (مِثلہٗ معہٗ) کا عقیدہ امام شافعیؒ نے وضع کیا تھا۔ یہ عسقلان کے صوبہ میں، 150ھ میں پیدا ہوئے اور ہارون الرشید کے زمانہ میں یمن میں مقیم تھے جو شیعوں کا مرکز تھا۔ ان پر بھی

1۔ دو قسم کی وحی کا عقیدہ، یہودیوں کے ہاں رائج تھا۔ ایک شبکتب (وحیٔ متلو) اور دوسری شبعلفہ (وحیٔ غیر متلو) ـــــ ہمارے ہاں یہ عقیدہ وہیں سے آیا ہے۔

تشیع کا الزام تھا اور اسی بنا پر ہارون الرشید کے ہاں ان کی طلبی بھی ہوئی تھی۔ اکثر عراق آتے جاتے تھے۔ آخرالامر' انہوں نے مصر میں' 204ھ میں انتقال کیا (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری مرحوم' صفحہ 347)۔ بہر حال' اس عقیدہ کو کسی نے وضع کیا ہو' اس کی رُو سے' قرآن سے باہر' ایک مجموعۂ وحی اور وجود میں آ گیا جنہیں احادیث کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں دین کا صحیح تصور اور دل میں قرآنِ مجید کے لَا شَرِيْكَ لَهٗ ہونے کی عظمت تھی' انہوں نے اس نئے عقیدہ کی مخالفت کی اور کہا کہ دین میں سند اور حجت صرف قرآنِ کریم ہے۔ جیسا کہ قدامت پرست طبقہ کا قاعدہ ہے' انہوں نے اُن لوگوں پر معتزلہ کا لیبل لگایا اور پھر ان کے خلاف اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ حالت یہ ہے کہ آج بھی جو شخص عقل وفکر کی بات کرے اور اس کے دلائل کا کوئی جواب اُن سے نہ بن پڑے' اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ معتزلہ ہے۔ وہ خود بخود ملحد و زندیق قرار پا جائے گا۔ ''معتزلہ'' اور شوافع کی کشمکش اور آویزش کی داستان بڑی طویل اور خونچکاں ہے' جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔

حدیث کا مقام

آخرالامر ہوا یہ کہ امام شافعیؒ کا پیش کردہ نظریہ' اسلام کا بنیادی ستون قرار پا گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے حدیث کو کیا مقام حاصل ہو گیا' اسے غور سے سنئے۔ جمعیت اہلِ حدیث کے سابق صدر' مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) اپنی کتاب' جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث'' میں لکھتے ہیں:

> تحقیق وتثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا...... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمۂ سنت کی تصریح کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف[1] ...... جبریل' قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے' آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

یہاں تک تو قرآن اور حدیث کو ہم پایہ قرار دیا جا رہا ہے لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام اوزاعیؒ کا قول ہے:

> قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے' جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں[1]۔

1۔ شیعہ حضرات صرف ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں جو اِن کے ائمہ سے مروی ہوں۔ اس لئے ان کے نزدیک سُنیوں کی حدیثیں قابلِ قبول نہیں اور سُنیوں کا مسلک یہ ہے کہ جس حدیث کا کوئی ایک راوی بھی شیعہ ہو وہ حدیث قابلِ تسلیم نہیں۔ اہلِ حدیث حضرات' بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار کو بھی مستلزمِ کفر قرار دیتے ہیں اور حنفی حضرات مسلم اور بخاری کی قریب دوسو احادیث سے انکار کرتے ہیں اور احادیث کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد جامع' امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چھ سات ہزار کو قبول کیا اور باقی سب کو مسترد کر دیا۔ اسی طرح دیگر جامعینِ احادیث نے بھی۔

اور ایک دوسرے امامِ حدیث' یحییٰ ابنِ کثیر فرماتے ہیں:

حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ قرآن حدیث پر قاضی نہیں[1]۔

اتنا ہی نہیں' عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث' قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ ''فتنۂ انکارِ حدیث'' میں لکھتے ہیں کہ

> نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حُجّت رہے اور مطابق نہ ہو تو حُجّت نہ رہے...... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (2:180) ''تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیّت فرض ہے' اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اُسے موت آئے''۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا لا وصیۃ للوارث وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اس حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دے دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ' قرآن کی آیت کے خلاف' حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (صفحہ 85)

یہ ہے وہ مقام جو قرآن کے مقابلہ میں احادیث کو عطا کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ عقائد کب وضع ہوئے اور احادیث کب وجود میں آئیں! ہم باب چہارم (حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ) میں بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسولؐ اللہ نے مرتب فرما کر اُمت کو دیا' نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مرتب ہوا۔ انہوں نے' بلکہ اس کی شدت سے مخالفت کی۔ ان کے بعد صحابہؓ اور بنی امیہ کے زمانے میں بھی ان کے مجموعے مرتب نہ ہوئے[2]۔ یہ مجموعے عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے)۔

جامعینِ حدیث سب ایرانی تھے

اہلِ سنت والجماعت' ان مجموعوں میں سے چھ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ (شیعہ جامعینِ روایات کی طرح) یہ سُنّی جامعینِ روایات بھی سب کے سب ایرانی تھے۔ یعنی

نام جامعِ حدیث	سنِ وفات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	ان میں سے کتنی اپنے مجموعہ میں درج کیں
1- امام محمد اسماعیل بخاریؔ	256ھ یا 260ھ	بخارا	چھ لاکھ	2762 (مکرّرات حذف کرنے کے بعد)

1۔ مختصر جامع بیان العلم' صفحہ 223۔

2۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے (قریب 100ھ) میں' امام ابنِ شہاب زہریؔ نے ایک مختصر سا مجموعہ' خلیفہ کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ لیکن احادیث کے مروّجہ مجموعوں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

2-امام مسلم بن حجاج	261ھ	نیشاپور	تین لاکھ	4348
3-امام ابو موسےٰ محمد ترمذیؔ	279ھ	ترمذ	تین لاکھ	3115
4-امام ابو داؤدؔ	275ھ	سیستان	پانچ لاکھ	4800
5-ابو عبداللہ ابنِ ماجہ	273ھ	قزوین	چار لاکھ	4000
6-امام عبدالرحمٰن نسائیؔ	303ھ	صوبہ خراسان کا گاؤں نساء	دو لاکھ	4321

آپ غور فرمایئے کہ رسولؐ اللہ کی احادیث جمع کی جاتی ہیں اور ان جامعین میں سے کوئی بھی عرب نہیں' سب کے سب ایرانی ہیں۔ ان جامعین کے سامنے احادیث کا کوئی تحریری مواد نہیں تھا' تمام احادیث زبانی روایات کی بنا پر جمع کی گئیں۔ آپ سوچئے کہ ایک شخص' رسولؐ اللہ کی وفات کے قریب دواڑھائی سو سال بعد' بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے' لوگوں کی زبانی سُن کر' روایات جمع کرتا ہے اسے' اس طرح (خود اس کے اپنے بیان کے مطابق) قریب چھ لاکھ روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے وہ' محض اپنے فیصلے سے' ستائس اٹھائیس سو کے قریب قبول کر لیتا ہے اور باقیوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ جنہیں وہ قبول کر کے اپنی کتاب میں درج کر لیتا ہے' ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ''وہ قرآن کے ہم پایہ ہیں' قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ ان کا انکار کفر ہے''۔

عباسیوں کی محبت

ان مجموعوں میں روایات کس قسم کی ہیں' ان کی مثالیں پیش کرنے کا یہ مقام نہیں [1]۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ احادیث عباسیوں کے دور میں جمع ہوئیں اس لئے ان میں اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ

> حضورؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے [2]۔ (توجیہہ النظر' صفحہ 17 —— نیز جامع البیان)

اس کا محرک جذبہ تو (ظاہر ہے) سیاسی ہے۔ عقیدہ کے طور پر اس قسم کی متعدد روایات ان کتابوں میں مذکور ہیں' جن میں کہا گیا ہے کہ

> حضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگ' خدا کی نعمتوں کو مدِّ نظر رکھ کر خدا سے محبت کرو اور اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہلِ بیت سے محبت رکھو۔ (ترمذی' بحوالہ تفسیر ابنِ کثیر' سورۂ شوریٰ)

---

1. اس کے لئے ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' ملاحظہ فرمایئے۔
2. تفسیر ابنِ کثیر میں بھی اس روایت کو نقل کیا گیا ہے۔ (پچیسواں پارہ' تفسیر سورۂ شوریٰ صفحہ 13)

یا مثلاً قرآنِ مجید میں ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى [42:23] ''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں (تبلیغِ قرآن) کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں طلب کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے رشتہ داری کا برتاؤ رکھو''۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ

آنحضرتؐ کی قرابت جملہ بطونِ قریش میں تھی۔ اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغِ قرآن اور تعلیمِ دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذیؒ نے اسے درج کرنے کے باوجود، سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ:

اس آیت میں قُربیٰ کے معنی آلِ محمدؐ کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد[1] کے ساتھ محبت رکھو۔

اصحاب معاذ اللہ مرتد ہو گئے تھے

دوسری طرف ان کتابوں میں اس قسم کی حدیثیں بھی ملتی ہیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ راوی ہیں کہ رسولِ خداؐ نے یہ خطبہ پڑھا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پیر، ننگے بدن، بلا ختنہ اٹھائے جاؤ گے ...... پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے اور فرشتے انہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ اس وقت مَیں کہوں گا، اے میرے ربّ! یہ میرے صحابیؓ ہیں۔ اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ تُو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔ اُس وقت میں بھی عیسیٰؑ کی طرح سے کہوں گا (وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا) پھر اللہ کی جانب سے ندا آئے گی کہ اے محمدؐ! یہ لوگ تیرے جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے[2] تھے۔

(بخاری، کتاب التفسیر)

اس سے پہلے، قرآنِ کریم کی جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی انہی کتبِ روایات میں مذکور ہے اور صحابہ کبارؓ کے متعلق یہ روایت (کہ وہ، معاذ اللہ، حضورؐ کی وفات کے بعد مُرتد ہو گئے تھے) بھی انہی کتابوں میں۔ پھر سن لیجئے کہ یہ کتابیں شیعوں کی نہیں، سنیوں کی ہیں اور ایسی مستند اور معتبر کہ (ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے) ان میں درج شدہ کسی ایک روایت کا انکار، مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

امام ابنِ جریر طبری

ان کتبِ احادیث نے جب یہ بنیاد فراہم کر دی تو اس پر اسلام کی ایک جدید عمارت کا استوار کر دیا جانا کچھ مشکل نہ رہا۔ یہ

1۔ اس میں ہر سیّد شامل ہوگا۔

2۔ اس سے پہلے شیعہ حضرات کی یہ روایت ہمارے سامنے آ چکی ہے جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے وقت، اہلِ بیت کے علاوہ صرف تین یا پانچ مسلمان رہ گئے تھے باقی مرتد ہو گئے تھے۔ وہ شیعوں کی روایت تھی یہ سنیوں کی ہے اور بخاری شریف کی ہے۔

کارنامہ، سُنیوں کے ایک نہایت قابلِ اعتماد، جلیل القدر، امام[1] محمد جریر ابنِ طبریؒ نے سرانجام دیا —— علامہ تمنّا عمادی (مرحوم) ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ابنِ جریر، طبرستان کے قصبہ آمل کے رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیلِ علم کے لئے باہر نکلے۔ 44 برس تک تحصیلِ علم میں سرگرداں رہے۔ (شیعہ تھے لیکن) از روئے تقیہ سُنّی بنے رہے۔ ان کے دادا کا اصل نام رستم تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابنِ جریر خالص شیعوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے[2] (طلوعِ اسلام۔ بابت اگست 1968، صفحہ 61)

امام طبریؒ نے ایک تو یہ کیا کہ (تیس جلدوں میں) قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے انداز یہ رکھا کہ ہر آیت کی تفسیر میں احادیث درج کر دیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تفسیر، امام طبریؒ کی نہیں، بلکہ خود رسول اللہؐ کی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ اب قرآنِ کریم کا وہی مطلب صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جسے امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جب کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں آیت کی یہ تفسیر خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائی ہے تو کون سا مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکے گا کہ یہ تفسیر ٹھیک نہیں یا یہ کہ اس آیت کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ نہ کوئی مسلمان ایسا کہنے کی جرأت کر سکے گا، نہ کوئی مسلمان ایسی بات سننا گوارا! نتیجہ یہ کہ قرآنِ کریم کا مفہوم، تفسیرِ طبری میں مقیّد ہو کر رہ گیا اور اس پر غور و تدبر اور تنقید و تنقیح کے سب دروازے بند ہو گئے۔ چنانچہ، طبری کے بعد جس قدر تفاسیر لکھی گئیں وہ انہیں کے تتبع میں لکھی گئیں اور جس نے اس سے اختلاف کی جرأت کی، وہ منکرِ حدیث، منکرِ رسالتؐ، فلہٰذا ملحد و بے دین قرار پا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اقدام سے، قرآنِ مجید کو کس طرح ان عقائد و تصورات کا پابند بنا دیا گیا جو ان کتبِ روایات میں مذکور تھے جنہیں ایرانی جامعین نے جمع اور مرتب کیا تھا۔

امام طبری کی تاریخ

جو اسلام عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ میں عملاً رائج و نافذ تھا، اس کے سامنے آنے کی ایک شکل یہ ہو سکتی تھی کہ اُس دَور کی صحیح تاریخ مرتب ہو جاتی۔ امام طبریؒ نے یہ راستہ بھی روک دیا۔ انہوں نے اپنی تفسیر کے ساتھ ایک ضخیم تاریخ بھی مرتب کر دی جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہی سُنّی مسلمانوں کے ہاں سب سے مبسوط تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے طبری کی تفسیر کو اُمّ التفاسیر اور

1۔ شیعہ حضرات کے ہاں امام کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن سُنّی حضرات، علومِ دین کے ماہرین کو امام کہہ کر پکارتے ہیں (مثلاً امام بخاری، امام طبری، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ)۔

2۔ شیعہ حضرات انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہ 224ھ میں پیدا ہوئے اور 311ھ میں وفات پائی۔

ان کی تاریخ کو اُمّ التّاریخ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی کتبِ تاریخ بعد میں مرتب ہوئیں' ان کا ماخذ طبرؔی کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں انہوں نے یہ التزام کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کا جو مفہوم اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کی تائید میں عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ کے واقعات اپنی تاریخ میں درج کردیئے ہیں' اور اس عہد کے جو واقعات اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں' ان کی تائید میں' اپنی تفسیر میں روایات درج کردی ہیں۔ اس طرح تفسیرِ طبرؔی اور تاریخِ طبرؔی' عہدِ رسالتمآبؐ وصحابہؓ کے اسلام کی مستند تعبیر کی آئینہ دار قرار پاگئیں —— اور یہی اسلام آگے چلا۔

اسلام دین نہ رہا' مذہب بن گیا

ماورائے قرآن' خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کے عقیدہ کا نتیجہ اتنا ہی نہیں تھا کہ اس سے وضعی حدیثیں وجود میں آگئیں اور انہوں نے دین کی حیثیت اختیار کرلی' اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلام سرے سے دیؔن ہی نہ رہا' یہ مذہبؔ میں تبدیل ہوگیا۔ دیؔن اور مذہبؔ میں کیا فرق ہے' اسے ہم تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔ اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ دین' اپنی آزاد مملکت میں زندگی کا عملی نظام بن سکتا ہے۔ اپنی ''آزاد مملکت'' سے مراد ہے وہ مملکت جس میں قوانینِ خداوندی (قرآنِ کریم کے احکام' اصول واقدار) حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ اور عمل پیرا ہوں گے۔ اگر ایسی مملکت نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا' وہ مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ مذہب میں' دین کے ارکان رسمی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں جن کا عملی نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ادائیگی سے انسان' بزعمِ خویش یہ سمجھ کر کہ مَیں احکامِ خداوندی کی اطاعت کررہا ہوں' اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلا لیتا ہے اور بس۔

آیۂ استخلاف کا مفہوم بدل گیا

استخلاف فی الارض (اپنی آزاد مملکت) کے سلسلہ میں قرآنِ کریم میں جو متعدد آیات آئی ہیں' ان میں سرِفہرست' سورۃ النور کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [24:55]

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور عملِ صالح کریں گے' اللہ نے وعدہ کررکھا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں حکومت عطا کرے گا اسی طرح جیسے اس نے انہی جیسے لوگوں کو ادوارِ سابقہ میں حکومت عطا کی تھی۔ یہ حکومت اس لئے عطا ہوگی کہ اس کے ذریعے' اللہ اس دین کو متمکن کردے جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور تا کہ ان کا خوف' امن سے بدل

جائے۔اور اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ صرف اللہ کی محکومیت اختیار کریں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں ــــ جو لوگ اس کے بعد اس ابدی صداقت سے انکار کریں گے' وہ فاسق ہوں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور اسی سے دین کا تمکّن ہوسکتا ہے ــــ یعنی اپنی حکومت کے بغیر دین کا تمکّن ممکن نہیں۔

لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''امامت'' کے لئے حکومت (اِستخلاف فی الارض) لازمی شرط نہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت علیؓ کے سوا' دیگر ائمہ میں سے کوئی بھی صاحبِ حکومت نہ تھا۔اس مشکل کے حل کے لئے کہا گیا کہ مذکورہ بالا آیت میں استخلاف سے مراد دنیاوی حکومت نہیں بلکہ ''روحانی امامت'' ہے۔اصولِ کافی میں ہے:

امام ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا۔اور اس میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وصی کو پیدا کیا اور اس کی مشیّت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہو اور اس میں آنے والے سال کے جُملہ اُمور تفصیل سے بتادیئے جائیں۔جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیاء و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں لوگوں پر حجت اس چیز سے جو اُن تک پہنچتی ہے۔اس رات میں یہ امور جبریل ان کے پاس لاتے ہیں۔ میں نے کہا' کیا محدّث وغیرہ کے پاس بھی جبریل آتے ہیں اور دیگر ملائکہ۔فرمایا انبیاء و مرسلین کے بارہ میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ان کے علاوہ بھی دُنیا کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک خدا کی کوئی حجت روئے زمین پر ضرور رہے گی اور ہر شبِ قدر میں امرِ الٰہی نازل ہوگا' اُس شخص پر جس کو خدا اپنے بندوں میں سب سے زیادہ دوست رکھتا ہے۔

خدا کی قسم شبِ قدر میں ملائکہ اور روح امرِ الٰہی کو لے کر آدم پر نازل ہوئے اور خدا کی قسم جب آدم مرے تو اُن کے وصی ان کی جگہ ہوئے۔اسی طرح آدم کے بعد جو انبیاء بھی آئے تو شبِ قدر میں ان کے پاس امرِ الٰہی آیا اور ان کے بعد اُن کے اوصیاء کے پاس۔

اور خدا کی قسم آدم سے لے کر محمدؐ مصطفےٰ تک اس رات میں جس کے پاس بھی امرِ الٰہی آیا' اس کو حکم دیا گیا کہ وہ فلاں شخص کو وصیت کرے' خدا نے اپنی کتاب میں آنحضرتؐ کے بعد والیانِ امر کے متعلق فرمایا ہے ''تم میں جو لوگ ایمان دار ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں' خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو روئے زمین کا خلیفہ اسی طرح بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو بنایا ہے الٰی قولہٖ وہی لوگ فاسق ہیں۔یعنی خدا فرماتا ہے' میں تم کو تمہارے نبی کے بعد اسی طرح خلیفہ بناؤں گا اپنے علم و دین اور عبادت کے لئے جس طرح اوصیائے آدم کو بنایا تھا۔یہاں تک کہ خدا نے ان کے بعد ختم المرسلین کو مبعوث کیا (تاکہ) میرے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔فرمایا' میری عبادت کریں ایمان کے ساتھ۔محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں' پس جو لوگ اس کے خلاف کہیں گے وہ فاسق ہیں۔پس خدا نے آنحضرت صلعم کے بعد والیانِ امر کو علم پر قدرت دی اور وہ ہم ہیں۔ (الشّافی' جلد اوّل صفحہ 85-284)

مذہب وسیاست میں ثنویّت

یہی نہیں، الکافی کی دوسری روایات میں، طلب وہوسِ سلطنت وحکومت (ریاست) کو ہلاکت قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمانوں کے دین میں ہوسِ ریاست اس سے زیادہ خوفناک اور مضر ہے جتنی دوشکاری بھیڑیوں کی موجودگی بکریوں کے گلّے کے لئے جو اپنے چرواہے سے الگ ہوگیا ہو۔

(الشافی، جلد دوم، صفحہ 316)

حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ہوسِ ریاست وحکومت کی وہ ہلاک ہوگیا۔ (ایضاً)

اس سے ''دنیاوی حکومت'' اور ''روحانی مملکت'' نہ صرف دو الگ الگ چیزیں قرار پا گئیں، بلکہ دنیاوی حکومت، مبغوض و مَردود ٹھہرا دی گئی۔ مذہب اور سیاست کی یہ ثنویّت، نظریۂ امامت کے تعلق سے شیعوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ سُنیوں کے ہاں بھی اسی طرح راہ پا گئی۔ موروثی امامت کے عقیدہ کے زیرِ اثر، بادشاہت پہلے ہی موروثی ہوچکی تھی (چنانچہ صدرِ اوّل کے بعد مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئیں، خواہ وہ شیعوں کی تھیں خواہ سُنیوں کی، سب موروثی تھیں) —— مذہب وسیاست کی ثنویّت کے نظریہ کے ماتحت، امورِ مملکت اور امورِ شریعت بھی دو الگ الگ شعبوں میں بٹ گئے۔ امورِ مملکت بادشاہوں کے حصے میں آ گئے اور امورِ شریعت، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں —— شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) اور ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق بھی اسی ثنویّت کا نتیجہ ہے۔ یوں خود ایک مملکت بھی دو حصوں میں منقسم ہوگئی جن میں دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں —— ایک بادشاہ کی، دوسری مذہبی پیشواؤں کی۔

اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ حکومت دو حصوں میں بٹ گئی، اس سے قانون سازی کا وہ سارا طریق ہی اُلٹ گیا جو قرآن کا تجویز کردہ اور دین کی اساس تھا۔ قرآنی نظامِ سیاست کی رُو سے، قانون سازی کا اصول یہ تھا کہ اُمت، باہمی مشاورت سے، احکام واصولِ قرآنی کے حدود میں رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین وضع کرتی تھی۔ قرآنی حدود غیر متبدل رہتی تھیں اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ مشاورت کا نظام، بادشاہت نے ختم کردیا اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والے قوانین کا تصور، مذہبی پیشوائیت نے ناجائز قرار دے دیا۔

قانون سازی کا اِمکان ختم کردیا

امام شافعیؒ کے پیش کردہ مسلکِ حدیث کی رُو سے عقیدہ یہ قرار پا گیا کہ احکام وقوانین سب کے سب احادیث کے اندر موجود ہیں، یہ مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے نہ کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہے، نہ موجودہ احکام میں

ردّو بدل کی اجازت۔ یہ اہلحدیث کا مسلک تھا۔ اہلِ فقہ نے شروع شروع میں اس مسلک کی مخالفت کی اور کہا کہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں' قیاس (اجتہاد) کی رُو سے' نئے نئے احکام مستنبط کئے جا سکتے ہیں اور جس حکم پر اجماع[1] ہو جائے' وہ اُمت کے لئے قانون بن جائے گا — یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ قانون کے مآخذ چار ہیں' یعنی قرآن' حدیث' قیاس اور اجماع' اس کی سند یہی فقہی مسلک ہے۔ اس سے بہرحال' نئے نئے احکام وضع کرنے کا امکان موجود رہا' لیکن' بعد میں انہوں نے بھی یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے اس لئے نہ سابقہ فقہی فیصلوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ہی نئے احکام وضع کئے جا سکتے ہیں[2]۔ اہلحدیث کا عقیدہ یہ تھا کہ جب قرآن اور حدیث میں تضاد پایا جائے تو حدیث کا حکم برقرار رہے گا کیونکہ حدیث' قرآن پر قاضی بھی ہے اور اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔ یہی عقیدہ اہلِ فقہ نے بھی اختیار کر لیا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مُسلّم امام' ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس مسلک کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں' وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ اور اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے[3]۔

یعنی' اگر قرآن کے کسی حکم اور فقہ کے کسی فیصلہ میں اختلاف نظر آئے' تو پہلے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ قرآنی آیت کی اس طرح تاویل کی جائے کہ اس کا مفہوم فقہ کے مطابق ہو جائے اور اگر ایسا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو پھر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اہلحدیث چونکہ کسی حدیث کو (جو ان کے ہاں صحیح قرار دی گئی ہو) منسوخ نہیں تسلیم کرتے اس لئے' اس نکتہ پر اہلحدیث اور اہلِ فقہ میں باہمی بحث و نزاع ہوتی ہے۔ جہاں تک قرآنی احکام کے منسوخ ہو جانے کا تعلق ہے' اس میں دونوں متفق ہوتے ہیں۔

اِس وقت اُمت' انہی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے — یعنی شیعہ اور سُنّی۔ پھر سُنیوں میں اہلحدیث اور اہلِ فقہ۔ اور اہلِ فقہ میں حنفی' شافعی' حنبلی اور مالکی۔ ان سب کے ہاں دین میں سند اور حجت روایات ہیں اور یا ائمہ فقہ کے فیصلے۔ قرآن صرف تلاوت کے لئے باقی رہ گیا ہے اور یا اس لئے کہ — از یٰسینِ اُو آساں بمیری[4]۔

---

1. اجماع کے متعلق آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس سے کن لوگوں کا اجماع مقصود ہے۔
2. فقہ کے چار مسالک معروف ہیں۔ حنفی۔ شافعی۔ حنبلی۔ مالکی۔
3. تاریخ فقہ اسلامی' مؤلفہ علامہ خضری (مرحوم) صفحہ 421
4. ہمارے زمانے میں (مولوی) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) نے قرآنِ خالص کی طرف دعوت دی لیکن چونکہ ان کے سامنے بھی اسلام بہ حیثیت ایک مذہب کے تھا' دین کی حیثیت سے نہ تھا' اس لئے ان کے متبعین بھی ایک فرقہ (اہلِ قرآن) بن کر رہ گئے اور یوں قرآنی تصورِ اِسلام کے لئے اور زیادہ نقصان کا موجب بن گیا۔

نظامِ سرمایہ داری کا اَحیاء

انسانوں کے وضع کردہ تصورات نے' انسانوں پر جن انسانیت سوز لعنتوں کو مسلّط کیا' تفصیل میں جایئے تو ان کی فہرست طول طویل ہے لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ (1) ملوکیت۔ (2) مذہبی پیشوائیت اور (3) نظامِ سرمایہ داری۔ قرآنِ کریم نے ان تینوں لعنتوں کو ختم کر کے' انسان کو کس طرح صحیح آزادی سے ہمکنار کیا' اس کی جھلک ہم' اس کتاب کے گذشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں۔ عجمی سازش نے' قرآن کو نگاہوں سے اوجھل کر کے' ان لعنتوں کو کس طرح پھر سے زندہ کر کے انہیں عین اسلام بنا دیا' اس کا اجمالی تذکرہ زیرِ نظر باب میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ ان میں سے پہلی دو لعنتوں کا احیاء کس انداز سے کیا گیا' اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس نے نظامِ سرمایہ داری کو کس طرح دوبارہ زندہ کر کے' اسلام کا جزو بنا دیا' یہ داستان بھی بڑی دلخراش ہے اور ایک جداگانہ تصنیف کی محتاج[1]۔ ہم سرِ دست صرف اس اصولی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بجائے' روایات کو دین میں سند قرار دے دینے کے بعد ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) یہ روایات عہدِ عباسیہ میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا' اسے اسلامی قرار دینے کے لئے روایات وضع کی گئیں جن میں سے کچھ کتبِ احادیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتبِ تاریخ میں۔ انہی روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی۔ لہٰذا' نظامِ سرمایہ داری' حدیث اور فقہ دونوں کی رُو سے' عین اسلام بنا دیا گیا۔ اس کی ایک بیّن مثال ہم اس سے پہلے سابقہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں' لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک بار پھر سامنے لے آنا' قارئین کے ذوقِ سلیم پر ناگوار نہیں گزرے گا۔

قرآنِ کریم میں نظامِ سرمایہ داری کے خلاف بیشمار آیات آئی ہیں۔ ان میں دو بیّن آیات سورۂ توبہ کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ [9:34-35]

جو لوگ سونا اور چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے فی سبیل اللہ (انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے قوانینِ خداوندی کے ماتحت) خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے (اے رسولؐ!) آپ ان کے لئے اللہ کی طرف سے الم انگیز عذاب کا اعلان کر دیں۔ (یہ عذاب اس دن وارد ہو گا جب) اس مال و دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی' پہلو اور کمر کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ اب تم اس کا مزہ چکھو۔

1۔ میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ واضح حکم، سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اب دیکھئے کہ حدیث کی رُو سے اس آیت کی تفسیر کیا کی گئی ہے۔ ابوداؤد میں ہے۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب الزکوٰۃ)

یعنی، اس تفسیر کی رُو سے، جسے ارشادِ رسالتمآبؐ کہہ کر پیش کیا گیا، قرآنِ کریم کی اس آیت کا مطلب یہ ہو گیا کہ اگر سال بھر کے بعد اڑھائی فیصد زکوٰۃ دے دی جائے تو پھر جس قدر جی چاہے دولت جمع کی جا سکتی ہے۔ اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مالِ تجارت کے کاروان کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا اونٹ مصر میں۔ اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع، فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جن کی رُو سے مال و دولت اور جائیداد اور زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کی ہی نہیں جا سکتی۔ ان (فقہی) احکام کی تفصیل میں جانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ (ہمارے زمانہ میں) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان کا ملخّص، اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی، مقدار اور کمیّت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے مقید کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک خاص حد سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔ (1950ء ایڈیشن صفحہ 52)

یہ ہے وہ اسلام جسے فقہ، احادیث اور تاریخ کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کے خلاف لَب کُشائی کرے اُسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ تم اسلام کو بہتر سمجھتے ہو یا رسولؐ اللہ اور سلف صالحین بہتر سمجھتے تھے!

آپ نے دیکھا کہ عجمی سازش نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

عقائد میں تبدیلی

اس وقت تک ہم نے اپنی گفتگو کو احکام تک محدود رکھا ہے' لیکن بنیادی بات عقائد کی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عقیدہ ہی وہ اساس ہے جس پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے ـــــ فرد اور قوم دونوں کی زندگی کی۔ قرآنِ کریم نے جب کہا کہ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [8:53] خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہ کرے' تو اس سے مقصود یہی تھا۔ انسانوں میں نفسیاتی تبدیلی' عقائد کی رُو سے پیدا ہوتی ہے اور عربوں نے (اسلام کے صدرِ اوّل میں) جو تحیر انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ قرآن کے عطا کردہ عقائد (نظریات وتصوراتِ حیات) کی بدولت تھا۔ عجم اس حقیقت سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے قرآنی عقائد کو اس طرح بدل دیا کہ اب ڈھونڈے سے بھی ان کا نشان نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

قرآن کا عطا کردہ بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور قومیں اپنی تقدیر آپ بناتی ہیں۔ مکافاتِ عمل کا یہی وہ عقیدہ تھا جس پر ایمان رکھنے سے جماعتِ مومنین چند سال کے عرصہ میں نہ صرف قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کی وارث بن گئی بلکہ ان کی صدیوں پرانی تہذیب کو مٹا کر (یا دھندلا کر) انسانیت کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔ ایرانی اور بازنطینی (عیسائی) دونوں انسان کو مجبور قرار دیتے تھے۔ اس عقیدہ کو ماننے والی قومیں' عربوں (مسلمانوں) کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی تھیں جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے قائل تھے' چنانچہ ایران کی پہلی ضرب کا نشانہ یہی عقیدہ تھا۔

تقدیر کا عقیدہ

مجوسیت کا بنیادی عقیدہ تقدیر کا تھا۔ ان کے ہاں ''نوشتہ تقدیر'' اٹل فیصلہ تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا تھا۔ یہ عقیدہ قرآنی عقیدہ کی ضد تھا۔ ایرانیوں نے اپنے اسی عقیدہ کو مسلمانوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے جس شخص نے اس مسئلہ کو چھیڑا' وہ معبد بن خالد جہنی ہے۔ اس نے اس مسئلہ کو ابو یونس نامی ایک دانشور سے اخذ کیا تھا جس کا تعلق اساورہ سے تھا (اساورہ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ شاہنشاہِ ایران کے دانشوروں پر مشتمل جیش تھا جو مسلمان ہو کر کوفہ' بصرہ وغیرہ میں پھیل گیا تھا)۔ معبد سے اس عقیدہ کو غیلانِ دمشقی نے لیا اور آگے پھیلایا۔ اس عقیدہ کا ملخص یہ تھا کہ انسان اپنے مقدرات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا' بے بس اور مجبور ہے۔

تقدیر کے متعلق روایات

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ عقیدۂ جبر کا بانی جعدؔ بن درہم تھا۔ ابن الندیم کی تحقیق کی رُو سے، یہ شخص ایرانی الاصل، مانوی مذہب کا پیرو تھا جو ظاہر داری میں مسلمان ہو گیا تھا۔ درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان نے سیکھا جو خراسانی الاصل تھا اور اس نے اسے مسلمانوں میں عام کیا[1]۔ شیعہ اور سُنی کی تفریق کے بعد مسلمانوں میں جو پہلا فرقہ پیدا ہوا، وہ یہی جبریہ (یا قدریہ) تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ، قرآن کے عقیدہ مکافاتِ عمل کی نقیض تھا۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایسا عقیدہ جو قرآن کے ایک بنیادی عقیدہ کے یکسر خلاف تھا، مسلمانوں میں کس طرح راہ پا گیا۔ گزشتہ صفحات میں جو بحث سامنے آ چکی ہے اس کی روشنی میں اس (بظاہر مشکل ترین) سوال کا جواب نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ اس عقیدہ کی تائید میں احادیث وضع کر دی گئیں۔ اس کے بعد اس کے ''عین اسلام'' قرار پا جانے میں کچھ مشکل ہی نہ رہی۔ اس سلسلہ میں دو چار احادیث ملاحظہ فرمائیے۔ جنہیں ہم (احادیث کے معتبر مجموعہ) مشکوٰۃ، باب التقدیر سے پیش کرتے ہیں۔

(1) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ خدا تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(2) حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے۔ یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔
(بحوالہ مسلم)

(3) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانا آگ میں ہو گا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری۔ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا (بحوالہ بخاری، مسلم)۔ نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا، پھر اس میں سے (یعنی آدم کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی اور فرمایا پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے، یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی اور پھر فرمایا کہ — پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے، یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسولؐ اللہ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسولؐ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے کام کراتا ہے......اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے......اور خدا اس کو اس کے کاموں کے

1۔ مسئلہ تقدیر سے متعلق میری مستقل تصنیف ''کتاب التقدیر'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

سبب دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ مالکؒ' ترمذیؒ' ابوداؤدؒ)

(4) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپؐ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے اس میں جنتیوں کے نام ہیں' اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے اُلٹے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جا سکتا ہے نہ کم۔ (بحوالہ ترمذی)

(5) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے' یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر)' اس کا نیک و بد عمل' اس کے رہنے کی جگہ' اس کی واپسی اور رزق۔ (بحوالہ احمد)

ظاہر ہے کہ جو شخص قرآنِ کریم کی واضح تعلیم اور علم و بصیرت کی روشنی میں اس قسم کی روایات پر غور کرے گا' اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات ابھریں گے اور وہ ان کا اطمینان بخش جواب چاہے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے اس صورت حال کا بھی پہلے سے حل سوچ لیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں جن سے اس بحث کا دروازہ ہی کھلنے نہ پائے۔ (مثلاً) حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ رسولِؐ خدا تشریف لائے اور ہماری باتیں سُن کر ان کا چہرہ انار کے دانوں کی طرح سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے انتہائی غصہ کے عالم میں فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تم میں اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں جب انہوں نے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی تو انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ سو میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور مکرّر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ پر بحث مت کرنا (بحوالہ ترمذی) —— یعنی ان لوگوں نے عقیدۂ جبر کو مسلمانوں میں عام کر دیا اور اس پر بحث و نظر کے دروازے بند کر دیئے۔ برامکہ نے اس عقیدہ کو بڑے زور و شور سے پھیلایا۔ مجوسیوں کا عقیدہ تھا کہ آنے والے سال کے تمام واقعات اور لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ نوروز کی شب میں ہو جاتا ہے' برامکہ نے اُسی شبِ نوروز کو "مسلمان کر کے" اس کا نام شبِ براتؔ (مقدرات کی رات) رکھ دیا۔ شبِ برات کی آتشبازی مجوسی آتشکدوں کے شعلوں سے ٹوٹے ہوئے شراروں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شیعہ حضرات "شبِ قدر" کو قسمتوں کے فیصلے کی رات مانتے ہیں۔ الکافی میں ہے:

امام ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا اور اس میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وصی کو پیدا کیا اور اس کی مشیّت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہو اور اس میں آنے والے سال کے جملہ امور تفصیل سے بتا دیئے جائیں۔ جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیاء و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں لوگوں پر حجت اس چیز سے جو ان تک پہنچتی ہے۔ اس رات میں یہ امور جبریل ان کے پاس لاتے ہیں۔

(الشافی، جلد اوّل، صفحہ 85-284)

اس روایت میں یہ ٹکڑا کہ "جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی" بات کو آگے بڑھاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان کے پانچ اجزاء ہیں، اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت (2:177; 4:136)۔ سارے قرآن میں انہی اجزاء کا ذکر ہے۔ انہی کے اقرار سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے، انہی کے انکار سے کافر۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب ایمان کے پانچ اجزاء نہیں، چھ ہیں اور چھٹا جزو یہی عقیدہ تقدیر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

اٰمنت باللّٰہ وملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والقدر خیرہٖ وشرّہٖ من اللّٰہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔

میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی، خیر اور شر سب خدا کی طرف سے مقدر ہو چکے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزاء خدا نے مقرر کئے تھے۔ ان میں ایک کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا۔ اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ اور یہ اضافہ حسبِ معمول روایات کی رُو سے کیا گیا۔ مثلاً

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر ایمان نہ رکھے۔ (1) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (2) موت کو حق جانے۔ (3) مرنے کے بعد جی اُٹھنے کو سچ مانے اور (4) تقدیر پر ایمان رکھے۔

(بحوالہ ترمذی و ابنِ ماجہ)

یوں تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان بن گیا ـــــ یعنی یہ عقیدہ کہ نفع، نقصان، رنج و راحت، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی، عزت و ذلت، نیکی و بدی، (اور افراد سے آگے بڑھ کر قوموں کا) عروج و زوال، ان کی موت و حیات، فتح و شکست، محکومی اور حکمرانی، سب خدا کی طرف سے پہلے سے مقدر ہے۔ انسان کی سعی و کاوش اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی ـــــ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ـــــ آپ، اسبابِ زوالِ امت کی تحقیق و تفتیش کے لئے بڑی کاوشیں کرتے ہیں، اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کمیٹیاں بٹھاتے اور کمیشن متعیّن کرتے ہیں لیکن اس کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ تفتیش کی حاجت۔ قوموں کو تباہ کرنے کے لئے، ایک "عقیدۂ تقدیر" کافی ہے۔ عجمی سازش نے اس عقیدہ کو اُمتِ مسلمہ میں عام کر کے ـــــ بلکہ اسے اس کا

جزوِ ایمان بنا کر —— اس ہمہ تن شعلۂ جوالہ قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا' اور اس کی نگاہ کا زاویہ اس طرح بدل دیا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہے کہ یہ چھٹا جزوِ ایمان' قرآن پر اضافہ اور اس کی بنیادی تعلیم کے یکسر خلاف ہے' تو قوم اس کے لئے صلیبیں کھڑی کر دیتی ہے۔ سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کے جزوِ ایمان بن جانے کے بعد' یہ قوم قیامت تک بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے؟—— تقدیر کا ایک مفہوم وہ تھا جسے حضرت عمرؓ نے سمجھایا[1] تھا اور ایک مفہوم وہ ہے جسے عجمی سازش نے وضع کیا۔ فاروقی مفہوم (جو قرآن کے عین مطابق تھا) کفر قرار پا گیا اور عجمی مفہوم' مسلمانوں کا جزوِ ایمان —— مزہ آیا نا انتقام لینے کا!!

لیکن نہیں! ابھی اس ترکش کا آخری تیر باقی ہے —— یہ تیر نہیں' وہ سیلِ سُبک سَیر و زمیں گیر ہے' جس کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس سازش کی یہ غارت گرِ متاعِ دین و دانش چال' اسلام کے تابوت کی آخری میخ تھی۔

تصوف

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ختمِ نبوت کی مہر کو توڑنے اور وحی کے مقابلے میں اُس کا ہم پایہ ایک نیا دروازہ کھولنے کے لئے محدَّثیت کا نظریہ وجود میں لایا گیا۔ لیکن یہ خصوصیت اہلِ تشیع کے ائمہ کرام تک محدود رہی' اس لئے اُس کا اثر نفوذ بھی انہی کے دائرے میں مقیّد۔ سُنیوں کے ہاں اس کے مقابل' دو قسم کی وحی کا نظریہ اختراع کیا گیا اور قرآن سے خارج عقائد و احکام کو قرآن کا ہم پایہ قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ چیز نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تک محدود رہی اور اس کا ماحصل احادیث کے سرمایہ میں مقیّد' ضرورت اس امر کی محسوس کی گئی کہ خدا کے ہاں سے "براہِ راست علم پا لینے" کے اس امکان کو قیامت تک ممتد کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو تصوف نے آ کر پورا کر دیا' وہ تصوف جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:

> اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (اقبالؒ نامہ' جلد اوّل صفحہ 78)

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا' کوفے کا رہنے والا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا جس کی وفات 160ھ کے قریب رملہ کی خانقاہ میں ہوئی۔ تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان' خاص قسم کے مجاہدات' ریاضات' مراقبات اور چلّہ کشیوں کے ذریعے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے' جہاں وہ خدا سے براہِ راست مکالمہ اور مخاطبہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات اس عقیدے کے حامی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اس قسم کے مخاطبہ اور مکالمہ کو اپنے ائمہ منصوص میں محدود سمجھتے

1۔ دیکھئے چوتھا باب۔

اور وہی خیال کرتے تھے' اس لئے انہوں نے صوفیہ کی مخالفت کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صوفیہ کے تمام خانوادے (نقشبندیہ کے سوا) انہی ائمہ کی وساطت سے حضرت علیؑ تک پہنچتے ہیں' جنہیں متفقہ طور پر شاہِ ولایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا درجہ خلافت سے بہت بلند ہے۔ اتنا ہی نہیں' صوفیاء کے نزدیک' تصوف کے بلند ترین مقام پر صرف اہلِ بیت پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ ابنِ عربی ''فتوحاتِ مکیہ'' میں لکھتے ہیں کہ قطب الاولیاء ہمیشہ اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ دیگر صوفیاء جو اُن سے متفق نہیں' ان کا عقیدہ ہے کہ قطب الاقطاب بہر حال' اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ (تحقیق سید و سادات' محمود احمد عباسی 219)

شیخ اکبر' ابنِ عربی

اہلِ تشیع کے ہاں محدّثیت کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سرچشمۂ علمِ خداوندی سے رسولؐ اللہ کو وحی ملتی تھی' اسی سے ائمہ کرام کو علم حاصل ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی عقیدہ اہلِ تصوف کا ہے۔ سرخیلِ صوفیاء' محی الدین ابنِ عربیؒ ' جنہیں شیخِ اکبر کہا جاتا ہے اپنی مشہور کتاب' فصوص الحکم' میں لکھتے ہیں:

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل صاحب الزمان' غوث' قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

> روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا' اولیاء ان کے متعلق رسولِ خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔...... اگرچہ رسولؐ اللہ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسولؐ پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مُصَرَّح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں' اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس' ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ کشف والہام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ہے...... صاحبِ کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیینؐ کے موافق ہے...... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسولؐ اللہ کا لینا ہے...... یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے...... پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ وہ معدنِ خاتم النبیینؐ و مادۂ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لئے تھے...... خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔ اگرچہ خلیفۂ ولی ظاہر میں متبعِ نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔
>
> (سلیم کے نام' جلد سوم' صفحہ 44-42)

محققین کا خیال ہے کہ ابنِ عربیؒ اخوان الصفا کے نظریات و معتقدات سے متأثر تھے۔ اخوان الصّفا' باطنی مسلک اسماعیلیہ کے پیرو' مصنفین کا ایک گروہ تھا جس نے (اپنے ناموں کا انکشاف کئے بغیر) کچھ رسائل تصنیف کئے تھے۔ ان کی تعلیمات' محمد ابوالقاسم الاندلسی (متوفی 395ھ) کی تصانیف کے توسط سے افریقہ اور اندلس (ہسپانیہ) تک رائج ہوگئی تھیں۔ اس لئے ان محققین کا قوی گمان ہے کہ ابنِ عربیؒ انہی کے فلسفہ سے متأثر تھے۔ تصوف کی جو تصویر ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک حد تک اخوان الصفا کی تعلیمات کا عکس ہے[1]۔

تصوّف کے اساسات قرآن کی ضِد ہیں

صوفیاء اپنے اس علم کا نام کشف اور الہام رکھتے ہیں۔ لفظ مذہب کی طرح یہ الفاظ بھی ان معنوں میں قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آئے۔ نہ ہی اس میں تصوف یا صوفی کا لفظ کہیں آیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وحی اور کشف والہام میں صرف لفظی فرق ہے' مفہوم و معانی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں ___ یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا۔ اس منفرد اور خصوصی علم کی رُو سے صوفیاء کرام نے جن عقائد و نظریات کو پیش کیا' وہ اسلام کی ضد ہیں۔ مثلاً:

(1) مجوسیّت کا بنیادی تصور' اہرمن اور یزداں کی ثنویت تھا' یعنی خیر اور شر کی مسلسل جنگ۔ صوفیہ نے کہا کہ انسانی ذات روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ مادہ سراسر شر ہے اور روحِ خداوندی (خواہ وہ کُل ہو یا اس کا جزو) خیر۔ اب دنیا میں مادہ اور روح کی کشمکش جاری ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات' مادہ کی کثیف دلدل سے نکل کر پھر سے اپنی اصل میں جا کر جذب ہو جائے۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھنا ہے۔ چنانچہ ترکِ علائق' ترکِ لذات' یعنی دنیا اور مافیہا کو قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دور بھاگنا' تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط ہے۔ قرآنِ کریم نے مادی کائنات کے متعلق کہا تھا کہ اسے خدا نے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ آپ سوچئے کہ قرآن کے اس تصور کے مقابلے میں یہ نظریہ کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اور اس سے دور بھاگنا ہی مقصدِ حیات' کس طرح اسلام کو اُس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا اور اس کی حامل قوم کو مفلوج و مصلوب بنا کر رکھ دیتا ہے۔

(2) قرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے' لیکن (افلاطون کے نظریۂ اعیانِ نامشہود کے تتبّع میں) تصوف کا نظریہ یہ ہے کہ اس مادی کائنات کا کوئی وجود نہیں' وجود صرف خدا کا ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ سب خدا ہی خدا ہے' اسے نظریۂ وحدت الوجود یا ہمہ اُوست کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ حضرات کہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں' اُس کا اندازہ شیخ اکبر کے اس بیان سے لگایئے جسے انہوں نے 'فصوص الحکم' میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

1۔ مذہب اور باطنی تعلیم' مرزا محمد سعید مرحوم۔

پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کیونکہ وہ ذاتِ حق سے جدا نہ تھا' اگرچہ اُس کی صورت فرعون کی تھی — (معاذ اللہ)

(3) صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ اُن کے اِن تمام عقائد اور نظریات کا مدار قرآنِ کریم پر ہے۔ اس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے وہ معنی جو اُس کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں' ظاہر بینوں کے لئے ہیں' اُس کے حقیقی معنی' اُس کے باطن میں پوشیدہ ہیں اور یہ باطنی علم صرف صوفیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ اس علمِ باطن کی رُو سے وہ قرآنی آیات کو کس طرح مسخ کرتے ہیں' اس کا اندازہ' ابنِ عربی ہی کی بیان کردہ ایک مثال سے لگایئے۔ قرآنِ کریم میں ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى [20:55] اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا' اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے''۔ ابنِ عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

ہم سب احدیت سے نکلے تھے' فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ پھر نمودار ہوں گے۔

(فصوص الحکم)

باطنی علم کی سند

علمِ باطنی کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اسے عوام پر ظاہر نہیں کیا جاتا خواص تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اس کی سند کے لئے اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں کہ

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہؐ سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک (علمِ ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے لیکن اگر میں دوسرے (علمِ باطنی) کو ظاہر کر دوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی جائے۔

(بخاری باب العلم' نیز مشکوٰۃ باب العلم)

(جیسا کہ حوالہ میں لکھا گیا ہے) یہ حدیث بخاری میں موجود ہے جسے اصح الکتب کہا جاتا ہے۔ کس قدر مقامِ تأسف ہے کہ نہ امام بخاری کو اس کا خیال آیا اور نہ ہی ایسی حدیثوں کی نسبت نبی اکرمؐ کی طرف کرنے والوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس سے حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس پر کتنا بڑا حرف آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو علم (وحی) عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ اے ہمارے پیغمبر! جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا جاتا ہے' اُسے لوگوں تک پہنچا دیں۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ [5:67] اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا۔ دوسری طرف کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ [2:159] ''جو لوگ اس روشن علم اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جسے ہم نے نوعِ انسان کے لئے قرآن میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے' ان پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی بھی لعنت''۔

معاذ اللہ!

اللہ تعالیٰ کے ان احکام اور وعید کے بعد یہ کہنا کہ خدا نے حضورؐ کو جو علم دیا تھا' آپؐ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ کو تو ظاہر کر دیا تھا اور دوسرے حصہ کو (معاذ اللہ) مخفی طور پر خواص میں سے بعض کے سپرد کر دیا' اس تاکید کے ساتھ کہ وہ بھی اسے عوام پر ظاہر نہ کریں' خواص تک محدود رکھیں۔ حضورؐ کی ذاتِ اطہر کے خلاف ایسا سنگین الزام ہے جس کے تصور سے روح کانپتی ہے لیکن ہمارے اربابِ شریعت اسے حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں درج کرتے ہیں اور اصحابِ طریقت اسے اپنے ''علمِ باطنی'' کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

علمِ لَدُنّی

یہ ''علمِ باطنی'' کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا' یہ صوفیہ میں سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ اسے علمِ لَدُنّی کہا جاتا ہے۔ اس علم کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ مرید اسے اپنے مرشد سے بالمشافہ حاصل کرے۔ یہ صدیوں کے بُعدِ زمانی کے باوجود باطنی طریق سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً) حضرت جنیدؒ بغدادی کے متعلق (کہ جن کی وفات 298ھ میں ہوئی تھی) یہ عقیدہ ہے کہ انہوں نے خرقۂ تصوف' رسولؐ اللہ کے صحابی' حضرت انسؓ بن مالک سے حاصل کیا تھا۔ اہلِ تصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ باطنی علم' رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ کو عطا فرمایا تھا اور آپ (حضرت علیؓ) سے یہ آگے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا گیا۔ اس منتقل ہو کر آنے والے علمِ باطنی کے علاوہ' اولیاء کرام کو مزید باطنی علم' خدا سے براہِ راست بھی حاصل ہوتا ہے جس کی رُو سے اُن پر قرآن کے باطنی معانی منکشف ہوتے ہیں۔

باطنی معانی کی رُو سے قرآنِ کریم کو کس طرح مَسخ کر دیا جاتا ہے' اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریقِ تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا' تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبالؒ نامہ' جلد 1 صفحہ 35)

اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا۔

جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحادوزندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبالؒ نامہ' جلد 1 صفحہ 44)

(4) دین' انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے ایک مکمل نظام اور ضابطہ کا نام ہے جو اپنی مملکت میں متشکل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا اسلام الا بالجماعۃ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ لیکن تصوف' جماعتی زندگی سے دُور بھاگتا ہے۔ وہ اپنی اپنی خلوت گاہوں میں مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے انفرادی نجات کا قائل ہے۔ اس تصور کی رُو سے اسلام میں اور ہندوؤں کی ویدانت' عیسائیوں کی رہبانیت اور ایرانیوں کی مجوسیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

جہاد کے خلاف

(5) اسلام نے زندگی کو جہدِ مسلسل سے تعبیر کیا تھا اور اس جہد کی آخری شکل وہ بتائی تھی جہاں جماعتِ مومنین ظلم کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں اُتر آتی ہے۔ وہاں سے فاتح ومنصور لَوٹتی ہے تو غازی کہلاتی ہے اور جان دینے والے حیاتِ جاوداں کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اسلام میں' اس جہاد سے افضل کوئی عمل نہیں لیکن تصوف اس جہاد کو جہادِ اصغر قرار دیتا ہے اور ترکِ دنیا کے ذریعے نفس کُشی کو جہادِ اکبر۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ وہ جہاد بالسّیف کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کے ہاں کی ایک مشہور رباعی ہے۔

غازی زپئے شہادت اندرتگ و پوست غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں باد کے ماند ایں کشتۂ دشمن است آں کشتۂ دوست

علامہ اقبالؒ اس رباعی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس نے اس کو زہر دیا ہے اُس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات دیا گیا ہے — آہ — مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں''۔

(مکتوبِ اقبال بنام سراجدین پال' اقبال نامہ' جلد اوّل' صفحہ 36)

اس ایک رباعی پر ہی کیا موقوف ہے۔ وہ (علامہ اقبالؒ) لکھتے ہیں کہ:

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی' اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہوجائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو پھر اُس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہوجاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اسی ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی وکاہلی اور اس شکست کو جو اِن کے تنازع للبقاء میں ہو' چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مَرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (ایضاً صفحہ 44)

انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا:

ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تأثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔

(اقبال نامہ، جلد 1، صفحہ 24)

اسے وہ مسلمانوں کا ''مجوسی ورثہ'' کہہ کر پکارتے ہیں، اور بصد کرب و اذیّت لکھتے ہیں کہ:

اس مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیّت اور اسلام)

علامہ اقبالؒ اور تصوف

علامہ اقبالؒ نے 1917ء میں (ISLAM AND MYSTICISM) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو لکھنؤ کے اخبار (NEW ERA) کی 28 جولائی 1917ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اُس میں انہوں نے تصوف کو ''شعبدہ بازوں'' کی کمند کہہ کر پکارا تھا۔[1]

صوفیاء کی کتابوں میں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے، اس کی تبیین کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کی کچھ مثالیں میں نے اپنی کتاب ''سلیم کے نام خطوط'' کی تیسری جلد میں پیش کی ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اُسے دیکھ لیں۔

مرزا غلام احمد کا دعویٰ

اب آگے بڑھئے۔ جب تصوف کے اس عقیدہ نے (جس کی بنیاد محدّثیت کے نظریہ پر تھی اور جس کی ابتداء شیعوں کے ہاں سے ہوئی تھی) کشف و الہام کے دروازے کھول دیئے تو اس سے دعویٰ نبوت کا بھی اِمکان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی انہی سیڑھیوں سے مقامِ نبوت تک پہنچنے کے دعویدار ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلے لکھا:

ہمارے سیّد الرسولؐ اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعدِ آنحضرتؐ کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اس لئے شریعت میں نبی کے قائمقام محدّث رکھے گئے ہیں۔ (شہادت القرآن صفحہ 28)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

میں نے لوگوں سے سوائے اس کے جو میں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، اور کچھ نہیں کہا کہ میں محدّث ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اُسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح محدّثین سے۔ (حمامتہ البشریٰ صفحہ 96)

1۔ یہ مضمون طلوعِ اسلام، بابت اپریل 1968ء میں شائع ہوا تھا۔

سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کی روشنی میں اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دِقّت نہیں رہتی کہ مرزا صاحب نے محدّثیت کا تصور کہاں سے مُستعار لیا تھا؟ اس کا سرچشمہ شیعہ اور تصوف کا لٹریچر ہے۔ (مثال کے طور پر) ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ محدّث کا عقیدہ سب سے پہلے اہلِ تشیع کے ہاں آیا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ قرآنِ مجید کی آیت [22:52] وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ ......) میں' نَبِیٍّ کے بعد لفظ مُحَدَّثٌ تھا جو قرآن کے مروّجہ نسخوں میں نہیں ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اپنے دعویٰ محدّثیت کی سند میں یہی آیت لفظ محدّث کے اضافہ کے ساتھ درج کی ہے[1]۔ باقی رہا تصوف' سو اس سلسلہ میں' مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان پیغامِ صلح کی اشاعت بابت 11 جولائی 1973 میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ:

> آپ کی (مرزا صاحب کی) تحریرات میں جو اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن سے اپنوں اور بیگانوں کو ٹھوکر لگی ہے اور آپ کو مدعیٔ نبوت سمجھنے لگے ہیں' جیسے ظلّی نبی' بروزی نبی' اُمتی نبی' غیر تشریعی نبی' فنافی الرسول' اور مجازی نبی' تو ان کے متعلق سمجھنے والی بات صرف یہ ہے کہ یہ اصطلاحات کہاں سے لی گئی ہیں اور ان کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنِ مجید اور احادیث میں تو کوئی ذکر نہیں اور آنحضرتؐ کے پانچ چھ سو سال بعد تک ہمیں ان کا وجود نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاحات صوفیاء کرام نے وضع کی ہیں۔

یہ ہیں ان دعویٰ کے منابع۔ اس کے بعد جو الہامات انہیں (بقول اُن کے) خدا کی طرف سے ملے' ان کے متعلق انہوں نے کہا:

> میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُن الہامات پر اُسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر' اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں' اُسی طرح اُس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے' خدا کا کلام یقین کرتا ہوں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ 211)

اور اُن کے بیٹے اور خلیفۂ اول' میاں محمود احمد نے کہا:

> پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب کوئی نبی آ جائے تو پہلے نبی کا علم بھی اُسی کے ذریعے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا۔ اور ہر بعد میں آنے والا نبی پہلے کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعہ دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں' سوائے اُس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا اور کوئی حدیث نہیں سوائے اُس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے۔ (اخبار الفضل' قادیان مؤرخہ 15 جولائی 1924ء)

1۔ براہینِ احمدیہ' ربوہ ایڈیشن (1957ء)۔ صفحہ 633' بحوالہ ہفتہ وار ایشیا' لاہور' مؤرخہ (14) اکتوبر 1973ء۔ میرے سامنے اس وقت براہینِ احمدیہ نہیں اس لئے میں نے اس حوالہ پر اکتفا کیا ہے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون سی خصوصیت کبریٰ تھی جس کی بنا پر خدا نے مرزا صاحب کو اس منصب کے لئے منتخب کیا تھا! سُن لیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آخری صداقت کو قادیان کے ویرانوں میں نمودار کیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو فارسی النسل ہیں، اس اہم کام کے لئے منتخب فرمایا[1]۔ (اخبار الفضل، مؤرخہ 3 فروری 1935ء)

آپ نے دیکھا کہ اس نبوت کے ڈانڈے کہاں جا کر مل رہے ہیں؟ — اِس فارسی النسل ''مامور من اللہ'' کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قرآن کے حکم جہاد کو منسوخ قرار دے دیا۔

جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کئے جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا۔ اور پھر بعض قوموں کے لئے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔

(اربعین نمبر 4، صفحہ 15، حاشیہ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے ایمان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا۔

ایضاً (صفحہ 47) (قادیانی مذہب، صفحہ 297)

ایرانی سازش کا ملخص

یہ ہے اجمالی سا تعارف اس سازش کا جس کی رُو سے، ایران نے اپنی شکست کا انتقام عربوں ہی سے نہیں بلکہ نفسِ اسلام سے اس انداز سے لیا کہ اس کی اصل و بنیاد تک کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اس ساری بحث کو علامہ اقبالؒ نے ایک فقرہ میں سمٹا دیا ہے جس میں کہا ہے کہ:

تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

(مقالہ نیو اِرا، 28 جولائی 1917ء)

یہی ''ایرانی اسلام'' (یعنی ہمارا ''مجوسی ورثہ'') ہے جو صدیوں سے مروج چلا آ رہا ہے۔ اس میں نہ شیعہ کی تخصیص ہے نہ

1۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ بھی سرزمینِ ایران ہی سے اٹھے۔ اور ان کی ''نبوت'' کا کارنامہ بھی حکمِ جہاد کی تنسیخ تھا۔

سُنّی کی' نہ اہلِ حدیث کی نہ اہلِ فقہ کی' نہ اربابِ شریعت کی' نہ اصحابِ طریقت کی۔ سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمدن' تصوف' شریعت' کلام　　　　بُتانِ عجم کے پُجاری تمام

اور اس کا نتیجہ یہ کہ:

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　　یہ اُمت روایات میں کھو گئی　　(اقبالؒ)

پھر' اس سازش کی ساحری کا کمال یہ ہے کہ ہمارے اربابِ مذہب' اصولات و جزئیات تک میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں' ان میں مسلسل باہمی آویزش و کشمکش رہتی ہے' یہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتاویٰ تک صادر کرتے رہتے ہیں لیکن جو شخص ان سے یہ کہہ دے کہ:

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز　　　　دگرگوں گشتہ! از خویش بگریز

ترازوئے بنہ کردارِ خود را　　　　قیامت ہائے پیشیں را بر انگیز

یہ سب کے سب' متحدہ و متفقہ طور پر اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔

علاج اس کا؟

سوال یہ ہے کہ کیا عجم کی اس سازش کا توڑ ممکن ہے' اور اسلام کو اس ملبہ کے نیچے سے نکالا جا سکتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن!

بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے' وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔　(خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی میری بھی عمر بھر کی آرزو اور پکار ہے' اور ان کے مظاہر کی تازہ کڑی' میری یہ سعی و کاوش جو اس تصنیف کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ بایں دعا کہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

پرویز